پاکستان کی مادری زبانوں
کا لوک بیانیہ
احمد سلیم
ڈاکٹر حمیرہ اشفاق
لوک ورثہ کا قومی ادارہ
اسلام آباد
الفیصل

پاکستان کی مادری زبانوں کا لوک بیانیہ

تحریر و تحقیق
احمد سلیم
ڈاکٹر حمیرہ اشفاق

لوک ورثہ کا قومی ادارہ، اسلام آباد، پاکستان

ISBN: 978-969-468-029-3

January 2019

Work

پاکستان کی مادری زبانوں کا لوک بیانیہ

Research & Written by
Ahmed Saleem
Dr. Humeera Ashfaq

Review
Zia Ud Deen Naeem

Executive Director
Shahera Shahid

Dy-Director Publication
S. Muhammad Ali

Title Design
Asad Fatemi

Text Layout
Richard Gorg

Lok Virsa
National Institute of Folk & Traditional Heritage
Garden Avenue, Shakarpurian, Islamabad, Pakistan.
Ph: 051-9249209 Email: jic.pmu@gmail.com
www.lokvirsa.org.pk

Joint Publisher

الفیصل ناشران و تاجران کتب

Al-Faisal Nashran
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore.
Ph: 042-37230777 & 042-.37231387

انتساب

پاکستان کی مادری زبانوں

کے نام

Hasnain Sialvi

فہرست

تیسرا باب: خیبر پختونخوا کا لوک بیانیہ

چوتھا باب: سندھ کا لوک بیانیہ

پانچواں باب: پنجاب کا لوک بیانیہ

چھٹا باب: سرائیکی وسیب کا لوک بیانیہ

ساتواں باب: آزاد جموں کشمیر کا لوک بیانیہ

آٹھواں باب: گلگت بلتستان کا لوک بیانیہ

پبلشر نوٹ

اگر میں یہ کہوں کہ لوک ورثہ کا قومی ادارہ پاکستان میں ثقافت اور لوک ادب سے متعلق کتابیں شائع کرنے والا سب سے بڑا ادارہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ادارے نے پاکستان کی گرانقدر ثقافت کو آنے والی نسلوں سے روشناس کروانے اور تمام ثقافتی جہتوں کو محفوظ کرنے کے لئے کتاب، مونوگراف، ایل پی ریکارڈز اور کیسٹوں کی صورت محفوظ بنانے کے جس کام کا آغاز آج سے چالیس سال قبل کیا تھا وہ نامساعد حالات کے باوجود آج تک جاری ہے۔

میں یہ بتاتے ہوئے بہت خوشی اور فخر محسوس کر رہی ہوں کہ اس ادارے نے اپنے مینڈیٹ کے حوالے سے بڑی دیانتداری اور جانفشانی سے کام کیا، وسائل کی کمی اور تربیت یافتہ افرادی قوت کے فقدان کے باوجود اس ادارے نے اپنے آپ کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی ہر ممکن کامیاب کوشش کی۔ مطبوعات کے حوالے سے تحقیقی اور طباعتی معیار کو وقت سے ہم آہنگ کیا، ایل پی ریکارڈ، کیسٹوں اور سپول ٹیپس کو ڈیجیٹلائز کر کے سی ڈی، ڈی وی ڈی اور ویب پر منتقل کیا۔ پاکستان کے تمام علاقوں کی ثقافت، فنون، لباس و زیورات پر مشتمل ورثہ ثقافتی میوزیم قائم کر کے اسے دنیا کے بہترین ثقافتی میوزیم کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہی نہیں قیام پاکستان کی جدوجہد کی مکمل تاریخ پر مبنی سمعی و بصری میوزیم ''پاکستان مونومنٹ میوزیم'' کا قیام آج نہ صرف لوک ورثہ بلکہ پورے پاکستان کے لئے قابل فخر ہے۔ ان تمام کامیاب کاوشوں کے پیچھے لوک ورثہ ملازمین کی شب و روز کی محنت کے ساتھ ساتھ پاکستان اور اس کی ثقافت سے دلچسپی اور محبت رکھنے والے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں، دستکاروں کی محنت اور عملی تعاون بھی کارفرما ہے جس نے آج اس ادارے کو اس مقام پر پہنچایا۔ میں ان سب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے امید رکھتی ہوں کہ باہمی اتفاق و اتحاد کی فضا میں یہ سفر اسی طرح جاری و ساری رہے گا۔

پاکستان کی ثقافت کے اجزائے ترکیبی میں ہماری صوبائی ثقافتی رنگارنگی انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری دیہی ثقافت اتنی خوبصورت، متنوع اور وسیع ہے کہ ایسی مثال دنیا کے اور معاشروں میں کم ہی ملتی ہے۔ پاکستان کی ثقافت کے بہت سے مخفی پہلوؤں پر ابھی کام کرنے اور انہیں کھوج کر محفوظ بنانے کی ضرورت ہے۔

زیر نظر کتاب ''پاکستان کا لوک بیانیہ'' بقول مصنف اور تحقیق کار محترم احمد سلیم صاحب کے، ''یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں پاکستان کی کم و بیش تمام زبانوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب تصنیف بھی ہے، تالیف بھی اور ترتیب بھی۔ اس اعتبار سے بھی یہ ایک منفرد اور جداگانہ کاوش ہے''۔

احمد سلیم صاحب ایک بہت سنیئر اور منجھے ہوئے لکھاری اور تحقیق کار ہیں خاص طور پر ثقافتی تحقیق کے حوالے سے ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اس کام میں ان کی معاونت ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے کی ہے۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ اُن کی یہ کاوش اب شائع ہو کر عام لوگوں کے مطالعے کے لئے دستیاب ہو گی۔

شاہیرہ شاہد
ایگزیکٹو ڈائریکٹر

مادری زبانوں کا لوک بیانیہ

بیانیہ......اپنے تجربات یا خیالات دوسروں تک پہنچانے کا ایک طریقہ ہے، اور اصل میں ''کہانی'' کے لئے متبادل ایک اصطلاح......! جذبات ابھارنے یا اس ذریعے سے ذہنوں کو تسخیر کرنے کے عمل کی استعداد اس امر پر منحصر ہوتی ہے کہ راوی بیان کے فن میں مہارت کتنی رکھتا ہے اور حواس پر اثر انداز ہونے کی اہلیت اس میں کس قدر ہے۔ ایک عمدہ قصہ گو اپنے سننے والوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے سکتا ہے، ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ سامعین کی سوچوں پر حاوی ہو کر ان کے آئندہ طرزِ عمل کی صورت گری اپنی منشا کے مطابق کرا سکے۔

ایک بیانیے کو ''لوک بیانیہ'' میں کیا چیز تبدیل کر دیتی ہے...... یہ ایک ذرا مختلف سوال ہے جس کو دو ٹوک جواب یوں ممکن نہیں کہ اہل علم کے مابین اس کی بنیادی خصوصیات کے حوالے سے فکری یک جہتی کا فقدان ہے۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ''لوک بیانیے'' وہ بیانیے ہوتے ہیں جو بنیادی طور پر زبانی روایات پر مشتمل ہوتے ہیں اور رد و بدل اور سینہ بہ سینہ چلنا ان کا اختصاص ہوتا ہے۔

چونکہ یہ بیانیے تحریری نہیں زبانی ذرائع سے نفوذ پاتے ہیں اس لئے لازمی ہے کہ بعض مخصوص خصوصیات ان میں اجزائے ترکیبی کے طور پر سرتاسر موجود ہوں۔

1۔ لوک بیانیوں میں کسی ایک حتمی وژن پر اتفاق کا پایا جانا ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ مختلف وژن حالات، ضروریات اور زمانوں کی بنیاد پر تراشے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ہر لوک بیانیہ، بوقت بیان نئے سرے سے تخلیق کیا جاتا ہے۔

2۔ بار بار تخلیق کے اس عمل کی وجہ سے لوک بیانیے میں زمانۂ حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ قصہ گو کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنے بیانیے کو دلچسپ، قابل فہم اور پرکشش بنانے کے لئے گزرے زمانے کی زبان، علامتوں اور واقعات کو پورے تنوع کے ساتھ جزو قصہ بنانے کا اہتمام رکھے۔ لیکن کسی صورت لوک بیانیہ لمحۂ موجود کی تخلیق ہوتا ہے اس لئے اس کو عصری صورت حال، اقدار اور رجحانات کی عکس ریزی سے کسی صورت گریزاں نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ لوک بیانیہ ایک ایسا تجدیدی کام ہے جس میں زمانۂ ماضی کو حال کی سطح پر متشکل دکھانا ہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

3۔ لوک بیانیہ، فرد اور کمیونٹی دونوں کا یکساں طور پر عکاس ہوتا ہے، قصہ گو بیانیوں کو اپنے حالات تاثرات کے تطابق میں نئے سرے سے ایک مختلف شکل دیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ تخلیق کاری بے حد و نہایت نہیں

ہوتی۔ اس کے بیانیوں کا پھیلاؤ اسی حد تک رہتا ہے جس حد تک اسے یقین ہو کہ کمیونٹی اسے قبول کرے گی۔ قصہ گو کے منصب پر آئندہ قائم رہنے کی خاطر بھی اسے بیانیوں کے ضمن میں کمیونٹی کے ردو قبول کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔

لوک بیانیے زبان کے ترقی یافتہ دور میں داخل ہونے کے بعد ہی متعارف ہوئے اور اس وقت سے آج تک تسلسل سے میدان عمل میں ہیں۔ شاید یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ لوک بیانیے ازمنہ قدیم اور کسانوں کے عہد سے متعلق کوئی شے نہیں ہیں، بلکہ جملہ معلوم انسانی گروہ، تہذیب کے تمام ادوار اور یہاں تک کہ ہمارا آپ کا زمانہ بھی ان کی کارگاہ ہونے کا شرف رکھتا ہے۔

دیو مالائی قصے، درویشوں کی کرامات، جانوروں کی کہانیاں، رسوم ورواج، جادو کی کرشمہ سازیاں، غم وخوشی، تقریبات اور جنگ وجدل کے مواقع پر گائے گئے گیت بھی لوک بیانیے کا جز ولاینفک ہوا کرتے ہیں چنانچہ تاریخ کا مرتبہ تو اسے نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ بات طے ہے کہ اس کے در یچے مختلف خطوں پر گزرے احوال اور ان خطوں کے مزاج و عادات کا طائرانہ جائزہ ضرور لیا جا سکتا ہے اور بعض مستند اندازے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ خصوصی طور پر کسی علاقے کے اقوال، دانش پارے، ضرب الامثال اور گیت اس باب میں نہایت معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہمارا ملک پاکستان دنیا کے ان خوش قسمت علاقوں میں سے ہے جسے رب کریم نے ایک خاص تنوع سے نوازا ہے، ہمیں ہر قسم کی زمین، موسم، باغات، صحرا، سمندر، دریا اور کھیت کھلیان میسر ہیں۔ زبانوں اور ثقافت کے حوالے سے بھی جو تنوع ہمیں حاصل ہے شاید ہی کہیں اور ہوگا۔ یہ ثقافتی و کثیر اللسانی امارت بلاشبہ ہمارے لئے اعزاز سے کم نہیں۔

اس ثقافتی و کثیر اللسانی امارت کے حامل ملک پاکستان کا لوک بیانیہ مرتب کرنا ہرگز کوئی سہل کام نہیں تھا۔ جناب احمد سلیم علم وادب کی دنیا کا ایک معروف نام ہیں، جس عرق ریزی و محنت اور یقینی طور پر سفر کی مشقت وصعوبت اٹھا کر انہوں نے ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے ساتھ یہ دقیع کام سرانجام دیا ہے اس پر میں انہیں ہدیہء تحسین اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ کام ''لوک ورثہ'' کے لئے ایک بیش قیمت اثاثے سے کم نہیں۔

سید ضیاء الدین نعیم

ہمارا بیانیہ

ہم نے جو کچھ کہنا تھا، لوک بیانیہ کی اس تصنیف میں کہہ دیا ہے اور کافی تفصیل سے کہہ دیا ہے۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں پاکستان کی کم وبیش تمام زبانوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب تصنیف بھی ہے، تالیف بھی ہے اور ترتیب بھی۔ اس اعتبار سے بھی یہ ایک منفرد اور جداگانہ کاوش ہے۔ اس کے لئے ہمیں سندھ کے ریگستانوں سے لے کر خیبر پختونخوا کی چٹانوں تک، پنجاب کے میدانوں سے لے کر بلوچستان کے پہاڑوں تک، دیر، سوات، چترال، آزاد کشمیر، سرائیکی وسیب اور گلگت، بلتستان سمیت ہم نے ان علاقوں کا عملی، ذہنی اور مطالعاتی سفر کیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ وجود میں آیا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کام کے دوران تحقیقی مواد کی جمع بندی، ماہرین سے ملاقاتوں، ان کی باتوں کو محفوظ کرنے اور اُسے موجودہ شکل دینے میں دو برس لگ گئے۔ ہم ابتداً اس کام کو چھ ماہ میں مکمل کرنے کا سوچ رہے تھے۔ آغاز میں اسے تین سو صفحات میں مکمل کرنے کا ارادہ تھا لیکن جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا، پھیلتا گیا اور اس پھیلاؤ کو سمیٹنے میں ایک برس اور لگ گیا۔ پاکستان کی جتنی زبانوں کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے، ان زبانوں کے لوک بیانیہ کی مہارت رکھنے والی علمی اور ادبی شخصیات نے قدم قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی، ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ پاکستان کے متعدد لوک اداروں سے ہمیں الگ رہنمائی اور مدد ملی جن میں سب سے بڑا ادارہ خود لوک ورثہ ہے۔ اس ادارے کی کئی مطبوعات بھی ہمارے مطالعے میں رہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لوک ورثہ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لوک خزانوں سے ہمیں سب سے بنیادی رہنمائی ملی۔ پاکستان بھر کے متعدد مقامی اداروں نے بھی ہماری ہر طرح سے رہنمائی کی۔ پاکستان کی مادری زبانوں کے سیکڑوں لوک پیاروں، خواتین، بزرگوں اور بچوں نے اس کتاب کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ ہم نے جن مطبوعات سے اکتسابِ فیض کیا ہے، ان کے مکمل حوالے، ہر باب کے آخر میں دے دیئے گئے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اس کتاب کے بارے میں ہمیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا ہے، سوائے لوک ورثہ کے قومی ادارے کے لئے اظہارِ تشکر کے۔ اگر ہمیں اس کا موقع نہ دیا جاتا تو ہم اپنی دھرتی کے ان لوک خزانوں کو نہ کھنگال سکتے۔

احمد سلیم / ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسلام آباد

پاکستان کا لوک بیانیہ

لوک بیانیہ کیا ہے؟

لوک بیانیہ کیا ہے؟ سادہ لفظوں میں لوگوں کی اپنی مادری زبانوں میں بیان کردہ حکایات، روایات، ان کے گائے ہوئے گیت، بزرگوں سے چلے آرہے لوک دانش سے بھرپور ضرب الامثال، لوک کتھائیں، جن میں قبیلے کی بہادری کے منظوم قصے، محبت کی آزادی کا بیانیہ، آزادی کے لئے مر مٹنے کی رنگین وسنگین داستانیں ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ رزمیہ بیانیے، جنگی ترانے نہیں ہوتے کیونکہ جنگی ترانے ریاستی جنگوں کو بڑھاوا دینے والے ہوتے ہیں۔ بیرونی حملوں کے خلاف عوام کا تخلیق کردہ رزمیہ لوک بیانیہ ہوتا ہے لیکن دوسروں کی آزادی کو کچلنے کے لئے بادشاہوں کے حملوں میں نام نہاد بہادری کے قصے لوک دشمن بیانیہ ہوتے ہیں۔

قبائل کی روایتی تاریخ بھی لوک بیانیہ ہے۔ اس طرح صدیوں سے چلی آرہی سینہ بہ سینہ روایات جنہیں ان کی مادری زبان میں بیان کیا گیا ہو، لوک بیانیہ کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں مادری زبانوں کا تنوع خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا آغاز، ان کا ارتقاء، ان کی موجودہ صورت، ان زبانوں کا ورثہ، یہ سب لوک بیانیہ کا حصہ ہے۔ پاکستان درجنوں زبانوں اور بولیوں کا ایک خوبصورت باغ ہے۔ جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ باغ یک رنگی کے نظریئے کو مسترد کرتا ہے۔ پاکستان چار قدیم صوبوں اور دو نئے صوبوں کا خطہ ہے۔ سندھ میں سندھی کے علاوہ تھری، سرائیکی، گجراتی، ڈھاٹکی، مارواڑی، کاٹھیاواڑی اور دیگر بولیاں لوک محاورے کا انگ سنگ ہیں۔ پنجاب میں پنجابی زبان، جو پنجاب کے طول وارض میں پھیلی ہوئی ہے کے علاوہ باگڑی، سرائیکی، پوٹھوہاری، دھنی، ہندکو، ہریانوی، چھاچھی اور ان کی درجنوں ذیلی شاخیں موجود ہیں۔ بلوچستان میں تین مرکزی زبانوں بلوچی، براہوی اور پشتو کے علاوہ کردی، سرائیکی اور سندھی، دہواری، فارسی، مکرانی، ہزارگی، لاسی، اور دری جیسی زبانیں اور بولیاں لوک اظہار کا ذریعہ ہیں۔ خیبر پختونخوا کی بنیادی زبانیں پشتو اور ہندکو ہیں، جبکہ ان کے علاوہ کھوار (چترالی) کوہستانی، کیلاشہ، اشریتی، گاوری، پالولا، توروالی، ڈومکی، واخی، اُرچنی، ارمڑی اور متعدد لوک بولیاں رائج ہیں۔ نئے تشکیل شدہ صوبے گلگت بلتستان میں بلتی، شینا، بروشسکی کے علاوہ گوجری، بدیشی، سمیت درجن بھر بولیاں لوگوں کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ آزاد جموں اور کشمیر میں کشمیری کے ساتھ ساتھ گوجری، پہاڑی، میر پوری، باگڑی، دیملی، ڈوگری، اور کئی دوسری لوک بولیاں شامل ہیں۔

نامور محقق اور توروالی ادیب زبیر توروالی نے شمالی پاکستان کی مقامی بولیوں کی فہرست میں کھوار، شینا، انڈس کوہستانی، توروالی، گاوری، پالولا، کیلاشہ، دمیلی، گاورتی، بتیری، چلوسو، ڈومکی، بروشسکی، اُشوجو، بلتی، واخی اور یدغہ کو شامل کیا ہے۔ محمد پرویش شاہین نے چترال کی تحصیل دروش میں واقع شیشی کوہ وادی کو زبانوں کی وادی قرار دیا ہے۔ ان زبانوں میں وہ گوجری، کیلاشہ، کھوار، پھلوڑا، شینا، پشتو اور فارسی کو شامل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ آزاد جموں کشمیر کی وادی نیلم میں بولی جانے والی زبانوں میں کشمیری، پہاڑی، گوجری، شنا، پشتو اور ایک بے نام زبان، جسے کنڈل شاہی کا فرضی نام دیا گیا ہے، کو شامل کرتے ہیں۔

اپنے ایک اور مقالے ''بحرین کا نسلی اور لسانی جائزہ'' میں محمد پرویش شاہین نے اس علاقے کی زبانوں میں توروالی، بدیشی، درشو، گاوری اور بعض دیگر مقامی بولیوں کو شامل کیا ہے۔ وہ گلگت بلتستان کو زبانوں کا گڑھ قرار دیتے ہیں۔ ان زبانوں کا لوک بیانیہ بھرپور اور وسیع ہے۔ پاکستان کی درجنوں زبانوں اور بولیوں کا لوک ادب، صوفی ادب، لوک دانش، اس لوک بیانیہ کا حصہ ہیں۔ اس حوالے کو آگے بڑھانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لوک بیانیہ کے تاریخی شواہد اور آثارِ قدیمہ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

آثارِ قدیمہ اور لوک بیانیہ:

ہماری لوک تواریخ مزاحمت کی تاریخ ہے۔ پاکستان کا لوک بیانیہ، ہمیں صدیوں پیچھے لے جاتا ہے۔ مہر گڑھ، موہنجو دڑو اور ہڑپہ کی عوامی زبانوں کی گواہی تک کلید نہیں مل سکی لیکن اتنا ضرور واضح ہو چکا ہے کہ وادی سندھ کے لوگوں نے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف کس سطح کی مزاحمت کی تھی۔ وادی سندھ کے دریاؤں پر رچے جانے والے گیتوں میں مزاحمتوں کی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔

اگر ہم لوک بیانیہ کا ذکر مہر گڑھ کی عظیم تہذیب سے کریں تو ہمیں آثار قدیمہ کے ماہرین کا سہارا لینا ہوگا۔ گویا آثار قدیمہ لوک بیانیہ کی اولین بنیاد ہیں۔

مہر گڑھ 7000 سے 3300 ق۔م تک کم و بیش نو ہزار سال پرانی تہذیب ہے جس میں ہم ترقی یافتہ انسانی زندگی کے واضح آثار دیکھ سکتے ہیں۔ مہر گڑھ کے لوگ گندم، چاول اور دیگر اجناس کی کاشت کرتے تھے۔ وہ گلہ بان تھے اور بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ وہ ماہی گیری کے طریقوں سے بھی واقف تھے۔ انسانی تاریخ میں کپاس کا سب سے پہلا استعمال مہر گڑھ کی دھرتی سے ہوتا ہے۔ مردوں کو جلانے کی ہندو رسم کے برعکس انہیں دفنانے کا رواج تھا۔ مردوں کے ساتھ ان کی ضرورت کا سامان مثلاً گھڑے اور زیورات وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ 7000 ق۔م کے دوران مہر گڑھ کی آبادی 25 ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ وہ مٹی کے گھروں میں رہتے۔ وہ مختلف بیماریوں خصوصاً دانتوں کے امراض اور ان کے علاج سے واقف تھے۔ عالمی تاریخ میں مٹی کی قدیم ترین اشیاء مہر گڑھ میں پائی گئی ہیں۔ وہ کپڑا بننے کے فن سے واقف تھے۔

شاہ محمد مری کے بیان کے مطابق:

''سبی سے تقریباً 26 کلومیٹر پر واقع مہر گڑھ میں دریافت ہونے والی قدیم تہذیب نے ثابت کیا ہے کہ بلوچستان کرہ ارض کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا جو یہاں 9000 قبل مسیح میں ابھری تھی۔ بلوچستان میں مہر گڑھ اور پیرک کے آثار قدیمہ پر تحقیقات نے ظاہر کیا ہے کہ 7000 سال قبل از مسیح یہ علاقے انسانی آبادی کے اولین مقامات تھے لہٰذا یہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں قدیم ترین کلچر اور تمدن کے علمبردار تھے۔ ان کے زمانے کو Neolithic نئے پتھر کا عہد کہا جاتا ہے۔ مہر گڑھ میں زراعت کی اولین نشانیاں ملی ہیں جن میں دالوں کی ہزاروں باقیات ملی ہیں۔

''سات ہزار سال قبل مسیح کھجور کی فصل کی ابتدا یہیں سے ہوئی تھی۔ مہر گڑھ کے علاقے میں پائے جانے والے اناج میں ''جو'' مقامی نوعیت کا تھا جو 8000 سال قبل مسیح میں کاشت کیا جاتا تھا۔ دیگر اجناس میں گندم کی مختلف قسمیں ملیں جو 5000 سال قبل مسیح میں کاشت ہوتی تھی۔ کپاس اگانے کی شہادتیں بھی ملی ہیں۔ کٹائی کے لئے پہلے پہل پتھر کے آلات استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں جب دھاتوں کے بارے میں علم بڑھا تو یہ آلات تانبے سے بنائے جانے لگے۔ فصل ذخیرہ کرنے کے لئے گودام انسانی بستیوں میں کچی اینٹوں سے بنائے جاتے تھے۔ یہ بڑے بڑے اور چوکور ہوا کرتے تھے۔ وہ یہ گودام ایک ہی قطار میں ایک ہی مقام پر تعمیر کرتے تھے۔ بڑے بڑے گودام اندر سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ زراعت کے ابتدائی دور میں مہر گڑھ میں آباد قبائل بڑے بڑے برتن پتھروں اور چمڑے سے بناتے تھے یا پھر درختوں کی شاخوں سے ٹوکریاں تیار کر کے ان پر مٹی کا لیپ کر لیا کرتے تھے۔ یہاں جانوروں کے شکار کی علامتیں موجود ہیں جن میں بارہ سنگھا، نیل گائے، ہاتھی اور بھینسے شامل تھے۔ وہ بھیڑ بکریوں، گائے، بیل اور بھینس پالتے تھے اور ان سے وہ سارے فائدے حاصل کرتے تھے جو آج کا انسان حاصل کرتا ہے۔ یہ لوگ گھوڑے استعمال کرتے تھے۔ پہیہ کی موجودگی اور استعمال کی شہادت ان کی کاشتکاری کی علامت ہے۔ وہ خانہ بدوشی کی بجائے زمین پر آباد رہ کر کاشتکاری کرتے ہیں''۔(1)

یہ تہذیب 7000 ق۔م سے 2600 ق۔م تک قائم رہی۔ اسے نئے حجری عہد کا زمانہ بھی کہا جاتا ہے مہر گڑھ کا رقبہ 2 مربع کلومیٹر یا 495 ایکٹر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی دریافت کا سہرا جین فرانس جیرگ اور کیتھرین جیرگ کے سر ہے۔ جنہوں نے 86-1974ء کے دوران اس علاقے میں کھدائیاں کیں۔ 7000 ق۔م کے عرصہ میں ہی پوٹھوہار کے علاقے میں روات کلچر اور سواں کلچر کے آثار بھی مل چکے تھے۔ درمیانی عرصے میں سپت سندھو اور وادیٔ سندھ کی تہذیب (3300 ق۔م سے 1300 ق۔م تک) کے آثار ملتے ہیں۔

مہر گڑھ کی زبان اب تک نامعلوم ہے۔ ہڑپہ اور موہنجو ڈرو کی زبان کو پڑھنے کی کوشش ہنوز جاری ہے۔ لیکن باقی آثار سے کافی حد تک اس کے لوک بیانیہ کا سراغ ملتا ہے۔ ان دریائی تہذیبوں کے بعد گندھارا مملکت (1500

ق۔م سے500ق۔م تک) کے علاقوں کی تہذیب کا لوک بیانیہ ٹیکسلا، سوات اور افغانستان سے وضاحت کے ساتھ سامنے آچکا ہے۔

سندھو، جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج اور سرسوتی، سات دریاؤں کی دھرتی، سپت سندھو آریائی حملوں سے قبل تہذیب کی جس بلندی تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہڑپہ اور روپڑ کے کھنڈر اس کا حال تفصیل سے سناتے ہیں۔ وہاں سے برآمد ہونے والی مورتیاں، مہریں، برتن، زیورات، قبریں، اور عمارتیں اس سچائی کا برملا اعلان ہیں کہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے سرسوتی سے سندھو، ندی تک بکھرے ہوئے میدانوں اور شمال مغرب کی جانب طویل پہاڑی سلسلوں میں گھری ہوئی یہ دھرتی تہذیب کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ پھر آریائی اقوام نے یہاں آکر موت اور خون کی ہولی کھیلی۔

مزاحمت کا لوک بیانیہ:

سات دریاؤں کی اس سرزمین نے آریاؤں کے عہد میں دوبارہ کروٹ لی۔ انہوں نے ''رگ وید'' کی تخلیق کی۔ اس کے منتروں کی زبان گو سنسکرت تھی مگر اس میں مقامی لفظوں کی آمیزش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم آج بھی جسم کے لئے ''دیہہ'' پیٹھ کے لئے ''کنڈ'' نسل کے لئے ''پیڑھی'' نتھ کے لئے ''نتھ'' اور کرائے کے لئے ''بھاڑے'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ قدیم دراوڑی لفظ ہیں اور پانچ ہزار سال گذر جانے پر بھی اپنی اصل صورت میں روزمرہ کی بول چال کا حصہ ہیں۔

آریائی شاعروں نے اپنی نظموں میں جہاں مفتوح دراوڑوں کے بدصورت ہونے اور آریائی مذہب سے ان کی بیزاری اور نفرت کو ہدف کا نشانہ بنایا۔ وہاں انہوں نے نئی سرزمین سے اپنا رشتہ جوڑتے ہوئے سپت سندھو کے دریاؤں اور میدانوں کی عظمت کو سلام بھی کیا۔ ان منتروں سے ہم اس عہد کے پنجاب کی تاریخ، جغرافیہ اور معاشرت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر ویدک سنسکرت کو موجودہ پنجابی کی ابتدائی شکل مان لیا جائے تو رگ وید، سندھی، سرائیکی اور پنجابی ادبیات کی پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔

وڈ کہا کی روایت:

''رگ وید کے بعد جو اہم ادبی کتاب پنجاب میں تصنیف ہوئی وہ ''وڈ کہا'' کہلاتی ہے ''وڈ کہا'' پشاچی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی پنجابی میں ''وڈی کہانی'' کے ہیں؛ اس کتاب کا مصنف گُناڈھے ضلع جہلم کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب پشاچی زبان میں اب ناپید ہے۔ لیکن اس کے سنسکرت ترجمے موجود ہیں۔ کشمیر کے ایک پنڈت شمندرا نے ''برہت کتھا'' کے عنوان سے اسے سنسکرت میں ڈھالا۔ کشمیر ہی کے ایک پنڈت سومدیو نے ان کہانیوں پر مبنی سنسکرت میں ایک کتاب ''کتھا سرت ساگر'' کے نام سے مرتب کی۔ ''کتھا سرت ساگر'' کا انگریزی ترجمہ

Ocean of story کے نام سے ہو چکا ہے۔ سوم دیو نے نہ صرف اصل ماخذ ''وڈ کہا'' کا حوالہ دیا ہے۔ بلکہ واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ کہانیاں سب سے پہلے پشاچی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ لسانیات کے بیشتر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ مغربی پنجاب پشاچی زبان کا گھر تھا۔ جس نے اس خطے کے عظیم لوک بیانیہ کو جنم دیا۔

اس کے بعد تبدیلیوں سے بھری نت نئی روایات جنم لینے لگیں۔ پنجاب، کشمیر، بلوچستان، سندھ، راجستھان، پختونخوا، بنگال، گجرات اور مہاراشٹرا سے لوک بیانیہ کی زبردست روایت نے جنم لیا۔ یہ دور ناتھ جوگیوں، وار گوئیوں اور صوفی و بھگتی لہروں کا دور بھی ہے جس نے اس عہد کے لوک بیانیہ کی شکل متعین کی۔

ناتھ جوگیوں کی شاعری ایک خیال کے مطابق 850ء سے 1450ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ ناتھ شاعروں نے مقبول پنجابی لوک گیتوں کی بنیاد پر اپنی نظمیں لکھیں۔ یہ شاعری اس دور کی مقبول لوک دھنوں میں گائی جاتی تھی۔ ناتھ شاعروں نے اپنے گیتوں میں احتجاج اور بغاوت کے اشارے کئے ہیں تاہم یہ اشارے روایتی انفرادیت پسندی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ ناتھ شاعر بدھ مت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی تعلیمات برہمنی ذات پات اور مذہبی جکڑ بندیوں کے خلاف احتجاج سے بھری ہوئی ہیں۔ ناتھ شاعری نے انسانی شخصیت کے داخلی اور خارجی تصادم کو بھی اجاگر کیا ہے۔

یہی دور وار گوئی کا دور بھی ہے وار گوئی رزمیہ شاعری کی روایت ہے اور پنجابی شاعری کی پہلی صنف سخن ہے۔ جن کے قدیم ترین نمونے آج بھی قابل فہم ہیں، وار سکھ گورو صاحبان کے عہد تک پہنچتے پہنچتے خارجی جنگوں کے ماحول سے نکل کر انسان کی داخلی کشمکش سے روشناس ہو چکی تھی اور اس کی باطنی کشاکش اس کا موضوع بن چکی تھی۔

پنجاب میں تصوف کی تاریخ شہنشاہیت کی نفی کرنے، بیرونی حملوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے، قتل و خونریزی کو ناجائز قرار دینے، مذہبی منافرت سے بلند ہو کر سوچنے اور ظالم طاقتوں کے حق میں آواز بلند کرنے کی تاریخ ہے۔ بابا فرید کے ساتھ ہی پنجابی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ فرید بابا پہلے صوفی شاعر ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف مروجہ سماجی قدروں سے بغاوت کی، اپنے رشتے عرب و فارس سے توڑ کر اس سرزمین سے استوار کئے بلکہ انہوں نے عربی اور فارسی کو ترک کر کے عوام کی زبان پنجابی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مسلمان حملہ آور ہندوستان میں تلوار لے کر وارد ہوا تھا۔ لیکن اس کی فوجوں کے ساتھ مسلمان صوفی بھی یہاں آئے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار کی بجائے کتاب تھی۔ چنانچہ انہوں نے قتل و خونریزی کی مذمت کی اور صلح کل کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے اس طریق کار کے نتیجہ میں بے شمار لوگ مسلمان ہوئے۔ بعد ازاں اسلامی تصوف پر جب ویدانت، بھگتی لہر کے اثرات پڑنے شروع ہوئے تو صوفیوں نے مذہبی تبلیغ ترک کر دی اور یوں وہ مسجد اور ٹھاکر دوارے سے بلند ہو کر انسانی وحدت کے گیت گانے لگے۔

پنجاب کے ساتھ ساتھ کم وبیش یہی صورت سندھ، کشمیر، گلگت بلتستان، بلوچستان، راجستھان، خیبر پختونخوا میں بھی نظر آتی ہے۔ پاکستان کا لوک بیانیہ ان علاقوں کے طول وارض اور درجنوں زبانوں سے لے کر پورے لوک ورثے تک پھیلا ہوا ہے جسے یہاں الگ الگ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

سرائیکی وسیب کا لوک بیانیہ:

گذشتہ صفحات میں ہم نے پنجاب کی متعدد زبانوں کے لوک بیانیہ کا ذکر کیا ہے جن میں سرائیکی بھی شامل ہے اس زبان کے بولنے والے اپنے جداگانہ تشخص ''سرائیکی وسیب" کی بات کرتے ہیں، جو ثقافتی اور تہذیبی رنگا رنگی سے مالا مال ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر پنجاب کے باب سے ہٹ کر ایک الگ باب میں کریں گے۔

سندھ کا لسانی تنوع اور لوک بیانیہ:

سندھ کا لوک بیانیہ آثار قدیمہ کے علاوہ صدیوں پرانی سینہ بہ سینہ چلی آرہی زبانی روایات پر مبنی ہے۔ نو آبادیاتی سندھ میں مغربی مستشرقین نے اواخر انیسویں اور اوائل بیسویں صدی میں ان کی جمع بندی کے کام کا آغاز کیا۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک نو آبادیاتی مفادات اس کام کا محرک بنے۔ ہمیں یہ بات ہرگز نہ بھولنی چاہیے کہ مستشرقین کے کام کا مطالعہ کرتے وقت، اس کام کو ان کے نو آبادیاتی مفادات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں خود سندھی اہل علم نے اپنے لوک ادب کی طرف توجہ مبذول کی جس سے اس خطے کے لوک بیانیہ کی صورت واضح ہو کر سامنے آئی۔ اس ضمن میں مرحوم نبی بخش بلوچ اور ان کی ٹیم کا کام چالیس جلدوں میں محفوظ کیا جا چکا ہے جس کا تفصیلی ذکر آئندہ ابواب میں کیا جائے گا۔ یہاں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ لوک بیانیہ کے تناظر میں زیادہ قابل قدر کام لوک ورثہ کے ادارے نے کیا ہے۔

پنجاب میں تصوف کی روایت اور لوک بیانیہ:

پنجاب میں لوک بیانیہ کے مختلف مظاہر میں صوفی روایات سب سے مؤثر عنصر ہے۔ اس لوک بیانیہ کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ مسجد اور ٹھاکر دوارے کے فرق سے اوپر اٹھ کر انسانی وحدت کے گیت گائے گئے۔ پنجابی میں ان خیالات کا اظہار مادھو لعل حسین اور بلھے شاہ کے یہاں بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ فیضی اور دارا شکوہ نے بھی ان خیالات کو پھیلانے کے لئے کافی کاوشیں کیں۔ جب صوفیوں کو ملحد قرار دے کر قتل کیا جانے لگا اور سرمد جیسے عظیم لوک دوست مجذوب کو اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تو صوفیوں کا حکمران طبقوں سے سیدھا تصادم ہونے لگا۔ ان کی شہنشاہیت دشمنی کے بیسیوں واقعات لوگوں کی زبان پر ہیں۔ یہاں پنجاب کے مشہور صوفی حضرت میاں میر کا ایک واقعہ دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار شہزادہ اورنگ زیب نے ایک دورے کے دوران حضرت میاں میر سے ملنا چاہا۔ جب وہ ان کے دروازے پر پہنچا تو دربان نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔

اورنگ زیب نے فارسی میں ایک مصرعہ لکھ کر اندر بھیجا اور درباروں سے ہٹ کر بیٹھے درویش پر طنز کیا کہ

در درویش رادربان نباید

یعنی درویش کے دروازے پر دربان نہیں ہونا چاہئے۔ میاں میر جی نے جوابی مصرعہ لکھ کر بھیجا:

بباید تا سگِ دنیا نیاید

یعنی دربان ہونا چاہئے تا کہ دنیا کا کتا اندر نہ آ سکے۔ صرف یہی ایک واقعہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ پنجاب کے صوفیاء شہنشاہیت کی دہشت سے قطعی خوفزدہ نہیں تھے۔

صوفی مت نے پنجابی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ فرید بابا کی شاعری میں موت کی دہشت اور اس کا جبر، مادھو لعل حسین کے یہاں علامتی اور قلندرانہ رنگ اور بلھے شاہ کے کلام میں بھگتی لہر کے اثرات، تصوف کی وسعت، اور پنجابی ادب پر اس کی گہری چھاپ کا پتہ دیتے ہیں۔

اندرونی شورشوں اور بیرونی حملوں کی چکی میں پسنے والے تیرھویں صدی عیسوی کے پنجاب کو بابا فرید کی شاعری میں تلاش کرنا بظاہر آسان نہیں ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے پر ہم ان اجتماعی آنسوؤں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے جن پر موت کے خوف کی تہیں چڑھی ہوئی نظر آتی ہیں اور جن کے پس منظر میں ہمیں بھگتی لہر کی وہ مشترک قدریں دکھائی دیتی ہیں جو مسلمانوں کی ہند میں آمد کے بعد ہندو مسلم میل جول کا سبب بنیں۔

تیرہویں صدی کا پنجاب تقریباً ایک صدی تک منگول حملہ آوروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ اس عہد کے مؤرخوں نے پنجاب کی کہانی بڑے دردناک لفظوں میں بیان کی ہے۔ ان کی تحریروں سے اس عام خوف و ہراس کا پتہ چلتا ہے، جو بیرونی حملوں کے نتیجہ میں تمام پنجاب میں پایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے خلاف عام لوگوں کے دلوں میں جو گرہیں پڑ چکی تھیں وہ پھیل کر ایک لوک بیانیہ کی صورت میں فرید بابا کی شاعری میں ملتی ہیں۔ لیکن عوام کی یہ نفرت خوف کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

فریدا دریا کے کنے بگلا بیٹھا کیل کرے
کیل کریند ہنجھ نوں اچتے باز پئے
باز پئے تس رب دے کیلاں وسریاں
جو من چت نہ چیت سن سو گلیں رب کیاں

خوف و ہراس کی لہریں بابا جی کے ان دوہوں میں اور بھی شدید ہو جاتی ہیں جن میں وہ موت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان دوہوں سے اس سماج کے طبقاتی تضاد کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گرونانک کا دور لودھی راج کے آخری اور مغل شہنشاہیت کے ابتدائی دنوں میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ عہد بھی

اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا پُر شور اور ہنگامہ پرور ہے۔ نانک نے اپنی شاعری میں الٰہی وحدت کے ذریعے انسانی وحدت کا پرچار کیا۔ ''پنجابی لٹریچر'' کے مصنف سرے بریاکوف کے لفظوں میں گرونانک کی تعلیمات ہندومت، اسلام اور ہندوستان کے دیگر چھوٹے مذاہب کے درمیان دراصل ایک سمجھوتے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے دور میں پانچ بادشاہوں کے تخت الٹے۔ گرونانک لٹتے اور کٹتے ہوئے پنجاب کو دیکھ رہے تھے۔ مغل شہنشاہ بابر نے حملہ کیا تو گرونانک نے لکھا ؎

پاپ کی جنج لے کا بلودھایا
جوری منگے دان وے لالو
کھون کے سوہلے گاویا نانک
رت کا کنگو پاے وے لالو

یہ سولہویں صدی کا لوک بیانیہ تھا۔ مادھولعل حسین کا دور مغل شہنشاہیت کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔ اکبر بادشاہ کا دین الٰہی بظاہر وسیع المشرب انسان دوستی کے جذبے کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندو رانیوں کو اپنے حرم میں سجا کر ایک متحدہ قومی ہندوستان کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی۔ بادشاہ کے نورتنوں نے ادب، تاریخ اور فلسفے میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن اس تمام کارروائی کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان کے اتحاد کا سارا ڈھونگ بالائی سطح پر رچایا گیا۔ اُونچے طبقات جو پہلے دن سے متحد تھے، اب سرکاری پالیسی کے طور پر ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ گئے۔ بادشاہ اور اس کے اہل کار کسانوں کی اس تحریک کو پھلتے پھولتے دیکھ رہے تھے جس کی بنیاد گرونانک رکھ چکے تھے۔ بادشاہ اس تحریک کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے اس نے اونچے طبقات کے اتحاد کو بنیادی اہمیت دی لیکن کسان تحریک کسی ایک شخص کی خواہش پر شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی ایک آدمی کی خواہش پر ختم ہوسکتی تھی۔ یہ سولہویں صدی کے لوک بیانیہ کا تسلسل تھا۔ چنانچہ مادھولعل حسین کا تصوف بادشاہ اور اس کے کاسہ لیس سازشی درباریوں کے خلاف جدوجہد کا اعلان نامہ ہے جس پر اس عہد کے کسانوں نے اپنے لہو سے دستخط ثبت کئے۔ مقامی روایات کے مطابق پنجاب میں ''بار'' کے علاقے میں ایک کسان فرید نے گرونانک کے لفظوں میں ''جوری'' یعنی زبردستی دان سے انکار کردیا۔ زمین کا مالیہ دینے کا انکار اس کے قتل کا حکم بن گیا۔ اس کی چمڑی میں بھوسہ بھر کر اسے برسرِ عام لٹکا دیا گیا تاکہ لوگ آئندہ بغاوت کا تصور بھی نہ کرسکیں۔ لیکن یہ آگ اور بھڑک اٹھی۔ فرید کے بیٹے دُلے نے بار کے علاقے میں مغل راج کے خلاف تحریک چلائی اور بادشاہ کے گماشتوں کو مالیہ دینے سے انکار کردیا۔ اس کی سرگرمیوں کو نظر میں رکھنے اور اسے گھیر کر ختم کرنے کے لئے اکبر بادشاہ نے شیخو پورہ کے نزدیک ایک آبزرویٹری بنوائی اور اسے ہرن مینار کے نام سے مشہور کیا۔ دلا بھٹی عوام کا اتنا محبوب کردار بن گیا کہ حقائق مختلف روایات سے گزرتے ہوئے مختلف شکلیں بدلتے گئے۔ لیکن یہ بات بہر حال

افسانہ نہیں ہے کہ شاعر لال حسین کا انقلابی دلا بھٹی سے تعلق تھا۔ ''حقیقت الفقراء'' نامی فارسی مثنوی میں بتایا گیا ہے کہ جب دُلے کو لاہور کی گھوڑے منڈی میں پھانسی دی جا رہی تھی، اس وقت مادھولعل حسین وہاں موجود تھا۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حسین کی پراسرار سرگرمیوں کے باعث مقامی پولیس اس کے پیچھے لگی رہی تھی۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ پولیس سے بچنے کے لئے شاہ حسین جس کوٹھڑی میں روپوش تھے اس میں بعدازاں ہمارے عہد کے عظیم شاعر استاد دامن نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارا۔ وہ کوٹھڑی اب تک سلامت ہے اور اس میں استاد دامن اکیڈمی کا دفتر قائم ہے۔

ان حقائق کی تصدیق مقامی روایات سے بھی ہو جاتی ہے اور یوں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ شاعر حسین انقلابی دلا بھٹی کی زبان تھا۔

اس نظر سے شاہ حسین کی شاعری کو دیکھا جائے تو اس کی رندی اور مستی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ملامتیہ فرقے کا ایک فرد شمار کرتا ہے۔ شرعی احکامات کا باغی ہے۔ ایک خوبصورت ہندو لڑکے مادھو کو ساتھ لئے شہر میں مست الست گھومتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کا لوک بیانیہ بلھے شاہ اور وارث شاہ کا مرہونِ منت ہے۔ جب شاعر پکار اٹھا۔

سانوں آمِل یار پیاریا

لیکن اٹھارہویں صدی کے زخمی اور لہولہان پنجاب میں یار کہاں سے ملتا۔ وہ تو حملہ آوروں کے قافلے کے ساتھ زنجیروں میں جکڑا ایران اور افغانستان کے بازاروں میں بکنے جا رہا تھا۔ اس کی چنری تار تار تھی اور زلفیں اُونٹوں کے کجاوؤں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔

پاکستان کے دیگر صوبوں کی طرح پنجاب کی دھرتی بھی لوک دانش سے مالا مال ہے جس کا زیادہ واضح اظہار ضرب الامثال میں ہوتا ہے۔ پنجابی ضرب الامثال لوک تواریخ کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ ایک دو مثالیں دیکھتے ہیں۔

کاں، کمبوہ، کلال قبیلہ پالدا

جٹ، سنڈھا، سنسار قبیلہ گالدا

(کوا، کمبوہ اور کلال اپنا قبیلہ پالتے ہیں۔ جاٹ، بھینسا اور سنسار قبیلے کو برباد کرتے ہیں۔)

اس ضرب المثل سے صدیوں پر پھیلی پنجاب کی قبائلی نفسیات کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں صدیوں کی لوک دانش کا نچوڑ دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور ضرب المثل سے تغلق اور سید حکمران خاندانوں کے دور کی پنجاب کی لوک دانش کا اظہار ہوتا ہے۔

تغلق وٹھی وگار

سیداں سُنج گیتی چودھار

(تغلق بادشاہ بیگار لیتے تھے لیکن سید حکمران نے چاروں طرف بربادی پھیلا دی ہے۔)

پنجاب کا لوک بیانیہ:

دیگر صوبوں کی طرح پنجاب بھی لسانی تنوع سے مالا مال ہے۔ جنوبی پنجاب میں سرائیکی وسیب کے لوک بیانیہ کا ہم الگ ذکر کر چکے ہیں لیکن شمالی پنجاب میں بھی لسانی تنوع کا قابل ذکر خزانہ موجود ہے جہاں مرکزی پنجابی (لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ وغیرہ) کے علاوہ دھنی، پوٹھوہاری اور چھاچھی کی رنگارنگی، بار کے علاقوں کے مقامی لہجے (جسے جانگلی کی توہین آمیز اصطلاح کہہ کر پکارا جاتا ہے) خانہ بدوش قبائل بھیل، مینگھواڑ وغیرہ کی مقامی بولیوں کا تنوع ملتا ہے۔ ان زبانوں کا لوک بیانیہ زبانی روایات، داستانوں، لوک دانش اور رزمیہ قصوں جیسے اہم عناصر پر مشتمل ہے۔ دھنی، پوٹھوہاری اور چھاچھی میں مقامی جغرافیائی مقامات کے تاریخی پس منظر پر مبنی روایات پنجاب کے لوک بیانیہ کو ثروت مند بناتی ہیں۔

بلوچستان کا لوک بیانیہ:

جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں۔ بلوچستان کے لوک بیانیہ کا آغاز مہر گڑھ سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی ہزاروں برس کی تاریخ لوک بیانیوں سے بھری پڑی ہے۔ بلوچستان کا لوک ورثہ، بلوچی کلاسیکی ادب، بلوچ سورماؤں کے گیتوں، بزم ناموں، رزم ناموں، لوک دانش، غرض بلوچستان کا لوک بیانیہ زندگی کے کسی پہلو سے خالی نہیں۔ جن شخصیات نے اس بیانیہ کی صورت گری کی، وہ خود زندگی بھر اس کا حصہ رہے۔ شیر محمد مری، گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، عبداللہ جان جمالدینی، ایک غریب بلوچ شاعر مُلا مزار بنگلزئی اور متعدد دوسرے۔

عوامی شاعر بنگلزئی کو اپنے لوک بیانیہ پر جلاوطنی کی سزا ملی اور اس نے زندگی کے باقی ایام جلاوطنی کے عالم میں سندھ میں گزارے۔ اس اجمال کی تفصیل عبداللہ جان جمالدینی نے بیان کی ہے۔

گل خان نصیر، جو بیسویں صدی کے اوائل میں شاعر، صحافی، مؤرخ، ترقی پسند سیاستدان اور عوامی ادبی انجمن سمیت کئی تنظیموں کے بانی کے طور پر ابھرے، نے بلوچ لوک بیانیہ کی تفصیل اپنی کئی کتابوں میں بیان کی ہے۔ ان میں اس کے شعری رجز ناموں کے علاوہ تین کتابیں بطورِ خاص ذکر کے قابل ہیں۔ ''بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی''، ''بلوچی رزمیہ شاعری'' اور ''بلوچی عشقیہ شاعری''۔ ''بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی'' گل خان نصیر کا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں شاعر اور مزاحمت کار یکجا ہو گئے ہیں۔ باقی دونوں کتابیں ان کے ایام اسیری کی یادگار ہیں۔ جس طرح فیض کا بہترین شعری بیانیہ جیل میں لکھا گیا۔ اسی طرح گل خان نصیر کی ''بلوچی رزمیہ شاعری'' اور''

بلوچی عشقیہ شاعری'' اب تک بلوچستان پر ہونے والے کام میں حرف آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔

گل خان نصیر نے ''بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی'' کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں رند ولاشار کی یلغار، گوھر کی اونٹنیوں کا قضیہ اور میر چاکر اور میر گواہرام کی نوک جھونک کا انتخاب کیا ہے۔ دوسرے باب میں نصیر نے شہ مرید کی آزمائش، چاکر کی آزمائش، اور ہانی شہ مرید کی داستان عشق کا رزمیہ بیان کیا ہے۔ تیسرا باب بیبکر کے رومانوں، بیبکر وسدو، بیبکر وملی اور بیبکر کے نصائح سے عبارت ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں شہداد چاکر کی روایات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھا باب بالاچ منتقم کی رزم آرائیوں، حمل جیئند کی داستان، حمل اور شیر کی لڑائی، میر حمل اور چاکر کہدائی کی نوک جھونک، اور میر حمل اور پرتگیزوں کی لڑائی کا بیانیہ ہے۔ جبکہ اختتامی باب، بلوچستان کے دو لوک رومانوں، سسی پنوں اور توکلی مست کا رزمیہ ہے۔ کتاب کی رزمیہ نظموں میں ایک نظم حمل جیئند اور پرتگیزوں کے درمیان اس لڑائی سے عبارت ہے۔ جس میں حمل پرتگیزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مارا جاتا ہے۔ سولہویں صدی کی یہ نظم، جسے حمل کی بہن نے لکھا، بلوچوں اور پرتگیزوں کے چپقلش کا لوک بیانیہ ہے۔

سات راتیں اور سات دن
اسی ایک سمت میں کشتی تیرتی چلی گئی
آٹھویں دن دشمنوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی
دشمن کی چار کشتیاں
اڑنے والے پرندوں کی طرح پر پھیلائے
انہیں نظر آئیں
چاروں طرف حمل کی کشتی کو
انہوں نے گھیر لیا اور وہ للکارے
حمل! ہم تجھے گرفتار کر لیں گے
حمل نے اب اپنی کشتی کے ساتھیوں کو آواز دی
حمل کے ساتھی بزدل دشتی تھے
ان کی جان، گز کے انگاروں کی طرح بجھ گئی
اور وہ دوسرے جو مچھیرے تھے
انہوں نے بھاگنے کا ارادہ کیا
اور پھر ان مچھیروں نے اپنا منہ کالا کر کے

سمندر میں چھلانگ لگا دی
ان کے کالے چہرے اور داڑھیاں
سمندر کی موجوں کی نذر ہوئیں
دیر نہیں ہوئی کہ انہوں نے حمل کو گرفتار کر لیا
حمل کے ہاتھ دھاریدار رسوں
اور نر اونٹوں کی آٹھ تاروں والی مہاروں سے
باندھ دیئے گئے
دھاریدار رسے دھاریدار سانپوں کی طرح
اس کے ہاتھوں کو کاٹتے رہے
اور اس کی پاک انگلیوں میں سے
رِس رِس کر خون بہنے لگا۔

''بلوچی رزمیہ شاعری'' میں ایک اور قابلِ ذکر نظم نصیر خان نوری، خانِ قلات اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان جنگ سے متعلق ہے۔ اسے نصیر خان نوری کے دربار کے ملک الشعراء جان درّک نے لکھا۔ یہ نظم ہندوستان کے مختلف حصوں پر افغان حملہ آور احمد شاہ کی لائی ہوئی بربادی کی تصدیق کرتی ہے:

شمال سے قندھار کے جابر افغانوں نے
دہلی کو لوٹنے
مکران پر قبضہ کرنے
آگرہ کی سر سبز و شاداب وادی
اور سکھوں کے شہر (امرتسر) کو
پائمال کرنے کے بعد
(نصیر خان نوری کو)
ایک شاہی امر و فرمان بھیجا
تم کون ہوتے ہو ملک (دینار) سے
انتقام لینے والے
(باز آجاؤ، ورنہ)
ہم تمھاری گردن توڑ دیں گے۔

یہ وہی احمد شاہ ابدالی ہے جس کے بارے میں پنجابی کی مشہور ضرب المثل میں کہا گیا ہے۔

کھادا پیتالا ہے دا

رہندا احمد شاہ دا

(جو کھا پی لیا۔ وہی غنیمت ہے باقی احمد شاہ کا)

''بلوچی عشقیہ شاعری'' بھی گل خان نصیر نے جیل میں مرتب کی۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

''آج کل میں نے بلوچی شاعری پر اردو میں لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ ''بلوچی کی رزمیہ شاعری'' کے نام سے مچ جیل میں مکمل کر چکا ہوں اور دوسرا حصہ اب'' بلوچی کی عشقیہ شاعری'' کے نام سے حیدرآباد سنٹرل جیل میں پایہء تکمیل کو پہنچا چکا ہوں۔ اس سے قبل 1968ء میں ساہیوال (پنجاب) کے ڈراؤنے جیل خانے میں بلوچستان پر ایک کتاب ''بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی'' لکھ چکا ہوں''۔

گویا، بلوچستان کا لوک بیانیہ گل خان نصیر کی تین جیل یاتراؤں کا نتیجہ ہے۔ ابھی ہم نے ان کی اپنی شاعری کا ذکر نہیں کیا جس کے لئے کئی دفتر درکار ہوتے۔ لیکن بلوچستان کا لوک بیانیہ بس یہی نہیں ہے۔ ہنگلاج کے ماتا مندر کی اساطیری کہانی ایک ایسا لوک بیانیہ ہے جو بلوچ قوم کی تہذیب وثقافت کی بنیاد ہے۔ ہمارے اپنے عہد کے شاہ محمد مری کہتے ہیں:

''ہنگلاج ماتا کا یہ مندر بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کی لیاری تحصیل کے دور دراز اور دشوار گزار کوہستانی علاقے میں ایک تنگ گھاٹی میں ہے۔ یہ مندر ایک چھوٹے قدرتی غار (جُڈو) میں ہے۔ یہ دیوی کا، انسان کا بنایا ہوا بت نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس غار کے فرش کے پتھر میں ایک ابھرتی ہوئی صورت ہے، جیسے خاتون سوئی ہوئی ہو۔ اس کا سر، ناک کا ابھار اور ناک کے دونوں اطراف چھوٹے چھوٹے گڑھے آنکھوں کی صورت ہیں۔ پتھر سے بنا، لیٹا ہوا، قدرتی بت۔''

بلوچ اسے ''بی بی نانی'' کی زیارت بھی کہتے ہیں۔ اس کہانی کو ہم تفصیل سے ایک الگ باب ''بلوچستان کا لوک بیانیہ'' میں دیکھیں گے۔ لیکن ہماری بات ابھی تمام نہیں ہوئی۔ ''لاہوت لامکاں'' کے بیانئے پر ایک نوجوان محقق پناہ بلوچ نے اس طرح نظر ڈالی ہے کہ ایک زندہ لوک بیانیہ وجود میں آ گیا ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی کی طرف نگاہ کریں تو انہوں نے ہنگلاج کا سفر بھی کیا اور لاہوت کا بھی۔ اس طرح وہ اگوری بھی تھے اور لاہوتی بھی۔

بلوچستان کا لوک بیانیہ ایک وسیع باغ کی طرح ہے جس میں طرح طرح کے پھول اور ان کی الگ الگ خوشبوئیں بسی ہوئی ہیں۔ لسانی تنوع، ثقافتی تنوع، مذہبی رنگارنگی، لوک ورثے کی رنگارنگی، لوک دانش کے طرح طرح

کے نمونے۔

اس طرح پشتو کا لوک بیانیہ، بلوچی لوک بیانیہ سے کسی طرح کم تر یا کمزور نہیں ہے۔ براہوئی لوک بیانیہ کے مزید سورنگ ہیں۔ لوک داستانیں، لوک گیت، لوک دانش (کہاوتیں)، صرف لوک گیتوں کے کتنے رنگ ہیں۔ لولی (لوری) لیکویا (پردیسیوں کے لئے ماؤں بہنوں، محبوباؤں کے گیت) ناز ینک (خوشی بھرے قصاید) (عورتوں کے گائے مرثیے) ٹپو (دو مصرعوں پر مشتمل بیت) ڈیہی (رومانی گیت) لیلڑی (عشق و محبت میں ہجر و فراق کے گیت) برنا زنا (خانہ بدوشی سے جدید زندگی تک قدیم ترین براہوئی صنف) برنازنا کا مطلب ہے ''اے نازنیں'' برنازنا، برنازنا کے ارکان کو جوڑ کر پڑھیں تو بقول نادر قمبرانی براہوئی شاعری کی ایک بحر بن جاتی ہے اور یہی نادر قمبرانی ہیں، جنہوں نے رابعہ خصداری کے حوالے سے براہوئی میں بلوچستان کا لوک بیانیہ تخلیق کیا ہے۔ رابعہ بلوچستان سے تعلق رکھنے والی پہلی عورت تھی جس نے محبت کی آزادی کے لئے جان دی۔ پروفیسر نادر قمبرانی نے اسے ''بلبلِ خضدار'' کہا۔ رابعہ کا بھائی حارث اس عشق کی پاداش میں اسے ایک حمام میں بند کر کے اس کی کلائیوں کی رگیں کاٹ دیتا ہے۔ وہ اپنی فگار انگلیوں سے دیواروں پر اپنے آخری اشعار لکھتی ہے۔ یہ چند اشعار اسے زندہ جاوید کر دیتے ہیں۔ فارسی کی پہلی شاعرہ رابعہ ایک ہزار سال قبل کاروکاری کا اولین شکار بنی۔

عبدالرحمٰن براہوئی نے اپنے قابل قدر کام سے براہوئی کے لوک بیانیہ کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ براہوئی لوک کہانیاں، ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں ''لکھمیر'' جیسی کہانیاں بلوچ معاشرت کے انسان دوست رویوں کا اظہار کرتی ہے۔ حالیہ برسوں میں افضل مراد نے اس کام کو آگے بڑھایا ہے اور ایک ڈاکو کے انسانی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ جب بادشاہ ڈاکو پر مہربان ہو کر اسے سارے خزانوں کا مالک اور اپنی بیٹی کا شوہر بنا دیتا ہے۔ تو شہزادی سے اس کا مکالمہ قابل توجہ ہے۔

''بس وہ ایک لڑکی ہے۔ معصوم، بشاش، خنداں، بیچاری مجھے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی لیکن مجھے اس نے ڈاکو سے انسان بنا دیا۔''

شہزادی ہنسنے لگی۔ تو ڈاکہ مارنے گئے تھے اور لُٹ کے آ گئے۔ دیکھا عورت کا معجزہ''

''بس وہی لڑکی میری سب سے بڑی سوچ ہے۔''

''آخر کیوں۔ کیا تم نے اسے داغدار کیا''

''نہیں تو''، لکھمیر نے جلدی سے کہا۔

''پھر کاہے کی سوچ ہے''۔ ''وہ برہنہ تھی، بالکل برہنہ۔ بیچاری سل کے پیچھے چھپی ہوئی تھی'' ''لیکن اسے کس نے برہنہ کیا''؟

''ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے''

''تو کیا تم نے ۔ان کے خلاف اس کی مدد نہیں کی؟''

''میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ مجھے اس کے لئے کپڑے لے جانے ہیں ۔''

''شہزادی کھلکھلا کر ہنسی'' یہ سب خزانے بادشاہ سلامت نے تمہیں دیئے ہیں ۔ہم اسے یہاں بلائیں گے اور مال مال کر دیں گے۔

۔۔۔۔وہ ہماری خادمہ بنے گی۔''

اب کے لکھمیر کھلکھلا کر ہنسا

''وہ یہاں نہیں آئے گی ۔صحرا بھلا محل میں کیسے سما سکتا ہے۔''

افضل مراد کا یہ کام صدیوں پرانی براہوئی سوچ کا جدید ارتقاء ہے ۔ یہ لوک بیانیہ ٹھہرا ہوا، رُکا ہوا، منجمد لوک بیانیہ نہیں ہے ۔ یہ بہتے پانی کا لوک بیانیہ ہے جسے کل آنے والے مزید آگے بڑھائیں گے ۔

پشتو، اگر چہ خیبر پختونخوا کی ایک مرکزی زبان ہے لیکن وہ بلوچستان کی بھی اہم زبان ہے ۔سید عابد شاہ عابد، عبدالقدوس درانی اور ڈاکٹر معصوم کاسی، بلوچستان کے پشتون لوک بیانیہ کے اہم نام ہیں ۔سید عابد شاہ عابد پشتون حب الوطنی کی داستان چھیڑتے ہیں:

بنگل مارا گیا، ظریف زخمی ہے

ژوب پر انگریزوں کے حملے کی دھند ہے

بنگل کی موت کی خبر ملی اور ژوب پر پرنگی (فرنگی) چھا گئے

میں اپنا پیار اس محبوب پر قربان کرتی ہوں

جو اپنا سر وطن کی آن پر قربان کرتا ہے

بلوچستان کے لوک بیانیہ کے جتنے رنگ ہیں، ان میں ہر رنگ انسان دوستی، وطن کی محبت اور انسانیت کا رنگ ہے۔

بلوچستان کے پشتو لوک گیتوں کی لے خیبر پختونخوا کے لوک گیتوں سے الگ ہے ۔لوک گیتوں کی ایک صنف انگئی ہے ۔جس میں یہاں کی پشتون عورت کا پورا لوک بیانیہ سما گیا ہے ۔ بارکوال میاخیل نے اسے مزاحمتی نسوانی چیخ کا نام دیا ہے ۔ انگئی مردانہ برتری اور پدرسری سماج کی یادگار ہے جو قبائلی اور جاگیردارانہ قدروں کی دھجیوں سے عبارت ہے ۔ بلوچستان میں ژوب اور لورالائی کے علاقے اس صنف سخن کے حقیقی سرچشمے رہے ہیں ۔ بارکوال کی رائے کے مطابق اسے لورالائی، کوئٹہ، ژوب اور دکی وہرنائی میں الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا ہے ۔ کوئٹہ کے قرب وجوار میں اسے انگئی، لورالائی میں چیغیان، ژوب میں متلونہ اور دکی وہرنائی میں اسے اودئی کہتے ہیں ۔ یہ صنف بلوچستان کے پشتون علاقوں میں لڑکیوں کی بے جوڑ شادیوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے ۔

یہ عموماً اپنی عمر سے دو تین گنا زیادہ عمر کے مرد سے شادی، چھوٹی عمر کی شادی، وٹہ سٹہ اور ونی میں ہونے والی شادی، بھائی کے رشتے میں بہن کی شادی یا باپ کی دوسری شادی کی صورت میں ایک معمر شخص سے شادی کے مختلف روپ ہیں۔ یہاں، ہم انگئی کا صرف ایک بیت نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ایک سجے سجائے کمرے کے دروازے پر
شال کے اوپر پھول لٹک رہے ہیں
میرے باپ نے مجھے وٹہ سٹہ میں دے دیا ہے
اور میرے بدلے، خود اپنے لئے
ایک خوبرو دلہن لاکر اسے اچھے سے
گدیلے پر بٹھادیا ہے
اب مجھے رخصت کرنے کی سخت گھڑی آ پہنچی ہے
گھر کے سامان میں بھی، نہ سرہانہ ہے، نہ گدیلا
بیگانہ سسرال مجھے طعنہ دے گا کہ
ماں باپ نے مجھے کیا دیا

انگئی اور دیگر اصناف سخن پر ہم بلوچستان کا لوک بیانیہ'' میں تفصیل سے بات کریں گے:

بلوچستان کے ایک اہم قبیلے ہزارہ کے ذکر کے بغیر ہماری بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ فارسی زبان سے مماثلت رکھنے والی اس زبان کو فارسی قرار دینا زیادتی ہے۔ ہزارگی میں اب تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ جس کی تفصیل ہم بلوچستان والے باب میں بیان کریں گے۔

خیبر پختونخوا کا لوک بیانیہ:

پاکستان کے دیگر صوبوں کی طرح خیبر پختونخوا بھی لسانی اور ثقافتی تنوع کا عظیم مرکز ہے۔ خیبر پختونخوا، جو گذشتہ چند برسوں تک شمال مغربی سرحدی صوبہ کہلاتا تھا۔ اپنی تاریخی، سماجی، لسانی اور ثقافتی پہچان سے محروم تھا۔ پورا نوآبادیاتی دور اور قیام پاکستان کے بعد ساٹھ برسوں تک اسے اپنی حقیقی شناخت نہ مل سکی۔ تاریخی طور پر یہ خطہ صدیوں تک پختونخوا ہی کہلاتا تھا۔ ثقافتی اور لسانی تنوع کے اعتبار سے پختونوں کے علاوہ یہاں دیگر نسلی اور لسانی گروہ بھی آباد تھے۔ جن کا ذکر اسی باب کے گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

خیبر پختونخوا کے لوک بیانیہ کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس خطے کے عوام نے کبھی غیر ملکی حملہ آوروں کے آگے سر نہیں جھکایا اور وہ ہمیشہ اپنی آزادی کے لئے برسرِ پیکار رہے۔ ''مہذب دنیا'' نے ان ''اُجڈ اور

وحشی'' قبائل پر اپنا نو آبادیاتی تسلط قائم کرنے کے لئے صدیوں کاوشیں کیں لیکن انہیں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوئی اور تو اور سوویت یونین جیسا سماجی انصاف والا ملک بھی انہیں اپنا مطیع نہ بنا سکا۔ اگر چہ سوویت یونین کی ناکامی میں مغربی سامراج کے نو آبادیاتی عزائم بھی کارفرما تھے۔ لیکن جو بھی وجوہات رہی ہوں انہیں کسی بھی دور میں جھکایا نہ جا سکا۔ مغل حکمرانوں بابر سے اورنگ زیب تک پشتونوں نے بایزید انصاری کی قیادت میں مغل شہنشاہیت سے ٹکر لی۔ خوشحال خان خٹک کو ایسی جگہ دفن ہونا بھی پسند نہیں تھا جہاں مغل شہسواروں کے گھوڑوں کی گرد اس کی قبر کو چھو سکے۔ پشتون، مغلوں کے بعد سکھوں اور انگریزوں کے خلاف مسلسل لڑے۔ ان کی جدو جہد نو آبادیاتی حکمرانوں کے خاتمے پر بھی تمام نہ ہوئی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد صوبے کی جمہوری حکومت کا خاتمہ، بابڑا کا قتل عام، بلوچوں، سندھیوں اور پنجابیوں سے ان کی صدیوں پرانی شناخت چھین لی گئی، جس کے خلاف پشتونوں نے ''اینٹی ون یونٹ فرنٹ'' کے پرچم تلے زبردست جدوجہد کی اور 1970ء میں اپنی پہچان واپس حاصل کر لی۔ اس لوک بیانیہ کی صورت گری میں بعض دیگر عناصر بھی شامل رہے ہیں لیکن بنیادی حوالہ آزادی اور خودمختاری کا رہا ہے۔ لنڈئی کے بول، رزمیہ داستانیں، عوامی شاعروں کے قصے، اس لوک بیانیہ کا ہر اظہار آزادی سے شروع ہو کر آزادی پر ختم ہو تا ہے۔

بابا ہوتک کا جنگی ترانہ اس جنگِ آزادی کا نقطۂ آغاز ہے، جب سورغر (کوہِ سرخ) مغل حملہ آوروں کے خون سے لالہ زار بن گیا۔ بابا ہوتک تلوار چلاتے اور اپنا جنگی گیت گاتے ہوئے نوجوانوں کے جوش میں اضافہ کرتے رہے۔

''آج سورغر (کوہ سرخ) پر جنگ کی آگ بھڑک اُٹھی ہے۔ لوگو! (اُٹھو)

ہمارے لئے یہ ایک الہنا بن گیا ہے۔ ہمارے گانوؤں اور گھروں پر مغلوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ دشمن غزنی اور کابل پر ٹوٹ پڑا ہے۔

ننگ و نام پر مر مٹنے والو! تاخیر نہ کرو۔ مغل آندھی کی طرح آ رہا ہے۔ ہماری دھرتی پر سراسیمگی کا سایہ چھا گیا ہے۔ مغل ہمارے دیہاتوں اور گھروں پر چڑھ دوڑا ہے۔

اے آزادی کے خواہشمندو! تیر و شمشیر حمائل کر لو۔ وطن کے ناموس کو بچالو، دشمن ہمارے گانوؤں اور گھروں کو غارت کرنے آ رہا ہے۔

سارے جوانو! شمشیر تیز کر کے وار کرو، تیروں سے حملہ کرو، اپنے سینوں کو ڈھال بنالو۔

جوانوں کا خون بہہ رہا ہے، دشت و جبل خون سے سرخ ہو رہے ہیں دشمن اب بھاگنے لگا ہے، وہ سہما ہوا ہے

پختونو! اٹھو! کہ پہاڑ پر جنگ ہو رہی ہے۔ کوہِ سرخ دشمن کے خون سے رنگین ہے۔ یہ وقت

غیرت اور شمشیر زنی کا ہے۔

غیرت مند جوانو! اپنی غیرت کے تحفظ کے لئے اپنی جان قربان کر دو، حریفوں کو تیروں میں پرو دو، اور اپنی افغان دھرتی کو بچالو۔

مغلوں اور سکھوں کے بعد پشتونوں نے انگریزوں کے خلاف متعدد جنگیں لڑیں جن میں چترال، بونیر، قلعہ گڑھ، مالاکنڈ، ڈکہ، سومندوں اور افغانستان کی جنگیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ان جنگوں کا بیانیہ پشتو میں چار بیتوں کی صورت میں ملتا ہے۔دلاسہ خان نے سکھوں کے خلاف جنگیں لڑیں، جن کا ذکر ان چار بیتوں میں ملتا ہے۔

پشتو لوک گیتوں کی اصناف ''لوبہ'' لنڈئی میں ان جذبات کا خوب اظہار ہوا ہے۔ایک ''لوبہ'' میں انقلاب کی نوید سنائی گئی ہے:

تیری خانی سیلاب کی زد میں ہے
ملک صاحب! تباہ ہو جاؤ گے
تیری خانی کا گاؤں برباد ہو رہا ہے
غربت کا گھر آباد ہو رہا ہے
سب موٹی توندوں والے فریاد کر رہے ہیں
تمہارے تو وہم میں بھی نہ تھا کہ انقلاب آ کر رہے گا
ملک صاحب تباہ ہو جاؤ گے
تمہیں کب غریبوں کا خیال آیا تھا
تم تو (الٹا) ان پر ظلم کرتے تھے
کس طرح تم انہیں ستاتے رہے
اب آگے بڑھ کر سارا حساب کتاب چکاؤ
ملک صاحب! تباہ ہو جاؤ گے
اب آ کر اپنی آنکھوں سے یہ حال دیکھو
تم نے اپنے آپ کو خود اس جھنجھٹ میں ڈال دیا ہے
اپنے جال میں خود ہی پھنس گئے ہو
اپنے کئے پر مورد عذاب ہو گئے ہو
ملک صاحب! تباہ ہو جاؤ گے
اپنے کئے کا کوئی علاج نہیں

ہمیں مطلقاً تیری ضرورت نہیں

یہ بھی شکر ہے کہ تیری بیگار سے چھوٹ گئے

تم تو خیر، تمہارا نواب بھی تباہ ہونے والا ہے

ملک صاحب! تباہ ہو جاؤ گے

ایک پشتون ماں اپنے بچے کو لوری دیتے ہوئے کہتی ہے۔

سو جا میری جان سو جا۔۔۔

سو جا۔۔۔ سو جا۔۔۔

تیرا باپ لڑائی پر گیا ہے

اچھی تیز تلوار کمر میں لٹکا کر

وہ اپنا سر وطن کے ناموس کی خاطر دے دے گا

کیونکہ وطن پر فرنگی نے چڑھائی کی ہے

میرے دل سے خون جاری ہے

ایک اور لوری میں کھُل کر طبقاتی بیانیہ کا اظہار کیا گیا ہے:

سو جا۔۔ مری جان سو جا۔۔ پیارے سو جا۔۔

تیرا باپ رات کو کھیتوں میں پانی دینے گیا ہے

اللہ ہو

اور خان بستروں پر آرام سے سوئے ہیں

اللہ ہو

سو جا میری جان۔۔ سو جا۔۔ پیارے سو جا

تیرے باپ کی یہ حالت مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے

اللہ ہو

بیچارے کا ہل چلاتے چلاتے خون خشک ہو گیا ہے

اللہ ہو

اور یہ موٹی توند والا سؤر ان سے تیار فصل گھر لے جائے گا

اللہ ہو

پہاڑوں پر خان باز۔ باشوں کا شکار کھیلتے ہیں

اللہ ہو

اور تیرے باپ کی زندگی کھیتوں نے اجیرن کر دی ہے

اللہ ہو

میرا دن خوانین کے کوچے کی خاک چھانتے ہوئے گذر جاتا ہے

اللہ ہو

سو جا میری جان۔۔۔سو جا۔۔ پیارے سو جا۔۔

پشتو کی مشہور لوک صنف لنڈئی میں بعض تاریخی واقعات کو بہت خوبصورتی سے سمویا گیا ہے۔ افغانستان کے صوبہ کُنڑ کا میر زمان خان، ترقی پسند حکمران امان اللہ خان کا زبردست حامی تھا۔ بچہ سقہ کے ہاتھوں، اس کے ساتھ اور اس کی اولاد کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ اس کا اظہار تاریخی لنڈئی میں کیا گیا ہے:

میر زمان خان! میں نے تجھے شیگل جانے سے منع کیا تھا

لے اب تجھے وہاں فرانسیسی بندوقوں کے سامنے باندھ رہے ہیں

شین کوڈک کے مغرب کی طرف

گریہ زاری کی آوازیں آرہی ہیں میر زمان

کی اولاد ملک بدر کی جارہی ہے

میر زمان کی دوشیزہ خوبصورت لڑکیاں

سرکانی کے میدان میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے

آئی ہیں اور بھٹے اکٹھے کر رہی ہیں

ایک بہن کے، اپنے بزدل بھائی کے لئے جذبات دیکھئے:

تو جو میوند کے معرکے میں شہید نہ ہو سکا

بھیا! خدا کی قسم، تجھے بے غیرتی کی زندگی گزارنے کے لئے

زندہ چھوڑ دیا گیا۔

اسی طرح جنگ آزادی کا ایک اور مجاہد زخمی حالت میں جنگ سے لوٹتا ہے تو ماں پکار اٹھتی ہے:

رحم داد کو خدا اس دفعہ صحت یاب کرے

اگر دوبارہ کوپر پر لڑائی چھڑ جائے

تو پھر بیشک شہید ہو جائے

اور جب وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جان دے دیتا ہے تو ماں پکار اٹھتی ہے:

رحم داد اخا کی جنگی لباس پہن کر واپس آ
کیونکہ کوپر کی لڑکیاں تجھے یاد کرتی ہیں

اسی طرح ایک محبوبہ اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتی ہے:

دشمن کو سرخ گولیوں میں دفن کردے
اگر کارتوس ختم ہو گئے تو اپنا لونگین گروی رکھ کر
بارود مہیا کر دوں گی

آزادی کی محبوبہ کہتی ہے:

غلامی کے طلبگار کو میں، ہرگز بوسہ نہ دوں گی

کاش تو تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آئے
تاکہ تیرے زخم سیتے ہوئے، میں تجھے بوسے دوں

اگر میرا محبوب جنگ میں شہید ہو گیا
تو اپنی نتھ کا لعل خیرات کر دوں گی

پشتو لوک بیانیہ کا یہ لب ولہجہ اپنی مثال آپ ہے۔

ہندکو، خیبر پختونخوا کی دوسرے بڑی زبان ہے، جس کی سرحدیں پنجاب کے بعض علاقوں تک چلی گئی ہیں۔ ہندکو اپنے مزاج اور کردار کے اعتبار سے مختلف زبان ہے لیکن خیبر پختونخوا کے لوک بیانیہ کے تعین میں وہ پشتو سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ پشتو کی طرح ہندکو میں بھی سامراج دشمن اور عوام دوست گیتوں کی مضبوط روایت موجود ہے۔ ہم صرف چند مثالیں دیکھتے ہیں:

انگریزاں نو مارسی ایں
انہاں ترکاں بھراواں اُتو
آپنی جندڑی وارسی ایں
(ہم انگریزوں کو ماریں گے
اپنے ترک بھائیوں پر سے
اپنی زندگی واریں گے)

انگریزاں تے قہر پوے

میں ایتھے تڑفنی آں

میرا جانی جیل اچ اے

(انگریزوں پر قہر نازل ہو

میں یہاں تڑپ رہی ہوں

اور میرا محبوب جیل میں ہے)

انگریز یزید ہوئے

قصہ خوانی دی گولی وچ

کتنے بچڑے شہید ہوئے

(انگریز یزید بن گئے ہیں

قصہ خوانی میں چلنے والی گولی سے

کتنے بچے شہید ہو گئے ہیں)

ہندکو کی ضرب الامثال میں کئی ایسے حوالے موجود ہیں جو پشتونوں کے جذبہ حریت و آزادی کی طرف اشارے کرتے ہیں: مثلاً

خٹک نہ ہوسی تے اٹک نہ ہوسی

یعنی خٹک نہیں ہوں گے تو اٹک کی سرزمین بھی نہ ہوگی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب خٹکوں نے یوسف زئی قبیلے کو صوابی کی طرف دھکیل کر اٹک پر قبضہ کر لیا اور پھر وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہ ضرب المثل اس موقع پر بولی جاتی ہے جب دو لازم و ملزوم چیزوں کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہو۔

خیبر پختونخوا میں چترال، سوات اور کوہستان ایسے علاقے ہیں جو مقامی زبانوں کے تنوع سے مالا مال ہیں یہ چترال کی وادی شیشی کوہ کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح توروال یا بحرین کی زبانوں کو بھی ہم زیر بحث لا چکے ہیں۔ ان زبانوں کا ادبی ذخیرہ عظیم روایات کا حامل ہے۔ ان میں قبائل کے تشکیلی دور کی روایات، لوک داستانیں اور لوک دانش کے نمونے شامل ہیں۔ یہ روایات سینہ بہ سینہ صدیوں کا سفر طے کر کے ہم تک پہنچی ہیں۔

شوہر کی موت پر ایک توروالی خاتون کی پکار سنئے:

خالہ! مجھ پر کیا بیتی

میری زریں شال جل گئی

اب بس نام کی دھجی ہے

(جس سے اپنے سر کو ڈھانپ رہی ہوں)

موت کے فرشتے سے ایک تور والی کے خطاب کے لفظ ہیں:

عزرائیل! تو تھکتا کیوں نہیں؟

اب بھی باری لگا تار ہتا ہے

اب بس بھی کر، تو نے تو

میرے باپ کا گھر اُجاڑ کر کھ دیا ہے

چترال کی معروف زبان کھوار ہے۔ جس کی لوک دانش کے نمونے قابلِ رشک ہیں۔ ایک ضرب المثل دیکھئے:

دریا پار کرتے وقت

دعا سے زیادہ لاٹھی کام آتی ہے

خوش قسمتی کے اظہار کے لئے ایک ضرب المثل حاضر ہے:

گل خاتون چمن میں

(خوش بختی کے دن آپہنچے)

اسی طرح ایک اور ضرب المثل ہے:

یتیم کا بکرا بھی ریوڑ سے دور رہتا ہے

ان مثالوں سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خیبر پختونخوا تہذیبی اعتبار سے کتنا ثروت مند ہے۔

گلگت بلتستان کا لوک بیانیہ:

صوبہ گلگت بلتستان میں، شینا، بلتی، بروشسکی، کھوار اور وخی سمیت کتنی ہی زبانیں رائج ہیں جن سے گلگت بلتستان کے لوک بیانیے کا تعین ہوتا ہے۔ اردو پورے صوبے میں لنگوا فرانکا کا درجہ رکھتی ہے۔ شنا گلگت کی مرکزی زبان ہے تاہم مختلف علاقوں میں اس کے مختلف لہجے ہیں۔ جیسے شینا خاص گلگت، شنا بگروٹی، شینا نگر و ہنزہ اور، شینا پونیالی واشکومنی، شینا استوری، شینا پلولی اور شینا چلاس، داریل تانگیر و کوہستانی لہجے وغیرہ، لیکن گلگت کی شینا کو مرکزی اور معیاری زبان کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ شینا زبان ابھی ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے۔ لیکن اس کی شاعری اور لوک ادب (لوک روایات) بھرپور ہیں۔ شینا لوک کہانیوں کا دو جلدوں میں مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح خلیفہ رحمت ملنگ کی منتخب شاعری کا مجموعہ بھی اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ یہ اور دیگر کتابیں شینا لیکو

ئج اور کلچر پروموشن سوسائٹی گلگت نے شائع کی ہیں۔ ملنگ شینا زبان کے عظیم شاعر تھے۔ سوسائٹی کے صدر شکیل احمد شکیل کے بیان کے مطابق ''اگر ہم ملنگ کے دور کی شینا شاعری کا احاطہ کریں تو یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ گلگت کا معاشرہ بڑی تیزی سے کسانی ثقافتی دور سے نکل کر شہری سماج میں بدل رہا ہے۔ ملنگ کی شاعری نے شینا شاعری کا رویہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی کے اظہار سے نکال کر محبت اور دوستی کی تمام انواع و اقسام اور روحانی مضامین اس میں داخل کر دیئے۔

ترجمہ: میرا کلام اگر کسی مجلس میں شروع ہو جائے تو شراب کے کوزے کھول دئے جائیں گے اور تمام عاقل لوگ دیوانے ہو جائیں گے۔ سارے عالم کے لوگ محو ہو جائیں گے اور فرشتے تیرے حلقہ بگوش ہوں گے۔

جمشید خان دُکھی نے حکمرانوں کے تناظر میں سینہ بہ سینہ چلی آتی روایات اور لوک کہانیوں کے حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے خصوصاً شری بدھت نامی ظالم حکمران کے انجام کی کہانی اسی طرح مجذوب بابا چلاسی کے روحانی بیانیہ کا زبردست اظہار ہے۔ اسی طرح بھبھوتن کا انجام، لوگوں کی دلی تمنا کا بیانیہ ہے۔ اپنے باب '' گلگت بلتستان کا لوک بیانیہ "میں ہم انہیں تفصیل سے زیرِ بحث لائیں گے۔

صوبے کی دوسری اہم زبان بلتی ہے۔ جو شینا کی طرح لوک بیانیہ کی دولت سے مالا مال ہے۔ اس خزانے میں لوک کہانیاں، لوک رومان، لوریاں، پہیلیاں، بدگوئیاں، دعائیہ کلمات اور ضرب الامثال شامل ہیں۔ ضرب الامثال لوک دانش کا دوسرا نام ہے۔ ایک دو بلتی ضرب الامثال ملاحظہ ہوں۔ اس ضمن میں محمد حسن حسرت کا کام قابلِ ذکر ہے۔ مثلاً

ایک ہاتھ میں دو خربوزے نہیں سما سکتے

یا

بلی کے نکل جانے کے بعد سوراخ بند کرنا وغیرہ

پہیلیاں بھی لوک دانش کی ایک شکل ہیں۔ ایک دو مثالیں دیکھیے

ایک عورت نے نوکر تے پہن رکھے ہیں (پیاز)

گائے کا بچھڑا پیدا ہونے سے پہلے چھت پر (دھواں)

بروشسکی بھی صوبے کی اہم زبان ہے جس میں لوک بیانیہ کے مذکورہ بالا تمام عناصر شامل ہیں۔

گلگت بلتستان کی دیگر زبانوں کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو اسی باب میں ہو گی۔

آزاد جموں کشمیر کا لوک بیانیہ:

آزاد جموں وکشمیر کی اہم زبانوں میں کشمیری، گوجری اور پہاڑی زبانیں شامل ہیں۔ پاک بھارت کے درمیان آزادی اور امن کے حوالے سے کشمیر کا ایک خاص حوالہ ہے۔ لل دید اور حبہ خاتون کی شاعری صنفی حوالے سے ایک متبادل لوک بیانیہ تشکیل دیتی ہے۔ کشمیری لوک داستانوں، گیتوں، لوک دانش (ضرب الامثال، پہیلیوں) اور روایات کے پہلو سے یہ لوک بیانیہ تو اہم ہے ہی لیکن کشمیر کی مخصوص صورت حال کے تناظر میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

لل دید یا للیشوری، جسے پاکستان میں للہ عارفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کی زندگی اور شاعری جس المیے کا اظہار کرتی ہے وہ صنفی نقطۂ نظر سے ہٹ کر سیاسی پہلو سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ للہ عارفہ کا المیہ کشمیر کا المیہ ہے۔ بلکہ للہ عارفہ بذات خود مجسم کشمیر ہے۔ سلیم خان گمی للہ کی ذاتی زندگی کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں۔

''سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک قریبی گاؤں پام پور میں کر دی گئی۔۔۔اس کا برہمن شوہر ان پڑھ جاہل زمیندار تھا۔ للہ کی ساس سنگدل قسم کی عورت تھی۔۔۔۔ للہ سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا البتہ اس کے سسر کا رویہ ہمدردانہ تھا اور یہ رویہ کہیں دیر میں جا کر پیدا ہوا۔ غالب خیال یہ ہے کہ اس کی ساس باتونی قسم کی سخت گیر عورت تھی۔ وہ چرب زبانی سے اپنے شوہر اور بیٹے کو قائل کر چکی تھی کہ للہ عارفہ سست، کام چور اور جاہل لڑکی ہے۔ ساس کے الزامات کا للہ نے کبھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش طبیعت لڑکی تھی اور اس پر ساس کی طرف سے جو بھی ستم روا رکھا جاتا وہ صبر وشکر سے برداشت کر لیتی۔ سسرال والے للہ کو پدماوتی کہہ کر پکارتے تھے۔

پدماوتی پر ساس کے ظلم کی حقیقت اڑوس پڑوس اور گاؤں کے لوگوں پر واضح ہو چکی تھی وہ سب اس کے ساتھ ہمدردی کرتے اور اس کی ساس کو برا بھلا کہتے لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ بات دوسروں کے معاملات کے دخل اندازی قرار پاتی۔

ایک بار للہ کے سسر نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی شاندار دعوت کی۔ دعوت کی بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ للہ حسب معمول گاؤں کی لڑکیوں کے ہمراہ گاؤں سے زیادہ فاصلہ پر آبشار سے پانی لینے گئی۔ تو اس کی سہیلیوں نے کہا آج تو تم پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ گی کیونکہ آج تمھارے سسر نے بڑی شاندار دعوت کا اہتمام کیا ہے۔ للہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ شاندار دعوت ہو نہ ہو اپنے مقدر میں تو باٹ لکھا جا چکا ہے۔

مشہور ہے کہ للہ کی ساس اس کو پیٹ بھر کر کھانا نہ دیتی تھی۔ وہ اس کی طشتری میں ایک باٹ رکھ دیتی اور اسے چاولوں سے ڈھانپ دیتی۔ ایسا اس لئے کیا جاتا کہ اگر کوئی شخص للہ کی چاولوں والی طشتری دیکھتا تو کہتا للہ تو پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہے۔ حالانکہ چاولوں کے نیچے باٹ ہوتا جو تھوڑے چاولوں کو زیادہ کر کے دکھاتا۔

للہ خاموشی سے، بغیر کچھ کہے، طشتری میں سے چاول کھا لیتی اور ہاٹ دھو کر علیحدہ کر دیتی۔ اس کی ساس دوسرے وقت دوبارہ کھانے میں وہی ہاٹ رکھ دیتی۔

ایک بار گاؤں کے چند معززین نے للہ کے سسر سے کہا تمھاری بیوی للہ کو بھوکوں مار رہی ہے۔ وہ نہ مانا۔ معززین نے کہا آج شام جب للہ کھانا کھا رہی ہوگی تو اس کی طشتری سے چاول ہٹا کر دیکھنا۔ للہ کے سسر نے ایسا ہی کیا اور واقعی چاولوں کی طشتری میں سے ہاٹ نکل آیا۔ ظاہر ہے کہ اسے بہت دکھ پہنچا ہوگا اور اس نے اپنی بیوی کو برا بھلا کہا ہوگا اور للہ کی ساس نے آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی کارروائی کو شدید کر دیا ہوگا۔

آخر للہ نے اس عالم رنگ و بو سے رشتہ توڑ کر معبود حقیقی سے پیار بڑھایا۔ وہ گھر بار چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں کی طرف نکل گئی۔ اسے آندھی، بارش اور برفباری سے کبھی خوف نہ آیا اور کبھی کوئی گزند نہ پہنچا۔ اس نے طعام و قیام کی کبھی کوئی پرواہ نہ کی اور رزق کے لئے ہمیشہ خدا پر بھروسہ کیا۔ وہ جنگل سے پھل اور گھاس پات کھا کر اور چشموں کا پانی پی کر خدا کا شکر بجالاتی۔ سونے کے لئے گھاس پھوس اور پتے ہی کافی تھے۔

اگر کبھی للہ ویرانوں اور جنگلوں سے نکل کر آبادی کی طرف چلی آتی تو لوگ جوق در جوق اس کے پیچھے لگ جاتے، سلام کرتے اور ہاتھ چومتے۔ اسے اب لباس کی بھی پروانہ تھی۔ وہ نیم برہنہ یا برہنہ گلی کوچوں میں گھومتی پھرتی، بعض لوگ اسے پاگل خیال کرتے، بعض مجذوبہ سمجھتے اور اکثر اسے رشی اور بھگت کا درجہ دیتے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو اس پر تہمتیں دھرتے۔

للہ عالم دیوانگی میں اشعار بھی کہتی تھی جنہیں اشلوک کہتے ہیں۔ لوگ اس کے اشلوک لکھ لیتے یا زبانی یاد کر لیتے۔ یہ اشلوک سنسکرت آمیز کشمیری میں ہیں اور کشمیری صوفیانہ شاعری کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔

للہ کے زندگی نامہ سے یہ طویل اقتباس کشمیر کا ایسا لوک بیانیہ ہے جو لل دید اور کشمیر کی صورت حال کی حیران کن مماثلت ظاہر کرتا ہے۔

کشمیر کی لوک دانش پر نظر ڈالیں تو اس سے بھی اس مماثلت کا اظہار ہوتا ہے۔ سلیم خان گمی اور تحسین جعفری کاشمیری نے کشمیری ضرب الامثال میں اس مماثلت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے بعد ضرب الامثال تو کشمیر کی کہانی بیان کرتی ہیں۔ مثلاً ایک ضرب المثل کے الفاظ ہیں:

''کوئی فریادرس ہو تو اسے اپنی داستان درد سنائیں
ظالم و جابر کے سامنے اپنا دکھڑا بیان نہ کریں جو الٹا ظلم و استبداد کے دوزخ میں ہمیں جھونک دے۔''

ایک اور ضرب المثل کے مطابق:

''کتنی عجیب بات ہے کہ باہر کے چوہے، گھر کے چوہوں کو بھگانے اور گھر سے بے گھر کرنے کی کوشش کریں۔''

کشمیر کا حسن اور اس حسن کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا اظہار اس ضرب المثل سے ہوتا ہے کہ:

''چاند نکلتا ہے تو کتے بھونکنے لگتے ہیں۔''

ایک اور کہاوت ڈوگرہ راج کی بدولت کشمیری عوام کی ناگفتہ بہ حالت کا اظہار کرتی ہے۔

''میں تو مرجاتا مگر گھر پر کس کو رکھوں''

جموں وکشمیر کی دیگر اہم زبانوں میں گوجری اور پہاڑی نمایاں ہیں۔ یہ دونوں زبانیں لوک گیتوں اور لوک واروں سے مالا مال ہیں۔ گوجری گیت زندگی کے مختلف مواقع پر لوک اظہار کا ذریعہ ہیں۔ جیسے شادی بیاہ، فصلوں کی کٹائی کے گیت، لوریاں، کنگن، ڈھولے، قینچی، بساکھ، گکو، چن، ماہیئے اور ڈنے ڈنے گجری چلے۔ جیسے گیتوں کے اصناف جموں کشمیر کے لوک بیانیہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح گوجری واریں ہیں۔ جن میں پنجابی کی طرح دُلے بھٹی کی وار کے ساتھ ساتھ مقدم میر، دلمیر، روح اللہ سانگو، صوبہ جنگباز، مکھنی، زمان، شہباز، سردار منصور خان، نور محمد نور، ناجر، سوہنا، سخی محمد۔ نادر نیک چورالادی، خوشال، سخی محمد، راجہ سلطان خان، سردار علی ربنر علی، مقدم وارث، برسیا، احمد حسن آوانہ، شمس رراجولی، شاہ بانو ربہرام ودیگر گوجری لوک بیانیہ تشکیل پاتا اور کشمیری عوام کی آزادی کے لئے صدیوں سے چلی آرہی جدوجہد اور تڑپ کا اظہار ہوتا ہے۔ سخی محمد کی وار کے بول ہیں:

''ڈوگری فوج میں افراتفری مچ گئی

راجوری پر حملہ ہوا وہاں سودخور جمع ہیں

ڈوگرہ کے ساتھ خون چوسنے والی جونکیں ہیں''

اسی طرح وار دُلا بھٹی کے بول ہیں:

''دُلا بھٹی، لال خان مغلوں پر بجلی بن کر گرے

مردوں نے گرج کر ظلم کا بیڑہ غرق کیا۔

نظاموں (مغل جرنیل) لدھی ماں کے پاؤں میں پگڑی رکھتا ہے

دُلا کی تلوار سر پر تھی

ماں نے کہا، دلا بہادر، بات سمجھا دیتی ہوں

مرے ہوئے مردار کو بھوکا شیر نہیں کھایا کرتا

نظاموں کو معاف کردے، آکر پاؤں پڑا ہے

ہارے ہوئے بزدل کو، ڈلے! کبھی نہ ستانا''

رانا فضل حسین کا یہ گوجری لوک بیانیہ اس پہلو سے اہم ہے کہ کشمیری عوام نے مغل حکومت کا 166 برس افغان حکومت کا 66 برس، سکھ دور کا 27 برس اور ڈوگرہ دور حکومت کا 101 سال مقابلہ کیا۔ ان واروں کا تعلق جموں کے علاقے پیر پنجال سے ہے۔

پہاڑی لوک بیانیہ بھی اپنے اندر ایک توانا روایت کا مالک ہے پہاڑی لوک واروں میں سردار منصور خان، فیروز خان کی وار کے ساتھ ساتھ، سردار بہادر علی، سیف علی، جنید اجی اور کھوڑی کی لوک واریں شامل ہیں۔ منصور خان، فیروز خان کی پہاڑی لوک واروں کے بول ہیں:

لیں گے جموں وکشمیر

ساتھ پونچھ کی جاگیر

آخر ظلم ختم ہو گا

لیں گے جموں وکشمیر

پہاڑی لوک گیتوں میں شوپیا، ڈھولا، چرخہ، مٹھا چن، چنوٹا ماڑیا، اٹھی جے جلیا ایں۔ الی الی بنی ماڑی، اور جنگیں رہیاں ٹری ڈھکی شامل ہیں۔ پہاڑی لوک گیت ''شوپیا'' جنگ پر جانے والے سپاہی کے حوالے سے ماؤں، بہنوں اور محبوباؤں کے جذبات سے عبارت ہے۔ سپاہی کی وطن واپسی خوشیوں بھری ہے۔ پہاڑی لوک بیانیہ کا یہ پہلو بے حد اہم ہے۔ امن کی خواہش اس بیانیہ کا لازمی جزو ہے۔ شوپیا کے چند بول دیکھتے ہیں:

سپاہی واپس آئے، گلیوں میں الغوزے بجے

اے میرے سپاہی! میرے ملک کی قسمت جاگ اٹھی

سپاہی کی ماں منتیں مانتی ہے، اس کی بہن بھی بار مانتی ہے

اس میرے چھلے کو، اے میرے سپاہی تلاش کرنا

پہاڑی زندگی میں عورت کن مشکلات سے گزرتی ہے اس کا اظہار ان بولوں میں ہوا ہے:

ڈھکی چڑھتے، میری ٹانگیں رہ گئی ہیں

چکی پیستے، میری بانہیں رہ گئی ہیں

روتے روتے آنکھیں جواب دے گئی ہیں

پانی ڈھوتے ڈھوتے، سر کے بال اڑ گئے ہیں

لوک بیانیہ کے اس جائزے سے ہم پاکستان کے تمام علاقوں اور ان علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کی ثروت مندی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے جستہ جستہ مثالوں سے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں آئندہ ابواب میں زیادہ تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

سندھ کا لوک بیانیہ:

سندھ کے حوالے سے ہم وادیِ سندھ کی تہذیب اور منگوڈرو کا ذکر کر چکے ہیں۔ مقدمہ کے اس حصے میں سندھ کی ماں بولی سندھی ہے لیکن یہاں بھی ہمیں لسانی تنوع کی مثالیں ملتی ہیں۔ سرائیکی، گجراتی، ڈھاٹکی اور دیگر

سلانی رنگارنگی موجود ہے۔اس کتاب کے تیسرے باب ''سندھ کا لوک بیانیہ'' میں ہم اس کی تفصیل بیان کریں گے۔
اس باب میں ہم سندھ کی روایتی تاریخ،سندھ کی تاریخی کہانیوں،قدیم لوک داستانوں اور تصوف کے لوک دوست
کردار پر بحث کریں گے۔اس باب میں ہم ڈھولا مارو،دودو چنیسر !ہوش محمد شیدی اور دیلو کو بلی کا رمز یہ اور'' مرویسوں
سندھ نہ ڈیسوں'' کا لوک بیانیہ کیسے سندھ کے ایک ایک ٹانئے میں بسے ہوئے کا ذکر کریں گے۔

دوسرا باب

بلوچستان کا لوک بیانیہ

1۔ بلوچی لوک بیانیہ کی مختلف جہتیں
2۔ براہوئی لوک بیانیہ
3۔ بلوچستان میں پشتو بیانیہ کے نسائی پہلو
4۔ بلوچستان کے پشتون رسوم و رواج
5۔ ہزارگی کا لوک بیانیہ
6۔ ہزارہ لوک دانش
7۔ ہزارہ داستان کا لوک بیانیہ
8۔ کھیترانی لوک بیانیہ
9۔ ہنگلاج ماتا مندر: شاہ محمد مری کا لوک بیانیہ

بلوچستان کا لوک بیانیہ

جیسا کہ گذشتہ باب کے ایک حصے میں بلوچستان کے لسانی تنوع کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ بلوچی، براہوئی اور پشتو جیسی مرکزی زبانوں کے علاوہ بلوچستان میں سندھی، سرائیکی، ہزارگی اور کھیتر انی جیسی زبانیں بھی خطے کے لوک بیانئے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کھیتر انی جس کے بولنے والے کھیتران قبیلے کے دو ڈھائی لاکھ افراد سے زیادہ نہیں ہیں، لوک بیانیے کا قابلِ قدر ذخیرہ رکھتی ہے۔ اس کی کلاسیکی شاعری ڈیہو (ڈیہی) یا دوہوں پر مشتمل ہے۔ اس کی شاعری زیادہ تر رومانوی اور رزمیہ ہے۔ لوک اصناف میں قوتک (مرثیہ گوئی) شادی بیاہ کے گیت (گاون) اور ضرب الامثال شامل ہیں۔ ڈاکٹر غلام محمد کھیتران بارکھان کی لازوال رومانوی داستان ''آدوگڑدو'' پر کام کر رہے ہیں۔ جبکہ وہ ''کھیتر ان نامہ'' شائع کر چکے ہیں۔(1) خدشہ ہے کہ اس زبان کے معدوم ہونے سے انسانی لوک دانش کا ایک بڑا حصہ معدوم ہو جائے گا۔

اس باب میں ہم کوشش کریں گے کہ بلوچی، براہوئی اور پشتو کے علاوہ بلوچستان میں لوک بیانیہ کا ورثہ رکھنے والی دیگر زبانوں کو بھی زیرِ بحث لا سکیں۔

بلوچی لوک بیانیہ کی مختلف جہتیں:

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے بلوچی، زبانی روایات، لوک داستانوں، لوک اصناف، لوک دانش اور لوک بیانیہ کے دیگر عناصر سے مالا مال ہے، خوش قسمتی سے اس حوالے سے خاصہ کام ہو چکا ہے اور مزید کام ہو رہا ہے۔ لیکن یہ سارا کام افراط و تفریط اور بے سمتی کا شکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سارے کام کا تنقیدی جائزہ لے کر لوک بیانیہ کی واضح سمت متعین کی جائے۔

سب سے پہلے لوک بیانیہ کے عناصر کی نشاندہی کی ضرورت ہے۔ کامل القادری نے اپنی کتاب، ''گاۓ جابلوچستان''(2) میں جن اصناف کی تفصیل بیان کی ہے، ان میں سپت، لولی، سوت، ہالو، لاڑوگ، زہیروگ، لیکو، دستانک اور قوتک شامل ہیں۔ عطا شاد اور عین سلام اپنی کتاب ''بلوچی لوک گیت"(1965)(3) میں سوت، لاڑوگ، ہالو، سپت لولی، زہیروگ، لیلوی، لیلی مور، ڈیہی، اور موتک جیسی اصناف کو شامل کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن غور، اپنی کتاب ''نغمۂ کوہسار(1968)''(4) میں کلاسیکی بلوچ شاعری کے تاریخی تسلسل کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ان کے مطابق شہ مرید، بیبرگ، میراں رند، جام درّک، مُلا فاضل رند، عزت پنجگوری، بالاچ، مہناز، غلام محمد بالاچانی، خاتون شاعرہ سیمک، رحم علی مری، توکلی مست، جمعہ کلوانی، تاجل، مولانا فاضل درخان، مولوی حضور بخش، سہنا بخش

علی، محمد خان مری، قاضی نور محمد گنج آبوی، مُلا بہرام، فقیر قیصر خان، فقیر فاضل اور جوانسال، وہ بلوچ شعرا ہیں جو لوک داستانوں، روایات اور شعری ورثے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ بشیر احمد بلوچ نے (5) دوستین وشیریں، مغل شہنشاہ شاہ جہاں، قلات کے عبداللہ خان، حضرت موسیٰ اور حضرت علی کی روایات کے ساتھ ساتھ بلوچ لوک قصوں اور بچوں کو سنائی جانے والی کہانیاں اس انداز میں بیان کی ہیں کہ بلوچستان کی حقیقی روح ان میں سمٹ آئی ہے۔ شاہ محمد مری نے (6) کلاسیکی اور لوک روایات کو مجموعی تاریخی تناظر میں دیکھا ہے۔ ان تمام حضرات سے اوپر گل خان نصیر، میر خدا بخش بجرانی اور شیر محمد مری کا کام ہے۔ ان تمام کاوشوں اور ہماری اپنی تحقیق کے نتائج سے بلوچی لوک بیانیہ کی صورت گری ہوئی ہے۔

قدیم بلوچی داستانوں میں حانی شہ مرید اہمیت کی حامل ہے۔ یہ میر چاکر رند کا دور ہے۔ یہ خالص عشقیہ داستان ہے۔ ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، کہ میر چاکر کیسے شہ مرید کی منگیتر حانی کو ہتھیانے میں کامیاب ہوتا اور کیسے شہ مرید زندگی بھر اس کے فراق میں تڑپتا ہے۔ اس کی شاعری سے درد کے چشمے پھوٹتے ہیں اور جب بالآخر حانی اسے مل جاتی ہے تو کیسے وہ اس سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ میر چاکر اور گواہرام کے معرکے رزمیہ شاعری کی معراج ہیں۔ میر چاکر اور گواہرام کے درمیان تیس سال تک ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے رسہ کشی ہوتی رہی۔ اگر چہ بہانہ گوہر جتنی کی اونٹنیوں کے بچوں کا واقعہ بنا۔ اس دور کے بلوچ شاعروں نے اس جدال وقتال کی وجہ شگان یا طعنہ قرار دیا ہے۔ اس عہد کا لوک بیانیہ گل خان نصیر کے الفاظ میں اس نہج سے عبارت ہے کہ:

> ''تیس سال کی اس خانہ جنگی میں رند ولاشار قبائل جس طرح کٹ کٹ کر مرے اور جس طرح یہ دونوں بہادر اور مشہور بلوچ تباہ و برباد اور منتشر ہو کر سندھ و پنجاب میں بکھر گئے۔ اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے، کم ہے۔'' (7)

میر چاکر اور گواہرام کے درمیان ہونے والی جنگوں کے بعد، ہم سہراب دودائی اور اس کے ہم عصروں کے درمیان معرکہ آرائیاں دیکھتے ہیں۔ جب 1502ء میں دودائی پنجاب میں داخل ہوا تو اسے ان بلوچ قبائل کا سامنا کرنا پڑا جو پہلے سے پنجاب میں آباد ہو چکے تھے۔ بلوچستان سے نکل کر سندھ اور پنجاب میں آباد ہونے والے بلوچ اب فکر معاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور ایک دوسرے سے معرکہ آراء ہو رہے تھے۔ وطن کی خلش اب انہیں پریشان نہیں کرتی تھی اور وہ ذہنی طور پر نئے وطن کو قبول کرتے جا رہے تھے۔ اس لوک بیانیہ کا اظہار بجار کی ایک نظم سے ہوتا ہے جو اپنے رند قبیلے سے ناراض ہو کر الگ ہو گیا تھا۔ نظم کے بول ہیں:

رند نہ سہی
دودائی بھی میرے بھائی ہیں
کوہستان نہ سہی

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے
چاچڑ کا نمکین پانی مجھے پسند ہے
اس کا ذائقہ
میرے بیٹوں کے منہ میں میٹھا ہے
اور یہ ترکوں کے حدود سے دور
اس پار ہے (8)

اسی دور کی نظموں میں حیر و مند وست کی ایک نظم اہم ہے۔ بجّار اس دور کے بلوچوں کے رواج کے مطابق اسے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ملک سہراب سے لڑنے آ رہا ہے۔ حیر و مند وست اپنی نظم میں کہتا ہے۔:

میلی چادروں والے رندوں کے
پیغام آئے ہیں
(معلوم ہوتا ہے) کہ رندوں میں بھی
ایک شمشیرزن پیدا ہوا ہے
جس کا نام
بہادروں کو مار ڈالنے والا بجّار ہے
اور جو ملک سہراب سے لڑنا چاہتا ہے (9)

اپنے قبیلے کو اطلاع دینے کے بعد حیر و مند وست تصورات میں آنے والی لڑائی کے میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ رزمیہ شاعری کا یہ اور اس جیسے دوسرے نمونے اعلیٰ ترین رزمیہ شاعری میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

کل جب خدا دن لائے گا،
ہم ایک بڑی فوج کو حرکت میں لے آئیں گے
اور صحرا جیسے ایک میدان میں نکل آئیں گے
دور ریت کے کسی ٹیلے کے دامن میں
رندوں اور دودائیوں کو لڑائیں گے
بہادر نوجوانوں کا دوبہ دو مقابلہ کرائیں گے
تھو، شہزاد سے کشتی لڑے گا
بسکان کا بیٹا دلی چھا سے
شمبو شوریدہ سر شوران سے

اور محمد آن، الّن پہلوان سے ٹکرائے گا
ان کا لشکر
اور ہماری بڑی فوج
ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائیں گے
جیسے سیلاب کا پانی بند سے ٹکراتا ہے
اور ایک دوسرے کو اس طرح کوٹیں گے
جیسے جوار کے خوشوں کو کوٹا جاتا ہے۔(10)

بقول گل خان نصیر:

''یہ تو ہوا دونوں طرف کے پہلوانوں کی دو بہ دو لڑائی کا بیان مگر کیا یہ ممکن تھا کہ حیر و مندوست جیسا ایک بہادر شخص اس میدان جدال و قتال میں دور کھڑا تماشا دیکھتا۔ وہ دودائیوں کا سردار تھا اس لئے اس نے اپنے رندوں کے اسی مرتبے کے سردار بجار کا انتخاب کیا۔ حیر و مندوست نے اسی نظم میں بجار سے اپنی اس لڑائی کا نقشہ جس جادو بیانی سے اثر انگیز الفاظ مین کھینچا ہے، اس سے شاہنامہ فردوسی میں رستم و سہراب کی لڑائی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔

میں اپنے گلے کی مُشکی گھوڑی پر
سُرخ نیزہ ہاتھ میں لئے
رندوں کے فہمیدہ سردار بجار کو (لشکر میں) ڈھونڈ نکالوں گا
خدا کرے کہ ایسا اتفاق ہو
اور وہ مجھے مل جائے
میں اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ کر
اور اسے اس کے لمبے اور میلے بالوں سے پکڑ کر
اپنی تلوار اس کے سر پر توڑ دوں
اور پھر ایک ہاتھ سے اس کو پکڑ کر
دوسرے ہاتھ سے اپنی کٹار
اس طرح اس میں بھونک دوں کہ
قبضے تک اس کے اندر گھستی چلی جائے
اور میرا دائیاں ہاتھ خون سے آلودہ ہو
بجار اپنی نیلی گھوڑی کی زین سے گر کر

میدان جنگ میں ابدی نیند سو جائے
یا پھر وہ مجھ سے
میری ہندی تلوار اور رندی ترکش اٹھا لے جائے
اور اتفاقیہ فتح حاصل کر لے (11)

لیکن حیرومندوست خود بجار کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اب غازی خان جس کے نام پر ڈیرہ غازی خان آباد ہے، کا بیٹا حاجی خان حیرومندوست کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ایک اور تصوراتی جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنے قبیلے کے لوگوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

اے شاہی رنگ و روپ رکھنے والے نوجوانو!
اب عورتوں جیسے گلے شکوے کرنا چھوڑ دو
میرے سر میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے
میرا جھومنے والا بدن تپ رہا ہے
کھجور کے درخت کے تنے میں لگی ہوئی
آہستہ آہستہ جلنے والی آگ کی طرح
میرا بدن سلگ رہا ہے
اور کیسمر کے انگاروں کی طرح
آتش انتقام میرے دل کو جلا رہی ہے
میرا بدن موم کی طرح پگھل پگھل کر
میرے نرم پیرہن پر گر رہا ہے
پرسوں مجھے اطلاع ملی کہ
ہمارے بدترین دشمن آئے ہوئے ہیں (12)

قدیم دور کے بلوچ شاعروں کی مذکورہ بالا نظمیں جس لوک بیانیہ کا اظہار کرتی ہیں وہ اگرچہ باہمی جنگوں سے عبارت ہے لیکن ان سے بلوچوں کی بہادرانہ خصوصیات کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر جنگیں پناہ میں آئے ہوئے افراد حتیٰ کہ جانوروں کی زندگی کی حفاظت کرتے ہوئے برپا ہوئیں۔ پھر بھی مذکورہ بالا لوک بیانیہ اور انتقام اور خون خرابے کی داستانوں کے برعکس، میر چاکر کے عہد کا جری شاعر بیبرگ (بیورغ) امن اور صلح جوئی کے لوک بیانیہ کا پرچارک ہے۔ اگرچہ مذکورہ جنگیں، گواہر کی اونٹنیوں کے بچوں کی حفاظت نہ کر پانے کے نتیجے میں رونما ہوئیں کہ پناہ میں آئے ہوؤں کی حفاظت بلوچ کی اپنی زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن بیبرگ اس سے

بھی آگے بڑھ کر جنگ کو جس طرح ٹالتا ہے اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

بہرگ کا تعلق رند قبیلے سے تھا۔ وہ بہادر اور نڈر تھا جب میر چاکر رندوں کا عظیم لشکر تیار کر کے 'نلی' کی جنگ کے لئے نکلا۔ تو بہرگ نے اسے جنگ سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ بزدلی کے طعنے بھی سنے لیکن جب میر چاکر کسی طرح نہ مانا تو وہ بھی اس کے ساتھ جنگ میں روانہ ہو گیا۔ 'نلی' کی جنگ میں میر چاکر کو عبرت ناک شکست ہوئی اور ایک دستے کی کمان کرتا ہوا بہرگ بھی مارا گیا۔ لیکن اس کی امن پسندی کا ایک بے مثال واقعہ اس کی ایک نظم سے مترشح ہے۔ اس جنگ سے کافی پہلے میر چاکر نے بہرگ کو ایک مشن پر قندھار بھیجا۔ جہاں وہ ایک حسینہ گراں ناز کی زلف کا اسیر ہو گیا۔ ملاقاتیں بڑھیں تو ایک دن گراں ناز نے کہا:

"میرا بادشاہ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ وہ میرے لئے دیوانہ ہے اور مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ اگر ہمارا راز اس پر فاش ہو گیا تو پھر وہ ہم دونوں کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم مجھے اپنے وطن لے چلو" بہرگ نے اسے بہتیرا سمجھایا مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہ ہوئی۔ بالآخر ایک دن وہ موقعہ پا کر گراں ناز کے ایما پر محل کے نیچے پہنچا اسے گھوڑی پر بٹھایا اور بولان کی طرف چل پڑا۔ کچھ روز بعد وہ قلعہ چاکر کی فصیلوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس موقع پر گراں ناز نے بہرگ سے کہا "اے میرے سردار! تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے پاس زبردست فوج ہے اور دشمن بھی طاقتور ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے دشمن گواہرام کے پاس چلے چلو اور اس کے پاس پناہ لو کیونکہ بادشاہ ہمارا تعاقب کرے گا اور میر چاکر خان گھر سے باہر محاذوں پر رہتا ہے پھر بادشاہ کا مقابلہ کیونکر کرو گے۔(13)

میر چاکر واقعی اپنے قلعے میں نہیں تھا۔ بہرگ کو اپنے دشمن میر گواہرام کے پاس گنج آبہ میں پناہ لینا پڑی۔ اس نے میر گواہرام کو بتایا:

"میں شاہِ قندھار، ذوالنون بیگ کی متاع بے بہا، گراں ناز کو ساتھ لایا ہوں اور پناہ چاہتا ہوں۔ میر گواہرام نے بلوچی غیرت وحمیت کے پیش نظر اپنے مخالف، بہرگ کو اپنے ہاں پناہ دی، تیسرے روز جب شاہ قندھار کی فوج درہ بولان کے پاس پہنچ گئی تو میر گواہرام نے اپنے ایک خاص ایلچی کے ذریعے میر چاکر خان کو پیغام بھجوایا کہ بہرگ ایک زبردست مصیبت کو لایا ہے۔ اس کے ساتھ بادشاہ کی "متاع بے بہا" ہے اور وہ تعاقب میں یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ اس موقع پر ہمیں اپنے تمام اختلافات ختم کر کے متحد ہو جانا چاہئے" چنانچہ اس پیغام کے ملتے ہی میر چاکر خان فوراً تیار ہو کر اپنی عظیم سپاہ سمیت میر گواہرام کے پاس پہنچ گیا اور دو عظیم لشکر لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔(14)

بیہرگ جنگ نہیں چاہتا تھا اس نے جنگ کو ٹالنے کے لئے اکیلے بادشاہ کا سامنا کرنے کی ٹھانی۔ اس نے گواہرام اور میر چاکر سے کہا کہ پہلے وہ دشمن کے کیمپ میں جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا محافظوں کو راستے سے ہٹاتا بادشاہ کے خیمے میں پہنچ گیا۔ بادشاہ سو رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کو جگایا اور بولا:

''میں بیہرگ ہوں!
جسے آپ بخوبی جانتے ہیں
میں آپ کا قصوروار ہوں
اور بخشش بادشاہوں کا کام ہے!
میں صرف اپنے لئے، بے گناہ
انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا؛
اس لئے خود آیا ہوں
اگر آپ مجھ پر رحم نہیں کر سکتے تو پھر
آپ کے رحم و کرم پر ہوں
یہ آپ کی تلوار ہے اور یہ میری گردن!!(15)

بادشاہ بیہرگ کی جرأت اور بہادری سے بے حد متاثر ہوا اور اسے معاف کر دیا۔ یوں ایک بڑی جنگ ٹل گئی۔ اسے اپنی محبت بھی مل گئی اس نے لکھا:

کوئی میرے لئے قیدی نہیں بنا
اور نہ میرے لئے رندوں اور لاشاریوں
کو جنگ کی آگ میں کودنا پڑا
میں سردار چاکر خان کے زیرِ سایہ
شگفتہ دلی و آسودگی سے اپنی محبوبہ گراں ناز کے ساتھ رہتا ہوں
اور اکثر اس کے سنہری ہار سے کھیلتا ہوں''

اس عارضی اتحاد کے بعد رند اور لاشاری پھر آمنے سامنے تھے۔ بیہرگ معرکہ ''نلی'' کی جنگ کو نہ ٹال سکا۔ میر چاکر اس جنگ میں کود پڑا۔ میر چاکر بیہرگ اور ہزاروں دیگر اس جنگ کا ایندھن بن گئے۔ بعض دیگر روایات کے مطابق میر چاکر اس جنگ میں بچ گیا تھا۔ اس نے ہرات میں پناہ لی اور کئی سال تک وہاں پڑا رہا تاکہ لاشاریوں سے اپنی شکست کا بدلہ لے سکے۔

یہاں ہمارا موضوع بیہرگ کا لوک بیانیہ ہے جس کے مطابق محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز نہیں ہوتا۔

اپنی کتاب میں سمر گ کو ہیکر لکھا ہے۔گل خان نصیر کے ہاں سمرگ کے عشق کی تفصیلات مختلف ہیں۔البتہ داستان کا انجام یکساں ہے۔گل خان نصیر نے اس کے بعض دیگر رومانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ان ساری تفصیلات سے قطع نظر سمرگ کا لوک بیانیہ امن اور صلح جوئی کا لوک بیانیہ ہے جو پندرھویں صدی کے بلوچ معاشرے کی دین ہے۔

بلوچ لوک بیانیہ کا ایک اور اہم کردار بالاچ گورگیج ہے جس کے بارے میں گل خان نصیر، کامل القادری، حکیم بلوچ، عبدالرحمٰن غور، میر شیر محمد مری بلوچ، سلیم خان گمی اور بعض دیگر علما نے اپنے اپنے انداز میں تحقیق کی ہے۔گل خان نصیر کے لفظوں میں۔

''بالاچ صرف ایک نڈر اور منتقم بلوچ نہ تھا بلکہ اعلیٰ پائے کا شاعر بھی تھا اس کی زبان صاف سلیس اور انتہائی حد تک مؤثر ہے۔تشبیہات و استعارات بلوچ ماحول کے مطابق اور قابل فہم ہیں۔چنانچہ اپنی ایک نظم میں بلیدیوں کے گاؤں میں اس کی وجہ سے عورتوں میں جو خوف پھیلا تھا، اسے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

رات کو جب پرندے
نیچے پرواز کرتے ہوئے گذرتے ہیں
تو بلیدیوں کی عورتیں
(اپنے خاوندوں سے) کہتی ہیں
سنو! بالاچ کے تیروں کی آواز آرہی ہے
اور جب گاؤں میں رات کو
بیل آپس میں لڑتے ہیں
تو گھروں کی پاک دامن بی بیاں
نیند سے اُچھل پڑتی ہیں
اور آہستہ سے
اپنے خاوندوں سے کہتی ہیں
خاموش رہو
بالاچ کے قدموں کی آہٹ ہے(16)

اپنی ایک اور نظم میں بالاچ، جوانمردوں کی صفات بیان کرتا ہے، جو اپنے خون کا انتقام لینے کو نکلتے ہیں:

جو لوگ اپنے خون کا انتقام لینا چاہتے ہیں
وہ اپنی بیویوں سے دور بھاگتے ہیں

اپنے مال و مویشیوں کی محبت چھوڑ دیتے ہیں
راتوں کو بیدار رہتے ہیں
عاشقوں کی طرح سرد آہیں بھرتے رہتے ہیں
دشموں پر دانت پیستے ہیں
یہ لوگ ہیں جو
اپنے خون کا انتقام لیتے ہیں
یا اپنے سر گنوا دیتے ہیں (17)

اسی بالاچ کا مشہور مصرعہ ہے جو ایک ضرب المثل بن گیا ہے۔

پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں

پوری نظم دراصل بلوچ قوم کا لوک بیانیہ ہے جس کی مثال خود بلوچی شاعری میں مشکل سے ہی ملے گی۔

پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں
دشوار گذار اور بے راہ گھاٹیاں ان کے گودام ہیں
وہ اونچی چٹانوں کے سائے میں بیٹھتے ہیں
اور بہتے چشموں کا پانی پیتے ہیں
پِش کے پتوں سے اپنے آب خورے بناتے ہیں
خاردار جھاڑیوں میں بیٹھتے ہیں
پہاڑی ندیوں کی باریک کنکریاں
ان کے لئے گدیلوں کا بدل ہیں
اور صاف پتھر ان کے سرہانے ہیں
(کچے چمڑے) سفید چپلیاں ان کے گھوڑے ہیں
اچھے خدنگ ان کے بیٹے ہیں
چکنی اور سخت ڈھالیں ان کے بھائی ہیں
نوکدار خنجر ان کے بھتیجے ہیں
سیوائی کمان ان کے باپ ہیں (18)

بالاچ کا بھائی دودا خان، اپنے معاشرے کی قدروں کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ وہ حجلۂ عروسی کو چھوڑ کر ایک مظلوم بیوہ بلوچ سمی کی حمایت میں، ظالم سردار بیورغ بُگٹی سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ اسی کا کم سن بھائی

بالاچ ہتھیار اٹھا کر گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے نہیں بلکہ مظلوم سمّی کا حق دلانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بالاچ کے لوک بیانیہ نے بلوچوں کی سیاسی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ گذشتہ ستر برسوں سے وہ ظلم سے برسرپیکار ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔

نوآبادیاتی دور میں رحم علی کی شاعری بلوچ لوک بیانیہ کا اہم اظہار ہے۔ رحم علی کے والد، بجار خان قومی شاعر تھے۔ ان کا بیٹا رحم علی اپنے والد کی زندگی میں ہی ایک انقلابی شاعر کے طور پر ابھر چکا تھا۔ رحم علی مری قبیلے کا اہم رجز خواں تھا۔ انگریزوں سے مری قبیلے کی جنگوں کا اس نے خوب نقشہ کھینچا ہے لیکن قبائلی زندگی میں استحصالی رویوں پر بھی بھرپور تنقید کرتا ہے۔

بعض تو پلنگ پر نیند کے مزے لیتے ہیں
اور بعض آدھی رات تک روٹی کے لئے سرگرداں
رہتے ہیں
بعض لوگوں کو تو پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں
اور بعض اپنے عیش اور آسائش کے لئے نادان لوگوں
کو ملازم رکھتے ہیں۔
غرضیکہ کچھ تو شادمان وخوشحال ہیں اور کچھ
دکھوں کی وجہ سے پریشان ونالاں

مریوں کے علاقے میں ہڑب اور گنبد کے مقام پر انگریزوں کے خلاف مریوں کے جو معرکے ہوئے، انہیں رحم علی نے اپنی شاعری میں امر کر دیا ہے۔ جنگ دراصل جرمنوں اور انگریزوں کے درمیان تھی۔ انگریز اس جنگ میں مری قبیلے کو چارہ بنانا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے، نواب خیر بخش خان مری انگریزوں کی یہ خواہش پوری کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ نتیجے کے طور پر انہیں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔ اس جنگ کا احوال رحم علی نے شاعری کی زبان میں اس طرح بیان کیا ہے۔

انگریز اور جرمن کی جنگ ہے
دو بڑی قومیں لڑ رہی ہوں
کالے منہ والی توپیں گرجتی ہیں
اور لاکھوں انسانوں کو ختم کر دیتی ہیں
ہمارے تمام سرداروں کو بلایا گیا ہے وہ بس
جا رہے ہیں

اب تمندار (بڑے سردار) سبی میں اکٹھے
ہو گئے ہیں اور وہ جرگہ کر رہے ہیں
یہ اس لئے کہ انگریزوں نے رنگروٹ طلب
کئے ہیں
اور سردار، اس مطالبہ کو تسلیم کرنے میں
پس و پیش کر رہے ہیں!
بہرام خان مزاری! آپ کے آدمی لام
(جنگ) پر جائیں یہ مناسب نہیں!!
بہادر اور جنگجو مری، پہاڑوں کی گھاٹیوں
میں اکٹھے ہونے لگے
آپ کے حکم سے نواب خیر بخش خان!
آپ کو سب آفرین کہہ رہے ہیں
کمزور وڈر پوک سردار، آپ کے طفیل (ذریعے)
بچ گئے ورنہ وہ رنگروٹ دینے پر مجبور تھے!
تمام بڑے پیر اور پیغمبر آپ کے حق میں دعا
کر رہے ہیں۔
نازک طبیعت بی برگ وسید حاں لڑائی
کے لئے اپنی گھوڑیوں کو زین کر رہے تھے
لڑائی کے لئے ان کے دلوں میں شوق تھا
اور ان کے صافے، کچھ سر پر اور کچھ
کاندھے سے نیچے زمین پر گھسٹ رہے تھے
اور ادھر مریوں کے جاسوس بھی پہاڑ کی چوٹی
پر ہشیاری سے بیٹھے تھے۔
اچانک انگریز ''بوڑ'' کے مقام پر پہنچے اور
ان کے ہوائی جہاز بھی ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے
شیر دل مریوں نے لڑائی کے دوران ''پلو''

(قمیض کے دامن کا ایک سرا) کو دوسرے
پلو،'' سے باندھا تا کہ پسپا نہ ہوں چنانچہ
بہت سے مری اس حالت میں مر گئے
ان شہیدوں کے لئے ہمدردی کے طور
پر بادل اٹھے اور ہڑب پر تیزی سے برسنے
لگے جو ہڑب کی جنگ میں شہید ہوئے
خدا کی طرف سے ان پر رحمت ہوئی اور وہ خدائی
انعام سے نوازے گئے۔ (20)

رحم علی نے گمبند کی خون آشام لڑائی کو مزاحمت کی ایک تخلیقی دستاویز بنا دیا ہے 1918ء کی اس جنگ میں جہاں ایک طرف اس نے انگریزوں سے نفرت کا اظہار کیا ہے وہیں، وطن کو غلامی سے نجات دلانے کا جذبہ بھی بھر پور ہے۔ نظم کے آخری بند میں رحم علی کہتا ہے:

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم (انگریزوں سے)
فیصلہ کن جنگ لڑیں
اب کون ہے کہ جو تلوار کی جھنکار پر رقص کرنے
کو تیار نہیں؟
آ جاؤ اے غازیو! اور شہیدو! جلدی آؤ اور اپنی
اچھی گھوڑیوں کو سنوارو، یہ بے عزتی کی نوکری ہم
سے نہیں ہو سکتی!
اس دنیا کو ایک دن ضرور چھوڑنا پڑے گا آج
ہم نے عزم کیا ہے کہ اپنا سر اپنے مالک حقیقی کے
لئے قربان کریں گے اور دونوں جہاں میں سرفراز
ہوں گے۔ انگریزوں کا مال اور دولت ہمیں
نہیں چاہئے۔
جنگ سے کون دور رہ سکتا ہے۔ (21)

بلوچ خواتین کی شاعری، بلوچ لوک بیانیہ کی ایک اور صورت ہے۔ بعض روایات کے مطابق رومانی داستان ''حانی شہ مرید'' کی حانی، محبت کی شدت میں شعر کہنے لگی تھی۔ اسی طرح مہناز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

اس نے بلوچی میں بڑی پُر اثر شاعری کی ہے۔ مہناز کی شاعری بہت کم محفوظ رہ پائی لیکن جس شاعرہ نے عورت کے حساس اور نازک جذبات کی بھرپور ترجمانی کی، وہ سیمک ہے، جسے بلوچی زبان کی عظیم شاعرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سیمک کی شادی رند قبیلے کے ایک خوبصورت نوجوان نتھا سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے بے حد محبت کرنے لگی۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب نتھا ایک قبائلی جنگ کا لقمہ بن گیا۔ شوہر کی موت نے سیمک کو پاگل کر دیا۔ جس کے نتیجے میں سوز و گداز سے بھری شاعری وجود میں آئی۔ ایک روایت کے مطابق '' جب نتھا مارا گیا تو سیمک اس صدمہ سے پاگل ہوگئی۔ سال دو سال کے بعد ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے اور یوں لگتی ہے جیسے نئی نویلی دلہن ہو، سیمک کی ماں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی آخر کار ماں کے زیادہ اصرار پر اس نے بتایا کہ جب میں پاگل تھی تو ایک رات نتھا کی قبر پر گئی۔ اور وہاں دیر تک روتی رہی اور پھر اچانک ایسا محسوس ہوا کہ گویا نتھا کی روح قبر سے نمودار ہوئی، اس نے دیر تک مجھ سے محبت کی باتیں کیں اور تسلی دی اور پھر اکثر وہ مجھ سے ملتا رہا۔ اسی خوشی میں میں جوان ہوگئی لیکن ماں! نتھا نے مجھے کہا تھا کہ یہ راز تم نے اگر کسی کو بتایا تو میں پھر تم سے نہیں ملوں گا۔ اب وہ مجھ سے کبھی نہیں ملے گا۔ ماں! کاش تم نے مجھ سے یہ نہ پوچھا ہوتا اور پھر اس کے بعد وہ رو رو کر پاگل ہوگئی۔ سیمک کا یہ شعر اس واقعہ کی شہادت دیتا ہے۔

جب نتھا قبر سے نمودار ہوا تھا
تو اس کی خوبصورت ڈاڑھی اور
مونچھوں پر جنتی کستوری لگی
ہوئی تھی اور وہ اس خوشبو سے معطر تھا (22)

نتھا کی جدائی میں سیمک کا دیوانہ پن اسے شاعری کی عظیم بلندیوں کی طرف لے گیا ہے۔ نتھا کی یاد میں لکھی جانے والی نظموں میں کمال کی تشبیہات ہیں جو اس کے دکھے دل کے درد سے بھری ہوئی ہیں۔ سیمک لکھتی ہے؛

دھند، غبار کے بادل چھٹ گئے ہیں
نتھا اتنا اونچا دکھائی دیتا ہے جیسے
کوہِ ماران کی بلند چوٹی
اس کی پگڑی ایسی سفید ہے جیسے
ساون کے گھنے سفید بادل کے ٹکڑے
اس کے اپنے گھنے بال شانوں پر ایسے
بکھرے ہوئے ہیں جیسے موسلا دھار
بارش اور مجھے تو ایسے محسوس ہوتا ہے

کہ بارش کے یہ قطرے نتھا کی بندوق
کی گولیاں ہیں
میرے شوہر کی آبدار تلوار ایسے چمک
رہی ہے میان میں جیسے رات میں
بجلی چمکتی ہے
اور نتھا کے بندوق کی گولی کی آواز
کچھ ایسی ہے جیسے بادل کی گرج! (23)

ایک اور نظم میں سیمک اپنی گریہ وزاری کو ایک اور صورت عطا کرتی ہے۔ بارش سے اس کا مکالمہ دیکھئے:

تانچی (ایک گاؤں) کی طرف سے
آئی ہوئی پھوار سے میں نے پوچھا
کہ تم مجھے کیوں بھگو رہی ہو، تم کس
کی روتی ہوئی آنکھوں کے آنسو ہو!
مجھے جواب ملا کہ میں تمہیں سیمک کے
صدقے میں بھگو رہی ہوں، کیونکہ
میں سیمک کی آنکھوں کا گریہ ہوں
وہ سیمک جو نتھا کی جدائی میں دیوانی
ہوگئی ہے
غم کی آگ نے جس کی حسین صورت
کو بجھی ہوئی راکھ میں بدل دیا ہے

سیمک جانتی ہے کہ نتھا جہاں گیا ہے وہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا لیکن اس کے دل میں نتھا کی کامران واپسی کی امید زندہ رہتی ہے۔

نتھا مرا تو نہیں، وہ تو مہم پر گیا
ہوا ہے اور وہ کامیاب واپس آئے
گا اور میرے لئے خوبصورت جوڑا
لائے گا۔ میں اسے پہن کر پھولی نہ
سماؤں گی! (22)

بلوچ ہیرو حمل جیئند، کا ذکر ہم گذشتہ باب کے ایک حصے میں کر چکے ہیں۔ یہاں ایک اور بلوچ شاعرہ کا ذکر مقصود ہے جو میر حمل کی بہن تھی اور جس نے حمل جیئند اور پرتگیزوں کے درمیان جنگ کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ نظم کا آغاز اس توہم سے ہوتا ہے، جس میں بلوچ مدتوں مبتلا رہے ہیں:

اے بھائیوں کی بہن
ہفتے کے دن اور سولہویں تاریخ کو
اپنا سر نہ دھونا
کیونکہ ہفتے کا دن بھائیوں کے لئے
اور (چاند کی) سولہویں تاریخ باپ کے لئے
سعد گھڑی نہیں ہے
ہفتے کے دن
اور سولہویں کی منحوس تاریخ کو
حمل نے اپنی کشتی سمندر میں ڈال دی
اور وہ کتنا منحوس دن ثابت ہوا (23)

رزمیہ بحر میں نہ ہونے کے باوجود اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک رزمیہ نظم ہے۔ جب حمل گرفتار ہو جاتا ہے تو پرتگیزی اس کی بہادری اور کردار سے متاثر ہو کر اسے پیشکش کرتے ہیں کہ وہ کسی پرتگیزی لڑکی سے شادی کر لے تو وہ ان کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے ان عورتوں کی خامیاں اور ان کے مقابلے پر بلوچ لڑکیوں کی صفات گنواتا ہے۔

مجھے اپنے ملک، (بلوچستان) کی
نشیلی آنکھوں والی بیبیاں پیاری لگتی ہیں (24)

''اس نظم میں شاعرہ نے مضمون کو جس طرح سے سمویا اور بیان کیا ہے اس سے اس کی قادر الکلامی اور رمز شناسی کے علاوہ بلوچی کی فصاحت کا بھی بطریق احسن اظہار ہوتا ہے، حمل کی وہ تمام خصوصیات ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں، جن کی وجہ سے بلوچوں میں اسے شہرت اور ناموری حاصل رہی ہے۔ بہادری، قوم پروری، وطن دوستی اور جنگجوئی نظم کے ہر ایک شعر سے نمایاں ہوتی اور اپنا اثر دکھلاتی رہتی ہے۔ میر حمل اپنے ساتھیوں کی بزدلی اور فرار سے بے حوصلہ نہیں ہوتا۔ پرتگیزی لٹیروں کے مقابلے سے جی نہیں چراتا بلکہ مردانہ وار ان کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے۔'' (25)

بلوچ خواتین کا شعری لوک بیانیہ رابعہ خضداری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ فارسی زبان کی اولین شاعرہ، جو عربی میں بھی شعر کہتی تھی، بلخ اور خضدار کی شہزادی اور رودکی کی ہم عصر تھی جس نے محبت کی آزادی کے لئے جان دی۔ ایک ہزار سال سے زائد پرانی اس شاعرہ کے چند اشعار ہی موجود ہیں۔ لیکن محمد عوفی کی کتاب "لباب الالباب"، شبلی نعمانی کی "شعر العجم" اور ڈاکٹر ذبیح اللہ کی "تاریخ ادبیات ایران" سمیت متعدد تذکروں میں رابعہ کا ذکر ملتا ہے، رابعہ رودکی کی ہم عصر تھی۔ عطار نے اپنے سیکڑوں اشعار میں اس کے عشق کی تفصیل بیان کی ہے۔ جن میں رودکی سے رابعہ کی ملاقات کے حوالے سے اشعار بھی ہیں۔ رابعہ کے والد کعب بلخ اور خضدار کے حکمران تھے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے الفاظ میں "جب کعب اس دنیا سے چل بسا تو اس کا بیٹا حارث تخت نشین ہوا۔ بستر مرگ پر کعب نے حارث سے کہا کہ رابعہ کو ہمیشہ عزت و توقیر سے رکھنا۔۔۔ ایک صبح وہ حسب عادت خضدار کے باغات میں گھوم رہی تھی، عین اس وقت بکتاش، جو کہ حارث کے غلاموں میں سے تھا، اپنی جادو زدہ آنکھوں میں زیبائی اور دلربائی کو لیئے ہوئے سامنے آیا اور سرخ پھول جو کہ ہاتھ میں رکھتا تھا، نیاز مندی اور شکر گزاری کے ساتھ رابعہ کے حضور میں پیش کیا۔ یہی سرخ پھول عشق اور دوستی کی علامت بنا۔ اس خیال سے کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے وہ آناً فاناً رابعہ کی نظروں سے دور ہو گیا۔ یہ واقعہ جو ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رونما ہوا، اس نے کعب کی بیٹی کے دل و دماغ میں تغیر پیدا کر دیا۔ وہ خوبصورت بکتاش کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔" (26)

دونوں کے عشق کی کہانی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ روایات کے مطابق رودکی کی ایک بار رابعہ سے سرِ راہ ملاقات ہوتی ہے وہ رابعہ سے اشعار میں کچھ سوال کرتا ہے۔ رابعہ اشعار میں ہی جواب دیتی ہے۔ ایک بار بخارا کے دربار میں رودکی بادشاہ کو رابعہ کے اشعار سناتا ہے جہاں اس کا بھائی حارث بھی موجود ہوتا ہے۔ ان اشعار سے رابعہ اور بکتاش کے عشق کی بات سامنے آتی ہے۔ حارث کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ اس کی بہن، اسی کے ایک غلام سے عشق کرے۔ وہ دونوں کی خط و کتابت ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ بکتاش کو کنوئیں میں قید کر کے اپنی بہن کو ایک حمام میں بند کرتا اور اس کی کلائیوں کی رگیں کاٹ دیتا ہے۔ رابعہ اپنی خون آلود انگلیوں سے حمام کی دیواروں پر اپنے عشق کی کہانی لکھتے لکھتے ختم ہو جاتی ہے۔ بکتاش کسی طرح کنوئیں سے نکل کر حارث کو قتل کر دیتا ہے۔ پھر رابعہ کی قبر پر پہنچتا ہے اور اپنا بھی خاتمہ کر لیتا ہے۔ یہ کہانی کتنی حقیقت پر مبنی اور کتنی عطار کے تخلیقی ذہن کا اظہار، جو بھی سچ ہو رابعہ کے وہ اشعار بھی عشق کے ایک لوک بیانیہ کے طور پر موجود ہیں اور اپنی اثر انگیزی کے باعث ان پر سچائی کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے رابعہ کی بعض غزلوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جو اس بیانیے میں مزید جان ڈال دیتا ہے۔ فہمیدہ ریاض کے لفظوں میں "رابعہ نے مختصر بحروں میں موتی پرو دیئے ہیں۔ کیا لازوال شاعری ہے کہ گیارہ صدی کے بعد بھی اسی طرح تر و تازہ ہے، اس پر جب خیال کیجئے کہ ان پر کیسا ظلم و ستم کیا گیا تو دل پر چھری سی چل جاتی ہے۔۔۔ بلاشبہ رابعہ کا سب سے بڑا جرم عورت ہونا ہی تھا۔ ان کے بھائی حارث اگر کسی ترک کنیز پر عاشق ہو جاتے تو اسے

آسانی سے اپنے حرم میں داخل کر لیتے اور ان کی سلامتی پر آنچ بھی نہ آتی۔۔" (27)

رابعہ کے کلام کا منتخب نثری ترجمہ:

اس کے عشق نے دوبارہ مجھے قید میں ڈال دیا

عشق ایسا سمندر ہے، جس کا کوئی ساحل نہیں

اے شخص تو، جو کہ دنیاداری سے آشنا ہے، کیونکر اس میں تیر سکے گا؟

میں (عشق کی) باگ سرکش گھوڑے کی طرح کھینچتی رہی

میں نہیں جانتی تھی کہ کھینچنے سے پھندہ اور بھی تنگ ہو جاتا ہے

تیرے ہونٹ شہد ہیں اور رخسار چاند

تیرا چہرہ لالہ ہے اور زلف سیاہ

تیرے لالہ جیسے رخساروں نے میرا یاقوت جیسا رنگ

سوکھی گھاس جیسا بنا دیا ہے

میرے اشک اولوں کی طرح، صرف بدخواہوں کے طعنوں کے باعث

برسے ہیں

میرا جرم کوشش (جہد) کے سوا اور کچھ نہ تھا

میری راہ اللہ کی راہ کے سوا کوئی دوسری نہ تھی

تاکہ وہ عشق سے میرا پورا وجود "ہُوْ" بنا دے (28)

رابعہ کے عشق کو غالباً اسی بنیاد پر عشق حقیقی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن رابعہ کی یہ جدو جہد، عورت کی طرف محبت کی آزادی کا ایسا لوک بیانیہ ہے جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔

براہوئی لوک بیانیہ:

بلوچستان کی دیگر زبانوں میں براہوئی، پشتو، کھیترانی اور لاسی بھی لوک بیانیہ کے متون سے مالا مال ہیں۔ عبدالرحمٰن براہوئی نے اپنی کتاب "قدیم براہوئی شعرا" میں بشام، ریکی، بنو جان اور قیصر خان کے رزمیہ کلام سے چند اقتباسات دیئے ہیں۔ خصوصاً انیسویں اور بیسویں صدی میں انگریزی استعمار کو للکارنے والے ان براہوئی شعراء کا رزمیہ کلام آج بھی زندہ ہے۔ بشام نے 1839ء میں مینگل قبیلے کی انگریزوں کے خلاف جھڑپوں کو اپنے کلام میں محفوظ کر لیا ہے۔ اس جھڑپ میں قبیلے کے ایک سردار میر ولی محمد نے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ شاعر بشام نے اس نازک موقع پر ایک ہیرو کا کردار ادا کیا اور اپنی رزمیہ شاعری سے مینگل قبیلے کا خون

گرمائے رکھا۔

براہوئی لوک بیانیہ کا صرف رزمیہ رنگ ہی نہیں ہے۔ بلوچی شاعرات کے لوک بیانیے کی طرح براہوئی لوک بیانیہ بھی بیچی جانے والی معصوم دوشیزاؤں کے درد سے لبریز ہے۔ ''لب'' کے نام پر لڑکیوں کو بیچے جانے کے حوالے سے متعدد گیت موجود ہیں جنہیں براہوئی خواتین نے تخلیق کیا ہے۔ ان گیتوں میں خواتین پر ہونے والے ظلم و زیادتی کی روداد بیان کی گئی ہے۔ ان سے پوچھے بغیر ان کی شادیاں کردی جاتی ہیں۔ حالانکہ ''لب'' جیسی رسم، بظاہر خواتین کو مار پیٹ سے بچانے کے لئے ہے۔ محمد افضل مینگل کے الفاظ میں،

''اس کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ عورت کو خواہ مخواہ کی مار پیٹ سے بچایا جائے تا کہ مرد کو احساس ہو کہ اگر کسی حرکت کی وجہ سے وہ بیوی کو نقصان پہنچائے تو دوبارہ شادی کے لئے اچھی خاصی محنت کرنی ہوگی۔ اس وجہ سے بھی مرد عورت پر ہاتھ اٹھانے سے گریز کرتا ہے۔ لیکن ہر اچھی رسم کو بعد میں غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنا عام دستور ہے۔ براہوئی لوک گیتوں میں ایک کردار قاہو کا ہے جس کا کردار کلام خور کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی وہ بات بات پر قسمیں کھا کر مال و دولت جمع کرتا ہے۔ قاہو نے ناز جان کے معصوم جذبات کو ''لب'' کے نام پر فروخت کر کے اسے زندہ درگور کردیا''(29)

اس حوالے سے ایک براہوئی لوک گیت اس طرح کی بے جوڑ اور جبری شادیوں کو بے نقاب کرتا ہے:

اے قاہو، بے جا قسمیں کھانے والے تم پر اللہ کی مار ہو
ناز جان کم سن ہے، جس کی بددعائیں تمہیں لگیں گی
جٹ قالین اور اونی دریاں فروخت کر گئے
لیکن قاہو پری پیکر ناز جان کو فروخت کر گیا
توت کا یہ شجر (یعنی بوڑھا دولہا) صد سالہ لگتا ہے
ناز جان سر پکڑ کر روتی رہی(30)

اسی طرح دارو نامی ایک شخص، جو کہ علاقہ کا بااثر تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک دوشیزہ 'لب' کے نام پر غیروں میں بیاہی گئی۔ لوک گیت میں دوشیزہ دارو کو بددعائیں دیتی ہے۔ بیٹے کو جھولا جھلاتے کہتی ہے:

بیٹا! میں نے تکلیف برداشت کر کے تجھے جنم دیا
میں مجبور تھی
میری روح اور احساسات کو
دارو نے غیر کے ہاتھوں بیچ دیا
میں اس قید سے فرار کی تدبیریں کرتی رہی

تیرے آنے سے میری تدبیروں پراوس پڑ گئی(31)

بلوچستان کی سرزمین کی کوئی ماں ہی اس طرح کی لوری کو تخلیق کر سکتی ہے:

براہوی ادب کے لوک بیانیہ میں خواتین قلم کاروں نے زبردست حصہ ڈالا ہے۔ان میں سرفہرست مائی تاج بانو، امت الواجد، نانو بانو، نور بی بی اور طاہرہ احساس جتک پیش پیش ہیں۔اس قافلے میں دیگر خواتین بھی شامل ہیں جن میں حمیرا صدف حسنی، آمنہ یوسف موج، نیلم مومل، ڈاکٹر عنبرین مینگل، جہاں آرا تبسم نظم و نثر میں نمایاں رہی ہیں۔نئی نسل میں نائلہ قادری اردو، براہوئی اور انگریزی میں لکھتی رہیں۔عورتوں کے حقوق کی پرچارک نائلہ قادری پدرسری نظام کی سفاکیوں اور چیرہ دستیوں کی شدید مذمت کرتی ہیں۔

بلوچستان میں پشتو لوک بیانیہ کے نسائی پہلو:

ہم نے اس کتاب کے پہلے باب میں پشتو لوک بیانیہ کا مختصر ذکر کیا تھا۔ یہاں بلوچستان کی عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم وزیادتی کو پشتو لوک بیانیہ کے حوالے سے دیکھنا چاہیں گے۔ہم نے پشتو لوک صنف انگئی کا تعارف کراتے ہوئے اس کی ایک آدھ مثال بھی دی تھی۔ یہاں ہم کچھ اور مثالیں دیکھیں گے۔لیکن پہلے ولور کے حوالے سے پشتو لنڈئی یا ٹپے کی بات کریں گے۔ولور کی رسم میں رقم کے بدلے کسی لڑکی کا سودا کر دیا جاتا ہے۔ایک لڑکی کی ایک بوڑھے شخص کے ساتھ شادی کردی جاتی ہے۔اس کے احتجاج کا اظہار اس ٹپے میں دیکھتے ہیں:

سفید ریشی میں اتنی زیادہ محبت

میرا بوڑھا شوہر میری سیاہ زلفوں سے کھیل رہا ہے

اور مجھے اس کی اس حرکت پر ہنسی آرہی ہے (33)

فاروق سرور کے لفظوں میں ''بلوچستان کی پشتون عورتوں کو ''ولور اور چند ٹکوں کی خاطر ان لوگوں سے بیاہا گیا جوان کے والدین کے ہم عمر ہیں۔جن کی پہلے سے دو تین شادیاں اور بھی ہیں اور یوں وہ سوکنوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عمر سوتیلے بیٹوں، بیٹیوں کی نفرت کا عذاب بھی جھیل رہی ہیں اور یہ کہ اس ولور کی خاطر ان کی شادی نشے کے عادی ان افراد سے ہوئی جو ہر وقت بھنگ، افیم اور چرس کے نشے میں ڈوبے رہتے ہیں اور انہیں ان کے جذبات کا کوئی احساس نہیں'' (34)

ایک انگئی کا متن درج ذیل ہے:

''میرے گھر کے سفید کمرے پر سیاہ دھواں منڈلا رہا ہے۔میرے پاس ٹھنڈی آہوں اور دُکھ کے ماسوا کچھ بھی نہیں، نہ ہی میری کوئی ماں ہے اور نہ ہی میرا بھائی، بابا میرے ولور کے بدلے خوب نوٹ لے چکا ہے۔وہ دوسری شادی کا خواب دیکھ رہا ہے جبکہ میں اس گھر سے خالی ہاتھ رخصت ہو رہی ہوں(35) ''

انگئی یا پٹغیان دراصل عورتوں کا تخلیق کردہ لوک بیانیہ ہے 'نئی نویلی دلہنیں، رخصتی کے وقت جسے رو رو کر گاتی ہیں۔ بقول شاہ محمد مری، انگئی، ان دلہنوں جولڑکپن والی سرحد کے خاتمے اور عورت پن والی سلطنت میں داخل ہونے والی ہیں، جو مشروط اور پابند آزادی کے خاتمے اور ابدی غلامی شروع ہونے کے مرحلے میں ہیں، کی فی البدیہہ شاعری ہے(36)

''لوگ کہتے ہیں کہ نہ رو لیکن آج رونا جائز ہے۔ لڑکیوں کی قسمت میں ہنسنا کہاں۔ آج کے دن ہی باپ کے گھر میں ہوں جس طرح قبر میں اتر کر واپس لوٹنا مشکل ہے۔ میری بھی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔(37)''

''سفید کمرے کے دروازے پر روپیہ'' اس سنگین جملے کی تشریح مندرجہ ذیل انگئی سے ہوتی ہے۔

''سفید کمرے کے دروازے پر روپیہ: بھائیوں نے میرا رشتہ کم سنی میں طے کیا ہے۔ اسی لئے تو چیخ چیخ کر رو رہی ہوں، میرے منہ میں ابھی تک ماں کے دودھ کا ذائقہ ہے۔ اگر مجھ سے کوئی نادانستگی میں غلط ہوا تو مجھ پر جان بوجھ کر وہ کام کرنے کا الزام لگ جائے گا۔(38)''

انگئی کے چند اور نمونے مسئلے کی سنگینی کو مزید اجاگر کرتے ہیں۔

''سر بازار گندم ہے۔ اے لوگو (پشتونو) اسی لئے رو رہی ہوں۔ آگ میں کھڑی ہوں، جل رہی ہوں۔ میں سوچتی ہوں میرا کون ہے۔ ایک ماں ہے۔ اسے بھی چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ سہیلیوں کو بھی جدائی کی آگ میں جلا دوں گی۔ بھائی کہاں ہیں کہ میں اسے بھی سناؤں۔ وہ تو قبر میں قید ہے۔ میں تو عاجز ہوں مجھے راستہ دو کہ ان کی قبر پر حاضری دوں، اے امی میں ان کو جگا دوں اور ان سے کہوں، اے لالا اٹھو۔ میں آپ لوگوں سے الگ ہو رہی ہوں۔ بہنوں کو بھی اس ویران گھر میں چھوڑ رہی ہوں۔ امی اگر بھائی وہاں نہ ہوا تو میں مایوس ہو جاؤں گی۔ اس زندگی سے تو قبر سودمند ہے میرا اگھبرو بھائی کہاں ہے کہ ان کو ساتھ لوں۔ میں تو چچا کے ہاتھوں محتاج ہوں۔

سفید کمرے کے سامنے جھاڑی:

بابا نے وٹے سٹے میں میرا رشتہ طے کیا ہے اب ایک خوبصورت دلہن کو میرے بدلے لایا جائیگا۔ اسے ایک نرم گدے پر بٹھایا جائے گا اور مجھے اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ میرے لئے کتنی مشکل گھڑی ہے۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگ مجھے طعنہ دیں گے کہ میرے پاس نہ تو کوئی ڈھنگ کا گدا ہے اور نہ تکیہ۔ اے میری امی اے میرے ابو میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کروں اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔

سفید کمرے کے آگے دروازے پر انگارہ:

مسمار ہو جائے بوری (لورالائی کا پرانا نام) کا بازار۔ میں مثل مینار و ؤں زار و قطار۔ ظالم بابا نے مجھے فروخت کیا ہے۔ مجھے کیا؟ اب اگر وہ علاقے کا سردار بھی بن جائے۔ میرے دل کے زخم اس سے کب بھر پائیں گے۔(39)

یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انگئی صرف کاکڑ قبیلے کی جغرافیائی حدود تک محدود ہے۔ دیگر پشتون قبائل اس صنف سے مبّرا ہیں۔

انگئی کو چغیان اور سریتی بھی کہتے ہیں۔ سید خیر محمد عارف نے اپنے مطالعے ''پشتو ادب میں خواتین کا حصہ'' میں انگئی کے کچھ اور متون بھی شامل کئے ہیں۔ یہ بات حیران کن ہے کہ خواتین کی یہ فی البدیہہ شاعری، ناخواندہ دیہاتی لڑکیوں کی تخلیق ہے۔ حالات کے رحم و کرم پر یہ لڑکیاں روایتی اور فرسودہ رسموں کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہیں۔ کہیں اسے ولور کے نام سے زندہ درگور کر دیا جاتا ہے کہیں ''سری'' کے نام پر۔ کبھی دشمنی ختم کرنے اور دشمنوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے، قاتل باپ یا بھائی مقتول کے ورثا کو اپنی بہن یا بیٹی رشتے میں دے دیتے ہیں۔ رخصتی والے دن اس لڑکی کی فریاد دور دور تک سنائی دیتی ہے۔

بوری کے خوبصورت سرے پر واقع رعنائیوں میں، میں اپنے بھائی کی راہ تکتی ہوں، وہ ذرا آگے آئیں تا کہ یہ گھٹاٹوپ اندھیرے روشنی میں بدل جائیں۔ مجھے نہ بابا کی ضرورت ہے اور نہ وہ آنے کی زحمت گوارا کریں۔ خدا کرے کہ وہ میری موت کی خبر سن لیں، تا کہ اسے ہمیشہ کے لئے میری شکوؤں اور شکایتوں سے نجات مل جائے(40)

بوری کے دہانے پر واقع زرگلی، کی بوٹیوں میں میری والدہ نے بے پناہ تکالیف سہی ہیں۔ اس ضعیف العمری کے باوجود اس نے میرے کپڑوں کی چکن دوزی پر آنکھوں کی بینائی گنوادی ہے۔ گو کہ بڑے بھائی میرے لئے اچھے اور عمدہ کپڑے لائے ہیں۔ جو بھی والدہ نے میرے لئے چاہا۔ بھائی نے وہ سب کچھ لا کر دیا۔ یہ سب کچھ ان خوش قسمت ماؤں کا نصیب ہے جنہیں قسمت نے لڑکوں سے نوازا ہے۔ میری بدقسمت والدہ کے نصیب میں لڑکیوں کا حصہ آیا ہے۔ جبکہ لڑکیوں کے خیمے سرنگوں رہتے ہیں۔ میرے جانے کے بعد میری بدقسمت امی اکیلی رہ گئی ہے۔ اسے آج تک اپنے بیٹے کی خوشی نصیب نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کی خوشیوں سے نوازے۔ (41)

جب لڑکی کی آہ و فریاد اور بددعائیں حد سے گزر جاتی ہیں تو دولہا کی رشتہ دار عورتیں ''جواب آں غزل'' کے طور پر دلہن کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں:

(اس گلی میں موسلا دھار بارش ہو، بھابی تم کیوں کرز ورز ور سے روتی ہو، یہاں جب تم اپنے آبائی گھر میں تھیں تو بھی ہماری آنکھوں کا نور تھیں ۔تم ہمیں کیوں بددعائیں دیتی ہو۔ہم تو آج تمہارے ہاں مہمان بن کر آئے ہیں اور پھر یہ بھی کہ تمہارے بھائی نے ڈھیر سے نوٹوں کے بل بوتے پر تمہارے ساتھ یہ سلوک کر کے اپنی نقدی بڑھائی ہے (42)

ٹپہ پشتو لوک بیانیہ کی ایک اور صنف ہے جو انتہائی مختصر ہونے کے باوجود انتہائی مؤثر ہے۔اس میں پشتون خواتین محبوب کو وطن پر قربان ہو جانے کی تلقین کرتی ہیں ۔ہم پشتو کے بلوچستانی ٹپہ کی ایسی چند بے مثال مثالیں دیکھتے ہیں۔

اگر میری کالی کالی زلفیں محبوب کے شہید ہونے کی وجہ سے میراث بھی ہو جائیں میں پھر بھی وطن کی جنگ میں اپنے محبوب کو وطن پر مر مٹنے کے لئے جانے سے منع نہیں کروں گی۔

میرے محبوب نے اپنا آپ وطن پر قربان کر دیا ہے۔میں اپنی زلفوں کی تاروں سے اس کا کفن سی رہی ہوں۔

صدا آرہی ہے کہ میرے محبوب کو چار پائی پر ڈال کر لایا جارہا ہے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہے کہ کہیں اس کی پشت پر زخموں کے نشان نہ ہوں۔(43)

یہ لب ولہجہ ایک پشتون عورت کا ہی ہوسکتا ہے۔ایسا ہرگز نہیں ہے کہ محبوب کی شہادت پر اس کا اپنا دل نہ زخمی ہوا ہو۔

تم اب تک خدا جانے کس محفل میں چراغ کی طرح روشنی بانٹتے ہوگے جب کہ میں ہجراں کی سیاہ پوش راتوں میں تنہا جی رہی ہوں۔

وطن کی آزادی کے لئے مر مٹنے کا یہ جذبہ صرف محبوب تک ہی محدود نہیں ہے۔بلوچستان کی پشتون عورت بھی اس جنگ میں پیش پیش ہے۔لنڈئی کے گیتوں میں ایسی ہی ایک مجاہدہ بخت نامے کا ذکر ملتا ہے۔پھر ایک پشتون عورت ہی اس مجاہدہ کو غازی قرار دیتی ہے یہ بلوچستان کے انگریزی عہد کی بات ہے جب ایک پشتون دوشیزہ بخت نامے اپنے پستول کی گولیوں سے ایک سکھ کو ہلاک اور اس کے انگریز آقا کو زخمی کر دیتی ہے۔تو ایک دوسری پشتون دوشیزہ لنڈئی میں اس کی بہادری کو سراہتے ہوئے کہتی ہے:

تم نے سکھ سپاہی کو قتل کر کے اور اس کے گورے آقا
کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر کے
غازی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

اور پھر جب بخت نامے کو گرفتار کر کے مقدمہ چلانے کے لئے مچ جیل لے جایا جارہا تھا تو لنڈئی کی شاعرہ بول پڑتی ہے۔

اس قوم کے افراد کو ڈوب مرنا چاہیے
جس کی ایک بہادر عورت، بخت نامے کو انگریزی سرکار
مچھ جیل لے جارہی ہے (45)

کاکڑ، پشتونوں کا ایک جانا پہچانا قبیلہ ہے۔ جو بلوچستان کے طول و عرض میں آباد ہے۔ مشہور جنگجو بلوس خان اسی قبیلے کا ایک انگریز دشمن فرد تھا۔ اس کے والد کا نام نذر خان تھا۔ بلوس خان، اپنے بھائیوں سمیت کوہ سیری کے مورچوں میں انگریز کے ساتھ بڑی پامردی سے جنگ کرتا رہا۔

انگریز جب بلوس خان کو زیر کرنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنے ایک منصبدار شربت خان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو بلوس خان کو اس کے حوالے کر دے۔

شربت خان نے بلوس خان کی ماں جنتہ آنا کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ اگر وہ اپنے بیٹے کو مجبور کرے کہ وہ پہاڑوں کی کمین گاہوں سے نیچے آ جائیں، تا کہ انگریز کے ساتھ صلح صفائی ہو سکے، تو بلوس خان کو انگریز کچھ بھی نہیں کہیں گے۔

جنتہ آنا کو شربت خان پر اعتماد نہ تھا، لہٰذا اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر شربت خان نے علاقے کے سفید ریش بزرگوں کے ذریعے جنتہ آنا کو ایسا کرنے پر راضی کر لیا اور بلوس خان مع اپنے بھائیوں کے پہاڑی مورچے چھوڑ کر واپس اپنے گاؤں آ گئے۔ مگر انگریزوں نے عہد شکنی کی اور بلوس خان کو گرفتار کر کے مچھ جیل میں قید کر دیا۔

اسیری کی طویل مدت گذرنے کے بعد بلوس خان زندانِ مچھ سے جب رہا ہو کر باہر آیا۔ تو انگریز سامراج کے خلاف دوبارہ برسرِ پیکار رہنے لگا۔ انگریز کافی پریشان تھے۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، بلوس خان اور اس کے ساتھیوں کی جنگی سرگرمیاں پہاڑی مورچے تک محدود تھیں جو انگریز فوج کی دسترس سے باہر تھا۔

بلوس خان کو انگریزی فوج تو شکست نہ دے سکی مگر ایک دن بلوس خان کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ زندگی کی جنگ ہار گیا۔ قبیلے نے بلوس خان کو احترام کے ساتھ دریائے سرخاب کے کنارے قلعہ رشید میں سپردِ خاک کر دیا۔

بلوس خان کی دلیری اور شجاعت کی داستان، کو بلوچستان کے نامعلوم پشتون شاعر نے یوں رقم کیا ہے:

''جنتے انا (بلوس خان کی ماں) کے سارے بیٹوں میں میری نگاہ صرف بلوس خان پر ہے،، مچھ سے تو وہ قیدی بھی اچھے ہیں، جو مچھ کے زندان میں بلوس خان کے ساتھ رہتے ہیں''

کمر میں کالی دستار اور کارتوس کی پیٹی باندھے ہوئے بلوس خان پہاڑ سے نیچے اترا۔

مگر افسوس کہ اس کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا، ورنہ وہ گولی سے ڈرنے والا نہیں تھا، وہ ان چیزوں سے بے نیاز تھا، گورہ فوج کو اپنی گولی کا نشانہ بنانا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ مچھ کے زندان میں دو قیدی ہیں۔ ایک نام لال محمد ہے اور دوسرے کا بلوس خان۔

انگریز لاٹ صاحب، اب آرام کی نیند نہیں سو سکے گا۔ کیونکہ بلوس خان کوستان میں بے خوف وخطر گھوم پھر رہا ہے۔''

بلوچستان کے پشتون رسوم ورواج:

بلوچستان کے پشتون لوک بیانیے کے مثبت پہلو بھی ہیں اور منفی پہلو بھی۔ خصوصاً رسوم ورواج میں یہ دونوں پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً توہمات، اب معاشرے سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اسی طرح بعض رسوم، جو منفی پہلو لئے ہوئے ہیں تیزی سے غائب ہورہی ہیں۔ بعض رسوم بیک وقت منفی بھی ہیں اور بعض پہلوؤں سے مثبت بھی۔ جیسے بدل یا انتقام، آر، طلاق، پردہ، پیغور اور لغاند وغیرہ لیکن بعض رسوم، معاشرے کی اعلیٰ ترین اقدار کی ترجمانی کرتی ہیں اور اپنے جوہر میں مثبت ہیں مثلاً تیوہ (جنگ بندی کا نشان) بول (زبان پر قائم رہنا) اوراشرا (اپنی مدد آپ) قابل ذکر ہیں۔

پشتون رسوم ورواج میں تیوہ دو قبیلوں کے درمیان صلح اور جنگ بندی کا نشان ہے۔ اس نشان کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دونوں قبیلے صلح صفائی کے کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے جنگ بندی کا یہ نشان موجود رہے گا۔ یہ نشان ایک پتھر کی صورت میں ہوتا ہے جسے انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بقول عبدالقدوس درانی:

جنگ بندی کے اس نشان کے رکھنے سے فوری طور پر جنگ بند ہو جاتی ہے اور خلاف ورزی کرنے والے کو بھاری تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔(46)

اگر چہ یہ رسم خیبر پختونخوا کے قبائل میں رائج ہے اور بلوچستان کے پشتونوں میں اس طرح سے اس رسم کا چلن نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں بھی اس کا ذکر ضروری ہے۔ آج جب پوری دنیا اور جنوبی ایشیاء کا پورا علاقہ تصادموں اور خوفناک جھڑپوں میں گھرا ہوا ہے اور اقوام متحدہ کی امن کی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہورہیں، پشتونوں کی یہ رسم اس حوالے سے قابلِ فخر اور اہمیت کی حامل ہے۔

ایک اور پشتون رسم ''بول'' کہیں زیادہ اہم ہے۔ بول یا قول وقرار کی یہ رسم بلوچستان کے کاکڑ قبیلوں میں رائج ہے عبدالقدوس درانی نے اس رسم کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

''پشتون ایک بہادر قوم ہے اور بہادری کی ایک علامت اپنی زبان یعنی اپنے قول کی پاسداری اور وعدے کی پابندی ہے۔ پشتون جب کسی سے کوئی وعدہ کرتا ہے تو اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ پشتون قبائل میں بہت سے ایسے واقعات سننے میں آئے ہیں جہاں ایک بار کئے ہوئے وعدے کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں۔ ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں، جہاں اپنے بیٹے کے قاتل تک کو پناہ دینے کا وعدہ کیا گیا تو اسے آخری وقت تک نبھایا گیا اگر کوئی کسی علاقے میں جرم کر کے دوسرے علاقے میں جا کر پناہ مانگے تو ایسی صورت میں اگر چہ پناہ نہیں دی جاتی لیکن مجرم کو دوسروں کے حوالے بھی نہیں کیا

جاتا۔ وہ مجرم کو کھانا وغیرہ کھلا کر اور پھر اپنے کچھ لوگ اس کے ساتھ کر کے اسے بخیریت اپنے علاقے سے گزارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جو حفاظت کے لئے اس کے ساتھ جاتے ہیں "بدرکہ یا بدرگہ" کہا جاتا ہے۔ اگر مہمان اپنے ساتھ کسی خاتون کو لے کر آجائے اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ اس عورت کو اغوا کر کے لے آیا ہے تو ایسی صورت میں عورت کے رشتہ داروں کو اطلاع کر دی جاتی ہے۔ مہمان بدستور پناہ میں رہتا ہے۔ البتہ عورت گاؤں کے کسی معتبر کے گھر میں رکھی جاتی ہے۔ رشتہ داروں کے آجانے پر گاؤں کے معتبرین جرگہ کرتے ہیں۔ اس طرح جرگہ میں فریقین کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ فیصلہ ہو جانے پر میزبان گاؤں والے ایک پر تکلف دعوت کا بندوبست کرتے ہیں اور اس طرح تمام رنجشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر فریقین میں سے ایک کمزور ہو اور کوئی جرم کرنے کے بعد دوسرے فریق کے اثر و رسوخ اور حیثیت کو دیکھتے ہوئے اس سے خوفزدہ ہو تو دُنبہ لے جا کر دوسرے کے گھر کے دروازے کے سامنے ذبح کر دیا جاتا ہے۔ دنبہ لے جاتے وقت وہ گاؤں کے سیدوں اور ملاؤں کو ساتھ لے جاتا ہے۔ لوگ دنبہ ذبح کرنے کے بعد دوسرے فریق کے پاس مجرم کو لے کر جاتے ہیں۔ اور اسے ان چیزوں کا واسطہ دیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ قرآن شریف بھی ساتھ لے جاتے ہیں ایسی صورت میں اکثر طاقتور فریق جرگہ کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی بدقسمتی سے طاقتور شخص اپنی ضد پر قائم رہے اور یہ تمام باتیں بے اثر ثابت ہوں تو بدی قائم رہتی ہے اور سال ہا سال تک فریقین ایک دوسرے کو قتل کر کے بدلہ لیتے رہتے ہیں۔ یوں بھی ہوا ہے کہ گھرانے کے گھرانے انتقام کی آگ میں جل کر تباہ ہو گئے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کمزور فریق انتقام کے خوف سے مجبور ہو کر اپنا علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ (47)

ایک اور خوبصورت رسم اشر یا اپنی مدد آپ، بلوچستان کے کم و بیش تمام پشتون قبائل میں صدیوں سے رائج ہے اور باہمی یا اپنی مدد آپ کا یہ تصور آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ترقی کا ایک سنہری اصول تصور کیا جاتا ہے اور مختلف انداز میں پشتون معاشرے کا ہر فرد اپنے جوہر میں ایک دوسرے سے جڑا ہوتا ہے۔ اشر کے تحت کوئی فرد اکیلا یا تنہا نہیں ہوتا۔ اجتماعیت اشر کی روح ہے اور یہ بلوچستان کے پشتونوں کے لوک بیانیے کا ایک اہم جزو ہے۔ بلوچستان کے پشتون معاشرے کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے کہ وہ آج بھی۔۔۔ اشر کے دستور کے تحت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ فصل کی کٹائی کا وقت قریب آتے ہی گاؤں کے تمام افراد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی فصل کاٹتے ہیں۔ مکان بنانے کی باری آئے تو سب مل کر مکان تعمیر کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت یا شادی کے موقع پر بھی، سب نہ صرف ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا کر پوری طرح شریک ہوتے بلکہ ایک دوسرے کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ (48) اشر کے دستور کے تحت ہر فرد یکساں طور پر قابل احترام ہے خواہ وہ گاؤں کا خان ہو یا عام آدمی۔

ہزارگی کا لوک بیانیہ:

ہزارہ شہیدوں میں حسین علی یوسفی بھی شامل ہیں ۔جنہیں 26 جنوری 2009ء کو شہید کیا گیا۔اس وقت ان کی عمر صرف انچاس برس تھی ۔ ان کی عظیم علمی اور قابل قدر تصنیف ''فرہنگ ادبیات، ہزارگی۔ضرب الامثال و محاورات'' ہمارے سامنے ہے یہ کتاب بلوچستان میں مقیم ہزارہ برادری کا زبردست لوک بیانیہ ہے۔ ہزارگی زبان اوراس کے علم وادب سے بھی انہیں بہت شغف تھا۔ وہ ہزارگی تھیٹر سے بھی وابستہ رہے۔انہوں نے 30 عدد کلاسیکی ہزارہ گی ڈرامے اور خاکے بھی تخلیق کئے ۔انہوں نے ہزارگی ڈکشنری اور ہزارگی تنقیدی نظم بھی شائع کیں ۔ان کے انتقال کے بعد فروری 2010ء میں آزرگی اکیڈمی کوئٹہ سے "فرہنگ ادبیات ہزارہ گی، ضرب الامثل ومحاورات" شائع ہوئی ۔محمد علی تورانی نے ''ہزارہ گی زبان کی خصوصیات اوراس کے ضرب الامثال'' کے عنوان سے اپنے تفصیلی تعارف کے ساتھ، اس فرہنگ کو، آزرگی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع کیا ہے۔محمد علی تورانی کے الفاظ میں ہزارگی زبان چونکہ زبانوں کے دو خاندانوں ہند یورپی اور یورال التائی سے مل کر بنی ہے اس لئے زبانوں کے دونوں خاندانوں نے باہم مل کر اس زبان کو ایک اور روپ دے دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس زبان کی صوت، ساخت، معنی اور دیگر ترکیبات ان زبانوں سے یکسر مختلف ہیں جن کی ترکیب سے یہ زبان وجود میں آئی ہے۔لہٰذا مذکورہ خصوصیات کے پیش نظر ہزارگی زبان کو فارسی کا ایک لہجہ قرار دینا ہرگز درست نہیں ۔مگر اسے کیا کہیے کہ مختلف وجوہ یا لاعلمی کی بنا پر ہزارگی زبان کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنے کی بجائے اس زبان کو محض فارسی کا ایک لہجہ قرار دینے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

ہزارہ لوک دانش:

ہزارہ لوک دانش دوسری زبانوں کی طرح ہزارگی زبان بھی اپنے بولنے والوں کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی سطح کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔اس کی واضح مثال ہزارگی ضرب الامثال، محاورات، دو بیتی، چار بیتی، لوک داستانیں اور تحتہ وغیرہ ہیں۔ (53)

محمد علی تورانی مزید لکھتے ہیں:

> ''کسی زبان کی ضرب الامثال اس کے بولنے والوں کے تاریخی واقعات 'زندگی کی مختلف سطح کے تجربات اور اجتماعی دانش کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔جنہیں لسانی گروہ بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس گروہ کے افراد اپنی روزمرہ کی باتوں میں وزن پیدا کرنے کے لئے اکثر ضرب الامثال کا سہارا لیتے ہیں۔دوسری زبانوں کی طرح ہزارگی زبان میں بھی ضرب الامثال بڑی کثرت سے ملتے ہیں جو اس زبان کے بولنے والوں کی اجتماعی دانش و تجربات کو اپنے

اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ہزارگی ضرب الامثال کو حروف کی صورت میں صفحات پر منتقل کرنے کے لئے بعض ہزارہ اہل قلم نے اپنی بساط کے مطابق کاوشیں تو کی ہیں اور وہ منظر عام پر بھی آئی ہیں لیکن اس حوالے سے شہید حسین علی یوسفی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے دوسرے لکھنے والوں کی طرح ہزارگی ضرب الامثال کو فارسی منطق کے مطابق نہیں لکھا ہے بلکہ اس حوالے سے ہزارگی زبان کے مزاج اور خصوصیات ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔(54)

یہ قوم اور اس کی زبان ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کے لوک بیانیہ کا آغاز بُدھ راہبوں سے ہوتا ہے۔ اس حوالے سے محمد علی تورانی کے علمی انکشافات انتہائی قیمتی ہیں ان کے بیان کے مطابق:

''ہزارہ قوم کی تاریخ پر گہری نظر ڈالنے سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ یہ قوم نہ صرف فارسوں اور تاجکوں کے ساتھ مستقل رابطے میں رہی ہے بلکہ سرزمین ہزارستان میں بدھ مت کے راہ پانے سے بامیان صدیوں سے ہندی راہبوں کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ راہبوں نے بدھ مت کی تبلیغ کے لئے سنسکرت زبان ہی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔ جس کی وجہ سے سنسکرت یا ہندایرانی زبانوں کا اثر ہزارہ قوم کی زبان پر پڑنا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ ترکوں اور مغلوں نے جنوبی ایشیاء پر صدیوں تک حکمرانی کی ہے اور ساتھ ہی ہزارہ قوم کے اکثر افراد مزدوری اور ملازمت کے لئے جنوبی ایشیاء کا رخ کرتے آئے ہیں۔ ایسے میں ہزارہ قوم کے افراد نے نہ صرف ہندی اور اردو کا اثر قبول کیا ہے بلکہ ترکی اور مغلی زبانوں نے بھی ہندی پر گہرا اثر ڈالا ہے جو اردو زبان کے ظہور پر منتج ہے۔ بہر حال ہزارہ قوم اور جنوبی ایشیائیوں کے درمیان معاشرتی روابط کے باعث نہ صرف ہزارگی زبان کے مصمتے اور مصوتے ہند آریائی زبانوں سے مطابقت رکھتے ہیں بلکہ اردو اور ہندی کی طرح ہزارگی زبان بھی محاورات اور ضرب الامثال سے مالا مال ہے جس کی مثال فارسی میں کم ہی ملتی ہے۔(55)

فرہنگ ادبیات ہزارگی چار زبانوں میں ہے۔ ہزارگی، انگریزی، اردو اور فارسی۔ اصل ضرب الامثال اور محاورے ہزارگی میں ہیں۔ جن کا انگریزی متن لیکچرار عبدالرحیم چنگیزی، اردو متن خود حسین علی یوسفی اور محمد علی تورانی اور فارسی /دری متن معلم علی کریمی نے کیا۔ اردو ترجمے کی ذمہ داری جناب محمد علی تورانی کو سونپی گئی تھی اور ان کے اپنے لفظوں میں کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے، جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو اس میں ضرب الامثال کے علاوہ بہت سے محاورات بھی نظر سے گزرے جن کا خود شہید یوسفی نے ترجمہ کر رکھا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہزارگی ضرب الا مثال اور محاورات کا ترجمہ لفظی اور منطقی ہوا تھا۔ جب کتاب کو میں نے ترجمہ کرنے کی ابتدا کی تو ہمارے پیش نظر یہ بات تھی کہ جس قدر ممکن ہو سکے، ضرب الامثال کے متبادل اردو زبان میں تلاش کئے جائیں اور اس حوالے سے میں

کسی قدر کامیاب بھی رہا البتہ یہ ضرور ہوا کہ میں نے لفظی ترجمے کو حذف کر کے متبادل اردو ضرب الامثال شامل کرنے کے علاوہ جن کے متبادل نہ ملے، اپنی دانست کے مطابق ان کا اردو ترجمہ کیا۔ (56)

یہاں بزرگ لوک دانش کے اظہار کے لئے ہم نے جناب تورانی کے اردو متن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جن پر مزید کام اپنی حیات میں ہی یوسفی مرحوم نے کیا تھا اور جس کے نتیجے میں جناب تورانی کے بہت سے تراجم کتاب سے حذف ہو گئے اور لفظی تراجم دوبارہ کتاب میں شامل ہو گئے۔تا کہ لوگوں کو ہزارگی زبان کی ساخت اور خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ ادراک ہو پائے۔اب ہم ہزارگی ضرب الامثال کے اردو متن کی طرف آتے ہیں۔ یہ ہزارگی لوک دانش کا وہ خزانہ ہے جو بہت حد تک خود ہزارگی زبان تک محدود ہے۔اور اس کا کوئی نعم البدل اردو یا دیگر زبانوں میں نہیں ہے۔

جھوٹ کی منزل مختصر ہے
یعنی جھوٹ کی ناؤ نہیں چلتی

☆ جس گھر میں چیونٹی نے جگہ بنالی وہاں مالک کا جینا دوبھر ہو گیا۔
دوسرے لفظوں میں، چیونٹی کسی کی زندگی بھی حقیر بنا سکتی ہے۔اس کا مزید مطلب یہ ہوا کہ حقیر چیزوں کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

☆ باغ سے زیادہ اس کے پھل میں مٹھاس ہے یعنی انسان ہمیشہ باطن کے بجائے ظاہری چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔

☆ ملاّ کے آنے سے بلاّ دم دبا کر بھاگ گیا یعنی سیر کو سوا سیر

☆ مُردے کا ایک راستہ متعین ہے جبکہ زندہ کے ہزار راستے ہیں۔

☆ ہزارگی محاورے کے مطابق جس مرد کی دو بیویاں ہوں وہ دو مذاہب کا پیروکار بن جاتا ہے۔اردو محاورے کے مطابق اسے یوں کہیں گے کہ دو جورو کا خصم، چوسر کا پانسہ

☆ میٹھے کے بعد کڑوے کے بعد میٹھا یعنی کبھی کا دن بڑا کبھی کی رات

☆ پیچھے کلہاڑی اور سامنے دیوار یعنی آگے کنواں، پیچھے کھائی

☆ ظالم کے آگے سے اور خچر کے پیچھے سے مت گزرنا یعنی حاکم کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے ڈرنا چاہئے۔اسے شعر کے پیرائے میں یوں کہا گیا ہے۔

افسر کی اگاڑی سے ذرا بچ کے رہو دوست
اس میں بھی تو گھوڑے کی پچھاڑی کا اثر ہے

☆ قندھار کی آمدنی سے اپنے روزگار میں مصروف ہونا بہتر ہے۔گویا گھر کی روکھی سوکھی، پردیس کے پلاؤ سے

بہتر ہے۔

☆ مجھے اجنبی سے ڈر لگتا ہے نہ پاگلوں سے بلکہ گھر کے اندر سے ہی ڈر لگتا ہے۔ اسے یوں کہا گیا ہے کہ جانتا چور گاؤں اجاڑے۔ اردو کا ایک مشہور محاورہ ہے۔ جس کے پیچھے ہندوستان کی ایک قدیم داستان پوشیدہ ہے یعنی گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔

☆ مجھے نہ بکری کے لے جانے سے کوئی سروکار ہے، نہ ہی بھیڑ کے لانے سے دلچسپی یعنی اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنا۔

☆ محلے کے کتے آپس میں چپقلش رکھتے ہیں لیکن فقیر کے خلاف سب متحد ہیں۔ اس لوک دانش کی مزید تشریح یوں کی گئی کہ گھر میں آپس کی پھوٹ کے باوجود دشمن کے خلاف متحد ہونا۔

☆ ہندو کے گھر میں گائے کا گوشت بھیجنا۔

☆ کوہ قاف کو جانے میں پری کو کیا مشکل یعنی ہنر مند بھوکا نہیں مرتا۔

☆ بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر حج کا فریضہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

☆ بندوق سے بچ گیا تو دام سے نہیں بچے، اس کے اردو کا مترادف محاورہ ہے کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

☆ مہمان کے گھوڑے۔

☆ دو بیلوں کی لڑائی میں جھاڑیاں ہی تلف ہوتی ہیں۔

☆ جنت میں اگر آگ نہیں تو مجھے نہیں جانا۔

☆ مفلس کے ہاتھ میں گندم کی روٹی تو کیا جو کی روٹی بھی عجیب لگتی ہے۔ اس کے مفہوم کا مشہور محاورہ دیا گیا ہے۔

غربت تیرے تین نام۔ جھوٹا، پاجی، بے ایمان۔

☆ درد نہیں، اجل مار دیتا ہے یعنی موت کا ایک دن مقرر ہے۔

☆ ملنگ کو رہنے کی جگہ دو تو پوری جائیداد پر دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ دیا ہاتھ، کھانے لگا ساتھ۔

☆ جاڑے کی دھوپ اور بادشاہ کی ہنسی پر بھروسہ مت کرو یعنی جاڑے میں کچھ دن موسم گرم ہونے اور بادشاہ کے نرم رویے کو دیکھ کر خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

☆ گھی گھی میں ضم ہو جاتا ہے۔

☆ داڑھی کھیلنے کے لئے نہیں ہوتی یعنی جتنی زیادہ شہرت، اتنی زیادہ ذمہ داری۔

ہزارہ داستانوں کا لوک بیانیہ:

ہزارگی میں لوک داستانوں پر بھی کام کیا جا رہا ہے۔ ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ اسے اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام بھی ہو رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں ''کوہ قاف کے اس پار'' کے عنوان سے ہزارہ قبائل کی عوامی داستانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس کی تدوین محمد جواد خاوری اور ترجمے کا کام پروفیسر شرافت عباس ناز نے کیا ہے اور اسے ادارہ فروغ تعلیم و ادبیات بلوچستان، کوئٹہ نے 2010ء میں شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ کل بارہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ داستانیں ہزارہ قبائل میں ہزاروں برسوں سے سینہ بہ سینہ آج کی نسلوں کو منتقل ہوئی ہیں۔ مترجم کے لفظوں میں داستانیں مظاہر فطرت و مافوق الفطرت اور اپنے متون کے ذریعہ انسانوں کے اندر کی تمام کیفیتوں، ادہام، خواہشات، آرزوؤں، تمناؤں، خوابوں اور اندیشوں کو بھی پورے رسان سے مصور کرتی ہیں۔ مثبت اور منفی قوتوں کی ازلی آویزش اور اس کے پس منظر سے ابھرنے والی ہمہ گیر اخلاقیات، سبق آموزی اور زندگی گزارنے کا ہنر ایسی لازوال دولتیں ہیں جنہیں داستان گوؤں اور کہانی کاروں نے انسانی تاریخ کے طویل سفر میں بڑی دل سوزی سے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو داستانیں وہ بنیادی سرمایہ ہیں جو انسانی تہذیب و تمدن کی رنگا رنگ تاریخ مرتب کرتی ہیں۔''

کتاب کی پہلی داستان ''بخت بیدار 'عقل خفتہ'' اور ''نیکی کر دریا میں ڈال'' اس مجموعے کی آخری داستان ہے جنہیں قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ صدیوں پرانے اس لوک بیانیہ کا ایک مجموعی تاثر لیا جا سکے اور ان خوابوں اور آدرشوں کا اندازہ لگایا جا سکے اور ایک بھرپور انسانی معاشرے کی ترجمانی ہو سکے۔

بیدار بخت، عقل خفتہ:

پرانے زمانے میں خدا کی اسی زمین پر کہیں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک امیر اور دولت مند تھا اور دوسرا غریب و مفلس غریب بھائی کی روزی کا دارومدار ایک چھوٹے سے کھیت پر تھا جو دولت مند بھائی کی وسیع اراضی سے ملا ہوا تھا اور وہ بھی پانی کی قلت کا شکار۔ بڑے بھائی کی زمینوں کی وجہ سے اس کھیت کو پوری فصل کے دوران بمشکل ایک رات پانی ملتا تھا۔ ایک رات جب اس کی پانی کی باری تھی، وہ کھیت پر پہنچا، کچھ دیر زمین کے جوتنے اور بیلچہ چلانے کے بعد اس نے پانی کا رخ اپنی زمین کی طرف موڑا اور ستانے کے لئے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں اپنا چھوٹا سا کھیت اور اس کی فصل میں صرف ایک رات پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ رات خاصی تاریک تھی اور پانی بہنے کی آواز اس کے تھکے ہوئے بدن اور سوچ میں ڈوبے ہوئے ذہن کو لوریاں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رفتہ رفتہ بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جب بیدار ہوا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ کئی گھنٹے سوتا رہا ہے۔ خود کو اس غفلت اور دیر تک سونے پر نفرین کرنے لگا۔ ایک ہی رات تو پانی لگانے کی آتی تھی اور اس کے بھی کئی گھنٹے نیند کی نذر ہو گئے تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور بیلچہ سنبھال کر تیزی سے پانی کی

کیاریوں کو تقسیم کرنے لگا۔

اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو بیلچے سے پانی کا رخ اس کے بھائی کے کھیتوں کی طرف موڑ رہا تھا۔غریب کسان کو سخت غصہ آیا۔بیلچے کو تلوار کی طرح تول کر آگے بڑھا۔''کون ہوتم'' کیوں میرے کھیت کا پانی لے رہے ہو؟

''زیادہ غصہ مت دکھاؤ، میں تمھارے بھائی کا مقدر ہوں۔''اس شخص نے سرد مہری سے جواب دیا اور بدستور اپنا کام کرتا رہا۔غریب دہقان کو ایک جھٹکا لگا۔اس نے آج تک ایسی بات نہ تو سنی تھی اور نہ دیکھی تھی۔وہ سوچ میں پڑ گیا۔اچھا تو یہ ہے میرے بھائی کی دولت مندی کا راز۔اصل میں یہ اس کا مقدر ہے جو ہر حالت میں اس کی مدد کرتا ہے حتیٰ کہ آدھی رات کو بھی اس کے لئے کام کر رہا ہے۔تو پھر میرا نصیب کہاں ہے؟ کہاں ہے میرا مقدر؟ اس نے خود کلامی سے باہر آ کر اس شخص سے دریافت کیا۔

''تمہارا مقدر۔۔تمھارا مقدر تو اس وقت سو رہا تھا۔۔اگر تم چاہتے ہو کہ اس غربت سے نجات حاصل کرو اور دولت مند بنو تو جاؤ اپنے مقدر کو جگاؤ۔

''مگر میں کہاں جاؤں؟ کہاں سو رہا ہے میرا مقدر؟''

''کوہ قاف کے اس پار۔''اجنبی شخص نے دور اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا اور جھٹ پٹے میں غائب ہو گیا۔

غریب دہقان نے اپنا بیلچہ ایک طرف پھینکا اور اپنے مقدر کو بیدار کرنے کے لئے کوہ قاف کی سمت روانہ ہو گیا۔منزلیں طے کرتا ہوا وہ کوہ قاف کی سمت بڑھتا چلا جا رہا تھا۔اس کے لئے نہ دن دن تھا اور نہ رات رات، آبادیاں، ویرانے، جنگل۔۔وہ گزرتا جا رہا تھا۔اچانک ایک بھیڑیے نے اس کا راستہ روک لیا۔ "کہاں جا رہے ہو اتنی تیزی سے۔''

''اپنے مقدر کو بیدار کرنے۔۔وہ ادھر سو رہا ہے،کوہ قاف کے پیچھے۔''دہقان نے حدِ نظر تک دیکھتے ہوئے انگلی کے اشارے سے،بھیڑیے کو بتایا۔

''اچھا!'' بھیڑیے نے ایسی حیرت ناک بات کب سنی تھی۔''جاؤ ضرور جاؤ۔۔اپنے مقدر کو جگاؤ۔لیکن ہاں،میرا ابھی ایک کام ہے۔میرے سر میں مستقل درد رہتا ہے اور اس درد نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔میرے سر درد کا علاج دریافت کرنا۔''

کسان نے بھڑیے کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔چلتے چلتے وہ ایک باغ کے احاطے کے قریب پہنچا۔سوچا، کچھ دیر آرام کر لے، چنانچہ باغ کی دیوار کے سائے میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔باغ کے مالک نے جب دیکھا تو احوال پرسی کے لئے اس کے پاس آیا۔سلام دُعا کے بعد کسان نے اسے

سفر کی وجہ اور اپنی منزل کے بارے میں بتایا۔ باغ کے مالک نے بھی اس سے ایک فرمائش کر دی۔ کہنے لگا ''میں مدتوں سے اس باغ پر محنت کر رہا ہوں، لیکن ساری کوششوں کے باوجود یہ سرسبز نہیں ہوتا آج تک ان درختوں نے پھل نہیں دیا۔ تم میرا ایک کام ضرور کرنا۔۔ جب کوہ قاف پہنچو تو اپنے مقدر سے میرے باغ کے بارے میں بھی دریافت کرنا۔ آخر یہ درخت کیوں سرسبز نہیں ہوتے؟ ان پر پھل کیوں نہیں آتا؟ دیکھو، بھول مت جانا"۔

کسان نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے مقدر سے اس کے باغ کے بارے میں ضرور سوال کرے گا۔ پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔

وہ پہاڑ اور بیابان عبور کرتا ہوا کوہ قاف کی جانب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر اسے آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک عظیم الشان شہر اس کے سامنے تھا۔ جب شہر کے دروازے پر پہنچا تو اچانک کسی طرف سے سپاہی نمودار ہوئے اور اسے گرفتار کر لیا۔ بے گناہ دہقان اپنی گرفتاری پر احتجاج کرنے لگا ''میں تو مسافر ہوں، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھے کیوں گرفتار کر رہے ہو؟''

''گھبراؤ نہیں پردیسی! اگر تم بے گناہ پائے گئے تو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔ اس وقت ہمارا ملک حالت جنگ میں ہے غنیم کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ شہر میں داخل ہونے والے ہر اجنبی کو اپنے سلطان کے سامنے پیش کریں"ایک سپاہی نے کہا۔

سپاہیوں نے اسے سلطان کے سامنے پیش کیا۔ سلطان نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آرہا ہے؟ اور کہاں کا قصد ہے؟ دہقان نے اسے اپنے بارے میں بتایا اور اسے سفر کے مقصد کے بارے میں بھی۔

سلطان نے کہا۔''یہ بات ہے تو تمہیں ہمارا بھی ایک کام کرنا ہوگا۔ ہماری سلطنت ایک مدت سے دشمنوں کی زد میں ہے۔ جب بھی جنگ ہوتی ہے۔ ہماری فوج شکست کھا جاتی ہے۔ تم جب اپنی منزل پر پہنچو تو اپنے مقدر سے ہماری شکست کی وجہ ضرور دریافت کرنا۔''

دہقان نے وعدہ کر لیا اور سلطان سے رخصت ہو کر کوہ قاف کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ کٹھن اور دور دراز تھا۔ لیکن دہقان بھی دُھن کا پکا تھا۔ اس کے لئے نہ دن دن تھا نہ رات رات۔ وہ اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا۔ پہاڑ، میدان، جنگل، بیابان، غرض منزل در منزل کوچ کرتا آخر کار وہ کوہ قاف کے پیچھے پہنچ گیا۔

دیکھتا کیا ہے کہ عجیب دنیا ہے۔ نیلا آسمان، سرسبز اور تازہ گھاس پر ایک شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے۔ جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ زندگی اپنی پوری شادابی سے بہار دکھا رہی ہے۔ زرد پتوں، یا مرجھائے ہوئے پھولوں کا نام ونشان تک نہیں۔ چشموں کی روانی فضا کو مسحور کیے ہوئے ہے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دور دور تک نہ آدم نہ آدم زاد۔ اس نے اپنے مقدر کی تلاش شروع کر دی اور بالآخر ایک کنویں تک پہنچ گیا۔ جھانک کر دیکھا تو کنوئیں کی تہہ میں اس کا مقدر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی آواز کنوئیں سے باہر تک آرہی تھی۔ دہقان نے اپنا منہ

کنوئیں میں ڈالا اور پوری قوت سے اپنے مقدر کو آوازیں دینے لگا۔ الغرض اس کی چیخ و پکار سے مقدر انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھا اور ایک ہی جست میں کنوئیں سے باہر آ گیا۔ دہقان نے گلوں شکووں کا پٹارا کھول دیا۔ مقدر خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر ایک انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ''جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ اس پر افسوس مت کرو۔ آئندہ کے بارے میں سوچو۔ یہ سوچو کہ تمہیں آئندہ کیا کرنا چاہیے۔ بس اب جاؤ اور بےفکر رہو۔ اب میں بیدار ہو گیا ہوں۔ جاؤ کامیابی تمہاری منتظر ہے"۔

دہقان یہ سنتے ہی اتنا خوش ہوا کہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر اپنے کھیت تک پہنچ جائے اور اپنے بھائی کو اپنی خوش بختی دکھائے۔ لیکن اسے فوراً ہی ان لوگوں کا بھی خیال آیا۔ جنھوں نے راستے میں فرمائشیں کی تھیں۔ بھیڑیا، باغ بان اور سلطان۔۔۔ یہ سب تو راستے میں میرے منتظر ہوں گے۔ اس نے سوچا اور ایک مرتبہ پھر اپنے مقدر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے تینوں کے سوالات بیان کیے۔ مقدر نے باری باری ہر سوال کا جواب اسے بتا دیا۔ اب دہقان خوش وخرم واپس روانہ ہوا۔

واپسی کا سفر پہلے کے مقابلے میں بڑا مسرور کن تھا۔ دہقان جب جنگ زدہ مملکت میں پہنچا تو بلا تاخیر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور نہایت عزت و احترام سے اسے اپنے قریب جگہ دی۔ پھر حکم دیا کہ اس کی شایان شان مہمان نوازی کی جائے۔ اسی وقت شاہی غلاموں اور کنیزوں نے دہقان کی خدمت شروع کر دی۔ شاہی دستر خوان بچھا دیا گیا۔ دہقان نے اس سے پہلے ایسی نعمتیں کہاں دیکھی تھیں۔ دل میں کہنے لگا، واقعی میرا مقدر بیدار ہو گیا ہے۔

جب طعام سے فارغ ہوئے اور دستر خوان بڑھایا جا چکا تو سلطان نے کہا ''ہاں تو میرے عزیز، اب بتاؤ کہ تمھاری مقدر سے ملاقات کیسی رہی؟ اسے جگانے میں کامیاب بھی ہوئے یا نہیں؟"

''کیوں نہیں، وہ نہ صرف بیدار ہو گیا، بلکہ میں اس سے آپ کے مسئلے کے بارے میں دریافت کر چکا ہوں۔''

''اچھا تو پھر کیا بتایا اس نے۔'' سلطان نے بےصبری سے پوچھا۔

''اس نے جو بتایا۔ وہ سب کے سامنے نہیں بتایا جا سکتا''۔ دہقان نے آہستہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سلطان نے تخلیے کا حکم دیا۔ جب تمام لوگ چلے گئے اور سلطان اور دہقان اکیلے رہ گئے تو دہقان نے کہا، ''آپ کی سلطنت ہمیشہ قائم رہے۔ آپ کی فوج کو ہر دفعہ جنگ میں شکست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایک عورت ہیں۔''

دہقان کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی سلطان کا سر جھک گیا وہ بالکل خاموش تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا اور کہا۔ ''آج تک اس راز سے کوئی واقف نہیں تھا۔ تم واحد شخص ہو جسے یہ بات پتا چلی ہے۔ تم مجھ سے شادی

کرلو۔ میری جگہ تخت پر بیٹھو، یہ سلطنت، یہ تاج وتخت یہ سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔''

دہقان نے دل میں سوچا، میرا تو مقدر بیدار ہو چکا ہے، میں کیوں بادشاہت کے چکر میں پڑوں۔ پس اس نے جواب دیا۔''میں آپ کی تجویز قبول نہیں کر سکتا۔ ایک شخص، جس کا مقدر جاگ اٹھا ہو، بادشاہی اس کے کس کام کی۔''

سلطان نے بہت اصرار کیا۔ لیکن بے فائدہ۔ دہقان کے سر پر تو جلد از جلد اپنے کھیت تک پہنچنے کی دُھن سوار تھی۔ وہاں سے روانہ ہوا اور منزل منزل کوچ کرتا آخر سوکھے سے باغ تک پہنچ گیا۔ باغ بان نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے مقدر کی بیداری کے بارے میں پوچھا۔ دہقان نے اسے مقدر سے ملاقات کی تفصیل بتائی اور پھر خوش خبری سنائی کہ اس کے باغ کے سر سبز نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے چاروں کونوں میں ایک عظیم خزانہ سونے کے چار مٹکوں کی شکل میں دفن ہے۔ جب تک ان مٹکوں کو نکالا نہیں جائے گا تمھارا باغ سر سبز نہیں ہوگا۔''

باغ بان نے کہا۔''اے مہربان! اب تک اس راز سے تمھارے اور میرے علاوہ کوئی واقف نہیں۔ میں اور تم مل کر اس خزانے کو نکالتے ہیں اور جو کچھ برآمد ہو اُس میں سے آدھا آدھا تقسیم کریں گے۔
دہقان نے اپنے آپ سے کہا کہ عجیب سادہ لوح ہے میرا ابھی نیا نیا مقدر جاگا ہے اور یہ مجھے خزانے کی تلاش کے لئے کہہ رہا ہے میں اور کھدائی۔ ہونہہ!
باغ بان نے، جو اس کے جواب کا منتظر تھا، پوچھا،''تو پھر کیا سوچا تم نے؟''
''تمہیں پتا ہے، میرا مقدر جاگ اٹھا ہے یہ کام تم اپنے جیسے کسی شخص کے لئے رکھو۔ بھلا مجھ جیسے خوش نصیب کو، جس کا نیا نیا مقدر بیدار ہوا ہو، ایسی باتوں سے کیا کام۔۔ یہ خزانہ پورے کا پورا تمھارا۔''

دہقان اس وقت خود پر بے حد غرور کر رہا تھا۔ آخر اس کا مقدر جو بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے باغ بان کو خدا حافظ کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا اور جلد ہی اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں بھیڑیے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی وقت اس نے بھیڑیے کی آواز سنی،''تمہیں دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے تمہاری بو کافی دور سے سونگھ لی تھی۔ سناؤ اپنے مقدر سے ملے یا نہیں؟''

دہقان نے اپنا سفر نامہ اوّل سے آخر تک بھیڑیئے کے گوش گذار کر دیا۔ سلطان سے ملاقات، اس کی طرف سے شادی اور تخت وتاج کی پیش کش، باغ بان کی طرف سے دفینے میں شراکت، غرض ہر چیز تفصیل سے بیان کر دی۔''لیکن تم نے میرے سر درد کا علاج بھی دریافت کیا اپنے مقدر سے یا نہیں؟ بھیڑیا بے صبری سے بولا۔
''ہاں ہاں کیوں نہیں میرے مقدر نے تمھارے سر درد کا علاج بھی بتایا ہے۔''
''کیا بتایا ہے؟''

''اس نے بتایا ہے کہ تمہارے سر کا درد صرف اس صورت میں ختم ہو سکتا ہے، جب تم کسی احمق شخص کا مغز کھالو۔''

یہ سنتے ہی بھیڑیے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔'' بھلا تم سے بڑا احمق بھی دنیا میں کوئی ہو سکتا ہے؟'' تختِ شاہی تمہارے قدموں میں تھا۔ تم نے اسے ٹھکرا دیا۔ ملکہ تم سے شادی پر آمادہ تھی، تم نے اسے دھتکار دیا۔ بے حساب خزانہ تمہیں پیش کیا گیا، تم نے لات مار دی۔ مقدر کی بیداری اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے؟ تمہارا مقدر تو جاگ اٹھا تھا لیکن تمہاری عقل اب تک بیدار نہیں ہوئی۔ تم واقعی ایک احمق آدمی ہو۔'' یہ کہہ کر بھیڑیا تیزی سے جھپٹا اور ایک ہی حملہ میں دہقان کو زمین بوس کر دیا۔ پھر اس کا سر چیر کر مغز نکالا اور کھا گیا۔

بھیڑیئے کے سر درد کی شکایت رفع ہو گئی تھی۔

گل دختر:

سال ہا سال پہلے کا ذکر ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک آبادی میں ایک بڈھا اور بڑھیا اپنے خاندان کے ساتھ جیسے تیسے زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ غربت اور افلاس اور اس پر ان کی سات اولادیں اور وہ بھی سب کی سب بیٹیاں۔ سات بیٹیاں اور بوڑھے ماں باپ، قدرت کی طرف سے ان کے لئے رزق کا عجیب و غریب بندوبست کیا گیا تھا اور وہ اس طرح کہ روزانہ ان کے گھر کے روشن دان سے ہر شخص کے لئے ایک ایک بُسراق (ہزارہ جات کی مخصوص روغنی ٹکیہ) نازل ہوتی تھی۔ وہ اس پر گزارہ کرتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے ان کا پیٹ کہاں بھرتا تھا؟

چنانچہ ایک دن بڑھیا نے اپنے شوہر سے کہا'' ہم دونوں اب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں ان سات لڑکیوں کا بوجھ کب تک اٹھائیں گے اگر کسی طرح یہ اپنے گھروں کی ہو جائیں تو ہمیں بھوک سے نجات مل جائیگی اور ان کا حصے کے بسراق ہم دونوں مل کر کھائیں گے۔ تم سوچو اب اس آخری عمر میں تو ہم کچھ آرام سے زندگی گزار لیں۔ ان ساتوں نے تو ہماری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔'' بڑھیا کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

بڈھے اور بڑھیا نے اس مسئلے پر کافی غور و خوض کیا اور آخر کار ایک منصوبہ تیار کر ہی لیا۔ ایک دن صبح ہی صبح بڈھے نے ساتوں لڑکیوں کو جمع کیا اور ان سے کہنے لگا۔

'' آج تو میرا دل چاکہ کھانے کو چاہ رہا ہے، چلو پہاڑ پر چلتے ہیں اور وہاں سے چاکہ لے کر آتے ہیں''۔

لڑکیوں کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ روزانہ بسراق سے بھی تنگ آ گئی تھیں۔ پھر یہ کہ انہیں گھر سے نکلنے اور گھومنے پھرنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ فوراً ہی چلنے کو تیار ہو گئیں۔ چلتے وقت ان کی ماں نے ہر لڑکی کو ایک ایک تھیلا دیا تاکہ اس میں چاکہ جمع کر سکیں۔ وہ جب کچھ بلندی پر پہنچ گئے تو باپ نے بیٹیوں سے کہا کہ'' مجھ سے اوپر نہیں چڑھا جا رہا تم سب جاؤ اور جا کر چاکہ لے آؤ میں یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں'' وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور

لڑکیوں کو پہاڑ پر اوپر کی سمت روانہ کر دیا۔ چاکہ کے درخت دشوار گزار گھاٹیوں میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکیا ں خوشی خوشی بلندی پر چڑھ گئیں اور اطمینان سے نیچے دیکھتی جا رہی تھیں جہاں ایک چٹان پر ان کا باپ بیٹھا ہوا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ''ہمارا باپ بھی ہمارا کتنا ہمدرد ہے دیکھو اکیلا بیٹھا ہماری حفاظت کر رہا ہے'' وہ آپس میں اپنے باپ کی تعریف کر رہی تھیں لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔

لڑکیاں جیسے ہی پہاڑ پر چڑھیں تو بڈھے نے اپنا چوغہ اتار کر ایک لکڑی پر لٹکایا اور اسے چٹانوں کے بیچ میں گاڑ کر تیزی سے نیچے اُتر گیا تھا اور دور بلندی سے لڑکیوں کو یوں نظر آ رہا تھا کہ ان کا باپ ان کی نگرانی کے لئے بیٹھا ہوا ہے۔

یہی نہیں بلکہ ان کی ماں نے جو تھیلے چاکہ جمع کرنے کیلئے انہیں دیئے تھے اس نے ان میں بھی سوراخ کر دیئے تھے چنانچہ لڑکیاں جتنا چاکہ چُن چُن کر تھیلوں میں ڈالتی تھیں، تھیلے بھر ہی نہیں رہے تھے چاکہ چنتے چنتے شام ہو گئی لیکن ظاہر ہے کہ تھیلے خالی کے خالی تھے۔ اب تو وہ بہت گھبرائیں، غور سے جو تھیلوں کو دیکھا تو وہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اپنی ماں کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔ لیکن سب سے چھوٹی بیٹی (جسے اس کے سر پر کم بال ہونے کی وجہ سے اس کی بہنیں کل دختر کہتی تھیں) نے ماں کی طرف داری شروع کر دی۔

''ہماری ماں بھی اب بوڑھی ہو گئی ہے۔ بیچاری کو اچھی طرح نظر بھی نہیں آتا تبھی تو وہ ان تھیلوں کو ٹھیک سے نہیں سی سکی۔ اس میں ماں کا کوئی قصور نہیں یہ کام تو ہمیں کرنا چاہئے تھا۔''

ماں کی اس طرح حمایت کرنے پر باقی بہنیں اس پر ناراض ہونے لگیں تو اس نے کہا ''ابھی میں دُعا پڑھوں گی اور خدا مجھے سوئی اور دھاگے میں تبدیل کر دے گا۔ تم اس سوئی دھاگے سے ان تھیلوں کے سوراخ سی لینا اور جب کام ختم کر چکو تو سوئی کو کسی پتھر پر رگڑ نا میں دوبارہ انسان بن جاؤں گی۔''

لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کل دختر نے ان پر توجہ دیئے بغیر دُعا پڑھنا شروع کیا اور فوراً ہی سوئی دھاگے میں تبدیل ہو گئی اور وہ جو ہزار گی کی مثال ہے کہ آفتاب دہ دو انگشت پٹنہ موشہ (سورج کو دو انگلیوں سے چھپایا نہیں جا سکتا) تو اس کے مصداق اب حقیقت ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے سوئی دھاگہ سنبھالا اور تھیلوں کو سینا شروع کر دیا۔ کام مکمل کرنے کے بعد انہوں نے سوئی کو پتھر سے رگڑا اور فوراً کل دختر ان کے درمیان موجود تھی۔

لڑکیوں نے جلدی جلدی دوبارہ چاکہ چننے شروع کر دیئے۔ اس مرتبہ ان کے تھیلے بھرنے میں دیر نہیں لگی۔ پھر سب نے تھیلے سنبھالے اور اس چٹان کی سمت روانہ ہو گئیں۔ جہاں ان کے خیال میں ان کا باپ انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جب وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ ایک لکڑی پر ان کے باپ کا چوغہ لٹک رہا ہے اور بس۔

لڑکیاں بہت کم گھر سے باہر نکلی تھیں اور پہاڑ کے اوپر تو وہ کبھی کبھی ہی گئی تھیں۔ پھر شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں بدل رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ راستہ بھٹک گئیں اور گھر کی سمت جانے کی بجائے بہت دور نکل گئیں۔ چلتے چلتے

ایک ایسے جنگل میں پھنس گئیں جہاں چاروں طرف گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی راستہ نہ پگڈنڈی، بے چارگی اور خوف کے مارے ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگیں لیکن اس جنگل میں ان کی فریاد کون سنتا۔ ہاں کل دختر انہیں تسلی دے رہی تھی "گھبراؤ نہیں اور خدا سے دُعا کرو وہ ضرور ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے گا۔ اس نے ہر مرض کی دوا اور ہر درد کا علاج پیدا کیا ہے۔ اب میں دعا پڑھتی ہوں میں کلہاڑی میں تبدیل ہو جاؤں گی تم کلہاڑی سے ان جھاڑیوں کو کاٹنا اور جب راستہ مل جائے تو کلہاڑی کو کسی پتھر سے ٹکرانا، میں واپس اپنی اصلی شکل میں آجاؤں گی"۔

یہ کہہ کر اس نے دعا پڑھی اور کلہاڑی میں تبدیل ہوگئی۔ باقی بہنوں نے کلہاڑی سے جھاڑیاں کاٹنا شروع کیں اور کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد وہ اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوگئیں۔ جنگل سے نکلنے کے بعد انہوں نے کلہاڑی کو ایک پتھر سے رگڑا اور فوراً ہی کل دختر اپنی اصلی حالت میں موجود تھی۔ ساتوں بہنیں اندازے سے ایک سمت روانہ ہوگئیں۔ لیکن جب انسان ایک مرتبہ راستے سے بھٹک جاتا ہے تو صحیح راستے پر آنے میں اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیاں بھی چلتے چلتے ایک دریا کے کنارے پہنچ گئیں۔ دریا پورے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے اس پار کھلا میدان تھا اور پیچھے خوف ناک جنگل جہاں سے وہ بڑی مشکل سے نکل پائی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے دریا پار جانے کا فیصلہ کیا مگر کیسے؟ وہاں نہ تو کوئی کشتی تھی اور نہ پُل۔ اس موقع پر بھی کل دختر ہی کام آئی۔

"جب تک میں ہوں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دعا پڑھی اور دریا کے اوپر پل کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ اس مرتبہ اس کی بہنوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکی اور آپس میں کہنے لگیں "ہم آخر کب تک اس گنجی کے احسانات اٹھاتے رہیں گے۔ کل یہ ہمیں طعنہ دے گی کہ میں نے تمہیں ہر مصیبت سے نجات دلائی اور جب یہ باتیں وہ دوسروں کو بتائے گی تو بھلا ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔" غرض اسی طرح کی باتیں کرتے اور سوچتے ہوئے انہوں نے اس مرتبہ کل دختر کو بیدار نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جب پُل عبور کر کے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچیں تو پل کو وہیں رہنے دیا اور آگے بڑھ گئیں۔ وہ اپنی دانست میں اپنی سب سے چھوٹی بہن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پل میں تبدیل کر کے چلی آئی تھیں لیکن۔۔۔

ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک چوپان (گلہ بان) اپنی بھیڑوں بکریوں کے ساتھ وہاں سے گزرا۔ چوپان اپنی لاٹھی کی پتلی نوک سے پل پر سے ٹھک ٹھک کرتا ہوا گزر رہا تھا اور اس کی ہر ضرب کل دختر کو بیداری کی منزل میں لا رہی تھی۔ جب چوپان اپنے گلے سمیت پل پر سے گزر چکا تو پل نے سٹ کر لڑکی کی شکل اختیار کر لی۔ چوپان نے جیسے ہی آہٹ سنی، پیچھے مڑ کر دیکھا اور حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ یہ دیکھ کر کل دختر نے کہا۔ "حیران مت ہو، میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں، تم نے مجھے بیدار کر دیا تمہارا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر اس نے چوپان کو مختصر لفظوں میں اپنی کہانی سنائی۔ چوپان اس سے بہت متاثر ہوا اور اسے ایک بھیڑ تحفے کے طور پر دی۔ کل دختر اس

بھیڑ کو لے کر اپنی بہنوں کو ڈھونڈ نے کے لئے روانہ ہو گئی۔

اُدھر اس کی بہنیں دریا پار کرنے کے بعد چلتی جا رہی تھیں اور اس دشت میں تھکن اور بھوک کے مارے ان کا حال اتنا خراب ہو گیا تھا کہ اب ان میں چلنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ ایک دوسرے سے کہنے لگیں ''کاش اس وقت وہ گنجی ہی ہوتی، وہ ضرور کسی نہ کسی طرح ہمیں نجات دلا دیتی۔''

اسی وقت کل دختر بھی انہیں ڈھونڈتی ہوئی قریب پہنچ چکی تھی، بولی، ''اب اس پچھتاوے کا کیا فائدہ تم چھ بہنیں تو اس ایک اجنبی چوپان کے برابر بھی نہیں نکلیں''

بہنوں نے جو اسے دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی۔ سمجھ گئیں کہ اب انہیں کم سے کم بھوک سے تو ضرور نجات مل جائے گی۔ کل دختر نے جب ان کی خستہ حالت دیکھی تو دل میں کسی قسم کا کینہ لائے بغیر چوپان کی دی ہوئی بھیڑ پیش کر دی کہ وہ اسے ذبح کر لیں۔ باقی بہنوں نے جیسے ہی یہ بات سنی خوشی کے مارے ان میں ایک نئی توانائی آ گئی۔ اور وہ بھیڑ کو ذبح کرنے کی تیاری کرنے لگیں۔ لیکن اب ایک اور مشکل سامنے تھی۔ اور وہ یہ کہ بھیڑ کے گوشت کو کس چیز میں پکایا جائے، وہاں نہ برتن تھے نہ دیگ نہ دیگچہ۔ کل دختر نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔

''میں دعا پڑھتی ہوں، جب میں ایک دیگچی میں تبدیل ہو جاؤں تو اس میں بھیڑ کا گوشت پکا لینا اور جب کھا چکو تو مجھے بیدار کر دینا۔'' یہ کہہ کر اس نے دعا پڑھی اور اب اس کی جگہ وہاں ایک بہت بڑی دیگچی رکھی تھی۔

بہنوں نے بہت شوق سے گوشت پکایا اور اس سے بھی زیادہ جوش و خروش سے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ظاہر ہے کئی دنوں کی بھوک ایسی ہی تو ہوتی ہے۔ جب خوب کھا چکیں تو دیگچی کو وہیں چھوڑ کر روانہ ہو گئیں اور کل دختر وہیں دیگچی کی شکل میں پڑی رہ گئی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک پرندہ دیگچی پر آ کر بیٹھا اور اپنی چونچ سے دیگچی کے کناروں پر لگے ہوئے گوشت کے ریزوں کو کھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی چونچ کی یہ رگڑ دختر کو ایک دم دیگچی سے انسانی شکل میں لے آئی۔ بیدار ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ اس کی بہنیں ایک مرتبہ پھر اسے دھوکا دے کر چلی گئی ہیں۔ اپنے خلوص اور قربانیوں کی اس توہین اور بہنوں کی بے وفائی کا اسے بہت دکھ ہوا اور اس نے اب ان سے نہ ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اپنے اندازے سے بہنوں کی مخالفت سمت میں چلنا شروع کر دیا وہ چلتی رہی چلتی رہی اور آخر کار اسے ایک غار کا دہانہ نظر آیا جہاں اس نے زندگی کے آثار محسوس کیے۔ غار کے اندر جو نظر ڈالی تو کیا دیکھتی ہے کہ غار میں جگہ جگہ سونا چاندی اور ہیرے جواہرات بکھرے ہوئے ہیں اور یہ کہ وہاں انواع و اقسام کے کھانے پینے کی چیزیں بھی ڈھیر میں۔ بھوک نے اسے بھی بے تاب کر رکھا تھا فوراً ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ جب خوب سیر ہو کر کھا چکی تو اسی وقت اسے آہٹ سنائی دی۔ آہٹ کی طرف دیکھا تو ایک خوب صورت اور تنومند نوجوان کو اپنے سامنے پایا۔ نوجوان نے بڑے اچھے لفظوں میں اسے خوش آمدید کہا اور پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا ''میں ایک شکاری ہوں

بہت دنوں سے دنیا کے جھمیلوں سے بیزار ہو کر اس غار کو میں نے اپنا ٹھکانا بنالیا ہے۔ یہاں کم سے کم میں دنیا کے دھوکے اور فریب سے تو محفوظ ہوں (شاید اس سے بھی کسی نے دھوکا کیا تھا) پتا نہیں کتنا عرصہ گزر گیا میں نے انسانوں کی شکل تک نہیں دیکھی، اب تم آ گئی ہو تو میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔"

اس طرح کی گفتگو میں وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے گئے اور لڑکی وہیں رہنے لگی۔ چند ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے عادات واطوار اور اخلاق سے آگاہ ہو گئے اور ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ظاہر ہے اب ان کی شادی ہو ہی جانی تھی۔ چنانچہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کل دختر کو اپنی بہنوں کا خیال آیا۔ اس کی نیک طبیعت اس کے غصے اور رنج پر غالب آ گئی اور ایک دن اس نے بہت سی بسراق تیار کیں اور اپنی بہنوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔

دوسری طرف اس کی بہنیں جو اسے دیگچی کی حالت میں چھوڑ کر چلی گئیں تھیں ایک بار پھر راستے میں بھٹک گئیں اور اس کوہ و بیابان میں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ بھوک اور تھکن سے ان کا بُرا حال تھا۔ وہ چلتے چلتے اور بھٹکتے بھٹکتے اتنی بے حال ہو چکی تھیں کہ اب ان کے لئے ہلنا جلنا تک مشکل ہو گیا تھا۔ سب کی سب ایک بڑی چٹان کے نیچے بے بسی کی تصویر بنی ہوئی پڑی تھیں اور خدا سے کھانے کے لئے دعا کر رہی تھیں۔ اسی وقت کل دختر نے ان کا پتا چلا لیا۔ چٹان کے اوپر سے ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک بسراق پھینکی۔ بسراق کو دیکھتے ہی ان میں جیسے نئی جان پڑ گئی۔ چیل کی طرح بُسراق پر جھپٹیں اور ذرا سی دیر میں اسے ختم کرنے کے بعد اوپر کی طرف دیکھ کر ہم آواز ہو کر بولیں:

"خدایا یکی دیگر (یا اللہ ایک اور)"

کل دختر نے سب کے لئے ایک ایک بُسراق اور نیچے پھینک دی۔ بہنوں نے اسے بھی پلک جھپکتے ہی کھا لیا لیکن ان کی بھوک کم نہیں ہو رہی تھی، تھیں بھی تو کافی دنوں کی بھوکی اوپر کی جانب دیکھا اور پھر ایک آواز ہو کر بولیں:

خدایا یکی دیگر!

اس مرتبہ کل دختر سے رہا نہ گیا۔ اسے زوردار ہنسی آئی اور وہ چٹان کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ بہنوں نے جیسے ہی اسے دیکھا شرم کے مارے ان کا برا حال ہو گیا۔ کل دختر نے ایک مرتبہ پھر ان کو مصیبت سے نجات دلائی تھی، انہیں اس ویرانے میں مرنے سے بچا لیا تھا۔ تمام بہنیں اس کے قدموں میں گر گئیں اور اس سے معافی مانگنے لگیں۔ کل دختر اپنی ہمدردانہ فطرت پر قائم تھی۔ اس نے نہ صرف ان کے تمام قصور معاف کر دیئے بلکہ انہیں اپنے ساتھ اپنے غار میں لے آئی۔ شکاری بھی ان سے بہت اخلاق اور نیکی سے پیش آیا اور اپنے ہیرے جواہرات سونا چاندی وغیرہ ان کے سامنے رکھ دیا کہ اس میں سے وہ جتنا چاہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ لڑکیوں نے کچھ دن غار

میں اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ گزارے اور پھر نئی زندگی کے آغاز کے لئے وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

اب ادھر کی سنوان کے ماں باپ جنہوں نے اپنے سازشی منصوبے کے ذریعے اپنی بیٹیوں سے جان چھڑائی تھی تا کہ خدا کی طرف سے نازل ہونے والی بسراق کو صرف وہی دونوں کھا سکیں، تو پھر جب کھانے کا وقت ہوا تو خدا کی طرف سے صرف دو عدد بسراق ہی روشن دان سے نازل ہوئیں یعنی فی کس ایک، بسراق۔ دونوں غم سے نڈھال ہو گئے۔ لالچ اور خود غرضی نے ان کی بیٹیاں بھی ان سے جدا کر دی تھیں اور وہ اپنی سازش میں بھی ناکام رہے تھے۔ اس وقت ان کی سمجھ میں آئی کہ خدا کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔

کھیترانی لوک بیانیہ:

بلوچستان کے قبیلہ کھیتران کی زبان کھیترانی کا مختصر تعارف گزشتہ باب میں دیا جا چکا ہے۔ جس میں لوک بیانیہ کی مختلف اصناف کا ذکر کیا گیا تھا۔ ان میں میر مصری خان کھیتران کی رزمیہ داستان اہم اور قابل ذکر ہے۔ میر مصری خان کھیتران کی قیادت میں 1916ء میں انگریزی سامراج کے تسلط کے خلاف مری، بگٹی، بزدار اور دیگر قبائل نے مل کر چھاپہ مار جنگ کی تھی۔ یہ دراصل مری، انگریز جنگ تھی۔ جو ہڑپ کے مقام پر لڑی گئی اور جس کا ذکر اسی باب کے گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ مقامی روایات کے مطابق ستمبر 1920ء میں سوویت آزربائیجان کے دارالحکومت باکو کے مقام پر مشرقی اقوام کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ جس میں مصری خان کھیتران کی قیادت میں ایک بلوچ وفد بھی شریک ہوا تھا۔

کھیتران:

یہ قبیلہ ایک طرف لغاری اور بزدار سے سرحد بناتا ہے، تو دوسری طرف مری اور بگٹی سے ملتا ہے۔ اُدھر کوہ سلیمان کے مشرقی دامن میں کھیتران وہودا میں رہتے ہیں جہاں ان کی زمینداری ہے۔ اکبر بادشاہ نے ان کے بڑے حصے کو وہاں سے بے دخل کیا۔ تب انہوں نے لغاری پہاڑوں کے علاقہ بارکھان میں پناہ لی۔

کھیتران کھیتی باڑی اور مویشی بانی کرتے ہیں۔ ان کی اولین زبان کھیترانڑیں ہے اور دوسری زبان بلوچی ہے۔ اصطلاحات، استعارات اور کلچر سب کچھ اپنے پڑوسی قبائل مری، بگٹی، بزدار لغاری قبائل (مری، بگٹی، بزدار) جیسا ہے۔ پڑوسی قبائل کے ساتھ تلخ وشیریں تعلقات بھی اس قبیلے کا خاصہ رہے ہیں۔

میر مصری خان کھیتران انگریز کے خلاف بہت بے جگری سے مزاحمت کرتا رہا۔ وہ اپنے ترقی پسند نظریات کی وجہ سے بلوچ سامراج دشمن تحریک کے نمایاں راہنماؤں میں شامل تھا۔

کھیتران چھ ذیلی قبیلوں میں تقسیم ہوتا ہے: دھڑے وال، گرینی، ایسانڑیں، لوہارانی، پھلیات اور سیلاچی۔ مزارانی ان کے لئے سردار فراہم کرتے ہیں۔ یہ قبیلہ بہت ہی متفرق نسل کے طائفوں کے آن ملنے سے بنا۔

حسنی قبیلہ گو کہ ابھی تک خود کو کھیتر ان سے الگ بتاتے ہیں مگر ان کے انضمام وادغام کا پراسیس جاری ہے۔
چاکر و گواہرم کے معلوم دور تک اس قبیلے کا کوئی نام موجود نہیں ہے۔ یہ بہت بعد میں تشکیل پایا۔

حسنی دراصل 19ویں صدی کے قریب سارے وسطی اور شمال مشرقی بلوچستان میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں پھیل گئے۔ آج یہ گروپ نہ آپس میں رابطے میں ہیں نہ ہی ان کے خاندانی یا تنظیمی تعلق رشتے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں بڑا طاقتور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ حسنیوں کو مری اور خان قلات سے 1780ء میں دھولا ونگا کے مقام پر شکست ہوئی۔ ان کا سردار صادق اور اس کا خاندان مارا گیا اور قبیلہ مکمل تاراج ہو گیا۔

یہ قبیلہ دو بڑی ٹکڑیوں کی صورت میں بلوچستان میں آباد ہے۔ ایک تو رکھی، رڑکھن کے وسیع علاقے میں، دوسری ٹکڑی سبی کے نواح میں آباد ہے۔ اس قبیلے کی ذیلی شاخیں اس قدر بڑی ہیں، یا، دور بکھری ہیں کہ وہ الگ قبیلے بن چکے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر حسنی قبیلے کی شاخیں یہ ہیں: بوبخیانی، نھتویانی، رئیسانی، شاہانی، مندوانی، شیلاچی، نوذہانی، جہلوانی، سوبیانی، ۔ اس کے چھوٹے ٹکڑے کچ، تل چوٹیالی (پنی کوٹ)، ببی (گلو شہر) اور کھیتر ان قبیلے (حسنی کوٹ) میں بکھر گئے۔

چھ مارچ 1918ء کو لیویز جمعدار مصری خان کھیتر ان کی قیادت میں مختلف قبائل کے تقریباً 500 افراد نے تحصیل بارکھان پر قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ 9 مارچ تک تحصیل پر قابض رہے۔ جب 24 مارچ کو سرکاری فوج بارکھان پہنچی تو کھیتر انیوں نے پھر اطاعت قبول کر لی۔
فوج کے ساتھ مزاحمت کے دوران 14 افراد نمیران (شہید) اور تین افراد زخمی ہوئے۔

ہنگلاج ماتا مندر: شاہ محمد مری کا لوک بیانیہ:

اور یوں آپ اچانک اس گیٹ پر پہنچتے ہیں جس پر لکھا ہے نانی مندر، ہنگلاج کا مندر، اور آس پاس سرخ، نارنجی جھنڈے، بینرز پوسٹرز ہیں۔
یہ مندر ہے، مزار ہے، تاریخی مقام ہے یا عبادت گاہ، تاریخ ابھی فیصلہ نہ کر پائی۔ شاید انگلش کا Shrine لفظ درست ہو۔ مزار، آستانہ۔

ہنگلاج زیارت پیچ وخم کھاتے بہتے پانی کے برساتی دریا کے ساتھ ساتھ بنائی گئی سڑک کے آخر میں واقع ہے۔ جس کے بعد ایک بہت بڑا پہاڑ اس ندی کو بند کر دیتا ہے۔

بلوچ اسے بی بی "نانی کی زیارت" بھی کہتے ہیں۔ ہمارے لوگ ہزاروں سالوں سے یہاں کی زیارت کرتے ہیں۔ سرخ کپڑے پہنے، خوشبو لگائے، چراغ جلاتے اور شیرینی بانٹتے ہوئے اور اگر آپ بلوچ کے سامنے نانی کے بجائے ہنگلاج کہہ دیں تو گویا آپ نے نام ٹھیک سے نہ لیا ہو۔ بے حد عقیدت مند ہیں بلوچ اس عظیم ورثے کے۔

یہ بی بی نانی کون ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ یہ اسلام سے بہت پہلے کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی دو تین ہزار سال تک تو ایسی کوئی ہستی پیدا نہ ہوئی تھی۔ یہ پانچ چھ ہزار سال پرانا افسانوی (آزمانکی) وجود ہے، جس کی ناز برداری آج بھی بلوچ کرتا ہے۔ نانی، یونانی دیوی اناہیتا ہے یا پھر اناہیتا، نانی ہے؟ پتہ نہیں۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ بی بی نانی کی زیارت صرف ہنگلاج میں نہیں۔ ہمارے وطن میں یہ بے شمار جگہوں پر موجود ہے۔

نانی کے مرید ہمیں معلومات دیتے رہے۔ مگر ان کی ساری معلومات عقیدے میں گندھی ہوئی تھیں۔ عقیدہ اور ''آزمانک کا آپس میں کوئی سمبندھ نہیں ہوتا''۔ آزمانک میں نے متھ Myth کو کہا ہے۔ دراصل آسمان کو ہم ''آزمان'' کہتے ہیں اور چونکہ پری اور دیو آزمانوں میں رہتے ہیں۔ اس لئے ان سے متعلق قصے کہانیوں کو ہم آزمانک کہتے ہیں آزمان میں رہنے والی پریاں اور دیو وہی کچھ کرتے ہیں جو زمین پہ ہم انسان کرتے ہیں۔ شادیاں، محبت، اغوا، کثیر بیویاں، مستیاں، شرارتیں۔

بلوچ مائتھالوجی کے مطابق ستی، یا دُرگا ایک پری تھی اس کے دس بازو تھے۔ ان میں اس نے جنگی ہتھیار پکڑے ہوئے ہیں۔ وہ بدمعاش دیوؤں یعنی راکھشسوں کو ختم کرنے والی پری ہے اور اس مقصد سے اس نے بہت سے جنم لئے ہیں۔ اسے ستی اور پاروتی (پہاڑوں والی) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے کل ناموں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے یہ پری زمین پر تو نہیں رہتی تھی۔ دور کہیں آسمانوں میں اس کا محل ماڑی تھا۔ یہ پری چونکہ انسان نہیں ہوتی۔ اس لئے محض زمین تک محدود نہیں رہتی۔ وہ زمین آسمان اور سمندر جہاں چاہے جب چاہے پل بھر میں موجود ہو سکتی ہے۔ ستی کے باپ کا نام دکشا ہے جو کہ خود دیو ہے۔ پہاڑوں کا دیو۔

دکشا کی اس بیٹی ستی کو ایک دیو سے محبت ہو گئی۔۔۔۔ شیو دیو سے، ''تباہ کرنے والا''، ''موت کا شہزادہ'' اور ''جنگ کا دیو''۔ اس شیو کو بعض اوقات پانچ چہروں اور چار بازوؤں کے ساتھ اور دوسری جگہوں پر قدرتی طور پر آدمی کی شکل میں، لیکن ایک اضافی آنکھ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کھوپڑیوں کا ہار پہنے ہوتا ہے۔ وہ کٹی پھٹی لاشوں پر ناچتا ہے اور مقتولوں کی کھوپڑیوں سے خون پیتا ہے۔ شیو درگا کے علاوہ کالی دیوی کا خاوند بھی ہے۔ بلوچستان سے باہر ہندوستان وغیرہ میں ہر سال اس کے احترام میں تہوار منائے جاتے ہیں۔ اور ان تہواروں میں خود پر اذیت ناک تشدد کیا جاتا ہے۔ مثلاً زبان کاٹنا، زخم میں لکڑی کے ٹکڑے داخل کرنا۔

پتہ نہیں انسان سپر پاورز کی تابعداری میں اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خود پر تشدد کیوں کرتا ہے۔ کیا بھگوان یہی چاہتا ہے کہ بھگت خود کو پیٹے مارے؟

ہم درگا پری کی بات کر رہے تھے جسے شیو دیو سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر شیو ہر طرح سے اس کی حوصلہ شکنی کرتا رہتا تھا۔ ستی، درگا، یا پاروتی نے ہر جتن کر کے دیکھا۔ اس نے اس حصول کے لئے روزے رکھے۔ دور تنہائی میں عبادت و دعائیں کیں۔ محبت و جنسی دیوی کی مدد حاصل کی، منہ بولے بھائی وشنو نے

اس کی کافی مدد کی۔ مگر وہ شیو کا دل جیتنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

وشنو یعنی ''حفاظت کرنے والا'' کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ وہ بھی ایک دیو ہے اور وہ ستی کا منہ بولا بھائی ہے۔ اس کے چار بازو ہیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں سنکھ۔ تیسرے میں ایک پہیہ اور چوتھے میں کنول پکڑا ہوا ہے۔ اس کے کپڑے نارنجی رنگ کے ہیں اور وہ ایک ایسے جانور پر سوار ہے جو آدھا آدمی ہے اور آدھا پرندہ۔ وہ گھر بار کا دیو ہے اور خاندان کی بدبختیوں کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ خوش حالی اور خوش قسمتی کی پری لکشمی کا خاوند ہے۔ (آپ یہ دلچسپ حقیقت نوٹ کر لیں۔ کہ اس بلوچ مائتھالوجی میں کپڑا ایجاد ہو چکا تھا۔ نیز رنگ سازی بھی موجود تھی۔ ساتھ میں نیزہ لوہے کے زمانے کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ بھی دیکھئے کہ یہاں انسان کے سماج میں شادی کا ادارہ قائم ہو چکا ہے)۔

ہم نے ملنگ سے ستی کے بارے میں مزید تفصیل پوچھی۔ اس کا شیو نامی دیو کے ساتھ عشق ابھی تک یک طرفہ تھا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے باپ کا محل چھوڑا اور جنگل ویران میں بیٹھ گئی۔ کھانا چھوڑ دیا اور دن میں درخت کا صرف ایک پتہ کھا کر گزارہ کرتی رہی۔ بالآخر وہ بھی ترک کر دیا مکمل بھوک۔

یوں کہیں جا کر اس نے شیو کی محبت حاصل کر لی اور اپنے باپ کی مرضی کے خلاف شادی شدہ شیو دیو سے شادی کر لی۔ (کثیر ازدواجی کا رواج۔ باپ سے بغاوت کی مثالیں!!)

میں نے نانی غار سے آس پاس کنراج پہاڑ کی طرف نگاہ دوڑائی اور میری سمجھ میں آ گیا کہ رومانویت ہزاروں سالوں سے بلوچ کی رگوں میں کیوں موجود ہے۔ سنگلاخ بلوچستان کو رومانویت نے ہی رہائش کے قابل بنا رکھا ہے۔ نہیں؟!!

اس کا باپ دکشا ضدی اور مغرور دیو تھا۔ اس نے ایک عظیم یجنا (آگ کی ایک بہت بڑی عبادت) منعقد کی۔ (اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے اساطیر میں آتش پرستی زرتشیوں سے بھی پہلے سے موجود تھی۔ آگ کا تقدس اس لئے کہ یہ گرمائش اور روشنی کا ہی منبع نہیں بلکہ یہ رات کو درندوں سے بچاتی ہے۔ مچھروں، کیڑوں مکوڑوں سے بچاتی ہے۔ خوف کو بھگاتی ہے۔ اسی لئے تو یہ محض عبادت کے لائق ہی نہیں بلکہ ایسا منصف بھی ہے کہ اس میں سے ننگے پیر چل کر پار ہو گئے تو بے گناہ اور اگر جل گئے تو دوشی۔

ضدی اور مغرور دکشا نے اس عبادت کے جشن میں سارے دیویوں، پریوں اور شہزادوں کو شمولیت کی دعوت دی۔۔۔ مگر اس نے ستی اور شیو کو نہیں بلایا۔ ستی کی تو خیر تھی مگر شیو کو نہ بلانا بہت مستی کی بات تھی۔ شیو تو سارے دیوؤں میں سب سے طاقتور تھا یہ تو بہت ہتک اور توہین کی بات تھی۔

ستی اس نظر اندازی کے باوجود باپ کے گھر جانا چاہتی تھی۔ آخر وہ اس کا باپ تھا۔ اس نے خاوند سے وہاں جانے کی ضد کی۔ شیو خود تو جانے پہ راضی نہ ہوا البتہ ستی کے وہاں جانے پہ کوئی اعتراض نہ کیا۔ ستی وہاں گئی تو

دیکھا کہ عبادت میں اس کے لئے اور اس کے خاوند کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی۔ کسی نے اس کا استقبال نہ کیا۔ بلکہ وہ پہنچی تو اس کا باپ اس پر بہت چیخا اس کی بے عزتی کی۔ اور اس کے خاوند شیو کی زبردست توہین کی۔ ستی دیوی اپنے محبوب خاوند کی اس توہین کو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اسی ہَیجنا کُنڈ (آگ) میں کود کر خودکشی کر لی۔ پری مر تو گئی مگر اس کا جسم جلا نہیں۔ (مائتھالوجی میں ایسا ہی ہوتا ہے)

یہ جو ہندوستان وغیرہ میں ستی بننے کا رواج ابھی تک ہے ناں شوہر کی موت پہ، تو یہ دراصل ستی کی اس وفاداری کی پیروی ہے جو اس نے اپنے خاوند سے دکھائی تھی۔ جس کے وقار کی خاطر اس نے خود کو آگ کے شعلوں کے حوالے کیا تھا۔

اپنی محبوبہ کی موت پہ ظاہر ہے شیو دیوتا غصے سے بپھر گیا۔ اس نے اپنے آدمی بھیجے اور تقریب کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ (اچھا؟ یہ آدمی بھیجنے کی سردارگردی تب بھی موجود تھی!!) اس نے دکشا کا سر تن سے جدا کر دیا۔ شیو نے اپنی محبوبہ بیوی ستی کی لاش کندھے پہ رکھی اور تباہ کن رقص شروع کر دیا۔

شیو دیوتا کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ رقص کا دیوتا بھی ہے۔ رقص کے ذریعے وہ دنیا میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔ اس کا ایک رقص تو بالخصوص سب سے تباہ کن ہوتا ہے۔ وہ جب سخت ناراض یا غصے میں ہوتا ہے تو تباہی والا اپنا یہ رقص کرتا ہے۔ لولاک کو اتھل پتھل کرنے کا رقص، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کا رقص۔

اس روز بھی غصے سے بپھرے ہوئے شیو نے یہی رقص شروع کیا جب اس کے رقص سے دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچنے کے قریب تھی تو لوگ دوڑے دوڑے دوسرے دیو کے پاس چلے گئے۔ جس کا نام وشنو تھا۔ انہوں نے اس سے فریاد کی کہ کسی تدبیر اور حکمت سے شیو کو رقص سے روکے ورنہ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ تب وشنو. پاروتی کے جسم کو اپنے سُدرشن چکرا کے ذریعے باون ٹکڑوں میں کاٹ ڈالتا ہے اور ان ٹکڑوں کو ایشیا بھر میں پھینک دیتا ہے تاکہ لاش غائب ہو جائے اور شیو اپنا تباہ کن غصہ بھول پائے۔

ستی (پاروتی) پری کے جسم کے یہ باون ٹکڑے مغرب میں بلوچستان سے لے کر، مشرق میں گوہاٹی تک اور یہاں سے بہت دور سری لنکا تک پورے جنوبی ایشیا میں جگہ جگہ گرے۔ جہاں جہاں یہ ٹکڑے گرے وہاں ''تیرتھ استھان'' یعنی مقدس زیارت گاہیں مختلف ناموں سے قائم ہوئیں بلوچستان کا ہنگلاج (کنراج پہاڑ میں واقع) سب سے مقدس ٹھہرا۔ اس لئے کہ پاروتی پری کا سر یہاں گرا۔ اس کا نام ہوا۔ ہنگلاج تیرتھ۔

پتہ نہیں اس زمانے میں انسان کو جغرافیہ کس طرح معلوم تھا کہ وہ قطب نما، خلائی جہاز اور دیگر آلات کے بغیر پاروتی کی لاش کے باون ٹکڑے تلاش کر بیٹھا اور وہ بھی ایک ٹکڑا بلوچستان اور دوسرا ہزاروں میل دور گوہاٹی میں۔

ہم پھر آپ کو خبردار کرتے ہیں کہ مائتھالوجی کے مزے لو۔ سوال نہ پوچھو۔ یہ ہمارے اجداد کی قائم کردہ داستانیں ہیں۔ انہیں فخر سے سنو۔ اپنے بچوں کو کہانی کے بطور سناؤ اور اپنے ادب پہ نازاں ہو جاؤ۔ اپنی قدامت اور اپنی

دھرتی کی تقدیس پر اتراؤ۔

چونکہ ستی (پاروتی) کا سر بلوچستان میں ہے اس لئے اس کا ہنگلاج بقیہ اکیاون زیارت گاہوں میں سب سے مقدس ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ستی پری سے وابستہ ان سارے باون مقدس مقامات کو کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے کہ ان سارے مقامات کی حفاظت شیو دیو کا ایک خون خوار دیو کرتا ہے۔ (تقدسات کی حفاظت ہمیشہ انسان سے زیادہ طاقت ور ماورائی قوتیں کرتی ہیں۔)

ایک مقبول ترین روایت یہ بھی ہے کہ ''دچاتر'' نامی ایک بادشاہ تھا اس کے دو بیٹے تھے۔ ہنگوال اور سندر۔ وہ بہادر مگر ظالم تھے اور عیاشی کی زندگی گزارتے تھے۔ وہاں کے لوگ شیو دیوتا کے پیروکار تھے۔ شہزادہ سندر نے ان علاقوں پر حملہ کیا اور ہزاروں کو قتل کر دیا، سونے کے زیورات لوٹ لئے اور ٹیکس کا مطالبہ کیا۔

لوگوں نے شیو دیو سے اس ظالم شہزادے سے نجات دلانے کی دعا کی۔ ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے شیو دیو نے ایک کرامت عطا کی اور گنزیش دیو نے سفاک شہزادہ سندر کو تین دنوں میں قتل کر دیا۔

گنزیش ہاتھی کے سر اور چار ہاتھوں والے موٹے آدمی کی شکل میں ہے۔ وہ چوہے پر بیٹھتا ہے۔ وہ اسی درگا پری کا بیٹا ہے، جو شیو کی بیوی ہے۔ شیو اور ستی کے اس بیٹے کو معاشرتی معاملات پر طاقت حاصل ہے۔ کسی بنک کار کے پاس چلے جائیں۔ آپ کو دروازے پر گنزیش کی تصویر بنی نظر آئے گی۔ آپ کسی بنیے کے پاس چلے جائیں تو اس کی دوکان کی دیوار پر نمایاں جگہ پر گنزیش کی تصویر موجود ملے گی۔ تمام کاروباری آدمی اس تصویر کو حفاظت کے نشان کے طور پر رکھتے ہیں۔۔ خط اس کے نام سے شروع کئے جاتے ہیں۔ حسابات کی کتابوں کے سرورق زعفران کے ساتھ اس کی شبیہ سے آراستہ کئے جاتے ہیں۔

شہزادہ سندر کے قتل ہو جانے پر اس کا بھائی ہنگو غضب ناک ہو گیا اور اس نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کی قسم کھالی۔ وہ نفس کشی، چلہ یا اسی طرح کی روپوشی میں چلا گیا۔ (جس طرح ہزاروں سال بعد ہمارا بالاچ گورگیو، سخی سرور کے دربار میں چلا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بالاچ بھی اپنے بھائیوں کا انتقام لینے کے لئے شکتی یا مافوق الفطرت طاقتیں لینے کے لئے زہد اور خدمت گاری میں رہا۔ اسے بھی سخی سرور نے ایک مافوق الفطرت طاقت بخشی۔ تیز دوڑنے کی طاقت، دشمن اس کا تعاقب کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ہنگول کو بھی برسوں کے زُہد کے بعد ہی بالاچ کی طرح کرامت ملی۔ یہ کہ تین دنیاؤں میں کوئی بھی جاندار اسے آہنی ہتھیار سے نہیں مار سکتا اور اس کی موت صرف ایسی جگہ پر ہوگی جہاں سورج کی شعاع داخل نہ ہو سکے۔

لہٰذا کلا اور کرامتوں سے لدے پھندے اس ہنگول بادشاہ نے آس پاس کے دوسرے بادشاہوں کو شکست دی، دہشت اور ظلم سے اپنی حکمرانی وسیع کر دی۔ اس نے خود کو ہنگول دیو کہلانا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی

حکمرانی میں ظلم اور بربریت سے تھک گئے۔ بیزار ہوئے، انہوں نے پری کے حضور ہنگول بادشاہ سے نجات کے لئے عبادتیں سجائیں۔ بالآخر پری ظاہر ہوئی اور ہنگول کو قتل کر دینے کا وعدہ کیا۔

ہنگول فرار ہو کر بلوچستان کے اس علاقے میں آیا اور ایک اندھیرے غار میں چلا گیا۔ مگر تعاقب کرتی پری لوہے کے ہتھیار کے بجائے اپنے لکڑی کے ہتھیار ''ترشول'' کے ساتھ آئی اور اسے قتل کر دیا۔ اپنی آخری سانسوں میں ہنگول نے پری سے درخواست کی کہ مستقبل میں یہ جگہ اس کے نام پہ ''ہنگول تیرتھ'' کے نام سے پکاری جائے۔ جسے پری (دیوی) نے قبول کرلیا۔

بلوچستان کے یہ مقامات مذہب کی عبادت گاہیں نہیں ہیں۔ یہ تو بہادروں، درویشوں کے عشق و محبت، جنگ و جدل اور شوق و شغل کے آسمانی قصوں کی زمینی صورت ہیں۔ خواہشات و عزائم کا زمینی آسمانی بالخصوص ہندوستانی فلموں والا مصنوعی مندر نہیں ہے اس لئے کہ نہ یہاں کوئی کمرہ گنبد ہے اور نہ کوئی گھنٹی گھڑیال ہے۔ اسے مندر کے بجائے متبرک جگہ کہنا چاہئے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیسی مقدس جگہ ہے۔

جغرافیائی طور پر ہم بتا چکے ہیں کہ ہنگلاج ماتا کا یہ تیرتھ استان بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کی لیاری تحصیل کے دور دراز دشوار گزار کوہستانی علاقے میں ایک تنگ درے میں ہے۔ آپ پہاڑی دریا (بارشوں کی عدم موجودگی میں بھی ایک ندی جتنا رواں پانی) کے کناوے چلتے جائیں اور اچانک سامنے گیٹ لگا ملے گا۔ اندر داخل ہوں تو عبادت گاہوں کی ایک قطار ملے گی۔ وہاں لگا ہوا بڑا نیلا بورڈیوں کہتا ہے:

''جئے ماتا دی۔ ہنگلاج مندر لسبیلہ شیوا میں۔ مکھی شام لال لاسی''

(مجھے مکھی شام لال کے ساتھ لفظ لاسی بہت اچھا لگا۔ مجھے بگٹی اور ڈومبکی ہندو اچھے لگتے ہیں کہ وہ اپنے نام کے ساتھ اپنا قبیلہ بھی لکھتے ہیں۔ میں ہمیشہ سے چاہتا ہوں کہ بلوچ ہندو، بلوچ سید اور بلوچ آرٹسٹ (لوری، لوڑی، ترکھان، جت، مریٹہ کو اپنے نام کے ساتھ اپنا قبیلہ ضرور لکھنا چاہئے۔ اس شناختی علامت کے ساتھ وہ کوئی مساوات تو نہ پائے گا لیکن رفتہ رفتہ کمیونٹی میں ضم ہونے میں آسانی ہوگی۔)

یہاں آتے ہی سب سے پہلے ہنومان مندر ملے گا۔ چھوٹا گیٹ ہے۔ اندر داخل ہوں تو ہنومان کے بت رکھے ہیں مختلف پوز میں۔ پوسٹر، جھنڈے، سندور، تیل کا چراغ۔۔۔

یہاں سے نکلیں آگے بڑھیں اور ندی کنارے درے میں چلتے جائیں۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑی غاروں میں مختلف عبادت گاہیں ہیں۔

جھنڈیوں پوسٹروں سے لدی پھندی ایک چھوٹی غار میں ایک عجب منظر ہے۔ ایک عورت نما لاش پڑی ہے۔ اس پہ (دس ہاتھوں والی، ہار پہنی) ایک اور خاتون کھڑی ہے۔ جس نے اپنا ایک پاؤں اس کی لاش پر رکھا ہوا ہے۔ بالکل سلطان راہی کی فلموں کے طرز پر۔ اس نے ایک ہاتھ میں ایک مرد کا کاٹا ہوا سر بالوں سے پکڑ رکھا ہے۔

باقی نو ہاتھوں میں بھی دوسری کئی باریکیاں ہیں اور اس کے ساتھ بورڈ پہ لکھا ہے۔ ''مائی کالی''۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کالی جو اپنے جنگی کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہ اپنے خاوند شیو دیو کے بالکل شایان شان ہے۔ اسے سانپ کے بالوں اور خوف و دہشت کی ہر خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ ایک راکھشس پر فتح حاصل کر لی اور اس فتح سے اتنی خوش ہوئی کہ اس نے انتہائی زور سے ناچنا شروع کر دیا۔ جس سے زمین کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ اور بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔ جب اس نے دیکھا کہ مردوں میں اس کا شوہر شیو دیو بھی شامل ہے تو وہ بہت دہشت زدہ ہوگئی۔ اس نے بہت زیادہ لمبائی میں اپنی زبان نکالی اور بت کی طرح بے حس و حرکت ہوگئی۔ اسے اسی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

''مشکی'' رنگت کا ہمارا خارانی دوست ضیا شفیع اور اس کا کیمرہ بردار موبائل اگر ساتھ نہ ہوتے تو ہم ہنگلاج آزمانک کی بھول بھلیاں نہ یاد رکھ سکتے تھے۔ اور نہ ان پر یہ رپورتاژ لکھ سکتے تھے۔ دلچسپ آدمی ہے ضیاء شفیع ۔ ہمہ وقتی بڑھتی ہوئی نامکمل خواہشوں سے بھرا ہوا اس کا دل اس سے حساسیت بھری شاعری کرواتا ہے تو خوش طبعی اس کی ''سوزارنگی'' کو حسین بناتی ہے۔ جب چاہے دانش ور بن جاتا ہے اور جب ضرورت ہو تو خدمت دار، خدا اسے اپنی اچھی بلوچیت کے ساتھ جڑے رہنے کی توفیق دے۔

یہ مقام دیکھنے کے بعد آگے چلتے جایئے، ندی کراس کیجئے اور اب بائیں طرف وہ Shrine آئے گی جس کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ یہ مقدس مقام ایک چھوٹے قدرتی غار (جُڈو) میں ہے اب بد بخت شہریت کی وجہ سے اس قدرتی پہاڑی غار کی شکل بدلنی شروع کر دی گئی۔ ظالموں نے سیڑھیاں بنادی ہیں۔ سرخی مائل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں۔ سیڑھیاں آپ کو پہاڑ کی بلندی پہ بنے ایک پلیٹ فارم تک لے جائیں گی۔ ظالموں نے ٹائلوں والا پلیٹ فارم بنا کر اس مقام کی اصل صورت بدل ڈالنے کی کوشش کی۔ وہاں ایک دروازہ کھڑا کر دیا۔ گھنٹی (بیل پر بندھی گھنٹی (شب) سے دگنی تگنی بڑی گھنٹی) لٹکانے کی تو خیر ہے۔ حکومت بلوچستان کو چاہئے کہ وہ اس پورے اہم تاریخی اساطیری سلسلے کو اپنی تحویل اور حفاظت میں لے لے اور اس میں کسی طرح کی مصنوعی تبدیلی نہ کرنے دے۔ یہ ہمارے آباؤ اجداد کے زرخیز ذہنوں کی تخلیقی داستانیں ہیں۔ ہمیں فطرت کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں کو آلودہ ہونے سے بچانا ہوگا۔ سیاسی پارٹیوں، دانش وروں، آثار قدیمہ اور آرٹ کے شائقین اس بڑے اثاثہ کو اپنی اصل صورت میں برقرار و برجاہ رکھنے میں اپنا رول ادا کریں۔ آپ اس پلیٹ فارم پر بیٹھیں تو آپ کو اپنے ساتھ ہی پہلو میں چار پانچ گز کا ایک غار نظر آئے گا۔ یہی ہے Shrine۔

وہاں بڑا فقیر نارنجی رنگ کی پگڑی پہنے بیٹھا ہے۔ قمیص شلوار میں، یہ سندھی بولنے والا ہے۔ اصل فقیر چھٹی گیا ہوا ہے اور یہ اس کا replacement ہے۔

وہیں اس کے پیچھے بائیں طرف بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں، کچھ ڈبے اور راشن پانی رکھا ہے۔ اس غار یا جڈو

کے فرش پر پہاڑ ہی سے پاروتی پری کا سر بنا ہوا لیٹا ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ انسان کا بنایا ہوا پاروتی کا بت نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس پہاڑی غار کے فرش پہ ایک ابھرتی ہوئی قدرتی صورت ہے۔ جیسے ایک خاتون سوئی ہوئی ہو۔ اس کا سر، ناک کا ابھار اور ناک کے دونوں اطراف چھوٹے گڑھے آنکھوں کی صورت ہیں۔ پتھر سے بنا لیٹا ہوا، قدرتی انسان۔ اس کے چہرے پر ایک باریک سرخ کپڑا چست انداز میں بچھایا ہوا ہے۔ جہاں سے ناک کا ابھار صاف نظر آتا ہے۔

اس مورتی والے پتھر اور آس پاس پہاڑ کو سندور سے سرخ کر دیا گیا ہے۔ اگربتیوں کے گچھے ہیں۔ عجیب الخلقت جانوروں کی تصاویر کے پوسٹر لگے تھے۔ جن پہ ہار پہنار کھے تھے۔ روایتی ترشول وہاں فکس تھا۔ آس پاس جھنڈے بینرز تھے، پینافلکس تھے۔ سب زیادہ تر نارنجی رنگ کے۔ یوں اس مقام کا قدرتی حسن فوت ہو چکا ہے اور دیوی دیوتاؤں کے ہیبت ناک واقعات سامنے موجود ہوتے ہیں۔

اسی پلیٹ فارم یعنی مجسمے کے نیچے نیم دائرے میں کھدی ایک اندھیری سرنگ ہے جس میں لوگ رینگتے رینگتے گھٹنوں کے بل نیم دائرے کی ایک طرف سے جا کر دوسری طرف سے نکلتے ہیں۔ اسے ''گربھ گپھا'' کہتے ہیں۔ زرد پٹکا پہنے گائیڈ نے اسے ''ماتا کا گربھ'' کہا تھا۔ یعنی ماں کا پیٹ۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اس تنگ و تاریک دس بارہ گز کے نیم دائرہ نما غار میں سے ہو آئیں تو سمجھیں آپ کے سارے سابقہ گناہ ختم ہو گئے ہیں۔ اور آپ ایسے پاک صاف ہو جاتے ہیں جیسے ماں کے پیٹ سے ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں۔

اس مرادمند سرنگ میں خواہشیں رکھنے والے لوگ گھٹنوں اور پیٹ کے بل رینگتے باہر آتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ سرنگ بازی کرتے وقت میری عینک وہیں گپھا میں گر گئی۔ کمزور عقیدے کا مالک میں بہت خوش تھا کہ گپھا میں میری عینک گم نہیں ہو گئی بلکہ اسے تو ستی پری نے رکھ لیا۔ اب بس میری نظر خود بخود ٹھیک ہو جائے گی اور عینکوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مگر ایسی کوئی کرامت میرے ساتھ ہوئی نہیں۔ مجھے تو الٹا جنید خان کی عینک ادھار لینا پڑی گوادر تک۔ مگر وہاں بھی دکانوں میں نئی عینک نہیں ملی۔ لہٰذا وہاں سے کوئٹہ تک میں ''ادھار آنکھوں'' سے دیکھتا رہا۔

میں نے دل میں طے کر لیا کہ میں سائنس کی دنیا کا فرد ہو کر اس علاقے اور ان اساطیری مقامات کی عزت کرتا رہوں گا۔ بھئی یہ ہمارے ادب، ہماری ثقافت کا حصہ ہیں۔ میں اسے آؤٹ ڈیٹ کہہ کر اپنے آباؤ اجداد کو مسترد نہیں کر سکتا۔ انہوں نے عالمی صداقتوں کو پہلی بار علم کے پہنچانے کے واسطے مائتھالوجی بنائی اور پانچ چھ ہزار سال قبل ہمیں بتایا کہ ''خیر'' کے واسطے جدوجہد کرنے والوں کو عوام کی طرف سے پانچ ہزار سال بعد بھی یاد رکھا جاتا رہے گا۔ آباؤ اجداد نے اپنے زمانے کے اہداف، خوفوں، آرزوؤں کو مجسم شکل دینے کے لئے جو کہانیاں بنائیں، ہمارے عوام اب تک انہیں یاد رکھتے ہیں۔

پاروتی پری کے بت کے ساتھ بیٹھے پنڈت کے ساتھ ہی ایک بڑا سا چوکور ڈبہ رکھا ہے۔اس پر نیچے ہندی میں کچھ لکھا ہے اور اس سے اوپر کی لائن پہ اردو میں یوں لکھا ہے۔"پیسے پٹی میں ڈالیں" واضح رہے کہ اس وقت تک ہم نے عامر خان کی مشہور فلم "پی کے" نہیں دیکھی تھی۔(عامر خان نے ہنگول بھی تو نہیں دیکھا!)

میں نے پانچ سو روپے کا نوٹ اس کے ڈبے میں کسی پیارے کا نام لے کر ڈال دیا۔دربار کے ملنگ نے جواباً مجھے ایک ناریل دے دیا۔یہاں زائرین بالخصوص، دیالو اور (کمزور عقیدے والے) زائرین کو ایک 'الوداعی' ناریل دیا جاتا ہے۔یہ ناریل، میں اسی پیارے وجود کے لئے لے گیا۔جس کے لئے منت مانگی تھی اور جس کے لئے خود کو سرنگ آلودہ کیا تھا۔

یہاں سیمنٹ کی خوب صورت پگڈنڈیاں ہیں، پل ہیں، ریلنگ ہیں، سبزہ ہے۔جن میں گز کی قدرتی جھاڑیاں بھی ہیں اور انسانی لگائے گئے درخت و پودے بھی۔البتہ برگد کے درخت مجھے یہاں کہیں بھی نظر نہ آئے۔ اس بڑے اساطیری مقام کے ساتھ بہتے نالے کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔

نانی مندر کے غار کے عین سامنے نیچے ندی کے کنارے ذرا سی جگہ کو جو بہ مشکل ایک چھوٹے کمرے کے برابر ہوگی، پارک جیسا بنا دیا گیا۔پتلے آہنی ڈنڈے وہاں لگے تھے جن کے سروں پر بجلی کے خوبصورت بلب اور جھنڈے تھے اور ان کی بنیادوں پر پودے اور پھولوں والے بیل بوٹے لپٹے تھے۔اس پارک نما جگہ پر ترشول گاڑے ہوئے ہیں۔(ترشول شیو کا ہتھیار ہوا کرتا تھا) اس پارک نما جگہ پر سفید بیل کا خوب صورت مجسمہ ہے جس پر سرخ کپڑا کوہان سے آگے گردن پہ اور کوہان کے پیچھے پیٹھ پر آرائشی انداز میں لپٹا ہوا ہے۔

وہیں پر سیمنٹ سے بنا شیولنگ زمین میں پیوست تھا جسے ناگ جیسا ڈھانچہ گویا سایہ کئے ہوئے تھا۔سجادہ نشین نے اس کی تشریح اس طرح گھما پھرا کر کی جس طرح کہ پادری "اگر مگر، چوں کہ چنانچہ" کرتا رہتا ہے۔آپ جب بھی ہزاروں برس پرانی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے آج کے اخلاقی معیار کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہیں گے تو آپ پھنس جائیں گے۔اگر آپ مائتھالوجی کو سائنسی پیمانے دینے کی کوشش کریں گے تو آپ اپنی دانش کی بڑھوتری روک دیں گے۔چنانچہ پنڈت پھنس چکا تھا۔اس نے سیدھے سادے شیولنگ کے ساتھ فلسفہ جوڑ دیا اور ہمیں سمجھاتے سمجھاتے وہ اور فلسفہ دونوں، ہلکان ہو چکے تھے۔ہم نے اپنے سابقہ علم ہی کو غنیمت جانا۔جس میں شیولنگ بس شیولنگ ہوتا ہے۔بھئی مائتھالوجی آپ کی میری فیوڈل اخلاقیات کو نہیں مانتی۔پانچ ہزار سال پہلے اخلاقی طور پر جو کچھ جائز و ناجائز تھا وہ آج پتہ نہیں کہاں تک applicable ہے۔

آخر میں بس یہ کہ شاہ لطیف بھٹائی ہنگلاج مندر کی زیارت پر آئے تھے۔میں نے ان کی شاعری کے اندر ان کے ان زیارتی سفروں کے بارے میں اشعار پڑھ رکھے ہیں۔

حوالہ جات:

1. ڈاکٹر غلام محمد کھیتران، کھیترانی زبان، مشمولہ ماہنامہ ''سنگت'' کوئٹہ، اپریل 2017، صفحہ 21
2. کامل القادری، گائے جا بلوچستان، بولان بک کارپوریشن کوئٹہ، 1971
3. عطا شاد، عین سلام، بلوچی لوک گیت، قلات پبلشرز، مستونگ، 1965
4. عبدالرحمان غور، نغمہ کوہسار، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1968
5. بشیر احمد بلوچ، بلوچی لوک کہانیاں، آرٹس کونسل، کوئٹہ، 1978
6. ڈاکٹر شاہ محمد مری، مختصر تاریخ زبان وادب بلوچی مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1978
7. گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 73
8. ایضاً، ص، 78-79
9. ایضاً، ص، 85
10. ایضاً، ص، 87
11. ایضاً، ص، 88-89
12. ایضاً، ص، 90-91
13. عبدالرحمان غور، نغمہ کوہسار، بلوچ اکیڈمی، کوئٹہ، 1968، ص۔ 44
14. ایضاً،
15. ایضاً، ص، 45
16. گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، ص۔ 114-115
17. ایضاً، ص، 116
18. ایضاً، ص، 118-119
19. عبدالرحمٰن غور، نغمہ کوہسار، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، 1968، ص . 132
20. ایضاً، ص، 135
21. ایضاً، ص، 135
22. عبدالرحمان غور، نغمہ کوہسار، ص۔ 120
23. ایضاً، ص، 121-122
24. ایضاً، ص، 123
25. ایضاً، ص، 124
26. گل خان نصیر، بلوچی رزمیہ شاعری، ص۔ 139
27. ایضاً، ص، 142
28. ایضاً، ص، 145-146

29- ڈاکٹر انعام الحق کوثر، رابعہ خضدار کی شہزادی، مشمولہ بلوچستان کا ادب اور خواتین، ادارت: فاطمہ حسن، ڈاکٹر شاہ محمد مری، وعدہ کتاب گھر، کراچی، 2006، ص۔ 59-58

30- فہمیدہ ریاض، رابعہ خضدار کی چار غزلیں، ایضا، ص 70

31- ایضا، ص 73-71

32- محمد افضل مینگل، براہوئی لوک گیت اور خواتین، ایضا ص 86

33- ایضا ص 87

34- ایضا ص 88-87

35- عبدالقیوم بیدار، براہوئی نسائی ادب، براہوئی ادبی سوسائٹی، کوئٹہ 2013، ص 165-164

36- فاروق سرور، پشتو لوک گیت اور خواتین، مشمولہ بلوچستان کا ادب اور خواتین، ص 91

37- ایضا ص 93-92

38- ایضا ص 90

39- ایضا ص 97

40- ایضا ص 99

41- ایضا ص 100

42- ایضا ص 101

43- سید خیر محمد عارف، پشتو ادب میں خواتین کا حصہ، ایضا ص 108-107

44- ایضا ص 108

45- ایضا ص 109

46- ایضا ص 110

47- ایضا ص 111

48- ایضا ص 112

49- رضا ہمدانی، رزمیہ داستانیں، لوک ورثہ، اسلام آباد، 1980ء ص 366-365

50- عبدالقدوس درانی (تالیف و ترجمہ) پشتو کلچر، پشتو اکیڈمی بلوچستان، کوئٹہ، 1982، ص۔ 73

51- ایضا ص 76-75

52- ایضا ص 86-85

53. A. Mir, Blood Flows freely in Pakistan Asian Times, October 5, 2001, Cited in Milhar, F Everything has shattered rising level of violence against Shia in Pakistan , London, MRG June 1914, p. 1

54. BBC, Pakistan Shias Killed in Gilgit Sectarian Attack, August 16, 2012

55. Milhar, Op. Cit

56. Aljazeera , Pakistan bus Bombing kills, 22 Shia pilgrims, January 21, 2014

57- محمد جواد خاوری (گردآوری و تدوین) کوہ قاف کے اس پار (ہزارہ قبائل کی عوامی داستانیں) پروفیسر شرافت عباس ناز، ادارہ فروغ تعلیم و ادبیات، بلوچستان، کوئٹہ 2010ء، ص 10-9

58۔ ایضاً ص 22 - 15

59۔ ایضاً ص 163 - 157

60۔ محمد علی تورانی ہزارگی زبان کی خصوصیت اور اس کے ضرب الامثال، مشمولہ فرہنگ ادبیات ہزارگی، ضرب الامثال ومحاورات، آزارگی اکیڈمی، کوئٹہ، 2010، ص، 18

61۔ ایضاً ص18-19

62۔ ایضاً ص19

63۔ ایضاً

64۔ شاہ محمد مری، بلوچ ساحل اور سمندر، سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ، ص 170-146

تیسرا باب

خیبر پختونخوا کا لوک بیانیہ

1۔ پشتون لوک بیانیہ
مغل اور پشتون لوک بیانیہ
پشتو لوک بیانیہ اور سکھ حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت
انگریز اور پشتون لوک بیانیہ
پشاور۔۔لوک بیانیہ
پشتون لوک دانش

2. ہندکو لوک بیانیہ
سامراج دشمن لوک بیانیہ
راجہ رسالو کا لوک بیانیہ
ہندکو ہزارہ کا لوک بیانیہ
ہندکو۔ڈیروی لوک بیانیہ
ہندکو۔۔لوک دانش
کاغان کا گوجری لوک بیانیہ

3۔ چترال کا لوک بیانیہ
لسانی تنوع
کھوار لوک بیانیہ
ڈاڈاڑ باچھا
کھوار لوک بیانیہ
پالولا لوک دانش
کیلاشہ لوک بیانیہ

خیبر پختونخوا کا لوک بیانیہ

لسانی تنوع کے اعتبار سے خیبر پختونخوا پاکستان کا انتہائی زرخیز خطہ ہے۔ دو مرکزی زبانوں پشتو اور ہندکو کے ساتھ یہاں درجن بھر زبانیں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم اپنے مقدمہ میں کر چکے ہیں۔ پشتو، مختلف علاقوں میں مختلف لب و لہجے کی حامل ہے۔ شہری پشتو اور قبائل کی پشتو میں خاصا فرق ہے۔ اسی طرح ہزارہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور کی ہندکو الگ الگ ہے۔ کوہستان میں کوہستانی کے علاوہ کئی مقامی زبانیں عوام کے جذبات کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح چترال لسانی تنوع میں اپنی مثال آپ ہے۔

پشتو لوک بیانیہ:

پشتو میں رجزیہ داستانوں، جنگی چار بیتوں، لنڈئی، لوک دانش، ضرب الامثال اور دیگر اصناف سے لوک بیانیہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ پشتون مزاحمت کے حوالے سے ہم بابا ہوتک کے ترانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ پشتونوں نے ہمیشہ غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ پہلے وہ مغلوں کے خلاف لڑتے رہے۔ بایزید انصاری اور اس کی چار نسلیں جنگ آزما رہیں۔ مغلوں کے بعد انہوں نے سکھوں کی جارحیت کو بھی قبول نہیں کیا اور سکھوں کے بعد سو سال تک وہ انگریزوں سے نبرد آزما رہے۔ حتیٰ کہ فقیر اپی کی صورت میں قیام پاکستان کے بعد بھی مزاحمت جاری رہی۔

پشتون لنڈئی میں مزاحمت کے تاریخی واقعات کا اظہار ملتا ہے۔ روشنیہ تحریک کے بانی بایزید انصاری پیر روشان نے مغلوں سے ٹکر لی۔ اس کا ذکر لنڈئی کے ان بولوں میں ملتا ہے۔

''روخانی'' مغلوں کے گلے کا پھندا ہیں
وہ ان کا صفایا کر کے ہی دم لیں گے
مغلوں کی شامت اعمال
''روخانیوں'' کی صورت میں ان کی موت کا پیغام بن گئی ہے
پیر روخان خدا رسیدہ بزرگ ہیں
ظالم مغلوں کو ان کی عیاشیوں کی سزا دے کر رہے گا۔ (1)

مغل اور پشتون لوک بیانیہ:

مغلوں کے خلاف پشتون معرکہ آرائیوں کا سلسلہ اورنگ زیب کے عہد تک جاری رہا جب صاحب سیف و قلم خوشحال خان خٹک نے مغل سامراج کو کئی معرکوں میں للکارا اس نے مغلوں کی منصب داری کو ٹھوکر مار کر

مغلوں کے خلاف کئی میدانوں میں صف آرا ہوا۔ اس نے اپنے دیوان میں لکھا ہے کہ خوشحال خان اس مقام پر دفن ہونا پسند نہیں کرے گا جہاں اس کی قبر پر مغل گھوڑوں کی گرد بھی اڑ کر پہنچ سکے۔ اس نے مغلوں کے خلاف اپنی معرکہ آرائیوں کا ذکر ایک نظم میں تفصیل سے کیا ہے۔ ہم اس طویل نظم سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

''چند شنواری، کچھ مہمند اور چند ایک آفریدی تھے، ان سب نے مل کر سارے صوبائی لشکر کو شکست دی۔ اس طرح مغلوں پر جو قیامت ٹوٹی، اس کا اندازہ مشکل ہے، قتل مقاتلہ، اور مالِ غنیمت کا کوئی حساب ہی نہیں۔ (2)''

''یہ موسم بہار پھر کدھر سے آ گیا کہ سارا وطن گلزار بن گیا ہے۔ ہر طرف ارغوان، ناز بو، سوسن، ریحان، یاسمین، نرگس، ار وانار کے پھول کھلے ہوئے ہیں، پھول تو بے شمار ہیں۔ مگر ان سب میں لالہء احمر امتیازی شان رکھتا ہے۔ لڑکیاں اپنے گریبان پھولوں سے سجا رہی ہیں اور نو جوان لڑکے اپنی دستاروں میں پھولوں (کے طرّے) لگا رہے ہیں۔''

اے مغنی! سارنگی کو کمان آشنا کر، ہر تار اور ہر پردہء ساز سے نغمات باہر لا۔

اے ساقی! شراب کے لبالب پیالے عطا کر، تا کہ میں نشے میں سرشار ہو جاؤں پشتون جوانوں نے پھر اپنے ہاتھ شہباز کے پنجوں کی طرح لہو میں سرخ کر لئے ہیں۔

اپنی چمکتی ہوئی برّاق تلواروں کو خون سے رنگ لیا ہے۔ جیسے اساڑھ کے مہینے میں لالہ و گل کا باغ کھل اُٹھا ہو۔

ایمل خان اور دریا خان (خدا ان کو ہمیشہ سلامت رکھے) ان دونوں نے ہمیشہ اپنی ہمت عالی کا مظاہرہ کیا۔ خیبر کے درّے کو خون میں نہلا دیا اور کڑپہ میں بھی ہنگامہ برپا کر دیا۔ انہوں نے کڑپہ سے باجوڑ تک کے دشت و جبل کو کئی بار ہلا کر رکھ دیا۔ اس محاذ پر تو پانچ سال ہوئے کہ تلواروں کی جھنکار سنائی دے رہی ہے۔

اٹک سے قندھار تک کے سب پشتون، ننگ و ناموس کے تحفظ کے لئے یک جان دو قالب ہیں اِدھر اُدھر بے شمار معرکے ہوئے مگر یوسف زئی قبائل ٹس مس نہیں ہوتے۔ کتنے بے شرم ہیں یہ لوگ!

پہلی جنگ تہترہ پر ہوئی جس میں اکیس ہزار مغل فوج کام آئی۔ ان کی بہنیں، بیٹیاں اور قطار در قطار اونٹ، ہاتھی اور گھوڑے مالِ غنیمت کی طرح پشتونوں کے ہاتھ آئے۔

دوسری جنگ میر حسینی کی تھی جو دوآبہ میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں مغل کا سر سانپ کی طرح کچلا گیا۔ پھر میں نے نوشہرہ کی جنگ میں مغلوں پر اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

گنداب کے معرکے میں، ایمل خان نے جسونت سنگھ اور شجاعت خان کا بھیجا نکال باہر کیا۔

چھٹی لڑائی، خاپش میں لڑی گئی، جس میں مکرم خان اور شمشیر خان نے ایمل خان کے ہاتھوں شکست کھائی۔ میرے حافظے میں یہی بڑی بڑی اور اہم لڑائیاں محفوظ ہیں، چھوٹی چھوٹی بے شمار جھڑپیں اس کے علاوہ ہیں۔ اب تک تو دشمن پر ہم غالب رہے ہیں، آگے کا علم خدا کو ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر، کو ایک سال ہو گیا ہے کہ میرے مقابلے میں (لاؤ لشکر سمیت) ڈیرے ڈالے پڑا ہے، باطن میں اس کا دل زخمی اور ظاہر میں بڑا پریشان ہے۔ سال بھر میں کتنے امراء آئے اور ہزیمت اٹھا کر تباہ ہوئے۔ سپاہیوں کی تباہی کا تو کچھ نہ پوچھو۔

اب تو ہندوستان کے خزانے، ''پختونخوا'' (پشتونوں کے علاقہ) میں بکھیرے جا رہے ہیں اور اشرفیوں کے توڑے کوہستانوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ حالات نے جس طرح پلٹا کھایا ہے یہ تو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

بادشاہ کی بد نیتی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بد نیتی ہی کے طفیل اس نے اپنے باپ کو ایذا پہنچائی، اب اس پر کسی کو اعتماد نہیں رہا۔ وہ بدنیت بھی ہے، بدعہد بھی اور عیار و مکار بھی۔

اب درمیانی راستہ کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ یا تو مغل صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں گے یا پھر پشتون خوار و ذلیل۔

اس وقت ۔۔ غیرت تقاضا کر رہی ہے کہ، اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے، پشتون غیرت کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ کوئی اور منصوبے بنا رہے ہیں تو یہ ان کی کم فہمی ہے۔ تلوار کے بغیر دوسری کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو لوگ باہم متحد ہو جاتے ہیں، تو پھر بادشاہ بھی ان کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔(3)

خوشحال خان اپنے اس لوک بیانیہ کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے:

(پختون) اس کٹھن مرحلے میں اپنے ننگ و ناموس کی فکر نہیں کرتے تو آخر میں سوائے پچھتاوے کے کچھ بھی ہاتھ آنے کا نہیں۔ اگر دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زیست نہ گزرے تو پھر میرے خیال میں ایسی بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

(دنیا فانی ہے) (انسان) ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ (البتہ) خوشحال خٹک کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

''جمادی الاول کے مہینے کی پہلی تاریخ تھی، اور سال 1086ء تھا جب میں نے برموؔل میں یہ اشعار لکھے''۔ (اس واقعہ کا مادہ ء تاریخ ''غفو'' ہے۔(4)

یہ لوک بیانیہ صدیوں پر محیط ہے۔ اقبال نے اپنے شاہینوں کا تصور یہیں سے لیا۔ ان معرکہ آرائیوں میں خوشحال خان ہمیشہ فتح یاب نہیں رہا۔ گنبد کے مقام پر اسے شکست بھی ہوئی۔ لیکن وہ پھر پلٹا، جھپٹا اور ڈوڈھ کے مقام پر اس نے مغلوں کے حامی قبیلے بنگش کو عبرتناک شکست دی۔ پشتون لوک بیانیہ میں اس جنگ کی بے حد اہمیت ہے۔ ڈوڈھ کوہاٹ کے جنوب مشرق کی طرف نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ خوشحال نے اس جنگ کا احوال لڑائی کے تیسرے دن ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور جب جنگ تمام ہوئی وہ یہ مصرعے لکھ رہا تھا۔

" گنبد' کی شکست کا غصہ اب جا کے اترا، جب خدا نے مجھے ڈوڈھ کے محاذ پر فتح دی"۔

''ڈوڈھ کے محاذ پر جب قتلِ عام ہوا تو سارا قلعہ خون میں نہا گیا تھا، اس قلعے کی تسخیر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، نہ ہی اتنی آسانی سے اسے سر کیا جا سکتا تھا، کیونکہ پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر شدہ یہ قلعہ کوہاٹ کے قلعے سے بھی زیادہ مضبوط اور نا قابلِ تسخیر تھا مگر اللہ کے حکم سے یہ کام صرف دو دن میں انجام پایا۔

اسی طرح خدا کے فضل سے ایک ہفتے میں سات قلعے ہمارے قبضے میں آ گئے۔ (اس محاذ پر) جب مریخ نے آسمان پر تلواروں کی جھنکار سنی ہوگی، تو اس پر بھی خوف سے لرزہ طاری ہو گیا ہو گا۔ بندوقوں کے داغنے سے نیلے رنگ کا جو دھواں نکلا اس نے آٹھویں آسمان کا اضافہ کر دیا تھا۔ خٹکوں کے نیزے زرہوں سے اس طرح پار ہو رہے تھے جیسے خیمہ دوز کی سوئی خیام سے، اور بنگش فوج کے تمام گھڑ سوار سپاہی خٹکوں کے نیزے کھا کھا کر مرنے لگے، اگرچہ تلواروں، تیروں (اور نیزوں) کی کمی نہیں تھی، مگر پھر بھی اکثر جوان (آمنے سامنے آ کر) دست بدست ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

(میرے) صدر خان نے اس محاذ سے پہلے کبھی جنگ کا میدان نہ دیکھا تھا۔ مگر آج اس نے بھی اپنے نیزے کو لہو میں رنگ لیا تھا، شاہین جب اپنا ٹھکانا چھوڑ کر محو پرواز ہوتا ہے، تو اپنی نگاہوں سے کونجوں کو پیغام دیتا ہے۔ (ڈوڈھ کی فتح سے) گنبد کی شکست کے سارے داغ دھل گئے، چاہے وہ زخموں کے داغ تھے، یا ہزیمت اور طعن و تشنیع کے۔

ڈوڈھ کی لڑائی میں، سردار عنایت، ملک میر اور اس کے دوسرے سنگی ساتھی اس طرح چٹ کر لئے گئے جیسے نمکِ طعام۔ (شکست کے بعد) اب بنگش کے لئے صرف کاشتکاری اور مویشی چرانا باقی رہ گیا ہے۔ اب وہ اپنی تلواریں نیام میں رکھ لیں، جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے، وہ کم عقل ہے۔

اگر بنگش میں غیرت و حمیت ہوتی، تو میں ان کے بھرے باغ سے ایک بادام بھی نہ توڑ سکتا۔ اب ان پر غم و الم کے ایسے پہاڑ ٹوٹے ہیں، کہ اہلِ کوہاٹ کے لئے روزِ روشن بھی شام بن گئی ہے۔ بنگشوں کے قافلے، کوہاٹ سے (کوچ کرتے کرتے) پشاور تک پھیل گئے ہیں۔

(اے خوشحال) اگر گنبد میں میرا پاؤں پھسل گیا تھا، تو کوئی بات نہیں، میں نے ہمت تو نہیں ہاری، میں اپنی حمیت میں ثابت قدم ہوں، میرا وہ جام جو، گنبد میں خالی ہو گیا تھا، ڈوڈھ میں دوبارہ لبالب ہو گیا ہے اور میرے حصے میں وہی فتح مندی آئی جس کے خواب میں دیکھا کرتا تھا۔

گنبد کی لڑائی تو میں نے صرف پشتونوں کے ننگ و ناموس کی حفاظت کے لئے لڑی تھی۔ اس میں میرا کوئی ذاتی مقصد نہیں تھا۔ میرا لشکر اگر ڈوڈھ میں ڈیرے ڈال دیتا تو ہمیں دس گنا زیادہ فائدہ ہوتا۔ تاہم اس جنگ کی خبر صرف نام کے پختون نے بھی سنی ہوگی، تو وہ مسرت سے (ناچ اٹھا ہو گا) میری بہادری کی خبر ملک، بملک پہنچے گی۔ ہندوستانی رعایا کو جب میری بہادری کا علم ہو گا، تو ہر زبان پر میری ہی شہرت کے افسانے ہوں گے۔

اورنگ زیب اسلام کا بادشاہ کہلاتا ہے (مگر حقیقت یہ ہے) کہ اگر کوئی نام کا پشتون بھی قتل ہو جائے تو وہ

بڑا خوش ہوتا ہے۔" (5)

ہم دیکھتے ہیں کہ بنگش قبیلے کے خلاف اس جنگ میں خوشحال خان، اپنے حقیقی دشمن مغل بادشاہ اورنگ زیب کو نہیں بھولتا اور اسلام کا نام نہاد بادشاہ ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔

پشتو لوک بیانیہ اور سکھ حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت:

جب پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے پختونخواہ پر حملے کئے تو پشتونوں نے ڈٹ کر ان حملوں کی مزاحمت کی۔ پشتون لوک بیانیہ میں اس تاریخی مزاحمت کی کئی ولولہ انگیز داستانیں درج ہیں۔ یہ مزاحمت درباری تاریخوں میں درج نہیں ہے بلکہ عوامی شاعروں نے اپنے کلام کے ذریعے جو لوک بیانیہ تشکیل دیا ہے، یہ اس کا حصہ ہے۔ رنجیت سنگھ اور اس کے جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی صورت میں پنجابی سامراج کی یلغار کو قدم قدم پر روکا گیا۔ پشتون سپہ سالار سید اکبر شاہ نے 14 مارچ 1823ء کو پیر سباق (نوشہرہ) کے مقام پر رنجیت سنگھ سے ٹکر لی۔ اس معرکے میں یوسفزئی اور خٹک نوجوانوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ لیکن میدان سکھوں کے ہاتھ رہا۔

1834ء میں سکھوں نے پشاور پر قبضہ کرلیا۔ سلطان محمد خان بارکزئی کو پشاور سے بے دخل کر کے ہری سنگھ نلوہ کو پشاور کا گورنر بنادیا گیا۔ اسی ہری سنگھ کے نام پر خیبر پختونخوا کا شہر ہری پور یادگار ہے۔

سکھوں کا منصوبہ صرف خیبر پختونخوا پر قبضہ نہیں تھا بلکہ وہ پورے افغانستان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ جب سکھوں نے پشاور پر قبضہ کرلیا اور ہری سنگھ نلوا پشاور کا گورنر بن گیا تو اس الف لیلوی شہر کی بربادی کے واقعات عام ہوئے۔ ان دنوں افغانستان کا حکمران دوست محمد خان تھا۔ پشتو شاعر احمد گل نے اس پورے عہد کو اپنی شاعری میں قلم بند کیا ہے۔

"سکھوں سے جہاد کے لئے امیر دوست محمد خان غازی کابل میں تیار ہو چکا تھا۔ بادشاہ ابھی قندھار میں تھا لیکن اس کی فوج کا ہنگامہ یہاں برپا تھا۔

کہا جارہا تھا کہ دوست محمد غازی جہاد کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ لشکر اس کے جلو میں ہے۔ یا اللہ! تو اسے فتح عنایت فرما۔

ایک دن جب غازی محمد اکبر مورچے کے قریب پہنچا۔ تو اس کا دشمن مورچہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اے سردار! کلمہ کے ڈال کو اپنے ہاتھ میں تھام کر اسلام کی حفاظت کر۔ پھر اس نے بڑی دلیری سے جنگ لڑی۔

دشمن کے ساتھ میدان جنگ میں دو دو ہاتھ کئے اور پھر دیکھتے دیکھتے امیر دوست محمد خان کے سپاہی آگے بڑھے۔ اس وقت بندوقیں گولیاں برسا رہی تھیں۔ لیکن بہادر درانی اپنے فرض کی خاطر اپنے سر کٹوا رہے تھے۔ ہری سنگھ سب سے بڑھ کر سرکش دشمن تھا لیکن مجاہدین نے اپنی تیز تلواروں سے دشمنوں کا قلع قمع کیا۔

ہری سنگھ نے اپنی سرکار کو خط لکھا کہ سکھوں نے پنجتار کا رخ کیا۔ سارے لوگ ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور شہر کے سامنے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور اپنی مصری تلواریں بے نیام کر لی ہیں جو بجلی کی طرح چمکنے لگی ہیں۔

مجاہدین نے دشمن سے جہاد کر کے اسے نیست و نابود کیا۔ مجاہدوں نے سکھوں کے خلاف بیابانوں میں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔

میرا ایک مرشد ہے اور سارے رندمشرب لوگ ان کے قدموں میں پڑے ہوئے ہیں۔

احمد گل شاعر کے آتے ہی تمام شاعروں میں ہل چل مچ گئی۔ میری بھی خواہش ہے کہ ایک جہاد میں شامل ہو جاؤں۔ احمد گل غصے میں آیا ہے۔ اے حریف گیدڑو! ہٹ جاؤ (6)۔

اسی طرح وزیر اکبر خان کی سکھوں کے خلاف معرکہ آرائیوں کا ایک اور پشتو لوک بیانیہ قابلِ توجہ ہے۔

''میں نے جب یہ بات سنی، کہ اکبر خان کابل سے اسلام کا عظیم لشکر لے کر آ رہا ہے، تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

وزیر اکبر خان نے اپنے باپ سے کہا:۔ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ کفار کی فوجیں لاہور آ گئی ہیں اور انہوں نے ''پختونخوا (پشتونوں کی سرزمین) کی ناکہ بندی کر دی ہے۔

وزیر اکبر نے باپ سے رخصت جنگ لیتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنا مال اور سر خدا کی راہ میں قربان کر دیا ہے۔ میں سکھوں کا قلع قمع کر دوں گا۔ فتح پائے بغیر اگر میں واپس آ گیا تو مجھے اسلام کا فرزند نہ کہنا۔ دوست محمد نے بیٹے کا یہ شوق دیکھ کر کہا۔ آفرین ہے تم پر، خدا تمہیں دین و دنیا میں سرخرو رکھے۔ غزاا اور شہادت بہت بڑا مرتبہ ہے، جس کو یہ دولت مل گئی، اس کے وارے نیارے ہو گئے۔

کابل سے شاہینوں کے ڈار آ گئے۔ بے تابیء شوق میں وہ بغیر کسی آرام کے منزلیں طے کرنے لگے اور پھر ڈکے میں آ کر انہوں نے صلاح مشورہ کیا اور طے پایا کہ پشتون غیرت کا یہی تقاضا ہے کہ اسلام کو خطرے سے باہر نکالا جائے اور پھر سب نے اسی مقام پر ڈیرے ڈال دیئے اور دشمن پر شیروں کی طرح حملہ کر دیا۔ کافر ڈر اور خوف کے مارے گپھاؤں میں چھپ گئے اور اسلام کا بول بالا ہونے لگا۔(7)

اس لوک بیانیہ کے الفاظ سے یہ گمان ہوتا ہے، جیسے یہ کفر و اسلام کا معرکہ ہو، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ پشتون لوک بیانیہ کی روح یہ نعرہ ہے:

"وطن یا کفن"

اسی نعرے کے تحت وہ دو صدیوں تک مغلوں کے خلاف لڑتے رہے۔ پہلے بایزید انصاری اور اس کی تین پشتوں کی قیادت میں اکبر سے شاہجہان کے خلاف اور بعد میں خوشحال خان خٹک کی قیادت میں اسلام کے داعی مغل

شہنشاہ اورنگ زیب کے خلاف۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ پشتون لوک بیانیہ مذہبی تفرقوں سے بالاتر رہا ہے۔

کابل کا بادشاہ کسی جذبہء جہاد کے تحت سکھوں کے خلاف نہیں لڑ رہا تھا بلکہ وہ کابل میں اپنے تخت و تاج کو خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ پشاور پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ ہری سنگھ نلوا پشاور کا گورنر بن چکا تھا اور سکھ فوجیں جلال آباد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس لئے امیر کابل کے لئے وطن کا دفاع ناگزیر ہو گیا تھا اور اس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

پشتون لوک بیانیہ کا ایک اور ہیرو دلاسہ خان زندگی بھر سکھوں کے خلاف لڑتا رہا۔ اس کی دہشت سے سکھ بنوں جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ شاعر سراج نے سکھ جرنیل اور دلاسہ خان کے درمیان ایک مکالمے کو منظوم کیا ہے جو پشتون لوک بیانیہ کا قابل قدر حصہ ہے۔

"سکھ جرنیل نے کہا کہ میں عزت اور ناموس کی خاطر نکل آیا ہوں بہت سارے لوگ میں نے مطیع بنائے۔ اب دلاسہ خان کو مطیع بنانے جا رہا ہوں۔ اگر وہ خراج نہیں دے گا تو اس کا گھر بار اور قلعہ کو مسمار کر دوں گا۔ اگر وہ مجھے مل جائے تو جذبہ انتقام کی آگ میں اسے بن لوں گا۔

غازی دلاسہ خان نے کہا اے سکھ خبردار! میں تم سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ یہ لو میں تمہارے سامنے ہوں اور تمہارے خلاف جہاد کرنے سے میں خوش ہوتا ہوں کیونکہ مجھ پر اپنے مرشدوں کی نظر ہے۔ میں ہمیشہ کافروں پر فتح پاتا ہوں اور میں تمہارے کسی فرد کو اٹک اور پنجاب تک نہیں چھوڑوں گا۔

سکھ سردار نے کہا۔ دلاسہ خان میری اطاعت قبول کر اور ہمارے راجہ کے سامنے سلامی ہو جا۔ اپنے ارادے سے باز آ جا تو بنوں سے نیلاب تک سارا ملک تمہیں بخش دوں گا۔

غازی دلاسہ خان نے کہا کہ " مجھے مال اور ملک کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے خلاف جہاد میں شریک ہو گیا تو سیدھا جنت میں جاؤں گا ۔ ویسے بھی دنیا فانی ہے۔ ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور مٹی ہی میں جائیں گے"۔

سکھوں کا لشکر آ گیا اور دلاسہ خان اس کے سامنے ڈٹ گیا۔ دن رات لڑائی ہوتی رہی اور توپوں کی جنگ کا بھی دلاسہ خان جواب دیتا رہا۔ اس وقت ایک ایسا ہنگامہ برپا تھا جس کی وجہ سے بچے اور بچیاں بد حالی اور اضطراب میں مبتلا تھے۔ (8)

پشتون لوک بیانیہ میں مذہبی حوالے، مذہب کے پرچار کے لئے نہیں بلکہ تہذیبی اور ثقافتی قدر کے طور پر آئے ہیں جس کی بنیاد وطن کی مٹی سے محبت کی سرشاری ہے۔

انگریز اور پشتون لوک بیانیہ:

مغلوں اور سکھوں کی طرح انگریزوں کے خلاف بھی پشتون مزاحمت جاری رہی۔ انیسویں صدی کا

نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول اس مزاحمت کی درخشاں مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پہلے دونوں ادوار کے مقابلے میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کا دور کہیں زیادہ درخشاں ہے۔ بونیر (1863) چترال (1895) تیراہ (1897) ڈکہ، چکدرہ، گنداؤ (گنڈاب) کی جنگیں، ملا صاحب، ہڈہ، ملتان خان، عجب خان، چمنے خان اور فقیرا پی کے انگریز دشمن معرکے اس دور کی چند یادگار مثالیں ہیں۔

انیسویں صدی کے انگریز دشمن معرکوں میں بونیر کا معرکہ بے حد اہمیت کا حامل ہے جسے نواب نامی شاعر نے اپنے رزم نامے کا موضوع بنایا۔ یہ بونیر پر انگریز چڑھائی کا شاخسانہ تھا، جس کی امبیلہ کے مقام پر زبردست مزاحمت ہوئی۔ شاعر کے بول ہیں:

''انگریز کی آنکھوں تلے اس وقت اندھیرا چھا گیا۔ جب امبیلہ کے مقام پر مجاہدوں نے فرنگی لشکر کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔

امبیلہ پر انگریز نے لام بندی کا حکم دے دیا۔ اور فوجیوں کے دل کے دل آگئے۔ بونیر کے مجاہد بھی شہبازوں کی طرح چھا گئے۔ انگریز ان کا زور دیکھ کر حیران و پریشان تھا۔ جوانوں نے سرخ پٹیاں اور ڈھالیں سنبھالیں، ہر طرف شور قیامت برپا تھا، بندوقوں کی گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔

امبیلہ کی اس لڑائی پر انگریز پریشان تھا، وہ خطرے میں گھر چکا تھا۔ وہ جب مجاہدین کے جذبہء بے اختیار کو دیکھتے، تو ان کی آنکھیں گویا اندھی ہو جاتیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ ان کو ریزہ ریزہ کر رہی تھی۔ آخر میں ڈپٹی کمشنر نے کہا: اس مردِ خدا کے ساتھ ہم نہیں لڑ سکتے۔ یہ بڑا معتبر بزرگ ہے، دیکھتے نہیں کہ ہماری گورا فوج کونوں کھدروں میں چھپ رہی ہے۔ ہماری جان خطرے میں ہے۔ یہ ہمارا خانہ خراب کر دیں گے۔ ہم سب اس وقت ان کے محاصرے میں ہیں"۔(9) شاعر نے انگیریزوں کی بے بسی کا نقشہ زوردار الفاظ میں کھینچا ہے۔ "اے ہمارے مرشد": آپ کو اپنا یہ وطن اور یہ ملک و مال مبارک ہو اب تو سارے یوسفزئی بھی ایک جگہ مجتمع ہو کر مقابلے کے لئے آگئے ہیں، اور فائرنگ شروع ہو گئی ہے۔

انگریز جرنیل نے کہا۔: ہم پر تو قیامت گزر گئی، لشکر سارا پس کر رہ گیا پھر بھی ہم سوات کو تابع نہ کر سکے اب تو میرا دم گھٹا جا رہا ہے، لیکن ہم تو عجب خان کی تلاش میں ہیں۔ کاش وہ ہمیں مل جائے۔

برکلی کے برساتی نالے میں مجاہد ناصر خان نے، شام کے جھٹ پٹے میں انگریزی فوج پر حملہ کر دیا، انگریز تتر بتر ہو گئے کچھ وہاں سے دم دبا کر بھاگ نکلے، اور کچھ مارے گئے۔ کچھ بھگوڑوں نے جھاڑیوں میں چھپ کر اپنی جانیں بچائیں، بھگوڑے چمبیلہ اور امبیلہ کی طرف جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ مگر مجاہدین نے ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

فرنگی چھ مہینے تک سورکاوی کے مقام پر مقابلہ کرتا رہا، اس کے بے شمار فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے۔

انگریز امبیلہ کی جنگ چھیڑ کر کفِ افسوس مل رہے تھے، ان کے لئے سلامت بچ نکلنے کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں"۔ (10)

پشتو لوک بیانیہ میں جنگ چترال قصہ خوانی بازار کے قصوں میں مقبول ترین قصہ ہے، یہ جنگ انیسویں صدی کے اختتام پر برپا ہوئی جسے شاعر مُلا منصور نے ایک لافانی رزم نامہ بنا دیا۔ اس جنگ میں پشتون قبائل نے اگر چہ ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن کئی مواقع پر انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی۔

"انگریزوں نے پھر لام بندی کا حکم دے دیا ہے۔ دیکھو تو۔۔ وہ چترال پر چڑھائی کی فکر میں ہیں۔ درگئی میں ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہ تو، سوات اور بونیر پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

انگریزوں نے لشکر جمع کر لیا ہے، مالا کنڈ میں قتل و غارت ہو رہی ہے۔ غازیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ پھول کملا گئے ہیں۔ اس صدمے سے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں اسلام کی برتری چاہتا ہوں، میں اسی فکر میں ڈوبا ہوا ہوں، بس ایک شہزادہ طالب ہے جس کا چہرہ مشعل کی طرح روشن ہے۔

شہیدوں کے چہرے (خون سے) گلزار ہیں، وہ عشق کی آگ میں ستی ہو رہے ہیں۔ جنگ، خار، اور بٹ خیلہ تک آ پہنچی ہے۔ تمام خوانین آپس میں مشورہ کر رہے ہیں۔ ان کو اپنی جان و مال کی سلامتی چاہئے، کتنے کم عقل ہیں، جو دشمن کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ گناہگار ہیں۔

یہ دشمن کو اپنے گھر لے گئے اور افسروں کے ساتھ ملی بھگت کر کے ایک جرگہ منعقد کیا مگر غازیوں کا تکیہ صرف خدا کی ذات پر ہے، وہ توکل کر کے میدان غزا میں کود پڑے، مگر دشمن نے پُل توڑ دیا۔ پُل کے ٹوٹنے سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

محمد شاہ خان کمک کو پہنچا اور جب غازی دوسرے حملے میں چکدرہ تک جا پہنچے، تو ہڈے کا مرد میدان (ملا صاحب ہڈے والے) بھی تشریف لے آئے۔

(یہ دیکھ کر) شینواری قبیلہ بھی میدان میں آ گیا۔ مگر باجوڑ کے لوگ عورتوں کی طرح صرف اپنا سنگار کرتے رہے۔

عمرا خان کی بہادری میں تو شبہ نہیں، مگر اس کے پاس جنگ کا سامان نہیں تھا، وہ کیسے میدان میں آتا۔

رحمت خلیل قبیلے پر خدا کی رحمت ہو، کہ وہ سر پر کفن باندھ کر جنگ میں کود پڑا۔ سید و شریف کے غوث پر سلام، سارے سوات میں وہی ایک مرد مجاہد ہے، باقی سب فضول، البتہ ایک رسالدار جس کا نام حیات ہے، شجاعت میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ بہت اچھا جرنیل ہے۔ اس کی تلوار کی دھاک لندن تک بیٹھی ہوئی ہے۔ اس پر اللہ کا خاص فضل و کرم ہے۔ اللہ اسے جنت الفردوس عطا کرے۔

مُلا مقصود شاعر اپنے خدا سے یہی دعا مانگتا ہے۔(11)

مُلا مقصود نے اپنے رزم نامے میں مُلا صاحب ہڈہ کی بہادری اور جفاکشی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا نام مولانا

نجم الدین اخوانزادہ تھا لیکن ہڈّہ کی نسبت سے مُلا ہڈّہ کہلاتے ۔ جیسے بعد میں گاؤں اپی کی نسبت سے فقیرا پی مشہور ہوئے ۔ مُلا صاحب ہڈّہ صحیح معنوں میں صاحب علم و عمل تھے ۔ وہ زندگی بھر انگریزی استعمار کے خلاف معرکہ آرا رہے ۔ شاعر محی نے ان کے ایک معرکے کو اپنی ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے:

''کالے پہاڑوں سے پشتونوں کے غول کے غول، کوہستانی شیروں اور بھو کے شہبازوں کی طرح اتر آئے ہیں، اے خدا تو ان کی مدد کر۔''

اس کی خنجر کی دھاک بیٹھ گئی ہے، جنت کے حور و غلمان، اس کے خنجر کی دھار پر اپنی جانیں نثار کر رہے ہیں ۔ آسمانوں پر شور احسنت برپا ہے ۔

چمر کنڈ کے سیاہ پہاڑوں میں، انگریزوں کا کچومر نکل رہا ہے، (وہ مجاہدین میں ایسے گھر گئے ہیں) کہ راہِ گریز مفقود ہو گئی ہے ۔

تلواریں، انگریز کے لہو سے سرخ ہو گئی ہیں، انگریز خاک و خون میں لت پت ریزہ ریزہ پڑا ہے ۔۔

غازی درّوں میں شہبازوں کی طرح گھوم پھر رہے ہیں اور دشمن قفس میں گرفتار ہو چکا ہے ۔

اے کمشنر! میدان چھوڑ کر بھاگ کیوں رہا ہے، ذرا سامنے تو آ، غازی تیرا انتظار کر رہے ہیں ۔

محی شاعر، دین کے جوش و جذبہ میں، طوطی کی طرح چہچہا رہا ہے، وہ دشمن کو زچ کر دے گا ۔ اگر وہ جاہل دشمن اس کے سامنے آ گیا تو ۔؟

مُلاّ ہڈہ صاحب کو، اے خدا غیبی قوت عطا کر، وہ دشمن کو ضرور قائل کر دیں گے اور اپنے مددگاروں کو راہ راست دکھا ئیں گے ۔

آن کی آن میں وہ دشمن کو آگ کے شعلوں میں ستی کر دیں گے ۔ ان کے گاؤں اجڑ جائیں گے، وہ دشمن کا نام و نشان مٹا دیں گے ۔

حضرت صاحب بڑی طاقت اور زور رکھتے ہیں، بڑے بڑے جنگجوان کی شمشیر کے جوہر پہچان گئے ہیں ۔ یہاں تک کہ لندن میں فرنگی بھی حضرت کی تلوار کا لوہا مانتے ہیں'' ۔(12)

ملتان خان بیسویں صدی کے ایک اور پشتون سورما ہیں ۔ ہندوستان میں برطانوی سامراجی حکومت ملتان خان کو ایک ڈاکو قرار دیتی تھی ۔ حکومتی مشینری اسے گرفت میں لانے کے منصوبے بناتی مگر کسی طرح کامیاب نہ ہو پاتی ۔ لیکن بالآخر اس پر قابو پا ہی لیا گیا ۔ بقول شاعر عبدالغنی:

''زوال کا وقت تھا، کہ اس پر خزاں آ گئی اور سوئیزئی کے پاس ملتان کو گولی لگی غالباً اس کی زندگی کا پیالہ بھر چکا تھا ۔

کرنا خدا کا ۔۔۔ وہ ننگرہار سے روانہ ہوا ۔ بڑے آرام کے ساتھ منزلیں طے کر رہا تھا ۔ ملتان خان اپنے

گروہ کا سردار تھا۔اس کے شیر خصلت ساتھی قلعہ کی طرح اس کو گھیرے ہوئے تھے۔
ان کو ڈاکہ زنی کا شوق تھا۔ وہ ہمیشہ اسی کام میں مصروف رہتے تھے مگر کبھی وہ کسی کے چنگل میں گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ملتان کی تلوار کی دھاک ہندوستان تک بیٹھی ہوئی تھی۔
فرنگی بھی اس کے وار سے خوفزدہ تھے، کیونکہ اس نے شہر کے بڑے مالدار صرافوں کو لوٹا تھا۔اس لئے وہ اس کے سر کے دشمن بن گئے تھے۔میں عبدالغنی تاحیات ملتان کی تعریف میں رطب السان رہتا ہوں۔(13)
درّہ آدم خیل کے بوستی خیل کی یونس شاخ سے تعلق رکھنے والا عجب خان آفریدی پشتون لوک بیانیہ کا ایک اور درخشاں ستارہ ہے۔نو جوانی کے دنوں سے ہی وہ انگریز دشمن سرگرمیوں کا آغاز کر چکا تھا۔ان سرگرمیوں کو قائم رکھنے کے لئے اسے جدید اسلحہ کی ضرورت تھی۔اس سے پہلے اس نے کوہاٹ میں پہرہ دینے والے ایک سنتری پر حملہ کر کے بندوق چھینی۔نومبر 1919ء میں کوہاٹ میں 13 لانسر کے گارڈ روم پر حملہ کر کے بہت سا جدید اسلحہ قبضے میں لے لیا۔اس سے قبل اس نے افغان امیر جنرل نادر خان کو ٹل پر حملہ کرنے میں مدد اور رہنمائی فراہم کی تھی۔12 اکتوبر 1920ء کو کوہاٹ چھاؤنی سے دو گھوڑے ہتھیا لئے۔اگلے ہی ماہ اس نے اپنے بھائی شہزادہ خان اور دیگر ساتھیوں کی مدد سے کرنل فوکس اور اس کی بیوی کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔مزاحمت کے دوران انگریز افسر مارا گیا جب کہ اس کی بیوی شدید زخمی ہوئی اور چند روز بعد انتقال کر گئی۔انگریزوں کے اغوا سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان کے بدلے ہندوستان میں تحریک آزادی کے قیدیوں کو رہائی دلا سکے۔ان چند واقعات نے عجب خان کو انگریزوں کی نظر میں ہوّا بنا دیا۔چند روز بعد کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کرنل بروس سے اس کا سامنا بھی ہوا۔جس نے عجب خان کے ٹل پر حملے میں ملوث ہونے اور کوہاٹ چھاؤنی کو لوٹنے کے الزامات لگائے۔اس واقعہ سے عجب خان کی انگریز دشمنی انتہا کو پہنچ گئی۔فروری 1923ء میں عجب خان نے پولیس لائن کوہاٹ کے اسلحہ خانہ پر حملہ کر کے 46 بندوقیں چھین لیں۔اب کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے عجب خان اور اس کے بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے گھر پر دھاوا بول دیا اور چادر اور چار دیواری کی حرمت تک کو روند ڈالا۔جب عجب خان واپس اپنے گاؤں آیا تو اس کی ماں نے اسے بزدل اور بے غیرت ہونے کے طعنے دیئے۔ٹوپی کے شاعر جمشید کے قصے ''عجب خان آفریدی ۔ نر پختون'' میں ماں اپنے بیٹے سے یوں مخاطب ہوتی ہے۔:

''راوی کے مطابق عجب خان جب گھر پہنچا
ماں کے حضور آداب وتسلیمات بجالایا
ماں نے کہا دفع ہو جاؤ میری نظروں سے
بے غیرت ہو تم، تمہیں قبر میں دفن ہونا چاہئے
مجھے (تم نے) قبیلہ بھر کی نظروں سے گرا دیا ہے

میں سب کے سامنے شرمندہ ہوں

فرنگیوں نے ہماری عزت پر وار کیا

خواتین کی ستر پوشی کا خیال بھی نہیں رکھا

جوانوں کی رائفلیں بھی ساتھ لے گئے

اگر تم سچ مچ میرے فرزند ہو

تو فرنگی سے علی الاعلان بدلہ لو

اگر تم نے نامردی کا مظاہرہ کیا

تو پھر میں تمہاری موت پر آنسو نہیں بہاؤں گی

نہ تمہارے چہرے پر کفن دیکھنا گوارا کروں گی

نہ تمہیں وطن میں دفن ہونے دوں گی

پشتون مائیں جب بہادر اولاد کو جنم دیتی ہیں

تو ان کی غیرت کے باعث باپ دادا کا نام روشن ہو جاتا ہے''۔(14)

عجب خان نے اپنے بھائی شہزادہ خان کے ساتھ مل کر انگریز افسروں پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اپنے اہل خانہ کو تیراہ کے مقام ماموزئی بھیج دیا اور کوہاٹ چھاؤنی کے چکر لگانے شروع کیے۔ ایک روز اس نے رائل آرٹلری کے دو افسروں کو سائیکلوں پر کمپنی باغ سے قلعہ بالا حصار کی طرف جاتے ہوئے ان پر حملے کی کوشش کی۔ دونوں افسران اپنی سائیکلیں وہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اب عجب خان نے میجر ایلس کی بیٹی کے اغوا کا منصوبہ بنایا۔ محمد عظیم آفریدی کے مطابق:

''13 اپریل 1923ء کو عجب خان، شہزادہ خان، حیدر شاہ اور گل اکبر کی معیت میں کوہاٹ روانہ ہوا۔ دن کو وہ کوہاٹ کی ایک مضافاتی بستی شاہ پور میں ٹھہرے اور رات کو انہوں نے میجر ایلس کے بنگلے پر ہلہ بول دیا۔ عجب خان نے بنگلے میں داخل ہو کر اپنے ساتھیوں کے لئے بنگلے کے دروازے کھول دیئے۔ مس ایلس اسی دن رات 8 بجے گھر واپس آئی تھی اور کھانا کھانے کے بعد ایک کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھی۔ سونے سے قبل اس نے خود ہی گھر کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے۔ رات کے بارہ بجے جب سارا کوہاٹ سکون سے محوخواب تھا عجب خان میجر ایلس کے بنگلے میں داخل ہوا تو اس وقت مس ایلس اور اس کی ماں دو پیوستہ چارپائیوں میں مچھر دانی کے نیچے سو رہی تھیں۔(5) عجب خان اور اس کے ساتھی پہلے ایک خالی کمرے میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد عجب خان ہاتھ میں ٹارچ لئے مسز ایلس کے کمرے میں گیا لیکن مسز ایلس نے اسے دیکھتے ہی ٹارچ پر ہاتھ مارا اور ساتھ ہی سیٹی بجائی(16) عجب خان کی خواہش تھی کہ اس حملہ میں میجر ایلس کے گھر کا کوئی فرد ہلاک یا زخمی نہ ہونے پائے لیکن مسز

ایلس کے شور وغل کی وجہ سے ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا اور شہزادہ خان نے غلط فہمی کی بنا پر مسز ایلس پر خنجر کا وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ چونکہ مسز ایلس نے ایک مرد کی طرح مزاحمت کی تھی اس لئے شہزادہ خان نے رات کی تاریکی میں اسے میجر ایلس خیال کرتے ہوئے اس پر خنجر کے پے در پے کئی وار کئے۔ شہزادہ خان پر یہ حقیقت کہ اس نے مرد کی بجائے عورت کو قتل کیا ہے اس وقت عیاں ہوئی جب مسز ایلس کے سر کے بال اس کے بازوؤں پر آ کر گرے (17)

عجب خان، مس ایلس کو لے کر بنگلے کے پچھلے راستے سے باہر نکلا اور پٹڑی پر چلتا ہوا خوشحال گڑھ کے گاؤں شیخاں پہنچ گیا۔ مس ایلس کے اغوا کی خبر چار سو پھیل گئی۔ خیبر پختونخوا کی تمام مشینری حرکت میں آ گئی لیکن عجب خان مختلف راستوں سے ہوتا ہوا ایلس کو لے کر تیراہ میں اپنے گھر پہنچ گیا اور تین روز تک وہاں قیام کیا۔ تیراہ وہ مقام تھا جہاں اکتوبر 1897ء میں 84 ہزار کی ہر طرح سے مسلح اور منظم فوج آفریدیوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔ انگریزوں نے عجب خان پر براہِ راست حملہ کرنے کی بجائے قبائلی جرگوں کی مدد حاصل کی۔ انگریزی حکومت نے عجب خان کی شرائط کو تسلیم کیا جس کے بعد مس ایلس کو رہائی نصیب ہوئی۔ اس لوک بیانیہ کا اہم ترین حصہ مس ایلس کا وہ بیان ہے، جو اس نے اپنی رہائی کے بعد دیا۔

"مس ایلس نے رہائی کے بعد عجب خان کی سیرت، اخلاق اور حسن سلوک کی بہت تعریف کی اور اس بات کی تصدیق کی کہ عجب خان نے اسے نگاہِ بد سے نہیں دیکھا۔" فروری 1983ء میں جب مس ایلس مسز مالی ویڈ کی حیثیت سے 60 سال بعد پشاور آئی تو اس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگرچہ اس کا اغوا اور اس کی والدہ کا قتل ایک ناخوشگوار اور المناک واقعہ تھا لیکن وہ عجب خان کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ جنہوں نے قید کے اذیت ناک ایام میں اس کا ہر طرح خیال رکھا تھا۔ اسی طرح مسز سٹار نے اپنی طبی رپورٹ میں یہ حقیقت تسلیم کی کہ نہ تو مس ایلس کو کسی قسم کی اذیت دی گئی اور نہ اس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا۔ مسز سٹار کی یہ رپورٹ اور مس ایلس کا بیان عجب خان کی اعلیٰ سیرت اور بلند کرداری کا ثبوت ہے۔ جس پر پٹھان اپنا سر فخر سے اونچا کر سکتے ہیں۔ (18)

انگریز حکومت نے جرگہ میں طے شدہ شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عجب خان کی گرفتاری کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور ناکامی پر درہ آدم خیل کے قبائل کے خلاف فوجی کاروائیوں کی دھمکیاں دیں اور ان گھروں کو جلا دیا گیا جہاں ان قبائل نے عجب خان کو پناہ دے رکھی تھی۔ انگریز حکومت زندگی بھر عجب خان کا پیچھا کرتی رہی لیکن اسے گرفتار نہ کر سکی اور وہ جولائی 1961 میں طبعی موت مرا۔

پشتون لوک بیانیہ کا ایک اور اہم کردار چمنی خان تھا۔ سکندر خان کے گھر جنم لینے والا تاج محمد خان اپنی بہادری اور جیداری کے سبب چمنی خان کہلایا۔ لیکن جرأت اور بہادری کی منفرد ترین مثال فقیر ایپی کی ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار علی خان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایپی کی جامع مسجد کا امام تھا۔ ایپی گاؤں بنوں

سے کچھ گھنٹے سفر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس واقعے کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ایک ہندو لڑکی اور ایک مسلمان وزیری کی وجہ سے امام مسجد راتوں رات امام مسلمین بن گئے۔ مرزا علی خان ان وزیری پختونوں میں سے ہیں، جنہوں نے انگریزوں کے خلاف انتہائی جوش و جذبے سے جنگ کی۔ بعد میں برطانوی مورخین نے انہیں ''فقیرا اپی'' کا نام دیا۔ اسلام کا علم بلند کیے صرف ایک تلوار اٹھائے فقیر ''اپی'' پہاڑوں سے طلوع ہوا اور برطانوی فوجیں اپنے تمام تر جدید اسلحے اور ہتھیاروں کے باوجود اس کی جنگی کارروائیوں کو محدود نہ کر سکیں۔

فقیرا اپی کا تذکرہ ہمیں دو جگہ ملتا ہے۔ ایک تو برطانوی فوجی کارروائیوں کی تاریخ میں دوسرے پختونوں کی کہانیوں کی روایات میں جو سینہ بہ سینہ چلتی ہیں اور جن کے ذریعے پختون اپنی تاریخ کو زندہ رکھتے۔

کہا جاتا ہے کہ 1936ء میں رام کور نور علی شاہ کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ ان کی شادی اسلامی طریقے سے ہوئی اور رام کور کا نام اسلام بی بی رکھا گیا۔ تاہم اس کے ہندو والدین نے تھانے میں رپورٹ درج کروادی۔ پولیس نے اسلام بی بی اور نور علی شاہ کو جلد ہی گرفتار کرلیا۔ مقدمہ بنوں کی عدالت میں پیش ہوا۔

اسلام بی بی نے عدالت میں تسلیم کیا کہ اس نے اپنی رضا سے نور علی سے شادی کی ہے۔ عدالت نے اس بنا پر اس کی گواہی کو مسترد کر دیا کہ وہ ابھی نابالغ ہے۔ اس طرح نور علی شاہ پر لڑکی کو اغوا کرنے کا الزام لگایا گیا عدالت نے اسے قصور وار ٹھہرایا اور تین سال قید کی سزا دی۔ لڑکی کو اس کے ہندو والدین کے حوالے کر دیا گیا۔ جو مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے لے کر ہوشیار پور روانہ ہو گئے۔ اسی دوران بنوں میں مسلمان احتجاجاً سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت نے ایک شادی شدہ مسلمان عورت کو اس کے کافر والدین کے حوالے کر کے اسلام کی توہین کی ہے۔

یہاں سے حاجی مرزا علی خان کہانی کے منظر پر نمودار ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ برطانوی حکومت کے اس مذموم فعل کے خلاف لڑیں۔ جس کے ذریعے برطانوی حکومت نے اسلامی اقدار کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ قیدی نور علی 18 مہینے بعد رہا کر دیا گیا اور اس کے خاندان والوں نے عدالت کے فیصلے کو مد نظر رکھتے ہوئے اور آئندہ مشکلات سے بچنے کے لئے جھٹ پٹ اس کی قبائلی لڑکی سے شادی کر دی مگر نور علی گھر سے بھاگ کر اسلام بی بی کی تلاش میں ہوشیار پور پہنچ گیا۔ اس کے بعد اس کا کیا بنا کوئی نہیں جانتا۔

وزیری پختونوں میں یہ کہانی اسی طرح بیان کی جاتی ہے۔ انگریزوں کا سرکاری ریکارڈ کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ مگر کسی بھی چیز کا تحریر میں ہونا اس بات کی سند نہیں کہ لکھی ہوئی بات سچ ہی ہوگی۔ برطانوی ریکارڈ اور پختونوں میں مشہور کہانی میں کئی اختلافات ہیں۔ برطانوی حکومت کے خلاف فقیرا اپی کے جہاد کو کسی اور ہی رنگ میں دیکھا گیا ہے اور اسلام بی بی کا نام بھی بدل دیا گیا ہے۔

برطانوی ریکارڈ کے مطابق چاند بی بی کو ایک وزیری نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ چاند بی بی اور اس کا میاں جو ہندو تاجر تھا بنوں میں رہتے تھے۔ اغوا کرنے والے نے اسے مجبور کیا کہ وہ اسلامی طریقے کے مطابق اس سے شادی کر لے۔ شادی ہوگئی اس پر چاند بی بی کے ہندو شوہر نے بنوں عدالت میں حقوق زن وشوئی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ وہ مقدمہ جیت گیا۔

اس قسم کے اغوا کے واقعات صوبہ سرحد میں عام تھے اور عمومی طور پر اس طرح کے معاملات وزیری جرگہ اور پولیٹیکل آفیسر مل کر حل کر لیتے تھے۔ مگر چونکہ مغویہ کا شوہر معاملات عدالت تک لے جا چکا تھا اس لئے ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ نتیجتاً اس واقعے کو بہت شہرت ملی اور مسلمان قبائل نے اس پر بہت احتجاج کیا۔ فقیر اپی نے موقعہ غنیمت جانا اور مذہب کو بنیاد بنا کر برطانویوں پر حملہ کر دیا اور کچھ ہی دنوں میں وزیری بغاوت کا لیڈر بن گیا۔ فقیر اپی کی خوش قسمتی تھی کہ پہلے ہی کچھ عرصہ سے قبائل حکومت کی پالیسیوں کے خلاف غصے میں بھرے بیٹھے تھے اس واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وزیرستان جنگ کی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

آج بھی کوئی وزیری برطانوی ریکارڈ کو خاطر میں لانے اور ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ وہ وثوق سے کہتے ہیں کہ لڑکی کا نام چاند بی بی نہیں تھا اور وہ شادی شدہ ہرگز نہیں تھی۔

ایک برطانوی تاریخ دان چارلس ملر نے لکھا ہے "1936" کے موسم گرما میں ایک وزیری بنوں آیا۔ اپنی چرب زبانی اور خوبصورتی استعمال کرتے ہوئے یا اپنے ہتھیاروں کی دھمکی سے یا دونوں کو استعمال کرتے ہوئے اس نے ایک شادی شدہ عورت چاند بی بی کو مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور اسلامی قوانین کے تحت اس سے شادی کر لے۔ چاند بی بی کے ہندو شوہر نے عدالت میں وزیری پر اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا اور اپنی بیوی کی واپسی کا مطالبہ کیا۔''

یہاں یہ خواہش ابھرتی ہے کہ چیزوں کو تاریخی حوالے سے دیکھا جائے۔ ایک مسلمان مرزا علی خان مسجد کا امام تھا اور کسی حد تک تنہائی کی زندگی گذار رہا تھا۔ اسلام بی بی کے واقعے کو اس نے اس طرح استعمال کیا کہ وہ راتوں رات مسلمانوں کا لیڈر بن گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کس میں اتنا جگرا ہے کہ وہ تاریخی حوالوں سے اس واقعے پر غور کرے۔

وزیری کہتے ہیں۔ ''ان لوگوں نے ہمارے ماضی کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ فقیر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کام کرنے والا انقلابی تھا۔ کوئی دیوانہ نہیں تھا۔ تاہم یہ بات وہ بھی مانتے ہیں کہ فقیر اپی توری خیل کے وزیروں میں سے ایک عام سا آدمی تھا۔ وہ 1890ء کے قریب قریب پیدا ہوا اور 1936ء میں اپی کی چھوٹی سی مسجد میں امام بن کر آیا۔ اپی بنوں اور وزیریں ٹوچی کی وادی کے درمیان واقع ہے تب تک اس نے خاموشی سے مذہبی زندگی گذاری تھی اور کبھی کسی سیاسی معاملے میں ملوث نہ ہوا تھا بلکہ عبدالغفار خان نے برطانویوں کے خلاف جو بھی سیاسی اقدام کئے تھے ان میں اس نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

فقیرا پی کا قد چھوٹا تھا اور کئی برسوں سے وہ اپنے مذہبی فرائض ادا کرتا آیا تھا۔ اسلام بی بی والا واقعہ اس کی شہرت کا نادر موقعہ تھا جو اس نے ضائع نہیں کیا۔

انتھونی کلے ٹن کہتا ہے "فقیرا پی کی شروعات بہت اچھی تھیں۔ وزیروں میں اس کے بہت سے پیروکار تھے اور محسود بھی اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس وقت براعظم میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس بے چینی کو اس مذہبی اپیل نے ہوا دی۔ اس نے فلسطین میں برطانوی پالیسی پر بہت تنقید کی"۔

جو آگ فقیرا پی نے لگائی اس کے تیزی سے بڑھنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ فقیرا پی نے اپنے آپ کو ایک شادی شدہ مسلمان عورت کی واپسی تک ہی محدود نہیں کیا۔ بلکہ اس نے برطانوی حکومت کے مذہبی معاملات میں مداخلت کے طریق کار کو ہدف ملامت اور تنقید کا نشانہ بنایا۔ اسے نوجوان پرجوش پیروکار ملے۔ جنہوں نے سولہ سال پہلے وزیروں کی برطانوی حکومت کے مقابلے میں ہار نہیں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ قبائلی لوگوں میں یہ تبدیلیاں برطانوی حکومت کی گرفت کی کمزوری کی آئینہ دار ہیں۔ یہ تاثر انڈین نیشنل کانگریس کے پروپیگنڈے نے اور مضبوط کر دیا۔

اس طرح فقیرا پی نے پہاڑوں میں رہنے والوں کے ہتھیار نیاموں سے باہر کر دیئے اور اپنے پیروکاروں کی فوج کا فیلڈ مارشل بن گیا۔

آج بھی وزیری فقیرا پی کا نام تعظیم سے لیتے ہیں۔ وہ اسے پختون غیرت کی علامت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس نے کافر حملہ آوروں کے خلاف اپنے لوگوں اور اپنی زمین کے دفاع کے لئے ہتھیار ننگے کر لئے تھے۔

فقیرا پی کا پیغام جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا گیا اور انتظامیہ مجبور ہوگئی کہ توری خیل ملکوں سے کہے کہ یا تو فقیرا پی کو ختم کر دیں یا اسے نکال باہر کریں۔ ملکوں نے کہا کہ وہ برطانوی مدد کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔ انہیں یہ بھی خوف تھا کہ اگر برطانوی حکومت نے مدد دے بھی دی تو شاید فقیرا پی نے عام لوگوں میں جو جوش وجذبہ بیدار کر دیا تھا اس کی وجہ سے عوام ان کی مخالفت کریں گے۔

نومبر 1936ء میں انگریزوں کو اطلاع ملی کہ فقیر خیسورہ وادی میں جو بنوں اور رزمک کے درمیان واقع ہے، موجود ہے۔ دو فوجی کالموں، ایک رزمک اور ایک بنوں سے، کو حکم دیا گیا کہ وہاں موجود حکومت کے حمایتی قبیلوں کی حفاظت کریں۔ بنوں سے روانہ ہونے والی فوج کو فرنٹیئر کور میں نیا نیا بھرتی کیا گیا تھا۔ مگر ان کے ساتھ آرٹلری نہیں تھی۔ جب انہوں نے فقیرا پی کو گھیرنے کی کوشش کی تو انہیں غیر متوقع طور پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ فقیر کے پیروکاروں نے دو راتیں انہیں محصور کیے رکھا اور جب آخر کار فوج نے حملہ کیا تو فوج کے ساتھ جانور گھبرا گئے۔ سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ دسمبر 1936ء اور جنوری 1937ء میں مزید لڑائیاں ہوئیں، جب انگریزی فوجوں نے جگہ جگہ خیسورہ کے علاقے میں آگ لگانا شروع کی اور سڑک بنانے کی کوشش جاری رکھی۔ 22 دسمبر کی لڑائی میں بھی 22

ویں رجمنٹ کے بہت سے لوگ مارے گئے۔

''مارچ سے دسمبر 1937ء تک فقیرا پی کے خلاف جو فوج بھیجی گئی۔اس کی تعداد بڑھتی گئی۔اس وقت اپی نے تقریباً 50,000 برطانوی اور ہندوستانی فوج کو مصروف رکھا تھا۔فوج کا مقصد یہ تھا کہ فقیر کے ساتھیوں کو ایک جگہ اکھٹا دیکھ کر ہی حملہ کیا جائے تا کہ ان کا جانی نقصان زیادہ ہو اور وہ آخر کار فقیر کو گرفتار کر سکیں۔ان کا خیال تھا کہ اگر وہ ایک اچھی سڑک بنانے میں کامیاب ہو جائیں جو ہر طرح کے موسم میں کام آسکے اور اس کے ذریعے وہ فقیر کے ہیڈ کوارٹر تک رسائی حاصل کر سکیں تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔

نمبر 60 سکوارڈن واپی ٹس کی بمباری کا مقابلہ کرنے کے بعد فقیرا پی نے غاروں میں پناہ لے لی تھی۔ جہاں تک فقیرا پی کے ساتھیوں کو ایک جگہ اکھٹا کرنے کا سوال تھا،فوج کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔مگر جب بھی فقیرا پی کو گرفتار کرنے کا موقع آتا تو وہ چکنی مچھلی کی طرح ان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔اگر چہ 1937ء میں فوج نے اس بری طرح یہ موقع گنوایا کہ وزیروں کے ایک بڑے قبیلے نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ فقیر کا ساتھ نہیں دیں گے۔

وزیری آج یقین سے کہتے ہیں''فوج اسے کبھی گرفتار نہیں کرسکتی۔کبھی نہیں۔''

جنرل نے فیصلہ کیا کہ وہ مزید آگے بڑھے گا اور فقیرا پی کو گرفتار کرلے گا۔جاسوسوں نے خبر دی کہ فقیر مشرق کی طرف بارہ میل دور ایک غار میں رہ رہا ہے۔فوراً ہی پیش قدمی ہوئی اور جنگ شروع ہوئی۔جب جان ماسٹرز اور اس کے آدمی ان غاروں میں پہنچے جہاں فقیرا پی روپوش تھا تو انہوں نے غار کو خالی پایا۔اگر چہ غار کا منہ اپی کے چولہے کے دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا۔

''غار کے منہ سے ابھی دھواں نکل رہا تھا اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اس کو یہاں سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں گذری۔انگریز فقیرا پی کے فرار کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ارسل کوٹ پر قبضہ ہو گیا اور اسے تباہ و برباد کردیا گیا مگر فقیرا پی ایک بار پھر جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔''

فقیرا پی ایک داستانی ہیرو تھا۔انہوں نے قیام پاکستان کے بعد بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ان کے متعلق پشتو زبان میں متعدد منظوم قصے اور کہانیاں لکھی گئیں۔نسل در نسل سینہ بہ سینہ زبانی روایات ان کے علاوہ ہیں۔ان کے بارے میں لکھی جانے والی شاعری آج بھی زندہ ہے اور وزیر حجروں میں آج بھی گائی جاتی ہے۔ایک گیت کی چند سطور بطور نمونہ پیش ہیں۔

''اے سرزمین وزیرستان کے امیر !اے عظیم کہستانوں کے درویش !اے حاجی سلطان!

وزیرستان،تیری ذات کی برکت سے گلزار ہے۔تجھ پر رب غفور کا کرم ہے۔تو بدر منیر ہے،تو تجلیات کا مظہر ہے،تو ہمیشہ انگریز کے ساتھ برسر پیکار رہا۔تو نے ہمیشہ اسلام کے ننگ و ناموس کی حفاظت کی،اے عظیم کہستان کے درویش !ہماری تمنا ہے کہ تو کبھی متغیر نہ ہو۔

تو وہ عالم باعمل تھا، جو پشتون بھی تھا، اپنے دین پر قائم بھی تھا، اور بے مثل و بے نظیر بھی، اے کہستان کے عظیم درویش! تیرے لئے میمیں (انگریز خواتین) لندن میں اشک افشانی کررہی ہیں اور کف افسوس مل رہی ہیں ان پر تیری تلوار کے جوہر آشکارا ہیں۔ اے کہستانوں کے فقیر درویش، اے حاجی اے سلطان۔" (18) بیسویں صدی پشتون لوک بیانیہ کے حوالے سے بہت بڑی صدی ہے۔ اس صدی کے دوران کئی تحریکیں چلیں، ہجرت تحریک، خلافت تحریک، پشاور سازش مقدمے اور 1930ء میں قصہ خوانی بازار پشاور میں ہونے والا قتل عام، ہم یہاں تحریک خلافت اور قصہ خوانی بازار کے قتل عام پر روشنی ڈالتے ہوئے پشتون لوک بیانیہ کی حکایت مکمل کریں گے۔ تحریک خلافت سے قبل ترکوں اور انگریزوں کی جنگ میں برصغیر پاک و ہند اور خاص طور پر خیبر پختونخوا کے عام لوگوں کی تمام ہمدردیاں ترکوں کی جدوجہد آزادی کے ساتھ تھیں۔ ملا مسرور کوہاٹی نے اس جنگ کو اپنے لوک بیانئے کا حصہ بنایا ہے۔ یہ وہ مشہور جنگ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا تھا۔

"طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں"

مسرور کوہاٹی کی نظم سے اگرچہ مذہبی شدت پسندی اور جہادی جذبات کا اظہار ہوتا ہے پھر بھی اس کے سامراج دشمن لہجے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

"ترکی کے سلطان پر، کفار کی یلغار ہے۔ شاید امام مہدی آخر زمان کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے۔
اے خدا! روم کا دبدبہ اور جلال ہمیشہ قائم رہے اور فرانس اور روس اس کی غلامی کی زنجیروں میں مدام جکڑا رہے۔
کفار نے طرابلس پر حملہ کردیا ہے اٹلی نے بھی ہوس ملک گیری میں لشکر کشی کردی ہے، سلطان ترکی نے اعلان جنگ کردیا ہے۔
اے لوگو! کمریں کس لو اور سد سکندر بن جاؤ اور پھر ترکوں نے مصر کی پارلیمنٹ میں درخواست گزاری۔
لارڈ کچنر نے اپنا سارا زور صرف کردیا، اور ترکوں پر سارے راستے بند کردیئے۔ ترک فوج مصر میں گھر گئی، اس غم سے میرے آنسو بہہ رہے ہیں۔
اے اللہ! کچنر کو دوزخ کا ایندھن بنا۔

کچنر کی تدبیر سے ترکی فوج کو مصر میں پسپائی کا منہ دیکھنا پڑا، اور وہ مصر سے واپس لوٹ گئی، ترک سپاہیوں کا ارمان جہاد دل ہی میں رہ گیا۔ انور بیگ کی اشکباری کو دیکھو، ترکوں کا یہ عظیم جرنیل، ایک فقیر اور قلندر کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ بادشاہ روپوش تھا۔ مگر یہ جرنیل، مرد میدان کی طرح، کوہ و بیابان میں ڈٹا ہوا تھا۔ وہ میدان کارزار میں اتر آیا۔ خدایا! ترکوں کے خنجر کو آبداری بخش۔۔ کیونکہ انور بیگ تیرے نام پر قربان ہورہا ہے۔ کافروں کا زور ہے جرنیل انور بیگ نے اپنا سر اسلام پر قربان کردیا ہے۔ شیخ سنوسی کو انور بیگ کی شہادت کی خبر پہنچائی گئی۔ ترک جھنڈا ہمیشہ اونچا رہے اور فرانس و روس اس کے غلام رہیں۔

شیخ سنوسی نے کفار کے قتل کا فتویٰ دے دیا اور قاصد کے ذریعے عام لام بندی کا اعلان کر دیا۔ ہر مرید کو تیر تفنگ سے مسلح کر کے کہا۔ وہ شخص ہرگز مومن کہلانے کا مستحق نہیں، جو جنگ سے کنارہ کشی کرے۔ مسلمانوں کا چھ لاکھ کا لشکر کوہستانوں اور میدانوں میں پھیل گیا۔ شیخ کا ہر مرید نیزے لئے سینہ سپر ہو کر میدان میں نکل آیا۔ دشمن قتل ہونے لگے اور کفر کا جھنڈا سرنگوں ہو گیا۔ ملت کفر پر خدا کی لعنت ہو۔

اس کی اس سازش پر لعنت ہو، اٹلی کے کنگ اور اس کے وزیر پر بھی لعنت ہو۔ یہ لعین، شیروں کو گیدڑوں سے اور شاہینوں کو زاغوں سے مرواتے ہیں۔ غازیوں نے اس جوش سے حملہ کیا کہ ہزاروں گوروں کو زنجیروں میں جکڑ لیا۔

وہ شیر کی طرح کافروں پر جھپٹے اور مالِ غنیمت میں، مالی، اسباب، توپیں، بندوقیں، گھوڑے اور اسلحہ بھی لائے، اٹلی کے شاہ کو جب خبر پہنچی تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اس کی فوج کا نام ونشان تک نہ رہا۔
طرابلس میں شیطان کو کامیابی نہ ہو سکی۔
جب ربِ غفار کا غضب نازل ہوا، تو کافر آگ میں جلنے لگے، ان کے خون سے صحرا رنگین ہو گئے۔ دشمن کو اپنے لشکر کا شمار تک یاد نہ رہا۔ موت کا فرشتہ ہر ایک کو للکار رہا تھا۔
یونان کے قد آور خوار وزار ہو گئے، مانٹی نیگرو، ترکوں کی تلوار کی چمک دمک سے فریاد کرنے لگے۔
بلقان کا لشکر، کٹ پتلیوں کی مانند ہے، ترکوں پر فتح کی امید لے کر آیا ہے۔ ان لعینوں کی آرزوؤں کا کاسہ ہمیشہ خالی رہے گا۔
کفر کا یہ خالی جام، بے غیرتی سے لبالب اور شیطان رجیم دائمی لعنت میں گرفتار ہی بھلا لگتا ہے۔
انور بیگ کے ہاتھوں، میں نے دشمنوں کو کچلا ہوا دیکھا، ان کا پایہ تخت اجڑا ہوا پایا، اسلام کی فتح ونصرت ہی بھلی لگتی ہے۔ جس طرح دلربا کے ساتھ وصل کی گھڑی۔
جرنیل عبداللہ۔ تعریف کے لائق ہے، مختار پر خدا کی رحمت ہو، دشمن کا خانہ خراب انہی بہادروں کے سبب سے ہوا۔
اے سرور، اللہ کی حمد وثنا کر دشمن کے گھر صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ تو ہمیشہ دین اسلام پر درود وسلام بھیجا کر، فرانس اور روس ہمیشہ اس کے زیر نگیں رہیں۔"

'قصہ خوانی بازار کا سانحہ خیبر پختونخوا کے لوک بیانیہ کا انمٹ باب ہے جسے سامراجی حکمرانوں نے اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی تردید لوک بیانیہ کی زبانی روایات سے ہو جاتی ہے۔ یہ 1930ء کا پشاور شہر ہے۔ جس کی آبادی تقریباً اسی ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ شہر کے اردگرد بڑی بڑی دیواریں ہیں جن کے درمیان وقفوں وقفوں سے بڑے بڑے دروازے ہیں۔ بڑی بڑی گلیاں 30 سے 40 فٹ تک چوڑی ہیں۔ لیکن ان

کے درمیان تنگ گلیاں بھی ہیں، جن کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ چونکہ شہر چٹانوں پر بنایا گیا ہے۔ اس لئے کچھ گلیاں تو بالکل ہی عموداً اوپر کو چڑھتی ہیں۔ وہاں ہمیشہ لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ان میں سب سے اہم قصہ خوانی بازار ہے۔ جو کوئی آٹھ سو بیس گز لمبا اور چالیس فٹ چوڑا ہے۔ یہ مغربی دیوار کی طرف سے کابلی دروازہ سے ہوتا ہوا شہر کے بالکل وسط تک جا پہنچتا ہے۔

یہ 23 اپریل 1930ء کی بات ہے کہ خان عبدالغفار خان اور کچھ دوسرے کانگریسی رہنماؤں کو بے چینی پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ جوں ہی ان کی گرفتاریوں کی خبر پشاور شہر میں پھیلتی ہے تو ہنگامے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہزاروں لوگ سرخ قمیصیں پہنے باہر نکل آتے ہیں اور ہر اس کپڑے کو سرخ رنگ سے رنگ دیتے ہیں جو ان کے ہاتھ لگتا ہے شہر میں فوج کو طلب کرلیا جاتا ہے اور ٹینک تنگ گلیوں کے درمیان گشت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک برطانوی سپاہی کو چھرا گھونپ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ شاہی گڑھوالی رائفلز کی دو پلاٹونوں کو قصہ خوانی بازار میں لوگوں پر کھلی فائرنگ کا حکم دے دیا جاتا ہے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ انہیں غیر مسلح کر دیا جاتا ہے اور انہیں برطانوی فوجیوں کی نگرانی میں دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پھر برطانوی سپاہی ہجوم پر فائر کھول دیتے ہیں اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہلاک ہو جاتی ہے۔

کیا یہی وہ سب کچھ ہے جو اس دن کو یاد رکھنے کے قابل بناتا ہے۔ شاید نہیں۔ تاریخ دان کو ابھی اس میں بہت سی وضاحتیں شامل کرنا ہیں اور شاعر کو ابھی اس واقعے کی دل سوزی کا اظہار کرنے کے لئے شعر کہنے ہیں۔ اس واقعے کی کڑیاں اس تحریک سے جا ملتی ہیں جو در حقیقت بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے بیس اپریل 1930ء کو اپنی پختگی کا اظہار کیا۔

بیس اپریل کو خان عبدالغفار نے ایک بہت بڑے جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا جو بظاہر آزاد سکول کی برسی منانے کے لئے منعقد کیا جانا تھا تاہم حکام کے خیال میں اس بغاوت آمیز ڈرامے کا مقصد حکومت کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرنا تھا۔ دو دن تک پورے صوبے سے آئے ہوئے نمائندگان کے درمیان بحثیں چلتی رہیں اور بہت سے گاؤں سے سرخ قمیصیں پہنے اور سرخ جھنڈے اٹھائے کئی وفود پشاور پہنچ گئے۔ لیکن جلسے کے انعقاد سے دس دن پہلے باچا خان جن کو کار کے ذریعے پشاور پہنچانا تھا تا کی پولیس تھانہ نے گرفتار کرلیا اور انہیں چارسدہ لے آئے۔ اسی دوران مہاتما گاندھی نے ڈانڈی میں نمک سے متعلق قانون کو توڑنے کا اعلان کیا اور ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ نمک سے متعلق قانون کی فنی اور رسمی خلاف ورزی شروع ہو گئی ہے تو ہر شخص جو عدالتی چارہ جوئی کا متحمل ہوسکتا ہے ہر اس موزوں جگہ پر نمک بنا سکتا ہے جہاں وہ اس کی خواہش رکھتا ہے۔

باچا خان کے سوانح نگار ٹنڈولکر کا کہنا ہے کہ اس سے سارے ملک میں سنسنی پھیل گئی۔ کلکتہ، دہلی، مدراس، الہ آباد، لاہور، پشاور میں ہزاروں لوگوں نے برطانوی قانون کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پشاور شہر کی تقریباً تمام آبادی

نے نمک سے متعلق قانون کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ کانگریس نے شاہی باغ میں نمک بنانے کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام کے رہنما علی گل خان تھے۔ شام تک باغ میں بیس ہزار کے قریب لوگ جمع ہو گئے اور وہاں نمک کا نیلام شروع ہو گیا۔ جو سو سے دو سو روپے فی پیکٹ تک گیا۔ شاہی باغ ایک بڑی عوامی ریلی کی آماجگاہ بن گیا۔ ایک مشہور لیڈر رحیم بخش غزنوی نے کھلی بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے کہا ''میں خدا کے سوا کسی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا اور اس لمحے سے اپنے باغی ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔''

اس افسوس ناک صورت حال تک پہنچنے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ پانچ اپریل کو کانگریس کی مقامی کمیٹی نے شراب کی مقامی دکانوں کے ارد گرد پکٹنگ کا فیصلہ کیا۔ شراب کے کچھ ٹھیکیداروں نے کانگریس کے لیڈروں سے درخواست کی کہ انہیں پندرہ دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ موجودہ اسٹاک ختم کر سکیں۔ کانگریس کمیٹی نے شراب کے ٹھیکیداروں کو بتایا کہ پکٹنگ کا کام 23 اپریل سے شروع کر دیا جائے گا۔ اس عمل کو روکنے کے لئے حکام نے نو نمایاں لیڈروں کو سحری کے وقت ان کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ دن کے وقت جب لوگوں کو گرفتاریوں کا پتہ چلا تو وہ کانگریس کے دفتر گئے تو معلوم ہوا کہ دو اور کانگریسی رہنماؤں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے ہیں۔ ابھی پکٹنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس کے ردعمل کے طور پر شہر بھر میں خود بخود ایک ہڑتال کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نو بجے صبح جب لوگ پکٹنگ کرتے رضا کاروں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ تو اس وقت پولیس کا ایک سب انسپکٹر اپنے مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ کانگریس کے دفتر میں آیا اور مزید دو کانگریسی رہنماؤں کے وارنٹ گرفتاری پیش کئے۔

دونوں رہنما خبر ملنے پر دفتر سے باہر آئے اور پولیس کی لاری میں بیٹھ گئے وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ سب انسپکٹر دوسری لاری منگوانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ گرفتار شدہ رہنماؤں نے اسے بتایا کہ وہ خود ہی رضا کارانہ طور پر پولیس تھانہ پہنچ جائیں گے۔ سب انسپکٹر رضا مند ہو کر چلا گیا۔ دونوں رہنما ایک بڑے جلوس کے ہمراہ کابلی گیٹ تھانے پہنچ گئے۔ تھانے کا دروازہ بند تھا ڈیڑھ گھنٹے کی کوششوں کے بعد تھانے کا دروازہ کھل سکا اور ایس ایس پی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار باہر آیا۔ اسے دیکھ کر لوگوں نے قومی نعرے لگائے۔ وہ ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی دونوں لیڈر تھانے کے اندر چلے گئے اور ہجوم انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا منتشر ہو گیا۔ اس دوران شہر میں صورت حال تیزی سے بگڑ رہی تھی اور عوام میں بے چینی اور غصہ پھیل رہا تھا اچانک دو آرمرڈ کاریں تیزی کے ساتھ آئیں اور نتائج کی پروا کئے اور کوئی وارننگ دیئے بغیر ہجوم پر چڑھ دوڑیں۔ کئی لوگ کچلے گئے، کافی زخمی ہوئے اور ان میں سے کچھ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ لوگ بالکل غیر مسلح تھے۔ نہ ان کے پاس لاٹھیاں تھیں نہ کلہاڑیاں اور نہ ہی پتھر اور اینٹیں۔ لوگوں نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا اور خاموشی سے مرنے والوں کی لاشیں اور زخمیوں کو اکٹھا کر لیا لیکن ڈپٹی کمشنر نے آرمرڈ کاروں کو کھلی فائرنگ کا حکم دے دیا۔ کئی لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے اور اس طرح ہجوم کو کافی پیچھے دھکیل دیا گیا۔ ہجوم منتشر ہونے کے لئے تیار تھا بشرطیکہ اسے آرمرڈ گاڑیوں

کے فوجیوں کی فائرنگ کے نتیجہ میں زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں کی لاشیں اٹھانے کی اجازت دے دی جاتی۔ اس کے لئے انہوں نے وہاں سے آرمرڈ کاروں اور فوجیوں کو ہٹانے کا مطالبہ کیا لیکن حکام نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ نتیجتاً لوگ منتشر نہ ہوئے۔ گولیاں کھانے اور جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب دوسری بار فائرنگ شروع ہو گئی جو وقفوں وقفوں سے تین گھنٹے سے زائد عرصے تک جاری رہی۔

یہ ہے اصل کہانی جو عینی شاہدوں نے بیان کی ہے لیکن نو آبادیاتی دانشور اسے کچھ اور ہی طرح سے بیان کرتے ہیں۔ آرتھر سونسن اپنی مشہور کتاب میں لکھتا ہے کہ بدقسمتی سے دو موٹر سائیکل سواروں نے آرمرڈ کاروں کا پیچھا کیا تھا اور ان کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر آرمرڈ کاروں کی طرف سے موٹر سائیکل سواروں پر فائرنگ کی گئی جس کے نتیجہ میں ایک شخص ہلاک ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد مسلح کار کے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اس کی لاش کو ڈھانپنے کی کوشش کی اور اس تیزی میں اس کی کار کچھ لوگوں پر چڑھ گئی جس کے نتیجے میں سارا مجمع مشتعل ہو گیا اور انہوں نے اینٹوں، پتھروں اور کلہاڑیوں سے مسلح کاروں پر حملہ کر دیا۔

اس بلوے کو دیکھتے ہوئے گھوڑ سوار پولیس نے ایکشن لینے کی کوشش کی لیکن ان کے گھوڑوں کو لاٹھیاں مار مار کر بھگا دیا گیا۔ اب ہجوم اور زیادہ دلیر ہو گیا اس نے ایک سوار کے جسم پر پٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دی۔ اس طرح مشتعل ہجوم نے ایک آرمرڈ کار کو بھی آگ لگا دی۔ اس دوران ڈپٹی کمشنر ایک پتھر لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکا تھا لیکن اس کے اسسٹنٹ نے اس سے اجازت لے کر آرمرڈ کاروں کو فائر کرنے کا حکم دے دیا اور گولیاں چلنے لگیں۔ جونہی ان کی سب مشین گنوں سے گولیاں نکلیں تو ہجوم سے چیخیں بلند ہوئیں اور وہ دیوانہ وار قصہ خوانی بازار کی طرف بھاگے جبکہ مسلح کاروں نے ان کا پیچھا کیا اب صبح کے گیارہ بج چکے تھے اور اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر کو پشاور بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ٹیلی فون پر یہ پیغام موصول ہوا کہ بے چینی والا علاقہ چھوڑ کر کابلی گیٹ کی طرف جایا جائے۔ لیکن اب بھی ہجوم بار بار ان مسلح آتشیں کاروں پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھتا رہا تھا اور انہیں آگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا رہے تھے اور سارے شہر میں بغاوت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا جس سے عام طور پر پرامن شہری بھی قاتل کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ سارا منظر وحشیانہ طاقت اور بے رحمی دکھا رہا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ سارا منظر خوفناک ہو چکا تھا اسی قسم کا اظہار فضل قیوم نے اپنے گیت میں کیا ہے جو دلما ہیٹسن اور ممتاز ناصر کی کتاب قصہ خوانی بازار کے قصہ گو میں شامل ہے۔

"میں آپ کو عزت اور وقار کی کہانی سناتا ہوں پروانہ ہمیشہ شمع کے لئے جل مرتا ہے۔
قصہ خوانی بازار میں اس قدر خون بہا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہم کسی قصائی کی دکان سے گزر رہے ہوں۔
وہاں پر اموات گنی جا سکتی تھیں اور ہر طرف سرخ خون بہہ رہا تھا۔
گورے ہر ایک پر فائرنگ کر رہے تھے اور وہاں سے دن کی روشنی میں بھی کوئی نہیں گزر سکتا تھا۔ یہ ایک

نا قابل فہم بات تھی۔ کافر انگریز اس قدر بے رحمانہ طریقے سے پیش آ رہے تھے غاصب حکمرانوں نے ظلم کی انتہا کر دی تھی۔

وہ غیر مسلح پٹھانوں پر گولیاں چلا رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ ایک بھوری داڑھی والے بزرگ نے جو اپنے کندھے پر ایک بچہ اٹھائے ہوئے تھا جب اس ظلم کو دیکھا تو اس کا خون کھول اٹھا،

اس نے بچے کو زمین پر اتارا اور دشمنوں پر حملہ کر دیا کیونکہ پروانہ خود ہی شمع کے ارد گرد جلتا ہے۔

میں اس باریش بزرگ کی جرأت دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ وہاں گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

بوڑھے اور بچے دونوں کو گولیاں لگیں اور وہ ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے زمین پر گر گئے۔

ایک انگریز کباڑی بازار سے گزر رہا تھا

اسے دیکھ کر میرا غم تازہ ہو گیا۔ وہ قصہ خوانی چوک سے باہر آ رہا تھا۔

ہاتھ میں پستول تھا اس نے اسے نکالا اور فائرنگ شروع کر دی اسے اس لڑکے پر غصہ آ گیا تھا جس نے ایک برطانوی سپاہی پر حملہ کر دیا تھا۔"

اب ہم دوبارہ تاریخ کے حوالوں کی طرف پلٹتے ہیں۔ کچھ شاہدوں کے مطابق مرنے والوں کی تعداد تین سو سے چار سو کے لگ بھگ تھی اور زخمی ہونے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ تقریباً چھ بجے شام پولیس نے کانگریس کے دفتر پر چھاپا مارا اور وہاں سے پارٹی کے جھنڈے اور نشان اتار دیئے گئے رات کو انہوں نے ان دو لاشوں کو بھی وہاں سے ہٹا دیا جو کہ خلافت کے دفتر میں لائی گئی تھیں۔ انہیں ساری رات ایک قریبی سکول میں رکھا گیا۔ سہ پہر تک شہر کے تمام دروازوں کے باہر آہنی جنگلے نصب کر دیئے گئے اور آہستہ آہستہ فوجی دستوں نے شہر کے مرکز تک گھس کر وہاں اپنا کنٹرول بحال کر لیا اس رات اور 24 تاریخ والے دن پشاور شہر پر فوج کا قبضہ رہا اور کچھ وقت تو یوں لگتا تھا کہ ایک دوسرا بڑا فساد ہونے والا ہے۔

25 اپریل کی رات کو انتظامیہ نے اچانک نہ صرف فوج کو ہٹا دیا بلکہ عام پولیس کو بھی واپس بلا لیا گیا۔

28 اپریل کی رات کو پولیس دوبارہ ظاہر ہوئی اور اس نے رضا کاروں سے کنٹرول واپس لے لیا۔ لیکن امن بحال نہ ہو سکا۔ کیونکہ معاملہ زیادہ بگڑ گیا جب شہر پر قبضے کا دوبارہ حکم دے دیا گیا۔

4 مئی کی صبح کو پہلا فوجی دستہ نمودار ہوا اور جلد ہی سارے شہر کو فوج کی تحویل میں دے دیا گیا۔

19 مئی کو یادگار کو گرا دیا گیا جس جگہ پر یہ "یادگار" کھڑی کی گئی تھی۔ اس پر اس طرح سیمنٹ کر دیا گیا کہ کوئی نشان باقی نہ رہ سکے۔

جلد ہی گورنمنٹ کو احساس ہو گیا کہ اس دفعہ اس کا سامنا ایک ایسی قومی تحریک مزاحمت سے ہے کہ جس

کی شدت اور اولوالعزمی کا ہندوستان کی کسی بھی تحریک سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حکومت سلیمان انکوائری کمیٹی قائم کرنے پر مجبور ہوگئی۔ حالانکہ حکومتی تشدد کے صرف پندرہ دن بعد کانگریس کی طرف سے قائم کی جانے والی کمیٹی کو صوبہ سرحد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کمیٹی کے اجلاس ایک ہفتہ تک راولپنڈی میں منعقد ہوتے رہے۔ کمیٹی کے سامنے 79 شہادتیں پیش ہوئیں۔ اس کے علاوہ بھی کمیٹی نے کئی ایک بیانات ریکارڈ کئے۔ ڈی جی ٹنڈولکر کا کہنا ہے کہ کمیٹی کی تیار کردہ رپورٹ پر جلدی میں پابندی لگا دی گئی۔ پھر بھی اس کی کئی کاپیاں مختلف جگہوں پر پہنچ ہی گئیں۔

پٹیل رپورٹ میں باچا خان کے گاؤں میں ہونے والے واقعات کو ایک عینی شاہد نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''13 مئی 1930ء کو صبح تین بجے جب کہ ابھی اندھیرا ہی تھا، پولیس نے اتمان زئی کا محاصرہ کرلیا۔ صبح ہونے پر ڈپٹی کمشنر برطانوی اور ہندوستانی فوجیوں کے ہمراہ گاؤں میں داخل ہوا، وہ سیدھا خدائی خدمت گار تحریک کے دفتر کی طرف بڑھا اور اس دکان کا دروازہ توڑ دینے کا حکم دیا جس کے اوپر خدائی خدمت گار تحریک کا دفتر تھا۔ پھر وہ اوپر بالکونی میں آیا اور خدائی خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ باہر نکل آئیں اور اپنی سرخ یونیفارم اتار دیں۔ لیکن انہوں نے جواب دیا کہ وہ سرخ وردیاں اتارنے کی بجائے مرجانے کو ترجیح دیں گے۔ ایک خدائی خدمتگار کے سینے پر ریوالور رکھ کر ڈپٹی کمشنر نے اسے سرخ وردی اتارنے کے لئے کہا تو اس نے کہا'' صاحب یہ ناممکن ہے۔ کسی پٹھان کے کپڑے اس وقت تک نہیں اتارے جا سکتے جب تک وہ زندہ ہے۔'' اس پر ڈپٹی کمشنر نے اس پر گھونسے برسانے شروع کر دیئے اور دوسرے سپاہیوں نے اسے بندوقوں کے بٹ اس وقت تک مارے جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں اس کے کپڑے اتار دیئے گئے اور اسے بالکل ننگا کر دیا گیا۔ اسی طرح ایک ایک کر کے ہر خدائی خدمت گار کو شدید مارا پیٹا گیا اور ان کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ اس مار پیٹ کے دوران ایک چودہ سالہ لڑکا ولی جو کہ عبدالغفار خان کا دوسرا بیٹا تھا وہاں کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے گرج کر اس سے پوچھا ''تم کون ہو؟'' ولی نے چیختے ہوئے جواب دیا۔ ''میں خان عبدالغفار خان کا بیٹا ہوں'' اس پر ڈپٹی کمشنر نے اسے گالی دی ایک برطانوی سپاہی نے اپنی بندوق ولی پر تان لی۔ لیکن ایک مسلمان سپاہی نے مداخلت کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک اور برطانوی سپاہی جو پاس ہی کھڑا تھا آگے بڑھا لیکن حسن خان جو کہ گرفتار شدہ لوگوں کا انچارج تھا اس نے لڑکے کو ہاتھوں میں اٹھایا اور قریبی مسجد میں چھلانگ لگا دی تو اس طرح لڑکے کی جان بچ گئی۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ کس طرح سپاہیوں نے خدائی خدمت گاروں کے دفتر کو آگ لگا دی اور سارے گاؤں میں تباہی پھیلائی۔ انہوں نے لوگوں کو وضاحت کا موقع بھی فراہم نہیں کیا اور ہر اس شخص کو گرفتار کرلیا جو سرخ قمیص پہنے ہوئے تھا۔

اور درحقیقت اب ہی تو اصل لڑائی شروع ہوئی تھی کیونکہ انتقام کے شعلے اب قبائلی علاقوں تک پھیل چکے تھے۔

پشتون محقق محمد افضل رضا کے مطابق:

''جب انگریزوں نے اٹک کے اس پار بھی ڈیرے جمائے تو ان کی حریص نگاہیں افغانستان پر پڑیں۔ وہ کافی عرصہ سے اس کوشش میں تھے مگر جب امیر شیر علی خان کا دور آیا تو فرنگیوں نے خوب زور لگایا اور افغانستان کی سر زمین پر قندھار کی جانب سے داخل ہوئے اور جنگیں شروع کیں۔ اس دفعہ فرنگی زیادہ زور و شور سے آئے تھے، بڑی توپیں ساتھ لائے تھے اور رسالے روانہ کئے تھے۔ مسلمانوں کے لئے ان کی نیت اچھی نہ تھی۔ مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ تھا اور وہ کفار کے مقابلے کے لئے تیار تھے۔ پشتون مائیں، بہنیں اور بیٹیاں پرانے زمانے میں پشتون مردوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتیں۔ میوند نامی میدان جنگ میں بھی پشتون عورتیں غازیوں کے ہمراہ تھیں اور ان میں ایک ملالہ بھی تھی(19)

قندھار کی جنگ میں میوند کی فاتح ملالہ کے لئے شاعر نے کہا ہے:

ملالے کی زلفوں کے لئے میوند جبین بنا
سبز تِل والی! آفرین ہو تجھ پر کہ لشکر کو مات دی

''سال 1297ھ تھا۔ شب برات کی 17 تاریخ تھی۔ فرنگی فوج میوند کے صحرا میں پڑی ہوئی تھی، ہر ساز و سامان سے لیس، کھانے پینے کی چیزوں سے سیر، سخت گرمی کا موسم تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی، زمین گرم توے کی طرح تھی۔ ملک گرم تنور تھا۔ پتھر گرمی سے پھٹ رہے تھے، باد گولے نظر آرہے تھے۔ ہوا سرخ شعلہ بنی ہوئی تھی، پانی نہ تھا اور کہیں یہ کنواں یا چشمہ تھا تو اس پر دشمن کا قبضہ تھا مسلمان غازیوں کے پاس پانی ختم ہوگیا۔ پیاس سے ہر ایک کی زبان باہر نکلی تھی۔ گلے خشک، ہونٹ سفید، ہر ایک کا دم نکلا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود کمر بستہ کھڑے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ دین کے دشمن، انسانی آزادی کے دشمن کو ملک سے نکال باہر کریں لیکن دشمن کا زور زیادہ تھا۔ وہ ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا اور لڑ رہا تھا۔ آخر جب غازیوں کی پیاس بڑھی تو کہتے ہیں کہ بعض نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دل ہارے، میوند میں بھی مسلمان بھاگنے لگے اور پیچھے کی طرف چلے گئے۔ پیچھے ان کی عورتیں تھیں۔ ان میں ایک لڑکی نے سر اٹھایا اور اپنے آپ سے کہا یہ تو کام خراب ہوا۔ یہ لڑکی ملالہ تھی۔ ملالہ، ملی غیرت اور پشتو کی علامت۔ جلدی سے عورتوں کے درمیان سے غازیوں کی جانب چل پڑی، قریب گئی، بہادر، دلیر اور شیرنی، ایک جرنیل ہی کی طرح تہہ دل سے نعرہ لگایا

اے پشتون بہادرو!!

ہر جنگجو پشتون کے کان تک یہ نعرہ پہنچا اور جنگ میں ملالے کی طرف دیکھنے لگے۔ ملالہ نے دل کے جوش

سے یہ مصرعہ کہا:

اگر میوند میں شہید نہ ہوئے

تو خدا کی قسم بھائی تمہیں بے عزتی کے لیے زندہ چھوڑا جا رہا ہے۔

ملالہ کے اس مصرعے کا ایک ایک حرف ہر غازی کے دل پر تیر کی طرح لگا اور جب یہ مصرعہ ختم ہوا تو جلدی سے بپھری شیرنی کی طرح دشمن کی طرف دوڑی اور دوڑتے ہوئے یہ دوسرا مصرعہ پڑھا:

اپنے بھائی کے خون سے چہرے پہ تل لگالوں گی

تاکہ سبز باغ میں سرخ گلاب کو شرمندہ کروں

شکست خوردہ مسلمان غازیوں کا جذبہ غیرت موجزن ہوا، کھڑے ہوئے ٹوٹے دل جڑ گئے جیسے مردے زندہ ہوئے ہوں۔ ہر غازی کی رگ رگ میں پشتون خون دوڑا اہال کھڑے ہوئے، ملالہ ان کے درمیان سے آگے نکل کر دشمن پر ٹوٹ پڑی تھی ہر ایک اس کے پیچھے دوڑا اور لشکر پر حملہ آور ہوا۔ دشمن نے کچھ مقابلہ تو کیا لیکن مسلمان جب ایک دفعہ اللہ کا نام پختہ یقین سے لے لیتا ہے تو پہاڑ بھی اس کے سامنے نہیں ٹِک سکتے۔ آخر دشمن کو شکست ہوئی وہ پیچھے جانے لگے اور بہادر غازی انہیں مارنے لگے، بہتوں کو ہلاک کیا اور بہت سے بھاگے۔ توپ اور بارود میدان میں چھوڑ گئے۔ میوند فتح ہوا، یہ کس نے فتح کیا؟ یہ پشتون عورت ملالے نے۔

نہ کمال تک پہنچے ہوئے ہزار جوان

نہ ایک بہادر ملالہ میوند کی رہنے والی(20)

یہ محض ملالہ کی بات نہیں۔ پشتون لوک بیانیہ خواتین کے بلند کردار سے مالا مال ہے۔

سوجا، میرا دودھ تجھ پر حرام

اگر تو نے دشمن کے آگے سر خم کیا

جنگ کے میدان میں تیرے ساتھ جاؤں گی

میں پشتون عورت ہوں، تلوار سے نہیں ڈرتی

دشمن کو سرخ گولیوں میں دفن کردے

اگر کارتوس ختم ہو گئے تو اپنا لونگین گروی رکھ کر بارود مہیا کروں گی

آزادی کی محبوبہ کہتی ہے

غلامی کے طلبگار کو میں ہرگز بوسہ نہیں دوں گی

اپنی نتھ کا لعل خیرات کر دوں گی

اگر میرا محبوب اس جنگ میں شہید ہو گیا۔(21)

تو تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آ، تا کہ میں

تیرے ایک ایک زخم کو سیتے وقت تجھے بوسے دوں(22)

پشاور۔۔۔لوک بیانیہ:

پشاور ایک الف لیلوی شہر، ایک ہزار ایک راتوں کا شہر ہے۔اس سے جڑی لوک روایات، آج تک اس شہر کی صورت گری کر رہی ہیں۔جب خوشحال خان خٹک رنتھنبور کے قلعے میں قید تھے تو غریب الوطنی کے اس عالم میں وہ پشاور پر نازاں تھے۔

اگر ہند چمپا پھولوں سے بھرا ہے تو مجھے اس سے کیا

میرے لئے وطن کا کانٹا اس سے بہت ہے

پشاور ہر دیار سے مجھے پیارا ہے۔

پشاور جانے والے محبوب سے تحفوں کی فرمائش ایک عام روایت ہے۔چند مثالیں دیکھتے ہیں:

پشاور جاؤ اور میرے لئے قمیض لے آؤ

اس کے علاوہ تین چار تازہ پھول بھی لیتے آنا

میرے محبوب شہر جاؤ، تو میری طرف سے تم پر جرمانہ ہے

کہ میرے لیے شہر سے جالی کا دوپٹہ لاؤ گے

اچھا پیز وان گرمہ میں بنتا ہے

پشاور کے سنار! تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تو نے اسے اچھا نہیں بنایا۔

پشاور! آخر کار تو ویران ہو جائے گا

ننگر ہار کی دوشیزائیں تجھے بددعائیں دیتی ہیں

(کہ ان کے محبوب پشاور سے لوٹنے میں بہت عرصہ لگا دیتے ہیں)(23)

تمھاری کشمیری چائے کے قربان جاؤں
جس سے یار کے چہرے کا رنگ چھلک رہا ہے
بخارہ کا پلاؤ پکانا دو
میں پشاور کی کھچڑی سے اسے نہیں بدل سکتا

یہ فالودہ، تکے، کباب اور قہوہ
اے قصہ خوانی! تیری ہر چیز پہ قربان جاؤں (24)

یہ سب تاریخی حوالے ہیں سچے حوالے ہیں لیکن یہ تاریخ عوام کی بیان کردہ ہے۔ یہ بیانیہ جھوٹ یا تحریف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

پشتون لوک دانش:

لوک دانش کے بغیر پشتون لوک بیانیہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سید خیال بخاری کے بقول ''محاورہ ہو، ضرب المثل یا عوامی شعر و شاعری، کسی زبان کا یہ ایک ایسا سرمایہ ہوتا ہے جو بطور خاص کسی ملک و قوم کے رہن سہن، بود و باش، خدوخال، سماجی دساتیر، روایات اور عادات و خصائل، غرض یہ کہ پوری قوم کے معاشرتی ڈھانچے یا بالفاظ دیگر، اس قوم کی ثقافتی زندگی اور تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ عوام کے دو طبقوں کے درمیان مغائرت اور اختلاف یا ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اکثر جو پردے حائل ہوتے ہیں یا جو غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں، ان کو کوئی دور کرنا چاہے تو اس کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اس مخصوص طبقے کی عوامی شعر و شاعری بالخصوص اس زبان کے روزمرہ محاورات اور ضرب الامثال کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ (25)

یہ عوامی شعر و شاعری ہی دراصل لوک بیانیہ ہے اور ضرب الامثال کو بنیادی طور پر لوک دانش میں شمار کیا جانا چاہئے۔ یہ لوک دانش برجستہ اور تاریخی حوالوں سے مزین ہے محمد نواز طائر نے کم و بیش بارہ ہزار ضرب الامثال کو اردو تراجم کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جس میں سے محض چند مثالوں کی مدد سے ہم اپنی بات کو واضح کر سکتے ہیں۔

اجی اخون صاحب! یہ رہا گھی، کہا خاموش رہو، اور لوگ سننے نہ پائیں

مُلا جی! سچ مت کہو، ورنہ گاؤں میں سر چھپانے کی جگہ نہیں رہے گی

بی بی سوات میں میاں باجوڑ میں
اگر تم ہشتنگر کا نہیں کھاتے تو اس کا بُرا نہ مناؤ

اکبر بادشاہ نے اکبر پورہ کا قصبہ بسایا، چوروں نے اس کے مقابل جبہ بسا ڈالا

اور مڑ قوم تب کوشش کرتی ہے، جب آفت بڑھ جائے

کچھ ایسے سوئے ہیں، سونے والے کہ حشر تک نہ جاگنے کی قسم کھا رکھی ہے

آگ، آگ کو نہیں بجھاتی

بدگمانی، ایمان کا زیاں ہے

بغیر علم کے فقر، آدھا کفر

گاؤں پر مغل کی یورش بھلی، نہ کہ گھر کی لڑائی

شکل وصورت سے درّانی، جیب خالی

لیلیٰ کے سب مجنوں پر خوش بختی اس کی جسے لیلیٰ چاہے

گھر تک تمہارا ساتھ دوں گی لیکن قبر تک نہیں

تم خدا کے بھی طالب ہو اور خرمہ کے بھی

گھوما ادھر اُدھر اور قیام شکر درہ میں

اگر دریائے سندھ بھی کاسوں میں بٹنے لگے تو وہ بھی خشک ہو جائے گا۔

جب عمر خان تھا تو ہر ایک کا مہمان تھا۔ جب عمر ے، ہو گیا تو ہر ایک اسے دھتکارنے لگا

گدھے سے کسی نے کہا، مبارک ہو تمہارا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا، مجھے کیا فائدہ، وہ اپنا بوجھ اٹھائے گا اور میں اپنا۔

اے نادان پشتون! پہلے چیز کا مغز کھاتے ہیں پھر پوست

نیند اور موت بہنیں ہیں

خیبر کی نوکری سے گھر پر بیکار رہنا اچھا ہے

گاؤں چھوڑ دو لیکن اس کے رسم ورواج مت چھوڑو

دیوانوں کے گاؤں (ٹھکانے) نہیں ہوتے

وطن کی قدر وہ جانے جو غریب الدیار ہو

دو تربوز ایک ہاتھ میں نہیں پکڑے جاتے

اجلاپن دل کا، نہ کہ سفید بالوں کا

عورت تن کا لباس ہے

غم پشتون کا لباس ہے

گوشت خوانین نے کھالیا اور ہڈیوں پر کتے آپس میں لڑ رہے ہیں

کتابیں دریا ہیں

مرغ چاہے اذان نہ دے، صبح ضرور ہوگی

موضع گودر کے جوتے، ہر پاؤں میں پورے آجاتے ہیں

ایک ہاتھ سے منہ نہیں دھویا جاتا

ہفتہ میں ایک نماز اور وہ بھی گاؤں ماتنہ میں، جہاں مسجد نہیں

ہندکو لوک بیانیہ:

خیبر پختونخوا میں متعدد زبانیں لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ پشتو کے بعد ہندکو خیبر پختونخوا کی سب سے بڑی زبان ہے جو صوبے کے وسیع وعریض علاقوں (پشاور، ہزارہ، ڈیرہ اسماعیل خان وغیرہ) میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان کا لوک بیانیہ اپنے موضوعات کے اعتبار سے پشتو سے زیادہ مختلف نہیں ہے اگرچہ اس کا اپنا رنگ اور رس ہے جسے ہندکو ٹپہ لنڈئی سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ ٹپے اس علاقے کی صدیوں پرانی تاریخ کے امین ہیں۔

نفس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قدامت، ہندو اور بدھ مت کے ادوار سے انگریزی دور تک ہے۔

بھری دنیا میں اکیلی ہوں، تو میرا گورو لگتا ہے

میں تمہاری چیلی ہوں

مظالم نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، ایک سوہنا رام نہیں ملتا

جب کہ ان گنت راون پائے جاتے ہیں

میں سوچوں میں غرقاب ہوں، سوکنوں کے ہاتھوں بن باس میں پڑی ہوں

مجھے دل کی بات کہنے دے، مجھ دکھیاری کو اپنے چرنوں میں رہنے دے

ہم دنیا کا کیا غم کریں، ان دکھوں کے ہاتھوں ایک دن ہم بدھ کا کام کر گزریں گے

پھر جب اسلامی دور آتا ہے تو ان گیتوں کے حوالے اسلامی بن جاتے ہیں۔ یہ گیت نئے دور کا لوک بیانیہ ہیں

نہ دھوپ باقی رہے گی نہ چھاؤں، تو دنیا مٹ جائے گی

ایک میرے نبی ﷺ کا نام باقی رہ جائے گا

پھولوں کی ڈالی ہے، ہمیں کس بات کا غم

مولا جنت کا والی ہے

پانچ وقت اذان ہوتی ہے، سفر پر جانے والے!

تیرا اللہ نگہبان ہو

گہرے کنوئیں میں اتر گئی ہوں، مولا! میری شرم رکھے

میں کوفیوں کے ہاتھ پڑ گئی ہوں

اس در پر جا بیٹھوں گی، جانی، مجھے آن ملے

تو پنجتن کی نیاز دوں گی

سامراج دشمن لوک بیانیہ:

پشتو کی طرح ہندکو میں بھی سامراج دشمنی کے گیت ہندکو لوک بیانیہ کا حصہ ہیں۔ فارغ بخاری کے لفظوں میں:

''انگریز دشمنی اہل سرحد کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ ہمیشہ سے حریت پسند رہے ہیں۔ انگریزوں نے ہماری آزادی چھین کر ہمیں غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے گلوخلاصی کے لئے برصغیر میں جو قومی تحریکیں وقتاً فوقتاً ابھرتی رہیں ان میں اس خطے کے باشندوں نے نہ صرف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ بعض سیاسی وجوہات کی بنا پر پشاور ان کا مرکز رہا۔

ترکوں سے ہمارا اسلامی رشتہ بھی تھا اور انگریز دشمنی کا مشترکہ جذبہ بھی دونوں طرف موجود تھا۔ اس لئے ہزاروں میل فاصلے کے باوجود ان سے ہماری دوستی نہایت مستحکم تھی۔ خلافت عثمانیہ کو تقویت دینے کے لئے پورے برصغیر میں خلافت کمیٹیاں قائم تھیں اور خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ یہ یہاں کی اولین سیاسی تحریک تھی جس نے ہندو پاک کی آزادی کی جدوجہد میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ علی برادران اس تحریک کے سربراہ تھے۔ اس تحریک کے بہت سے ترجمان اخبار جاری تھے جن میں سے مولانا محمد علی جوہر کا انگریزی روزنامہ ''کامریڈ'' اور اردو روزنامہ ''خلافت'' قابل ذکر ہیں ترکی کے مصطفےٰ کمال، انور پاشا کی یہاں کے عوام پرستش کی حد تک قدر کرتے تھے اور کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں ان کی تصویریں آویزاں نہ ہوں۔ یہ تصویریں اب تک بعض گھروں میں موجود ہیں۔

انگریزوں کو ترکوں کی ''سرکشی'' ایک آنکھ نہ بھاتی تھی آخر ترکوں کی آزادی کا غرور توڑنے کے لئے انگریز نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں شریک ہونے کے لئے ہلال احمر کے وفد کے بہانے متحدہ ہندوستان سے کئی ایک سرتیز نوجوان ترکی جا پہنچے جن میں صوبہ سرحد کے سورماؤں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ یہ نوجوان ترکوں کے شانہ بشانہ انگریزوں سے لڑے، ان میں سے اکثر شہید ہو گئے اور باقی ماندہ نے وہیں سکونت اختیار کر لی کیوں کہ وہ اس وقت کے غلام آباد میں واپس آنا نہیں چاہتے تھے۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر ہندکو میں کچھ ٹپے لکھے گئے۔ یہ ٹپے ترکوں اور انگریزوں کی جنگ کے ایام میں یہاں کے عوام کے جذبات کے ترجمان ہیں۔(26)

کوئی خیر کی خبر آئے، ہمارا ترک غازی
انگریزوں پر فتح پائے

سدا ٹھنڈا پانی پئیں، مولا!! اس دھرتی پر
ہمارے انور کمال جیتیں

ہم انگریزوں کو ماریں گے، ان ترک بھائیوں پر سے
ہم اپنی زندگی واریں گے

ہندکو زبان کے ان گنت ٹپے، تحریک آزادی کے سرفروش نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہیں:

انگریزوں پر قہر نازل ہو، میں یہاں تڑپ رہی ہوں

اور میرا محبوب جیل میں ہے

رو رو کر آنکھیں سوج گئی ہیں، انگریزوں کے مظالم سے لوگ شہر سے بھاگ رہے ہیں

انگریز یزید ہوئے، قصہ خوانی کی گولی میں کتنے بچے شہید ہوئے

انہی دنوں آفریدی قبائل نے پشاور کے لکڑی گودام پر حملہ کر دیا۔ اس بارے میں ایک ہندکو ٹپے میں کہا گیا:

چھت پر کوا اترا ہے، غازیوں کا شکر

لکڑی گودام پر چڑھ دوڑا ہے

پشتو کی طرح ہندکو میں بھی چاربیتہ ایک انتہائی مقبول صنف ہے جس میں حب الوطنی اور سامراج دشمنی کے جذبات کے ساتھ ساتھ تاریخی اور واقعاتی عناصر (آفاتِ سماوی) وغیرہ بھی شامل ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ صدی قبل پشاور میں شدید طوفان بادوباراں کے باعث پورا شہر اور اس کے مضافات سیلاب کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ قصہ خوانی کے نزدیک باڑہ دریا قابوس باہر ہو گیا۔ ایک ہندکو چاربیتے میں اس تباہی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جس کی حیثیت تاریخی اور واقعاتی ہے۔ اردو ترجمے کے مطابق:

''بارش اندھے کی لاٹھی بن کر دیوانہ وار برسی۔ منڈی کا سارا غلہ بہہ گیا، لوگ باگ، اللہ اللہ کر رہے ہیں،

نواب خان اس طوفان میں غرق ہو گیا۔ جب بارش ناگہانی آئی تو اس میں قصہ خوانی بازار بھی بہہ گیا۔

بٹیا باپ سے جدا ہو گیا۔ ماں بیٹی سے بے خبر ہو گئی۔ نتیجہ کیا ہوا، خدا بہتر جانتا ہے۔

اللہ کے قہر سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے کہ خیر و شر اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ریتی بازار کی ندیا کچھ اس طرح چڑھی کہ سب کچھ بہہ گیا۔ سب کلمہ شریف کا ورد کرنے لگے۔ سب حیران و پریشان تھے کہ یہ کیسا طوفان ہے۔

نواب خان نے جب یہ کیفیت دیکھی تو گھوڑے پر زین کس کر حالات کا جائزہ لینے نکل کھڑا ہوا۔ باڑہ دریا کی موجیں سو سو نیزے اچھل رہی تھیں۔ جب وہ باڑہ میں اترا تو اجل نے اس شیر کو زیر کر لیا۔ لوگوں نے جب اس کی موت کی خبر سنی تو وہ افسوس کرنے لگے۔

دنیا فانی ہے، صرف اللہ پاک کی ذات باقی رہے گی۔ (27)

ہزارہ کا ہندکو لوک بیانیہ:

ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے ہزارے کے ایک مشہور رزمیہ چار بیتے کا حوالہ دیا ہے۔ڈاکٹر ممتاز منگلوری کے لفظوں میں ''اس چار بیتے کا موضوع مختصراً یہ ہے:

کہ برطانوی دور حکومت میں مانسہرہ کے مغرب میں مانسہرہ سے آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ''ڈوگہ'' نامی چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے سید محمود شاہ کو انگریز سرکار نے باغی قرار دے دیا۔ چنانچہ اس کی گرفتاری کے لئے سرکار کو خاصا تردد کرنا پڑا محمود شاہ بھی اپنی جان کی حفاظت کے لئے جنگلوں اور پہاڑوں کے باسی ہو گئے۔وہ گھر پر قیام نہیں کرتے تھے۔ایک دن محمود شاہ کا پروگرام اپنے گھر جانے کا تھا۔ان کے پروگرام کی مخبری ہو گئی۔سرکار نے اوگی کے قلعے سے ایف سی (بارڈر) کی بھاری نفری روانہ کی۔محمود شاہ گھر پہنچا تو ایف سی نے سارے علاقے اور گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ایسے میں جو نتیجہ ہو سکتا تھا، ہوا۔ساری رات گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔شاید سحری کے وقت محمود شاہ نے زخموں کی تاب نہ لا کر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

اس چار بیتے کا مطلع ہے:

اٹھا مخبراں تا نہ کریں اعتبار او بجی

بعض لوگ چار بیتے میں یہ مصرعہ پڑھتے ہیں:

اگیوں بارڈر آئی ا کی تا سٹھ لتے جتڑا چالی

یعنی ایف سی کے (ایک جمع ساٹھ چالیس) ایک سو ایک جوان محمود شاہ کے قتل میں شامل ہوئے۔بعض لوگ یہی مصرعہ یوں پڑھتے ہیں:

اگیوں بارڈر آئی ا کی تا سو تا جتڑا چالی

یعنی ایف سی کے (ایک جمع سو جمع چالیس) ایک سو اکتالیس افراد نے اس مہم کو سر کرنے میں حصہ لیا۔

ہندکو کے ہزارہ کے شاعر میر عبداللہ ترنگڑی کے رہنے والے نے محمود شاہ کی بہادری اور جوان مردی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شہادت پر گہرے رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے چار بیتہ لکھا۔میر عبداللہ کا چار بیتہ تو اتنا مقبول نہیں ہوا لیکن لوک چار بیتہ بہت مشہور ہے۔(28)

راجہ رسالو کا لوک بیانیہ:

راجہ رسالو پنجاب کا ایک بہادر سورما گزرا ہے۔اس راجے کی جدال و قتال کی کئی داستانیں رزمیہ لوک داستانیں ہیں جو سفر کرتی ہوئی پوٹھوہار سے ہزارہ پہنچیں اور وہاں کے لوک بیانیہ کا حصہ بن گئیں۔ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے ایسی کئی داستانیں ہندکو زبان و ادب کی تاریخ میں درج کی ہیں۔

کہتے ہیں کہ دو ہزار سال پہلے ہزارہ اور ٹیکسلا کے علاقے کا ایک راجا رسالو تھا۔ راجا رسالو کی بہت سی روایات اور کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ راجا رسالو کا باپ راجا سالباہن راولپنڈی سے سیالکوٹ تک کے علاقے کا راجہ تھا۔ اس نے شمالی ہندوستان کے ساکا حملہ آوروں کو شکست دے کر سیالکوٹ میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔

راجا سالباہن کے بیٹے رسالو نے بھی قسمت آزمائی کرنے کے لئے شمالی سرحد کی طرف قدم بڑھائے۔ اس زمانے میں ٹیکسلا پر راجا سری کپ کی حکومت تھی۔ رسالو کی راجا سری کپ سے نبرد آزمائی ہوئی اور راجا رسالو سری کپ کو قتل کر کے علاقے کا حکمران بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ سری کپ کے ساتھ معرکے سے پہلے راجا رسالو اور سری کپ نے چوپڑ کا کھیل کھیلا۔ وہ مقام خان پور اور ٹیکسلا کے درمیان کھنڈرات کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ اس کھیل میں راجا رسالو نے ستر حسین و جمیل دوشیزاؤں کو اپنی بہادری سے مرعوب کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ راجا سری کپ کی ایک رانی رسالو پر عاشق ہو گئی۔ ابتدا میں وہ رسالو سے کہتی ہے۔ گیت:

ترجمہ: نیلے گھوڑے والے اپنا نیزہ جھکا کر آ۔ آگے راجا سر کپ (سر کپ کے معنی سر کاٹ دینے والے کے ہیں) وہ تیری گردن کاٹ لے گا۔ اپنا بھلا چاہتے ہو تو واپس مڑ جاؤ۔

راجا رسالو اس کو جواب دیتا ہے:

ترجمہ: میں دور دراز سے آیا ہوں میں نے جیت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں راجا سری کپ کا سر کاٹ کر اس کے چار ٹکڑے کر دوں گا پھر تجھے اپنی دلہن بناؤں گا اور خود مہاراجہ بنوں گا۔

رانی سری کپ کے پاس گئی، وہ ایسی باتیں کرنا چاہتی تھی کہ سر کپ رسالو سے خوفزدہ ہو جائے۔ وہ کہنے لگی:

ترجمہ: ایک راجپوت بڑے زور شور سے آ رہا ہے۔ راجا وہ تمہیں ہلاک کر دے گا اور مجھے ساتھ لے جائے گا۔

راجا سری کپ رانی کی باتوں سے مرعوب نہیں ہوا۔ اسے اپنی طاقت پر بہت ناز تھا اس لئے اس نے رانی سے کہا:

ترجمہ: رانی! کیا باتیں کر رہی ہو؟ ایک چھوٹی سی نگری کا باسی آیا ہے اور تم اتنی چیخ و پکار کر رہی ہو۔ میں ایک دفعہ باہر نکلا تو میری ڈھال ہی اسے نچا دے گی۔ میں صبح سویرے اس کی گردن کاٹوں گا اور پھر روٹی کھاؤں گا۔

اس کے بعد سری کپ اور راجا رسالو کا معرکہ ہوا اور راجا رسالو نے سری کپ کا سر کاٹ کر اس کی رانی کو کلاں کو ساتھ لیا اور مورتی کے پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ جو راولپنڈی کے جنوب میں واقع ہے۔ اسی طرح ایک اور داستان کے مطابق کہتے ہیں کہ راجا رسالو کی ایک رانی گندگر کے پہاڑ میں رہتی تھی۔ یہ پہاڑ ہری پور کے مغرب میں غازی تک پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑ کے شمالی دامنوں میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت گاؤں تھے۔ راجا رسالو کی اس رانی نے ایک مینا اور ایک طوطا پال رکھے تھے۔ وہ رانی سے بہت میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ اسے کہانیاں سناتے

اور اس کا دل بہلاتے رہتے تھے۔

اتفاق سے رانی کو ایک دیو سے محبت ہوگئی۔ راجا رسالو کی عدم موجودگی میں وہ دیو سے عاشقانہ راز و نیاز کرتی رہتی۔ ایک دن رانی اور دیو اسی قسم کی راز و نیاز میں مصروف تھے کہ طوطے اور مینا نے ان کی وہ ناپسندیدہ حرکات دیکھ لیں۔ مینا اور طوطے کو رانی کی راجا رسالو سے بے وفائی اور دیو اور رانی کی یہ بے ہودہ حرکات بالکل پسند نہ آئیں۔ مینا ضبط نہ کر سکی اور رانی کو اس بے وفائی پر لعنت کی۔ رانی کو مینا کی ان باتوں پر غصہ آیا اور اس نے مینا کی گردن مروڑ ڈالی۔ مینا کا یہ حال دیکھ کر طوطا ایک دم سے وہاں سے اڑ گیا۔

راجا رسالو اسی سارے علاقے میں شکار کرتا رہتا۔ شکار سے تھک کر وہ مختلف جگہوں پر بیٹھ کر تھکان اتارتا۔ اس نے اس طرح کی کئی جگہیں بنا رکھی تھیں۔ ایبٹ آباد کے سامنے سربن کے پہاڑ میں بھی اسی طرح کی جگہ (غار) راجا رسالو کے نام سے موسوم ہے۔ طوطا مینا کے مارے جانے کے بعد راجا رسالو کی ان علاقوں میں تلاش کرتا رہا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے راجا کو رجوعیہ کے قریب ایک جگہ پر سویا ہوا دیکھا۔ طوطا اڑا اور ندی دوڑ کے پانی سے اپنے پر ڈبوئے اور راجا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے پھینکے۔

راجا رسالو جاگا۔ اس نے طوطے سے خیریت پوچھی۔ طوطے نے رانی کی بے وفائی، دیو سے معاشقے اور مینا کے رانی کی لعنت ملامت کرنے پر مارے جانے کے واقعات پوری تفصیل سے بیان کئے۔ یہ سنتے ہی راجا رسالو، غصے میں بھرا ہوا اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گندگر کی طرف بڑھتا رہا جہاں رانی قیام پذیر تھی۔

راجا رسالو بہت تیزی سے سفر کرتا ہوا وہاں پہنچا۔ گھر پہنچ کر بیوی اور دیو کو عشق و عاشقی کا کھیل کھیلتے دیکھ لیا۔ بیوی کو تو اس نے وہیں قتل کر دیا لیکن دیو بھاگ گیا۔ راجا رسالو نے دیو کا پیچھا کیا۔ دیو جان بچانے کے لئے بھاگتے ہوئے ایک غار میں گھس گیا۔ راجا رسالو وہاں پہنچا تو دیو غار کے اندر جا چکا تھا۔ راجا رسالو نے ایک بڑے سے پتھر پر اپنی تصویر بنائی جس میں کمان پر تیر چڑھایا ہوا دکھایا گیا تھا۔ راجا نے تصویر والا پتھر غار کے منہ پر اس طرح رکھ دیا کہ پتھر کا تصویر والا رخ غار کے اندر کی طرف تھا۔ اس طرح وہ دیو وہاں قید ہوگیا۔

کہا جاتا ہے کہ دیو کبھی غار سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو راجا رسالو کی تصویر دیکھ کر شور کرتے ہوئے واپس غار کے اندر دوڑ جاتا۔ لوگ عام روایت کرتے ہیں کہ بہت مدت تک گندگر پہاڑ سے ایک خوفناک آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہتی تھی۔

تزک جہانگیری میں بھی اس آواز کا ذکر موجود ہے۔ جہانگیر جب دورہ ہزارہ و کشمیر پر گیا تو سلطان پور کے قریب پڑاؤ ڈالا، اسی علاقے کے لوگوں سے سنا کہ برسات کے دنوں کے بعد آسمان پر بادلوں کی گرج جیسی آواز نکلتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس پہاڑ کا نام گھن گرج رکھا گیا ہے۔ یہ آواز پہاڑ سے سال دو سال کے وقفے کے بعد نکلتی

ہے۔ یہ بات جہانگیر کی زندگی میں ان کی محفلوں میں بھی متعدد بار سنی گئی۔

میجر ایبٹ (ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر) کے بیان کے مطابق بھی انیسویں صدی کے پہلے تیس سالوں تک یہ آواز لوگوں نے اس سے بیان کی۔"

ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے راجا رسالو کی پیدائش اور جوانی کی کہانیاں بھی بیان کی ہیں جن کے مطابق:

"سیالکوٹ کے راجا سالباہن کی دو رانیاں تھیں۔ ایک کا نام اچھراں تھا، چھوٹی کا نام لوناں تھا۔ رانی اچھراں کا ایک بیٹا تھا جس کا نام پورن تھا جو بعد میں پورن بھگت کے نام سے مشہور ہوا۔ پورن کی نوجوانی سے متاثر ہو کر اس کی سوتیلی ماں لوناں اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے اپنے محل میں بلایا اور دلی خواہش کا اظہار کیا۔ پورن ایک نیک انسان اور خداترس شخص تھا وہ سوتیلی ماں کے فریب میں گرفتار نہ ہوا اور محل سے بھاگ آیا۔ رانی نے بدلہ لینے کیلئے راجا سے پورن کی جھوٹی شکایت کی کہ وہ بری نیت سے اس پر حملہ آور ہوا ہے۔ راجا نے رانی کے کہنے پر اعتبار کر لیا اور بیٹے کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر اسے ایک کنوئیں میں پھینک دیا۔ جو آج بھی سیالکوٹ اور کلووالی کے درمیان موجود ہے اور بانجھ عوتیں وہاں جا کر اس کنوئیں کے پانی سے نہاتی ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اس کنوئیں کے پانی کی تاثیر سے بے اولاد عورت اولاد والی ہو جاتی ہے۔

پورن کئی برس اس کنوئیں میں پڑا رہا پھر جو اس کی قسمت جاگی تو اتفاق سے گورو گورکھ ناتھ ادھر سے گزرے انہوں نے اسی کنوئیں پر اپنا ڈیرہ جمایا۔ گورو نے پورن کو کنوئیں میں پایا تو اسے وہاں سے نکلوایا۔ گورو کو اپنی روحانی طاقت سے معلوم ہو گیا کہ پورن بے گناہ ہے۔ اس نے اللہ سے دعا کی اور پورن کے ہاتھ پاؤں صحیح سالم ہو گئے تو گورو نے اس کے کان چھدوا کر اسے اپنا چیلا بنا لیا۔

پورن گورکھ ناتھ کے ساتھ رہا پھر گورو نے اسے سیالکوٹ جانے اور اپنے ماں باپ سے ملنے کی اجازت دے دی۔ پورن سیالکوٹ پہنچا تو اس نے اسی باغ میں اپنا ڈیرہ جمایا جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ باغ بالکل خشک اور ویران ہو چکا تھا۔ پورن نے سوکھا ہوا باغ دیکھا تو اللہ سے دعا کی اور پانی پر اللہ کا نام پڑھ کر اسے باغ کے پودوں پر چھڑکا تو سارے کا سارا باغ اسی وقت ہرا بھرا ہو گیا۔ اس واقعہ سے پورن کی شہرت راجا کے محل تک بھی پہنچ گئی۔ رانی اچھراں جو بیٹے کی جدائی میں رو رو کر آنکھیں کھو چکی تھی۔ فقیر کی خدمت میں یہ التجا لے کر حاضر ہوئی کہ اسے اس کی بینائی دوبارہ مل جائے۔ پورن نے اپنی ماں کو پہچان لیا مگر اس پر اپنی حقیقت نہ کھولی۔ البتہ دل ہی دل میں ماں کے لئے دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کی اور اس کی ماں کی بینائی بحال ہو گئی۔

پورن کی اس کرامت کی خبر سن کر راجا سالباہن اور رانی لوناں بھی فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے اولاد کے لیے درخواست کی۔ فقیر بولا راجا سالباہن کا پہلے بھی ایک بیٹا تھا وہ کہاں ہے۔ مجھے اسکے متعلق صحیح صحیح بتاؤ پھر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ رانی کو اولاد ہو جائے۔

رانی کو چونکہ بیٹے کی شدید خواہش تھی اس لئے اس نے راجا کی موجودگی میں فقیر کو سارا واقعہ صحیح صحیح سنا دیا کہ کیسے اسے پورن سے محبت ہوگئی اور کیسے اس نے خاوند سے کہہ کر اس بے گناہ کے ہاتھ پیر کٹوا دیئے تھے۔ فقیر بہت خوش ہوا کہ رانی نے سب کچھ سچ سچ کہہ دیا ہے۔ اب پورن نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور کہا کہ مجھے غور سے دیکھ میں وہی پورن ہوں۔

پورن نے اپنی سوتیلی ماں لوناں کو چاول کا ایک دانہ کھانے کے لئے دیا اور کہا کہ کچھ عرصے کے بعد اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ جو بہادر اور نیک و پارسا ہوگا مگر وہ اس کے پاس نہیں رہے گا۔ اس سے جدا ہو جائے گا اور وہ اس کی جدائی میں اس طرح روئے گی جیسے اس نے رانی اچھراں کو رلایا تھا۔

پورن نے اس کے بعد ماں باپ سے اجازت لی اور گورو گورکھ ناتھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وقت مقررہ پر رانی لوناں امید سے ہوئی اور پھر ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا۔ رانی نے ایک غلام کو خبر دینے دربار بھیجا۔ غلام نے راجا کو یہ پیغام دیا:

ترجمہ: اے دربار میں بیٹھے راجا! تمھارے گھر معزز مہمان آئے ہیں، وہ پہلے تو گھی اور گڑ طلب کرتے ہیں پھر دو بکریاں، نہ تو بکریوں کی پسلیاں ہیں نہ مہمان کے دانت۔ یہ پہیلی بوجھو اور فوراً گھر پہنچو۔ راجہ سالباہن نے یہ پہیلی بوجھ لی اور کہلا بھیجا کہ میں فوراً پہنچتا ہوں۔

بچے کی پیدائش سے پیشتر تین جوگی محل میں آئے تھے اور انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ رانی کا بیٹا پیدا ہوگا۔ جس کا نام راجا رسالو ہوگا۔ وہ بہت بڑا آدمی بنے گا لیکن اگر اس کے ماں باپ میں سے کسی نے اسے بارہ برس کی عمر سے پہلے دیکھ لیا تو لڑکا مر جائے گا۔ پہلے بارہ برس بچے کو تہہ خانے میں بند رکھا جائے اس کے بعد وہ دریا پر ضرور نہائے، نیا جوڑا پہنے اور پھر اپنے ماں باپ سے ملنے آئے۔

راجا نے جوگیوں کی پیش گوئی پر عمل کرتے ہوئے رسالو کو تہہ خانے میں بھجوا دیا۔ اس کے لئے باندھیاں، چند جوڑے، کچھ ہتھیار اور ایک بچھیرا جو اسی دن پیدا ہوا تھا بھیج دیا۔ اس کے علاوہ ایک طوطا اور ضرورت کی چیزیں بھی بھیج دیں اور تہہ خانے میں اسے ضروری علوم وفنون سکھانے کا اہتمام بھی کروایا۔ رسالو گیارہ برس کا ہوا تو اس نے ضد کی اور وقت سے پہلے تہہ خانے سے نکل کر دریا کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ اس ایک برس میں مختلف علاقوں میں گھومتا پھرتا رہا اور مختلف واقعات اور حالات سے دوچار ہوتا رہا۔

راجہ رسالو کی بہادری کی داستانوں میں سے ایک یوں ہے کہ دریائے جہلم کے مغرب میں ایک شہر مانک پور تھا، وہاں سات آدم خور دیو اور دیونیاں رہتی تھیں۔ یہ تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ تین بھائیوں کے نام سری کپ، سر سکھ اور امبا تھے اور بہنوں کے نام کپی، کلھی، منڈا اور مان وہی تھے۔ ایک دن راجا رسالو شہر گیا تو ایک عورت کو کھانا پکاتے ہوئے کبھی روتے ہوئے اور کبھی گاتے ہوئے دیکھا۔ رسالو نے اس عجیب طرز عمل کی وجہ دریافت کی تو

اس عورت نے بتایا کہ گاتی تو یوں ہوں کہ آج میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے اور روتی ہوں کہ اس کا آدم خور دیو کے ہاں جانے کا وار آ گیا ہے۔ (باری آ گئی ہے)۔

رسالو نے عورت سے کہا اب مت رو۔ میں ان دیوؤں سے خود نمٹ لوں گا۔ چنانچہ اس نے اس سب آدم خوروں کو مار ڈالا۔ بجز ایک کے جو گندگر کے ایک غار میں جا چھپا تھا۔ جہاں کبھی کبھی اس کے دھونکنے کی یعنی سانس لینے کی آواز آتی ہے۔

راجا رسالو دریا کے کنارے پہنچا تو وہاں راجا سری کپ کی بیٹی رانی چوڈھال بیٹھی تھی۔ اس نے راجا رسالو سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اور کہاں جا رہا ہے۔ راجا رسالو نے جواب دیا۔ ''اے حسینہ! میں سیالکوٹ سے آیا ہوں اور راجا سری کپ کے ساتھ چوپڑ کھیلنے کا ارادہ ہے'' رانی نے کہا ''پہلے مجھ سے کھیلو پھر راجا سری کپ کے ساتھ کھیلنے کی جرأت کرو۔'' راجا رسالو نے کہا کہ میں عورت کے ساتھ نہیں کھیل سکتا۔ میں مرد ہوں اور مردوں کا مقابلہ کرتا ہوں۔ تب رانی چوڈھال نے کہا کہ میرے پاس ایک بجھارت ہے جو تجھے بوجھنی ہوگی۔ اگر یہ پہیلی نہ بوجھ سکے تو تمھارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ راجا رسالو نے کہا کہ کیا تم نے اس سے پہلے بھی کسی کا سر کاٹا ہے۔ رانی نے جواب دیا میرا باپ راجا سری کپ ہر روز ایک آدمی کا سر کاٹتا ہے لیکن میں نے صرف دس آدمیوں کے سر کاٹے ہیں۔

راجا رسالو نے کہا کہ یہ بات ہے تو پھر بوجھواؤ اپنی پہیلی۔

رانی نے کہا:

ترجمہ: آٹھ گھاٹ ہیں، نو کشتیاں ہیں، چودہ بھنور، اگر تو سچا اور بہادر راجا ہے تو بتا پانی کتنے سیر ہے؟

راجا رسالو نے جواب دیا:

ترجمہ: آٹھ گھاٹ ہیں، نو کشتیاں، چودہ بھنور، اگر تو مجھے آسمان کے تارے گن کر بتا دے، میں تجھے بتا دوں گا کہ پانی اتنے سیر ہے، جس قدر جنگلوں کے درخت اور شاخیں ہیں اور ان پر جتنے پتے ہیں پانی اتنے سیر ہے۔

راجا رسالو آگے بڑھتا ہوا شہر کے سامنے پہنچا، وہاں راجا سری کپ کی دوسری بیٹیاں موجود تھیں۔ جب انہوں نے راجا رسالو کو دیکھا تو ایک نے اس نے کہا:

ترجمہ: اے نیلے گھوڑے والے راجا! اپنا نیزہ جھکا کر آگے آ۔ آگے راجا سری کپ بیٹھا ہے جو تیرا سر قلم کر دے گا۔ اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ۔

راجا نے جواب دیا:

ترجمہ: میں دور سے بیڑا اٹھا کر آیا ہوں کہ یہاں فتح سے ہمکنار ہوں گا سری کپ کا سر کاٹ کر اس کے چار ٹکڑے کروں گا۔ تجھے اپنی دلہن بناؤں گا اور خود تمہارا راجا بنوں گا۔

راجاسری کپ کی اس بیٹی کو راجار سالو سے پیار ہو گیا اور وہ دوڑی دوڑی باپ کے پاس پہنچی اور کہا:
ترجمہ: ایک راجپوت بڑی کر وفر سے مار و مار کرتا آتا ہے وہ تمہیں ہلاک کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

راجاسری کپ کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا، وہ بولا:
ترجمہ: بیٹی رانی! تو کیا کہہ رہی ہے ایک چھوٹی سی نگری کا باسی آیا ہے اور تم اتنی چیخ و پکار کر رہی ہو۔ میں ایک دفعہ باہر نکلا تو میری ڈھال ہی اسے نچا دے گی۔ میں صبح سویرے اس کی گردن کاٹ کر ہی کھانا کھاؤں گا۔

راجار سالو نے راجاسری کپ کے ساتھ چوپڑ کی بازی کھیلی۔ بازی سے پیشتر راجاسری کپ نے اس سے چند پہیلیاں بوجھوائیں۔ پھر دونوں نے چوپڑ سے متعلق چند امور طے کیے۔ راجاسری کپ نے پہلی بازی پر اپنی سلطنت، دوسری پر ساری دولت اور تیسری بازی پر اپنا سر دینا طے کیا۔ پہلی دونوں بازیوں میں راجار سالو نے اپنے ہتھیار اور گھوڑا ہار دیا۔ گھوڑے نے راجار سالو سے کہا:
ترجمہ: راجا سالباہن نے مجھے سونے کے بھاؤ خریدا، آؤ اور میری پیٹھ پر چھلانگ لگا کر چڑھ جاؤ، میں تمہیں لاکھوں رکاوٹوں سے پار لے جاؤں گا۔ پرندوں کی پرواز میری رفتار کو چھو بھی نہ سکے گی۔، چاہے وہ لاکھ کروڑ کوس اڑتے جائیں۔
راجا! اگر تجھے چوپڑ کھیلنی ہی ہے تو اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھو۔
دراصل راجاسری کپ کی جیب میں اس کا چوہا تھا جو راجار سالو کی نظر بچا کر چوپڑ کی گٹیاں آگے پیچھے کر دیتا تھا۔ راجا سری کپ نے شبہ کرتے ہوئے رسالو سے کہا تیرا گھوڑا شاید تجھے مشورہ دے رہا ہے پھر سری کپ نے خادموں کو حکم دیا کہ گھوڑا وہاں سے لے جائیں۔ گھوڑے نے یہ سنا تو رو پڑا اور بولا:
ترجمہ: اے بھولے راجا! نہ رو میں تیرے فراق میں نہ تو گھاس کھاؤں گا۔ نہ ایک قدم آگے چلوں گا۔ مگر تو اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال۔

تب راجار سالو سمجھ گیا کہ گھوڑا کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے دائیں طرف سے اپنی جیب سے اپنی بلی نکالی جس نے چوہے کو ہراساں کر دیا۔ اب راجار سالو نے جیتنا شروع کر دیا اس پر راجاسری کپ نے محل کی ستر خوبصورت عورتوں کو حکم دیا کہ وہ راجار سالو کے سامنے کھڑی ہو جائیں۔ راجاسری کپ کا خیال تھا کہ راجار سالو کی توجہ بازی سے ہٹ جائے گی اور عورتوں کی طرف مبذول ہو جائے گی اور راجاسری کپ آخری بازی جیت جائے گا مگر راجار سالو نے ان عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ راجا نے اپنا بلی کا بچہ چھوڑا جو کھڑکی میں بیٹھ گیا اور چوہے کو اندر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔
چوہے نے کہا:
ترجمہ: اے لڑھکنے والے پانسے! یہاں تو خوش قسمت انسان ہے اگرچہ بازی سر دھڑ کی ہے لیکن جیسا راجاسری کپ

چاہے گا ویسا ہی ہوگا۔

اس کے بعد راجا رسالو جیتنے لگا پہلے سری کپ سے اس کی سلطنت جیتی پھر دولت جیتی اور آخر کار راجا سری کپ اپنا سر بھی ہار گیا۔

راجا رسالو کے بارے میں ہندکو زبان کے گیتوں سے عیاں ہے کہ تاریخی طور پر راجا رسالو کا باپ سالباہن سرزمین سیالکوٹ سے راولپنڈی تک غیر متنازعہ طور پر بادشاہ تھا۔ راجا رسالو پیدائش سے گیارہ برس کی عمر تک تہہ خانے میں بند رہا۔ گیارہ برس کی عمر میں تہہ خانے سے نکل کر راولپنڈی سنگ جانی، ٹیکسلا، اٹک اور ہزراہ کے خطے میں مختلف مہمات سر کرتا رہا جس میں فتوحات، عشق و محبت، لوگوں کی دستگیری کے سلسلے میں راکھشسوں سے لڑائیاں اور دیوگوگندگر کے پہاڑ میں قید کرنا وغیرہ کارنامے شامل ہیں۔(31)

ہندکو۔ ہزارہ کا لوک بیانیہ:

راجہ رسالو کی داستان کے علاوہ محبت کی بعض داستانیں بھی ہندکو بیانیہ کا حصہ ہیں۔ ضلع ہزارہ کی وادی کاغان کی ایک المیہ داستان منشی اور درشی کی داستان ہے:

''انگریزوں کے زمانے میں درشی کے جنگل میں ڈنگا اینڈ کمپنی کا کٹائی کا ٹھیکہ تھا۔ کمپنی کے منشی سے ایک مقامی لڑکی (اور بعض روایتوں میں دو لڑکیاں) محبت کر بیٹھی تھیں۔ لیکن راہِ عشق کی پُر خار راہوں پر چلنے والے یہ پریمی اپنی منزل نہ پا سکے۔ دل کے افسانے جب نگاہوں کی زبان سے ہو کر زبان زد عام ہوئے تو سماج نے دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیواریں چننے کی کوشش کی لیکن عشق کی آگ میں جلنے والے کب کسی مشکل کو خاطر میں لاتے ہیں۔ محبت تو اندھی اور بہری ہوتی ہے جس کی رسمیں تر کی ہیں نہ تاری۔ محبت محبت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن محبت کرنے والوں کے درمیان فصلیں کھڑی کرنے والے تو ان احساسات سے بے بہرہ ہوتے ہیں چنانچہ وہ اس ملن کو روکنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اور اس پر بھی جب دو پریمی ایک ہونے کی سعی ناکام کرتے ہیں تو انہیں ایک روایت کے مطابق ہمیشہ کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔

لیکن محبت کی یہ کہانی ان کے ختم ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور ایک درد بھرے پُر سوز گیت میں ڈھل کر ابدی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ قینچی جو ظلم، سفاکی اور چیر پھاڑ کی علامت کے طور پر اس گیت میں سامنے آئی ہے۔ اس کا تاثر ہر پڑھنے سننے والے کو اداس و ملول کر جاتا ہے۔

قینچی جو دو معصوم دلوں پر بڑی بے رحمی کے ساتھ چلائی گئی لیکن دو دلوں سے اُمڈنے والے جذبوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور یہ جذبے اس ستمگری کے بعد اور بھی نکھر گئے اور ابدیت کا درجہ پا گئے۔

قینچی اس جذبے پر لکھی جانے والی طویل نظم ہے جس میں شدت تاثر ہے، اثر آفرینی ہے سوز و گداز، درد و یاس اور حسرت و ناامیدی کا ایک سلگتا ہوا احساس اس میں ملتا ہے۔(32)

اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

ترجمہ: درشی کے بن میں بکائن کے درخت اگائے گئے ہیں۔ میرا یوسف (محبوب) کھو چکا ہے اور میں زلیخا کی طرح اس کی شیدائی اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ میرا صبر وقرار لُٹ چکا ہے، دل جدائی کی قینچی سے چاک ہے، خدا اور رسولؐ میرے محبوب کو لوٹا کر لائیں۔

ترجمہ: ایک اونچا سا بنگلہ بنا کر اس کے گرد تاروں کی باڑ لگاؤں۔ لوگوں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا ہے کہ منشی کو قتل کر دیا جائے، وہ چاہتے ہیں کہ میرا محبوب مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے، جدائی کی قینچی ۔۔۔۔۔

ترجمہ: درشی کے بن میں خوبانیاں پک رہی ہیں گویا موسم بہار ہے، ایسے میں لوگوں نے مل کر میرے محبوب کو کلہاڑیوں سے قتل کر دیا۔

ترجمہ: درشی کے بن میں بان پکا ہوا ہے۔ اے ظالمو! منشی کو مت قتل کرو، منشی میرا ہے۔ وہ میری روح ہے، میری جان ہے، اس طرح روح کو تن سے جدا نہ کرو۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ یہ قیامت کی گھڑی آنی تھی، آ گئی۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں بھیڑیں چر رہی ہیں، میرے محبوب کو لوگوں نے وقت سحر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں برسات آئی ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اور میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ دل کو قینچی لگی ہے دل بہت تنگ ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ اللہ نبیؐ اس کے ساتھ ہیں۔

ترجمہ: اونچا بنگلہ بناؤں اور اس کے چاروں طرف کھڑکیاں بناؤں۔ جا میرے منشی تجھے اللہ کے حوالے کیا۔ دل کو قینچی لگی ہے، دل بہت تنگ ہے۔ منشی چلا گیا ہے۔ اللہ نبیؐ اس کے ساتھ ہیں۔(33)

اس موضوع پر ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی تحقیق بے مثال ہے۔ وہ قینچی کے کاغانی لب و لہجے کو بھی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اس کا متن دیکھیے:

ترجمہ: درشی کے جنگل میں میرا دل جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ اللہ میرا اس کا حال جانے۔ غموں کی قینچی نے کاٹ دیا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے۔ میرا اللہ ہی حال جانے۔

اس کے بول یوں بھی ادا ہوتے ہیں:

ترجمہ: درشی کے جنگل میں میرا دل جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ اللہ میرا اس کا حال جانے۔ غموں کی قینچی لگی ہے اور دل بہت تنگ ہے میرا منشی چلا گیا ہے میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں برسات آئی ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اور میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے۔ اللہ اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں رتن جوگ اُگی ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اور مجھے جانے کا روگ دے گیا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے میرا دل ہی جانتا ہے میرا منشی چلا گیا ہے۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں پتوں کا ڈھیر ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اللہ پھر اسے واپس لے آئے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں نیلا دھاری چڑھی ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے تو یہ جان/زندگی کس کام کی۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں پیارپیار ڈھوکیں ہیں۔ میرا منشی چلا گیا ہے تو سارے لوگ اس کے جانے کے گانے گاتے ہیں۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں چڑیوں کی ڈار ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اور میں زاروقطار رو رہی ہوں۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں درختوں کی قطار ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اور میں بین کر رہی ہوں۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں کیسی کیسی بھینسیں ہیں۔ میرا منشی چلا گیا ہے تو یہ دیس کھانے کو لگ رہا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں جنگلی اخروٹ ہیں۔ میرا منشی چلا گیا ہے اللہ اسے موڑ لے آئے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں فاختاؤں کا جوڑا ہے۔ میرا منشی چلا گیا ہے اس کے چلے جانے کا غم تھوڑا نہیں۔

غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں خوبصورت میدان ہے۔میرا منشی چلا گیا ہے جان گھبرا گئی ہے۔غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں (بن تِل) جنگلی تِل چُن رہی ہوں۔میرا منشی چلا گیا ہے تو دل کہیں نہیں لگتا۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔میرا منشی چلا گیا ہے اللہ اس کا نگہبان۔غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں کہیں میرے پیر نہیں ٹک رہے۔میرا منشی چلا گیا ہے میرا اللہ خیر کرے۔غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں گھاس پھونس پھیلا ہے۔میرا منشی چلا گیا ہے اور دکھوں کا زور ہے۔غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں نیلا نیلا (سبز سبز) ساگ ہے۔میرا منشی چلا گیا ہے اور میں راگ گا رہی ہوں۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں پھولوں کی لالی ہے۔میرا منشی چلا گیا ہے تو سارا دیس خالی نظر آتا ہے۔غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں نیلی نیلی بیلیں ہیں۔میرا منشی چلا گیا ہے اور میں کوکیں مار رہی ہوں۔غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں گہرے گہرے نالے ہیں۔میرا منشی چلا گیا ہے اور مجھے دکھوں میں جلا گیا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔میرا منشی چلا گیا۔میرا اللہ ہی

اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں فریاد کررہی ہوں۔ میرا منشی چلا گیا ہے اور بہت یاد آرہا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں خوبصورت خوبصورت پھول ہیں۔ میرا منشی چلا گیا ہے باتیں بھول گئی ہیں۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں کیسے کیسے مال مویشی ہیں۔ میرا منشی چلا گیا ہے اب میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔

ترجمہ: درشی کے جنگل میں نیلے نیلے (سبز سبز) پیڑ ہیں۔ میرا منشی چلا گیا ہے میرا سکھ بھی چلا گیا ہے۔ غموں کی قینچی لگی ہے۔ غموں کی قینچی ایسی لگی ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میرا منشی چلا گیا۔ میرا اللہ ہی اس کا حال جانے۔(34)

یہ لوک بیانیہ دراصل نوآبادیاتی دور کا کاروکاری کا سانحہ ہے۔

فارغ بخاری نے ہزاروی لہجے کے اس گیت کو ایک اور انداز میں دریافت کیا ہے۔ اس لوک بیانیہ سے جڑے گیت انتہائی پُر اثر اور دل کو چھو لینے والے ہیں:

ترجمہ:

میرے دل کو جدائی کی قینچی کاٹ رہی ہے
اسی لئے میرا دل بے چین ہیں
وہ یہ چاہتا ہے کہ میں جنگل کے محاسبوں کو جان سے مار ڈالوں
مجھے خدا پر بھروسہ ہے
کہ وہی ہمارا محافظ ہے
کاغان کے جنگل میں آری سے درخت کاٹ رہی ہوں
میرے دل میں تیرے دیدار کی آرزو ہے
میرے محبوب۔۔۔آخری بار آکر مجھ سے مل جا
دو کونجیں اُڑی ہیں
انہوں نے پہاڑ کی چوٹی کا اونچا راستہ اختیار کیا ہے

ایک مدت سے
دل کی دنیا آباد تھی
جو آج اجڑ گئی ہے
اے اونچے درخت تو کتنا پھیلا ہوا ہے
تیرا یہ پھیلاؤ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے
کہ تیری چھاؤں کے نیچے میرا محبوب ستا رہا ہے
میں ایک خوبصورت بنگلہ بناتی ہوں
اس کے چاروں طرف روشندان لگواتی ہوں
میرے محبوب اب چلا جا
میں تجھے خدا کے حوالے کرتی ہوں

فارغ بخاری کے لفظوں میں ضلع ہزارہ کے لوگ گیتوں میں دکھ درد بھی ہے اور شوخی و شرارت بھی۔ ان میں تازگی اور شادابی ہے جو اس امر کی غماز ہے کہ یہ ایک ہرے بھرے، شاداب اور سرسبز ماحول میں بسنے والے باشندوں کے لوک گیت ہیں۔ ان میں ایسی آزاد فضا ملتی ہے جس میں زندگی کی رعنائیاں اور جوان لہو کی خوشبو انگڑائیاں لیتی، ناچتی اور گاتی محسوس ہوتی ہے۔

'قینچی' اس لہجے کی مخصوص صنف ہے۔ اس میں منشی کا کردار محبوب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ 'قینچی' میں گویا منشی اور اس کی محبوبہ کی مکمل داستان ہے۔ اس علاقے میں منشی کو وہی مقام حاصل ہے جو مجنوں کا تھا۔ ''منشی'' کو نہ صرف اپنی محبوبہ سے جدا کیا گیا بلکہ محبت کی پاداش میں اس کو قتل بھی کر دیا گیا۔ محبوبہ اس کے غم میں گرلاتی ہے اور اس کی محبت و رومان کے تانے بانے کو ظلم و فراق کی جس قینچی نے غارت کیا۔ اس کی دہائی دیتی ہے۔(35)

ضلع ہزارہ کا ہندکو لوک بیانیہ ''محنت کش کسانوں، سخت جان چرواہوں، آہنی بازوؤں والے محنتی مزدوروں'' کے گیتوں کا لوک بیانیہ ہے۔ یہ گیت ''خوشیوں اور مسرتوں سے محروم، محبت اور پیار کو ترسی ہوئی غریب و وفادار گھرانوں کی بے زبان روحوں کے گیت ہیں۔ پھٹے ہوئے آنچلوں اور دریدہ، پیراہنوں کے گیت ہیں۔ تشنہ ہونٹوں اور فاقہ کش جسموں کے گیت ہیں۔''

ترجمہ:

کونجیں اُڑتی ہوئی آ کر سائے میں اتریں
جہاں باز بستے تھے اب وہاں کوؤں کے ڈیرے ہیں
اڑتی ہوئی کونجیں آ کر بیلے میں اتریں

روزی کی تلاش میں لوگ بھٹکتے پھر رہے ہیں
اڑتی ہوئی کونجیں صحن میں اتریں
کپڑے میلے تھے ابھی ابھی دھوکر آئی ہوں
اڑتی ہوئی کونجیں حجرے میں اتریں
براتیں چڑھیں اور مجرے ہوئے

''کونج پاک و ہند کی ہر زبان کے لوک گیتوں کا ایک مستقل موضوع ہے۔غریب الوطن، مظلومیت، قناعت اور محنت کا سمبل ہے۔۔۔مندرجہ بالا گیت میں کونج کی غریب الوطنی کی رعایت کو علامت بنا کر اپنے غریب الوطن محبوب کے لئے ایک برہا کی ماری محبوبہ اپنے جذبات و احساسات کو علامتی رنگ میں بیان کیا ہے۔اس میں گردشِ ایام کا رونا ہے کہ باز کی جگہ کوّے سنبھال بیٹھے ہیں۔یعنی اچھے لوگ دربدر ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ حریص لالچی اور چالاک لوگ عیش کر رہے ہیں۔اور اچھے لوگ روزی کے لئے مسافری میں بھٹک رہے ہیں۔(یہاں اپنے محبوب کی طرف اشارہ ہے) اور لوگوں کی شادیاں ہو رہی ہیں وہ ناچ رنگ میں مست ہیں (یہاں اپنی محرومی کا دکھ ہے) کپڑے دھونے میں اپنی محنت مزدوری مجبوری اور بے بسی کا اظہار ہے۔(36)

وطن کی محبت کا لوک بیانیہ ہندکو کے ہزاروی لہجے میں بھی نمایاں رہا ہے۔اپنے محبوب کی منتظر لڑکی اسے فتح مند دیکھنا چاہتی ہے۔

ترجمہ:

محبوب! میرے دل کو راحت پہنچا
دشمن کی فوج پر
فتح پا کر واپس آ

دوسری عالمی جنگ کا یادگار ریہ ٹپہ ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب ہٹلر کی فوجیں یورپ میں ہر طرف یلغار کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔اور وطن کے سپاہی کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔

ترجمہ: ہر طرف طاق ہی طاق ہیں
جرمن، تیرے بچے مریں
تو جنہیں بے رحمی سے مار رہا ہے، انہیں ماؤں نے
بڑے دلار سے پالا ہے
ڈولی میں کھوجی ہے
اللہ پاک ہمارے فوجیوں کو

کامیاب واپس لائے
تاکہ انہیں اپنے وطن میں روزی نصیب ہو (37)

ہندکو۔ڈیروی لوک بیانیہ:

ڈیرہ اسماعیل خان کے ہندکو لہجے میں اس لوک بیانیہ کا ایک اور اچھوتا انداز ملتا ہے

ترجمہ: بازار میں جامن بک رہے ہیں
میرا محبوب بنوں چلا گیا ہے
میں اپنے محبوب سے ناراض ہوں، بہت ناراض ہوں
سبز مارکین کی قمیض پر مجھے پھول کاڑھ دے
میں یہاں، میرا محبوب چھاؤنی میں ہے
اس نے روڑی کوٹ کر سڑک بنائی ہے
میں اپنے محبوب سے ناراض ہوں، بہت ناراض ہوں
سبز مارکین کی قمیض پر مجھے پھول کاڑھ دے
محبوب چھاؤنی میں روڑی کوٹ کر سڑک بنا رہا ہے

محرومی کے احساس سے محبوبہ کا دکھ بڑھتا جاتا ہے کہ وہ محنت مزدوری کے لئے اس سے جدا ہو کر بھی اور روڑی کوٹ کر سڑک بنانے کی محنت شاقہ کا عذاب جھیلنے کے باوجود اس قابل نہیں کہ اس کی اتنی سی خواہش پور کر سکے۔(38)

ہندکو۔لوک دانش:

بھٹھ پوے اوہ گہنا، جیہڑا کن تروڑے
ترجمہ: بھاڑ میں جائے، وہ سونا، جس سے ٹوٹیں کان

ہتھ نہ پہنچے، تھُو کوڑی
ترجمہ: انگور کھٹے ہیں

ضرب الامثال نسلوں کی اجتماعی لوک دانش کا حاصل ہوتی ہیں جو صدیوں کے عمل سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہیں۔ اسے خالص ترین لوک بیانیہ کہہ سکتے ہیں جو سماجی اور انسانی بنیاد پر مبنی ہوتا ہے۔ ہندکو کی چار پانچ ضرب الامثال سے معاشرے کے سماجی، معاشی، حتیٰ کہ تاریخی تار و پود کو سمجھنا چاہتے ہیں تو چند ضرب الامثال ہی ہمارے مطالعے کے لئے کافی ہیں حالانکہ ہندکو کی چند سو کہاوتوں کی مدد سے ہم ہندکو معاشرے کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کر سکتے ہیں۔ مثلاً روٹی کی حقیقت کو جس ضرب المثل میں بیان کیا گیا ہے، اس کی بنیاد پر تمام انسانی رشتوں اور پیداواری تعلقات کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ انسانی نفسیات کی تہداری تک پہنچ سکتے ہیں اور تمام انسانی مخاصموں، جنگوں اور

امن کے سوال کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔
ایک اور ضرب المثل کا جائزہ لیتے ہیں

ہتھ نہ پہنچے، تھوکوڑی

یا اس کے اردو مترادف انگور کھٹے ہیں کو لے لیجئے۔ یہ ضرب المثل عالمی صداقت ہے اور دنیا کے ہر معاشرے میں عام مروّج ہے۔ اس کے پیچھے نفسیاتی، سماجی، معاشی، حتیٰ کہ تہذیبی پہلوداری موجود ہے۔ انسانوں کے درمیان حسد، لالچ اور اپنی ناکامیوں پر جھلاہٹ جیسے روّیے اسی لوک دانش کا نتیجہ ہیں۔ ان روّیوں کی حامل ضرب الامثال کی چند مزید مثالیں درج ذیل ہیں:

نہ چور گئے، نہ کالی راتیں گئیں

یہ ضرب المثل بدی کی سرشت کے ہمیشہ جاری رہنے کی بات کرتی ہے کہ تاریک راتیں بھی وہی ہیں اور چوروں کا وجود بھی ختم نہیں ہوا۔ اس لئے چوروں کا راج کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ یہ ضرب المثل لوک بیانیہ کی روح کے منافی ہے جس میں دانش تو ہے لیکن بدی کی سرشت کے جاری رہنے کی بات بھی ہے۔ گویا ظلم کا کبھی خاتمہ نہیں ہو سکتا ۔ ہر زبان میں ایسی ضرب الامثال یا دانشمندی پر مبنی اقوال موجود ہیں، جو ظلم اور بدی کی قوتوں کا پرچار کرتے ہیں جن کا تنقیدی جائزہ لیتے رہنا ضروری ہے۔

اسی طرح بعض ایسی ضرب الامثال کا سہارہ لیا جاتا ہے جن کی بنیاد رجعت پسند روایات پر رکھی گئی ہو مثلاً

بہن کے گھر بھائی، وہ بھی کتے کی مثل، سسر کے گھر داماد، وہ بھی کتے کی مثل

یہ ضرب المثل پرانے روایتی تصورات پر مبنی ہے اور ایک طرح سے انسانی رشتوں کو جوں کا توں قائم رکھنے کی بات کرتی ہے۔ ان کے برعکس ترقی پسند اور صحت مند قدروں کی حامل ضرب الامثال بھی ہیں جو حقیقی معنوں میں لوک بیانیہ کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً

دل میں سچ تو کوٹھے پر ناچ
اس کی مترادف اردو ضرب المثل
سانچ کو آنچ نہیں، ویسی ہی صحت مند قدروں کی حامل ہے یا پھر
اونٹوں والے دروازے بھی اونچے رکھتے ہیں۔

اسی طرح،

دوست دستِ تعاون بڑھائے تو اسے نگل نہیں لینا چاہئے
بروقت نمازیں، بے وقت ٹکریں

ناخنوں سے ماس جدا نہیں ہوتا

ایک در بند، سو کھلے

جتنا گڑ ڈالو گے، اتنا میٹھا ہوگا

انگلی سے سورج نہیں چھپ سکتا

پیدل اور سوار رات کو ایک ہی جگہ پہنچتے ہیں

لاٹھی مارنے سے پانیوں میں لکیر نہیں پڑتی

آگ اور پانی کی دوستی نہیں ہوتی

جگہ وہی جلتی ہے، جہاں آگ لگی ہو

ہاتھ سے چاند نہیں چھپتا

لعل گدڑی میں چھپا نہیں رہتا

سر سلامت ہوں تو ٹوپیوں کی کمی نہیں

آگ جلتی ہے تو دھواں بھی اٹھتا ہے

کاغان کا گوجری لوک بیانیہ:

ہندکو کے کاغانی لہجے کی بات گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ منشی اور درشی کی لوک داستان کاغان کی امر داستان کہی جا سکتی ہے۔ جہاں تک گوجری بولنے والوں کا سوال ہے، وہ صرف کاغان یا خیبر پختونخواہ کے دیگر علاقوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ برصغیر پاک و ہند کے دیگر کئی علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے، جن میں جموں و کشمیر، ہماچل پردیش، اتر پردیش، گجرات کاٹھیاواڑ اور راجستھان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ فارغ بخاری کے لفظوں میں یہ سارے برِ صغیر میں اس گوجر قبیلے کی زبان ہے جو سفید ہنوں (White Huns) کے ساتھ یہاں آئے۔ سفید ہنوں کی نسل تو آج شاید دنیا میں کہیں موجود نہیں البتہ ان کے ساتھی گوجر آج بھی زندہ و پائندہ ہیں۔ یہ صدیوں سے پہاڑوں کے دامن میں الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں۔ کہیں کہیں پہاڑوں اور ٹیلوں کو کاٹ کر کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ سبزیاں بھی اگاتے ہیں لیکن ان کا بنیادی پیشہ دودھ، اون اور کھالوں کی تجارت ہے۔ پاک و ہند میں کئی ایک شہر گجرات، گوجر خان، گوجرانوالہ وغیرہ انہیں کے نام پر آباد ہیں خصوصاً خیبر پختونخوا میں (جو گوجروں کا مرکزی مقام ہے) کوہ ہندوکش سے کاغان اور کشمیر کی پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے کوہستانی سلسلوں میں بہت بڑی تعداد میں گوجر آباد ہیں۔ ان کے نام سے بہت سے گاؤں گوجری، گوجراں، گوجر گڑھی، گجر کلی، گوجر سرائے وغیرہ مشہور ہیں ان کی زبان گوجری کہلاتی ہے جو ہندکو ہی کی ایک اکھڑ بولی ہے یہ وہی زبان ہے جسے دہلی میں کھڑی بولی کا نام دیا گیا اور اردو زبان کی اصل قرار پائی۔ ان کی زبان میں پراکرتی (جو اس دیس کی قدیم بولی ہے) گھلی ملی محسوس ہوتی ہے۔

پشتو زبان کے مشہور محقق مولانا اثر افغانی کی تحقیق کے مطابق آرین کی یلغار کے دوسرے مرحلے میں جہاں پہلے آرین قبائل نے شہروں میں پناہ لی وہاں بعض قبائل جو میدانی علاقوں سے مانوس نہ تھے پہاڑی سلسلوں میں آ کر پناہ گزین ہوئے یہ لوگ ابتداء ہی سے پہاڑی زندگی کے عادی تھے اور مال مویشی پر گزر کرتے تھے۔اسی رعایت سے یہ گوجر کہلائے اور وہ جو زبان بولتے تھے اسے گوجری کہا گیا یہ گوجر ابھی مشرقی افغانستان کے علاقہ نعمان اور دیگان میں دریائے کونٹر کے دائیں کنارے چار دیگان کی حدود تک پھیلے ہوئے ہیں اور سوات، دیر، چترال کی ریاستوں کے علاوہ ضلع ہزارہ میں کاغان اور گلیات میں بھی ان کی بھاری تعداد آباد ہے۔یہ قبیلہ گوجری یا پشائی کہلاتا ہے اوران کی بولی پشئی یا پشاچی ہے۔پشاچی کی ہندکو سے مماثلت ان اعداد سے ظاہر ہے۔ (39)

کاغان کا گوجری لوک بیانیہ مویشیوں کی زندگی سے جڑی گوجر معاشرت کا لوک بیانیہ ہے جس میں پرشکوہ پہاڑ ہیں، پھول، جھرنے، سبزہ زار اور بھیڑ بکریوں کی زندگی ہے۔کھلی فضائیں اور آزاد ماحول ہے۔فطرت سے ان کا قریبی ربط وضبط ہے۔اکھڑ اور الھڑ باشندوں کے فطری جذبات ہیں مثلاً اس گیت کی فضاء دیکھئے:

اونچی حویلی میں نیلی نیلی گھاس ہے
مجھے پردیس میں غم کھا گیا ہے
اللہ پردیسیوں کے محبوب کو واپس لائے
اونچی حویلی میں خوبصورت پھول ہیں
پردیس آ کر سب باتیں بھول گئیں
اللہ بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو ملائے
اونچی حویلی میں نیلا نیلا ساگ ہے
پردیس میں راگ گا رہی ہوں
محبوب میری تقدیر الٹ گئی ہے
اونچی حویلی میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے
پردیس آ کر میری جان کمزور ہو گئی ہے
محبوب کبھی تو آ کر میرا حال دیکھ
اونچی حویلی میں خوبصورت میدان ہے
پردیس میں میری جان سوکھ گئی ہے
محبوب آ کر مجھے شاداب کر دے
اونچی حویلی میں مویشی چر رہے ہیں

پردیس میں میرا برا حال ہے
محبوب کبھی تو آ کر مل لے
اونچی حویلی میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں
محبوب تیرا نام گنگنا رہی ہوں
اونچی حویلی میں چھوٹی چھوٹی کاڑ ہے
پردیس میں غم نے جلا دیا ہے
میرے محبوب آ کر میرا رونا دیکھ
اونچی حویلی میں دھوپ پھیلی ہے
پردیس میں رنگ روپ جاتا رہا
محبوب آ کر میرا پیلا رنگ دیکھ
اونچی حویلی میں بھیڑیں چر رہی ہیں
میرے محبوب مجھے چپ لگ گئی ہے
اونچی حویلی میں رتن جوگ ہے
پردیس میں جان کو روگ لگ گیا ہے
محبوب آ کر میری نبض دیکھ جا(40)

ایک اور گوجری گیت کا آہنگ ملاحظہ ہو:

ترجمہ: سفید کوٹھے پر انگور کی بیل ہے
سردی گزر گئی، بیساکھ آ گیا
میرا چاند نہیں آیا
سفید کوٹھے پر پیارا موسم ہے
عصر کے وقت اسے تار دے کر بلا لوں
میرا چاند نہیں آیا
سفید کوٹھے پر ہنگ کا درخت ہے
میری جان عذاب میں ہے
میرا چاند نہیں آیا
اونچے درخت پر بٹیر ہے

میرے لئے ساری دنیا اندھیر ہے
میرا چاند نہیں آیا
اونچے بوٹے کے نیچے نارنگی ہے
میں بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی ہوں
میرا چاند نہیں آیا
نیلی گھاس کو مویشی چر رہے ہیں
میرے دل میں یہی خیال ہے
میرا چاند نہیں آیا
سفید گھوڑی اور لال لگام ہے
نہ مجھے خوشی ہے نہ آرام ہے
میرا چاند نہیں آیا
تمام کھیتوں اور جنگلوں سے ہو کر آئی ہوں
میرے دکھ کا کہیں کوئی علاج نہیں
میرا چاند نہیں آیا
تمام کھیتوں میں گنا اُگا ہے
میری زندگی میں کوئی لذت نہیں
میرا چاند نہیں آیا
نیلے راستوں میں بن کھوڑا اگا ہے
میری امید کب پوری ہوگی
میرا چاند نہیں آیا
آگ جلے تو روٹی پکاؤں
میری تقدیر کھوٹی ہے
میرا چاند نہیں آیا
کورے گھڑے میں پانی بھرتی ہوں
رو رو کر جان ہلکان ہوگئی ہے
میرا چاند نہیں آیا

رات آئی دن گزر گیا
سارا دیس مجھے ویران لگتا ہے
میرا چاند نہیں آیا
گھٹا چھائی، برسات آئی
رو رو کر رات کاٹتی ہوں
میرا چاند نہیں آیا
نیلے جنگل میں گھنے پھول کھلے ہیں
میری قسمت میں کچھ نہیں
میرا چاند نہیں آیا
دن ڈوبا، شام آئی
کیسی خوشی، کہاں کا آرام
میرا چاند نہیں آیا(41)

فارغ بخاری بتاتے ہیں کہ:

''ان گیتوں میں موسموں کا ذکر، کھیتوں کا ذکر اور اوقات کا تذکرہ بے محل نہیں، اس معصوم مخلوق میں عشق کا وہ مجہول تصور نہیں کہ سب کام کاج چھوڑ محبوب کے فراق میں بیٹھے رو رہے ہیں۔ عشق اپنی جگہ کچھ کم نہیں لیکن یہ غریب مخلوق مصنوعی زندگی نہیں گزار سکتی۔ انہیں گھر کا کام بھی کرنا ہوتا ہے۔ مال مویشی بھی چرانے پڑتے ہیں کھیتی باڑی کا کام بھی ضروری ہے۔ یہ نہ کریں تو کھائیں کہاں سے۔۔ ہاں یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی محبوب کی یاد سے غافل نہیں۔ دل میں دکھ ہے آنکھ میں آنسو ہیں، لبوں پر آہ ہے، دوشیزہ روٹی پکا رہی ہے آنسو بہہ رہے ہیں، پانی بھر رہی ہے ٹھنڈی آہیں بھر رہی ہے، دودھ دوہ رہی ہے، دل سے ہوک اٹھ رہی ہے۔

گوجروں کی زندگی کی طرح ان کے لوک گیت بھی صاف شفاف اور پاکیزہ ہیں ان کی محبت اور عشق میں تقدس اور عبادت کا احساس ہوتا ہے ان کی زندگی سادہ ہے اس لئے ان کے مسائل مہذب دنیا کے مسائل سے بہت کم ہیں ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ محبوب محنت مزدوری کے لئے جدا ہو جائے تو یہ مفارقت ان کے لئے جان کا روگ بن جاتی ہے یہ دُکھ ان کے تمام گیتوں میں مختلف رنگوں میں جھلکتا ہے۔

ترجمہ:

جلد واپس آ محبوب، کیوں دیر لگا دی ہے
پردیسیوں کا جی گھبرا رہا ہے

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب تیرا ہی خیال ہے

پردیسیوں کا فرقت میں بُرا حال ہے

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب، جی اداس ہے

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب، میں لاچار ہوں

پردیسیوں کو غم نے مار دیا ہے

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب،

میرے دل میں بڑا ارمان ہے

پردیسیوں کو یہ دیس کھانے کو دوڑتا ہے

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب میرا دل غمگین ہے

پردیسیوں کے سینے میں تیر لگ رہے ہیں

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب سخت بے چین ہوں

پردیسیوں کی صبح بھی شام سے کم نہیں

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب، دل خفا ہے

پردیسیوں کی زندگی کوئی زندگی نہیں

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب، تیرا غم مجھے لے ڈوبا ہے

پردیسیوں کا رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب دل حیران ہے

تو ہی ہم پردیسیوں کی جان ہے

میرے محبوب جلد واپس آ

جلد واپس آ محبوب میری جان کو روگ لگ گیا ہے

پردیسی اپنے دیس سے دور ہیں

میرے محبوب جلد واپس آ (42)

چترال کا لوک بیانیہ:

لسانی تنوع: چترال، لوک بولیوں کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ درجن سے زائد زبانوں کا یہ خطہ لسانی تنوع کا شاندار مرقع ہے۔ یہاں کی مرکزی اور نماں یا ترین زبان کھوار ہے جس کے لوک بیانیہ کی مختلف جہتیں ہیں، یہ ضلع کی رابطہ زبان بھی ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی نے کھوار کے علاوہ دیگر زبانوں کی تفصیل بیان کی ہے؛ اس کے علاوہ علاقے کی دیگر تیرہ زبانوں میں شینا، گرار بتی، ڈامیا، پشتو، کیلاشہ، یدغہ؛ کٹی (بشگالی) دری، گوجری، سریقولی، واخی، کرغیز اور اوراورسونی دار شامل ہیں (43) جنہیں شین، گواری، ڈمیلی، پٹھان کیلاش، قنجی، واخی بشگالی، تاجک، گوجر، سریقولی، کرغیز بنسونی قبائل بولتے ہیں۔ شینا کو پھلوار پالولا بھی کہا جاتا ہے۔ مقامی طور پر اسے اسور یتانو وار کا نام بھی دیا گیا ہے۔ پالولا کا حروف تہجی عربی ہے۔ گوار بتی ابھی تک تحریر کی سہولت سے محروم ہے اور اس میں سینہ بہ سینہ روایات کا سلسلہ قائم ہے۔ جنوبی چترال میں نو آباد پشتون پشتو یا پختو بولتے ہیں جو مطبوعہ ادبیات سے مالا مال ہے کٹی (بشگالی وار) کا تعلق کافر گروپ سے ہے اور گوبور، رمبور اور بمبوریت وادی میں بولی جاتی ہے۔ دری تاجک قبیلے کی زبان ہے جب کہ کیلاشہ کافر گروپ کی ایک اہم زبان ہے۔ یہ تحریری زبان نہیں ہے۔ البتہ رومن رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس زبان میں سورماؤں کی بہادری کے کارناموں کی داستانیں موجود ہیں۔ یدغہ بیک میں بولی جاتی ہے اور اسے قنجی تارکین وطن بولتے ہیں۔ اس کا ایک گیت ماماشیش، خاصی شہرت کا حامل ہے۔ چترال کا خانہ بدوش قبیلہ گوجر، گوجری زبان بولتا ہے۔ جس کا جاندار ادبی ذخیرہ موجود ہے۔ کینڈال ڈی ڈیکر (Kendall D Decker) نے اپنی انگریزی تصنیف ''چترال کی زبانیں'' میں چترال میں کھوار، یدغہ، پھلورا یا پالولا، کیلاشہ، ڈمیلی، مشرقی کٹی وری اور گوار بتی زبانوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ محمد پرویش شاہین نے چترال کی تحصیل دروش کی وادی شیشی کوہ کو زبانوں کی وادی قرار دیا ہے۔ وادی کی زبانوں میں انہوں نے گوجری، کیلاشہ، کھوار، پشتو، گوار بتی اور بدخشی یا مداکلشٹی کا ذکر کیا ہے۔ (45)

کھوار لوک بیانیہ:

کسی علاقے کا لسانی تنوع اور رنگا رنگی اس علاقے کا حسن ہوتا ہے۔ دیگر پاکستانی علاقوں کی طرح چترال بھی تنوع کے اس حسن سے مالا مال ہے۔ صرف کھوار زبان کی رنگا رنگی کو دیکھا جائے تو اس میں کلاسیکی شاعری،

لوک گیت، لوک داستانیں ہیں۔ لوک دانش ہے، کلاسیکی شاعری خود لوک رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کی ایک مثال بابا محمد سیئر کی ہے جو کھوار کے ساتھ ساتھ فارسی کے اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ لیکن کھوار میں ان کا شعری مجموعہ ''یارِ من ہمیں'' ان کا نمائندہ کلام ہے۔ غلام عمر کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ان کا زمانہ تقریباً وہی تھا جو چترال کے حکمران شاہ محترم شاہ ثانی المعروف بہ شاہ کٹور ثانی (1788 تا 1838) کا دور تھا۔ محمد سیئر دوست محمد لال کے صاحبزادے تھے۔ اپنے والد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انہوں نے دور دراز ملکوں کے سفر کئے۔ ثمر قند، بغداد اور سر ہند معروف مقامات ہیں۔ جہاں سے انہوں نے تحصیل علم کیا۔ بعض روایات کے مطابق ،ان کا دور خانہ جنگی کا دور تھا۔ ان جنگوں کا زمانہ کم و بیش ایک صدی پر محیط پوری اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کا نصف اوّل ہے۔ محمد سیئر بھی بعض لڑائیوں میں شریک رہے۔ اس لئے انہیں صاحب سیف وقلم کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کے شعراء میں محمد صنعاء محوی اور ملا پیچ کے نام معروف ہیں۔ بازار میں سکے کا چلن نہیں تھا۔ کسی ایک جنس کی ادائیگی دیگر اجناس سے کی جاتی تھی۔ پولو اس عہد کا مقبول ترین کھیل تھا۔ اس کے علاوہ لوگ باز کے شکار کا بھی شوق رکھتے تھے۔ محمد سیئر کا تعلق طبقہء امراء کی اشرافیہ سے تھا۔ فارسی میں ان کے کلام کے دو مجموعے ہیں جن میں سے ایک ''شاہنامہ سیئر'' ابھی تک قلمی نسخے کی صورت میں موجود ہے۔ یہ اس دور کی رزمیہ شاعری کا مرقع ہے۔ انہوں نے زبردست عشق کیا۔ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی منزل تک پہنچے۔ زندگی کے آخری دور میں عبادات اور تصنیف و تالیف میں گزارے۔ ''یارِ من ہمیں'' ان کی کھوار شاعری کا مجموعہ ہے۔ غلام عمر نے اپنی معروف کتاب ''چترال کی لوک کہانیاں'' میں ایک کہانی مرزا محمد سیئر یا سیار کے بارے میں بھی لکھی ہے جس سے ان کے عشق کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

''شوگرام اور ریشن دو ایسے گاؤں ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے آباد ہیں۔ درمیان میں دریا بہتا ہے۔ شوگرام مغرب کی طرف ہے اور ریشن مشرق کی طرف، دونوں گاؤں کے درمیان ایک پُل ہے جو رابطہ کا کام دیتا ہے۔ اب یہ پُل لکڑی اور لوہے کے تاروں کا بنا ہوا ہے۔ پرانے زمانے میں دریائے چترال کے اوپر یہ پل بید کی شاخوں سے بنا ہوا تھا۔ اس قسم کے پلوں کو ''تیلی سیر'' (یعنی بید کی شاخوں سے بنا ہوا پل) کہتے ہیں سوائے اس تیلی سیر کے شوگرام اور ریشن میں نقل و حمل کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ دونوں گاؤں دریا کی سطح سے بہت اونچے ہیں۔ اس لئے ان کی آب پاشی دریا کی مرہون منت نہیں۔ بلکہ شوگرام کے بیچ میں ندی بہتی ہے جو شوگرام کو سیراب کرتی ہے اور ریشن کے بیچ میں ''ریشن گول'' کی وہ مشہور ندی ہے جس کے پانی میں فولاد زیادہ شامل ہے اور اسے صحت بخش پانی کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوگرام کی نسبت ریشن زیادہ زرخیز اور شاداب جگہ ہے۔ شوگرام اور ریشن کی مٹی میں بھی فرق ہے۔ شوگرام کی مٹی سیاہی مائل چکنی مٹی ہے اور ریشن کی خاک سُرخ اور سرخی مائل ہے۔ تمام گاؤں سُرخ سا لگتا ہے۔ آبادی اور رقبے کے تناسب کے لحاظ سے ریشن، شوگرام سے بڑا بھی ہے اور پرانے زمانے سے زیادہ ترقی یافتہ بھی

ہے۔قدیم زمانے میں قافلوں اور کاروانوں کی گزرگاہ ریشن میں سے تھی اور اب بھی آمدورفت کی سڑک ریشن میں سے ہی گزرتی ہے اور چوگان بازی کا میدان بھی ریشن میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

''شوگرام کے جنوبی ساحل پر جو ریشن کے بالکل سامنے ہے ایک تنومند وجیہہ صورت شرفاء کے لباس میں ملبوس نوجوان پتھر پر پہاڑ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔دنیاو مافیا۔سے بے خبر،استغراق میں محو،ٹکٹکی باندھے ریشن کی طرف دیکھ رہا ہے۔اس کی آنکھوں میں اشتیاق اور تجسس بھرا ہے۔نوجوان کا چہرہ سرخ انگارے کی طرح دہک رہا ہے اور ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔چہرے سے یاس اور ناامیدی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔بلکہ ہرلحہ امید کی جھلک نظر آتی ہے اور ہر لحہ نہایت امید سے ریشن کی طرف دیکھ رہا ہے۔کبھی حسرت سے اپنے گردوپیش پر نگاہ دوڑاتا ہے پھر فوراً پُر امیدی سے ریشن کی طرف دیکھنے لگتا ہے بہار کا یہ پرکیف منظر بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا ہے۔پھولوں کی خوشبو پرندوں کی چہچہاہٹ،مایوں کی نغمہ سرائی،ڈھلتے سورج کا نظارہ دریا کی موجوں کا شور کوئی بھی چیز اس کی توجہ ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔وہ ان تمام سے بے نیاز محویت کے عالم میں بیٹھا ہے۔

''مرزا محمد سیار ایک معزز گھر کا لڑکا،زیورِ علم سے آر استہ،شرافت کا پیکر اور بلند اخلاقی میں بے مثال نوجوان تھا۔دینی حمیت اور خاندانی شرافت دونوں اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ کسی غیرعورت سے عشق نہ کیا جائے۔مگر دل پر کسے اختیار حاصل ہے۔''

''ایک مرتبہ ریشن کی ایک تقریب میں محمد سیار نے اسے دیکھا اور دل مین ایک خلش سی محسوس کی۔پہلے پہل اسے ایک معمولی خلش سمجھ کر اتنی توجہ نہیں دی لیکن خلش تھی کہ درد بن گئی۔شوگرام اور ریشن کے لوگ تقریباً ایک ہی برادری کے لوگ ہیں ان کے مفادات مشترک ہیں۔وہ مربوط دیہی زندگی گزارتے ہیں۔پرانے زمانے سے وہ ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔اجتماعی کام میں دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ ہیں۔اسی سبب سے ان کے میل ملاپ اور ایک جگہ جمع ہونے کے مواقع پہلے بہت زیادہ تھے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا زیادہ تھا۔محمد سیار اکثر ریشن جایا کرتا تھا۔خرید وفروخت کرنے کے علاوہ کچھ دیر کسی دوست،رشتہ دار کے ہاں ٹھہرتا اور شام کو واپس لوٹ آتا ۔قومی جرگے اور اہم اہم کام بھی ریشن میں وقوع پذیر ہوتے تھے۔

چوگان بازی کے مقابلے ریشن کی ''جنالی'' میں ہوتے تھے اور محمد سیار چوگان بازی کا مانا ہوا کھلاڑی تھا چنانچہ یہ سب کچھ بہر ملاقات ثابت ہوا اور روز روز کی دید نے آتش بھڑکانا شروع کردی۔پہلی ملاقات میں جو چنگاری اس کے دل میں لگی تھی۔وہ اب آتش سوزاں بن گئی اور وہ اس آگ میں تپتا اور جلتا رہا۔''

''معاشرتی اور اخلاقی اقدار کا تقاضا تھا کہ اس کا عشق راز میں رہے اور محمد سیار نے اس آگ کو سینے سے باہر بھڑکنے نہ دیا اور اندر ہی اندر جلتا رہا۔اور انتہا یہ کہ اس آتش عشق سے اس کی محبوبہ بھی واقف نہ ہو سکی۔اسے علم نہیں کہ محمد سیار لال جو اکثر آتا ہے اس کے دل میں کیا کیا طوفان اٹھے ہوئے ہیں۔سیار نے مصلحت کے آگے ہتھیار

ڈال دیئے تھے لیکن کہاں عشق اور کہاں مصلحت، یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں چنانچہ اس نے بار بار ریشن کی طرف جانا موقوف کیا اور شوگرام ہی میں اس پہاڑی کے اوپر جا بیٹھا جسے ''زدموسورو'' کہتے ہیں اور اکثر اوقات وہیں گزارتا اور کوئے یار کی طرف والہانہ انداز میں دیکھتا جاتا۔''

محمد سیآر کو عشق نے شاعر بنا دیا تھا جس کا شہرہ دُور دُور تک ہونے لگا تھا وہ غزل اور مثنوی میں دل کی بات کہتا۔ وارداتِ قلب ونظر محبوب کا حسن بے مثال، سیآر کے دل کی جنونی حالت درد کی شدت اور آگ کی سوزش، اس کے اشعار میں جھانکنے لگی اور سیآر کہتا رہا۔ کئی سال بیت گئے اسی دوران اس کی مشہور نظم ''یارِمن ہمیں'' سامنے آئی چونکہ دل سے نکلے ہوئے اشعار تھے ذاتی مشاہدات پر مبنی تھے۔ اس لئے ان اشعار کو شہرت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ آناً فاناً مقبول عام ہو گئے اور بزم کی مجلسوں میں گائے جانے لگے۔ سیآر خود بھی اکثر انہیں گاتا رہتا تھا۔

سیآر کے اس معصوم اور یک طرفہ عشق نے اس کی محبوبہ کو نام دیا اور لوگ اسے ''یارِمن ہمیں'' کے نام سے پکارنے لگے گو خاتون کے گھر والوں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی تھی مگر عشق کا دستور نرالا ہوتا ہے۔''

''ایک دن گاؤں کی خواتین اکٹھی ہوئیں اور سب نے سیآر کی معشوقہ پر طنز کی کہ فلاں تیرے عشق میں دیوانہ ہو کر تیری تشہیر کرتا پھرتا ہے ''یارِمن ہمیں'' کو یہ باتیں بہت بُری لگیں اور مزاج کی برہمی کا یہ عالم ہوا کہ نوکر کو ساتھ لے کر غصے سے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح شوگرام کا راستہ لیا۔ وہ گاؤں سے باہر نکلی اس وقت سردیوں کے دن تھے اور برف باری ہو رہی تھی۔ راستے پر تقریباً گھٹنوں تک برف کی تہہ جم گئی تھی اور چلنے سے پاؤں برف کے اندر دھنس رہے تھے کُہر اور دھند کا یہ عالم کہ چند گز آگے بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دن پر شب کا گمان تھا۔ یارِمن ہمیں نے اس خراب موسم کی کوئی پروانہ کی تھی وہ آگے بڑھتی رہی، غصے سے اس کا چاند سا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ حسن کی تلوار بے نیام ہاتھ میں لئے قتلِ سیآر کی مہم پر جا رہی تھی اور اپنا ہر اگلا قدم پچھلے سے زیادہ زور کے ساتھ رکھتی تھی۔

''ادھر محمد سیآر آج دن بھر ریشن کی طرف نگاہیں دوڑاتا رہا لیکن دھند کُہر اور برف باری کی وجہ سے دیدار حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر دل کے ہاتھوں مجبور موسم کی خرابی کی پروا کئے بغیر ''شوقے'' کو سر پر اوڑھ کر عازمِ ریشن ہوا اور برف پر پھسلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ شوگرام اور ریشن کے درمیانی پل تک پہنچ گیا۔ آدھا پل ابھی طے کیا ہی تھا کہ دوسری طرف سے آتی ہوئی ''یارِمن ہمیں'' اچانک شعلۂ جوالا بن کر اس کے سامنے آ گئی۔ دھند اور برف باری کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کو بہت قریب آنے پر ہی پہچانا اور تھوڑی دیر کے لئے دونوں حیرت زدہ ہو گئے ظلم ہمیشہ قوی ہوتا ہے۔ ''یارِمن ہمیں'' آگے ہی بڑھنے لگی۔ یہ پل ایسا تھا کہ اس کی چوڑائی بالکل معمولی تھی۔ بمشکل ایک شخص کے چلنے کا راستہ تھا جب اسی طرح دو انسانوں کا آمنا سامنا ہو جائے تو سوائے اس کے کوئی صورت نہیں کہ ایک انسان یا تو واپس مڑے اور راستہ خالی کر دے یا پھر ایک طرف لگ کے اس طرح کھڑا ہو جائے کہ دوسرا اسے چھو کر پاس سے گزر جائے۔ پُل کے تختے پر برف کی وجہ سے پھسلن تھی۔ ذرا پاؤں پھسلنے سے گرنے اور خوفناک انجام سے

دوچار ہونے کا اندیشہ تھا۔محمد سیار کے لئے یہ صورت آزمائش کا مرحلہ تھا اس نے سوچا اوراچانک ایک خوفناک فیصلہ کر بیٹھا۔''

''محمد سیار عاشق صادق تھا اس کے ذہن میں معاً دو خیال کوندے کہ پُل کے بیچ میں ایک طرف لگ کے دوست کو گزرنے کا راستہ دے۔یہ ایسے موقعوں کے لئے عام اور مروّج طریقہ تھا اور کسی کو گزرنے کے لئے راستہ دینے کے لئے کمال ادب تھا۔اگر ایسا کرتا تو کوئی عجیب بات نہ تھی بلکہ عین قرینہ تھا لیکن محمد سیار نے اس خیال کو مسترد کردیا کہ اس کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس طرح سے محمد سیار کے کپڑوں اور جسم کے معشوق سے چھو جانے کا اندیشہ تھا اور اس کی غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس گناہ کا مرتکب ہوجائے۔دوسرا خیال اس کے ذہن میں یہ گزرا کہ پیچھے مڑ کے واپس چلے اور دوست کے لئے پل کو خالی کردے۔ایسے تنگ راستوں میں راہگیروں کا ایک دوسرے کو راستہ دینے کا یہ طریقہ بھی رائج تھا۔اس میں دوسرے کے لئے یعنی جس کے لئے راستہ خالی کیا جاتا ہے۔عزت، توقیر اور حوصلہ افزائی کی بات ہوتی ہے کہ راستہ سے ہٹ کے اس کے گزرنے کے لئے جگہ خالی کی جاتی ہے۔محمد سیار اگر اس طرزِ سلوک کو روا رکھتا تو عین قابل قبول بات تھی اور معشوق کو بھی کوئی شکوہ نہ ہوتا۔لیکن اس نے اس خیال کو بھی مسترد کردیا کہ اس میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ پلٹ کے چلنے میں معشوق کی طرف پیٹھ کرنی پڑتی تھی جو بے ادبی کے مترادف تھا اور اس بے ادبی کو وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

لہٰذا اس نے دل میں فوراً فیصلہ کیا کہ الٹے پاؤں چلنا چاہئے تاکہ دونوں خامیاں نہ رہیں کہ معشوق کو چھونے کا گناہ بھی نہ ہو اور پیٹھ کرنے کی بے ادبی بھی نہ ہو۔وہ منہ معشوق کے رُخ، تاباں کی طرف کئے پھسلان اور لرزاں پُل پر الٹے پاؤں چلتا رہا۔آنکھیں چہرہء یار پر گڑ گئیں۔گردن موڑ کے راستہ دیکھ کے اِلٹے قدم لینے کی مہلت اس لئے نہیں تھی کہ سامنے چاند ہے جس سے نظریں ہٹانا اسے پسند نہ تھا الٹے قدم چلتا رہا لیکن پھسلن کی وجہ سے اچانک لڑکھڑا گیا اور دوسرے ہی لحہ وہ دریا کی موجوں سے جاملا۔

''شوگرام پل دریا کے اوپر انتہائی بلندی پر بنایا گیا تھا۔پل سے نیچے دریا پر نگاہ ڈالیں تو دونوں طرف کی ٹھوس چٹانوں میں گھری ہوئی گھاٹی کے اندر کنواں سا لگتا ہے اکثر کمزور قسم کے انسان کا سر اس منظر سے چکرا جاتا ہے لیکن محمد سیار اتنی بلندی سے دریا میں گرا صرف اس مقصد کے لئے کہ چھو جانے پر گناہ اور پیٹھ پھیرنے پر بے ادبی شانِ عشق کے خلاف باتیں ہیں یہاں سچائی کا عشق ہے جو معشوق کی رضامندی کے علاوہ تمام خوف وخطر سے بے نیاز ہوتا ہے۔

''محمد سیار تیراکی میں تجربہ کار اور موجزنی سے واقف تھا۔تیر کر دوسرے کنارے یعنی ریشن کی طرف والے کنارے نکلا اور دریا سے نکل کر برف کی سطح پر بھیگے ہوئے موٹے اونی کپڑوں کے ساتھ کاٹتی ہوئی سردی کی پروا کئے بغیر ریشن کی طرف چلتا رہا اور اس منجمد کرنے والی ہوا کے مقابلے میں اپنے عشق کی گرم ہوا سے تپش حاصل کرتا

رہا۔ بالآخر ریشن گاؤں پہنچا۔ سیدھا ''یارمن ہمیں'' کے پڑوس میں ایک ہمسائے کے گھر گیا۔ گھر کے مرد نے دیکھا کہ لال کے کپڑے اس کے جسم پر شدت ہوا کی وجہ سے منجمد ہو گئے ہیں۔ اس نے اس حالت کو دیکھ کر پوچھا کہ اے لال! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' محمد سیار نے جواب میں تمام ماجرا بیان کیا۔ اس نے ماجرا سن کر کہا'' تیرے یار نے تو تجھے اجل کا نوالہ بنایا تھا مگر خدا کی طرف سے تمہیں مزید زندگی گزارنی ہے۔

''اس واقعے نے اس رومان کو وہ شہرت بخشی کہ عشق میں محمد سیار کی شخصیت کو ضرب المثل قرار دیا گیا۔ یار من ہمیں نے بھی اس واقعے کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا اور کبھی غصے کا اظہار نہیں کیا۔

''مرزا محمد سیار کا عشق آخری عمر تک جاری رہا اور بالآخر اس کا رُخ عشق حقیقی کی طرف رو بہ پرواز ہوا۔ لیکن یار من ہمیں اس کے شعری اظہار سے دور نہ ہو سکی''۔

غلام عمر کی ایک اور تصنیف ''باباسیئر'' شاعر کی حیات، شخصیت اور شعروفن پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ جس میں ان کے فارسی اور کھوار کلام پر الگ الگ بحث کی گئی ہے۔ زندگی اور شخصیت کے حوالے سے جناب غلام عمر نے ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، سکونت، معاشرتی زندگی، ان کے عہد کی تاریخ و ثقافت اور معاشرے کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اور اپنی مختصر تحقیقی کتاب کو ایک مخزن کا درجہ دے دیا ہے۔

محمد سیئر کے عشق کے مقابلے میں اٹھارویں صدی کے کھوار شاعر محوی کے کلام کی اپنی منفرد حیثیت ہے جس میں رباعیاں اس آگ کا واضح اظہار ہیں۔

تیرے بغیر میں فردوس میں کوثر کے کنارے بیٹھا خود کو دوزخ کی آگ میں جلتا محسوس کروں گا۔

تیرے بغیر درشگوم (کا علاقہ) میرے لئے جہنم بن گیا ہے(47)

محوی کی ایک اور تند و تیز غزل دیکھیں:

- اگر میں دریا میں کود پڑوں تو دریا جل جائے گا۔ آسمان کو آگ لگے گی اور زمین جل جائے گی
- ایسا نہ ہو کہ خدا آگ میں جلائے۔ بدن جل کر دل بھی جل جائے گا
- اے زاہد! تو ان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ، تمہارا مسلک جل کر تو بہ خاکستر بنے گا
- آنچل کو چہرے سے نہ اٹھا۔ آسمان پر چاند کے چہرے جل جائیں گے
- عشق کی آگ ایک ہی طرف نہیں جلاتی، کوہ کن پہاڑ تراشتا ہے۔ شرین جل جاتی ہے
- ایک محوی ہی کے دل میں آگ نہیں لگی ہے۔ تمہارے لئے کتنوں کے دل جل جائیں گے۔(48)

لیکن محوی محض عشق کی تپش کا شاعر نہیں ہے۔ ''کھوراپونچ بیتی'' میں اس کا انداز بدلا ہوا ہے۔

تمہاری ساری عمر تعمیر میں گذر رہی، صرف مال و متاع چھپانے کے لئے تم ایسا کرتے ہو، حقیقت میں تم دوسروں کے لئے کرتے ہو۔ اگرچہ اپنے خیال میں محنت مشقت کر کے اپنے لئے کرتے ہو کیونکہ عمر کی بنیاد استوار نہیں ہے"۔(49)

لیکن کھوار شاعری محض ہجر و فراق اور محبوب کے لب و رخسار کے بیان تک ہی محدود نہیں ہے۔ جدید کھوار شاعری میں بیداری اور انقلاب کا پیغام بھی ملتا ہے۔ صنفی اعتبار سے آج کی کھوار شاعری کا لوک بیانیہ ترقی پسندانہ اور انقلابی ہے۔ شیر ولی خان اسیر، جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر تعلیم بھی ہیں، کی طویل نظم ژور نامہ (دختر نامہ) ہمارے عہد کا نمائندہ صنفی لوک بیانیہ ہے۔ اس طویل نظم میں وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہیں وہ اس کے حقوق کی پاسداری کی تلقین کرتے ہیں۔

"اپنی بیٹی سے پوچھ کر اس کا بیاہ کر، تاکہ تیری بیٹی خوش و خرم تیرے گھر سے رخصت ہو جائے۔ جو بات تیری بیٹی کو بھی سوچنی چاہئے اس کا غم کھا کھا کر تم کیوں دبلی ہوتی جا رہی ہو؟ (یعنی بیٹی کے لئے لڑکے کا انتخاب صرف اور صرف تیری سوچ کا معاملہ نہیں بلکہ تیری بیٹی کا بھی ہے)۔

تم اپنی بیٹی کو رخصتی کے وقت یوں نصیحت نہ کیا کرو کہ جس گھر میں جا رہی ہو وہاں ہر قسم کی سختی جھیل کر زندگی بسر کرو، پھر کبھی اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر اس گھر کی طرف مت آنا۔ اس قسم کی نصیحتیں جو اس کے گوش گزار کرتی آئی ہو، درست نہیں ہوتیں۔

(اگر تم بیٹی کو ہر سختی جھیلنے اور چپ رہنے پر مجبور کروگی) تو اس کا نتیجہ خودکشی کی صورت میں نکلے گا۔ یا تیری بیٹی سسرال سے بھاگ جائے گی۔ (اور جو سب کے لئے بدنامی کا باعث ہوگا) قیامت کے دن اس کی سزا تمہیں بھی ملے گی کیونکہ اس ظلم میں تم برابر کی شریک ہوتی آئی ہو"۔(50)

کھوار لوک بیانیہ کی بات کھوار لوک ادب کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی نے بے حد قابل قدر کام کیا ہے۔ لوک کہانیوں کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "چترال میں ہر گاؤں، ہر ندی اور ہر پتھر کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی ضرور وابستہ ہے۔ حسب موقع ایسی کہانیاں جابجا مذکور ہیں۔ تاہم دو چار کہانیاں بطور مثال یہاں لکھ دی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں بعض اقدار مشترک بھی ہیں اور بعض اقدار متنوع بھی۔ کسی کہانی میں محبت کا بیان ہے تو کسی کہانی میں زنانہ حسن کا ذکر ہے تو کسی کہانی میں مردانہ طاقت اور پہلوانی کا ذکر ہے تو کسی کہانی میں دشمنی کا ذکر ہے۔ لیکن ہر کہانی میں جن بھوت پری یا پری زاد کا کوئی نہ کوئی کردار ضرور ملتا ہے۔ اگر ایسا کردار نہ بھی ملے تو محیر العقول واقعات ضرور ملتے ہیں جن کا فطرت انسانی سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔۔ یہ کہانیاں عرصہ سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں بعض کہانیاں بہت پرانی ہیں اور بعض کہانیاں ماضی قریب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈاڈاڑ بادشاہ ایسی ہی ایک کہانی ہے اس کہانی میں جس پتھر کا ذکر ہے وہ پتھر شندور روڈ دریائے لاسپور کے بائیں کنارے پھورت کے مقام پر واقع ہے اور آج بھی کہا جاتا ہے کہ لوگ اس پتھر کے قریب سو جائیں تو جنات اور پریوں کی آوازیں سن لیتے ہیں۔(51)

ڈاڈاڑ باچھا:

کہا جاتا ہے کہ ڈاڈاڑ بہت امیر آدمی تھا وہ اپنے قبیلے کا سردار اور علاقے کا حاکم تھا۔ لوگ بھی اس کو چاہتے تھے اور علاقے کے درو بام بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ پھورت کے قریب نوغور بوہت پر اس کا قلعہ تھا اور وہ اس قلعہ میں رہتا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں ایک آدم زاد تھی اور دوسری پری زاد۔ پری زاد کا نام شوڑے اور آدم زاد کا نام چوڑے تھا وہ دونوں حسن جمال کی پیکر تھیں اور قدوقامت کے علاوہ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ ڈاڈاڑ کے سوا کوئی ان میں فرق نہیں کر سکتا تھا کہ پری زاد کون سی ہے اور آدم زاد کون سی ہے۔ ایک دفعہ دشمن نے ڈاڈڑا باچھا پر حملہ کیا اور گھمسان کا رن پڑا۔ دشمن کے پاس بہت قوت تھی۔ ڈاڈاڑ کے کتے نے اہم کردار ادا کیا ان کے پاس کمان میں ایک تیر تھا اگر وہ استعمال ہوتا تو دوسرا تیر نہیں تھا۔ باچھا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تیر پھینکتے ہی کتے کو اس کے پیچھے لگا دیتا دشمن کو تیر لگتے ہی کتا وہاں پہنچ جاتا اور تیر واپس لاتا ایک مدت تک باچھا نے اس طرح جنگ جاری رکھی۔ آخر کار دشمن نے مکر سے کام لے کر پہلے کتے کو ہلاک کر دیا اور پھر ڈاڈاڑ باچھا بھی اس جنگ میں مارا گیا اور اس کی اولاد نے ترک وطن کیا۔ کہتے ہیں ''برگ دیر'' ڈاڈاڑ باچھا کا خزانہ تھا ان کی ہلاکت کے بعد یہ خزانہ بھی پتھر بن گیا اور پہاڑوں پر جتنے درخت تھے وہ بھی باچھا کی اولاد کے ساتھ ہجرت کر کے چلے گئے چنانچہ نوغور بوہت اور آس پاس کے پہاڑوں پر کوئی درخت اب تک نہیں اُگ سکا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باچھا کی ہلاکت کے بعد لوگوں نے ایک عجیب طریقہ سے معلوم کیا کہ اس کی بیویوں میں پری زاد کون سی ہے اور آدم زاد کون سی ہے۔ ان دونوں کے بارے میں لوگوں کا عام مقولہ یہ تھا۔

تجھے ماشوڑے کیوں کر کہا جائے۔ تمہارے ہونٹوں پر خون نہیں اور تمہیں چوڑے کیونکر کہا جائے تمہارے ہاتھ میں پتھر نہیں۔ جب بادشاہ کی تدفین کا وقت آیا تو اس کی لاش ایک تنگ راستہ میں رکھ دی گئی اس کی دونوں بیویوں سے کہا گیا کہ اس راستے سے گزر جائیں۔ چنانچہ چوڑے آئی اور لاش پر سے گزر گئی پھر ماشوڑے آگئی لاش کے قریب آ کر رک گئی۔ اس نے لاش سے مخاطب ہو کر کہا لال ڈاڈاڑ متے ژاغہ دیت میرے سنہری بدن والے ڈاڈاڑ مجھے گزرنے کی جگہ دے دے ماشوڑے کا یہ کہنا تھا کہ لاش میں حرکت پیدا ہوئی اور لاش نے ایک طرف سے ماشوڑے کو جگہ دے دی۔ تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ پری زاد یہی ہے اب بھی ماشوڑے قبیلہ غذر میں اور چوڑے قبیلہ لاسپور میں آباد ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ پری زاد ماشوڑے قبیلے کی بیٹی تھی(52)

چترال کے لوک گیت:

چترالی لوک گیتوں کی ایک صنف ''شارو ہاشانو'' ہے جس میں لوگوں کی غربت اور ان کے دکھوں کا اظہار ہوتا ہے۔ دشمن کا ڈر ہوتا ہے گیت کے بولوں میں جو لوک بیانیہ سامنے آتا ہے وہ صاف اور واضح ہے:

ترجمہ:

ماں ماں۔۔۔۔۔ دیکھ کون آ رہا ہے
ماں کی جان۔۔۔۔جنگل کا کوئی گڈریا ہوگا
ماں ماں۔۔۔۔۔۔بندوق کی چمک تو دیکھ
ماں کی جان۔۔۔۔یہ تو سورج کی روشنی ہے
ماں ماں۔۔۔۔۔تیرے سینے سے خون بہہ رہا ہے
ماں کی جان۔۔۔یہ تو پسینہ ہے
ماں ماں۔۔۔۔۔یتیموں کی کون پرورش کرے گا
ماں کی جان۔۔۔خدا تمہارا محافظ ہوگا (53)

ایک اور گیت ''اشور جان'' اپنی ماں کی طرف ایک بیٹے کے جذبات کا اظہار ہے۔

ترجمہ:

لوگ میری ماں سے کہتے ہیں تیرا بیٹا پاگل ہے
یہ لوگ پاگل ہیں، میں نہ پاگل ہوں نہ دیوانہ
میں اپنی محبوبہ کا مشتاق ہوں
میری محبوبہ دریا ہے۔ میں بیابان میں تڑپتی پیاسی مچھلی ہوں''

لوگ میری ماں سے کہتے ہیں تیرا بیٹا پاگل ہے
اے پاگل لوگو، میرا بیٹا بُرا بن کر نہیں رہے گا
اگر اس کی وجہ سے تمہیں نقصان کا ڈر ہے تو اسے مار ڈالو
یقین کرو اس حرکت پر تمہیں کوئی گناہ نہ ہوگا

اس گیت میں ماں کی مامتا پر اس کی حب الوطنی کا جذبہ غالب آ گیا ہے۔ لوگوں سے اپنے فرزند کی برائی سن کر وہ کہتی ہے اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ اتنا برا ہے کہ اپنے وطن عزیز کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے تو بے شک اسے قتل کر دو، نہ صرف یہ کہ میں اس کی ماں تم پر قتل کا دعویٰ نہیں کروں گی بلکہ تمہیں گناہ بھی نہیں ہوگا کیوں کہ وطن دشمن کا قتل جائز ہے خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔(54)

چترالی لوک گیتوں پر وطن کی محبت کا غلبہ اس لوک بیانیے کی بنیاد ہے:

ترجمہ:

میرے وطن چترال۔۔۔۔۔۔۔تجھ پر میری جان نثار

تیرے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور تیرے سینے پر دودھ کی نہریں بہتی ہیں

تو جنت کی مانند خوبصورت ہے میری یہ جنت مجھے اس جنت سے زیادہ پیاری ہے

پاکستان میں تیری مثال باغ کے ایک پھول کی طرح ہے

علاقائی اور ملکی محبت کی وضاحت جو اس گیت میں ملتی ہے شاید اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ وطن باغ ہے علاقائی وحدتیں اس کے پھول ہیں۔ باغ سے اس لئے پیار ہے کہ یہ پھول باغ کا ثمرہ ہیں پھولوں سے اس لئے محبت ہے کہ یہ اس باغ کے پھول ہیں جو ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کی دنیا ہے۔

ان پر میرا سلام ہو جنہوں نے وطن کے لئے اپنی جانیں قربان کیں

دشمن کو شکست دی اور اپنے وطن کو امن بخشا

انہوں نے تمام دنیا میں اپنا نام زندہ رکھا

اور جنت میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لی

انہوں نے اپنے سفر کی تاریخ ہمیشہ کے لے روشن کر لی

اگر چہ ہمیں مفارقت کا صدمہ دے گئے (مگر)

انہیں فرشتوں نے خوش آمدید کہی

اور حوروں نے ان کا استقبال کرتے ہوئے زندہ باد کے نعرے لگائے (55)

گذشتہ صفحات میں بدخشاں کے والی محمود شاہ کے چترال پر حملے کے حوالے سے ہندکو گیتوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایک چترالی لوک گیت میں اس واقعہ کا حوالہ اس طرح ملتا ہے:

ترجمہ:

اے محمود شاہ ہم چاہتے تھے کہ تو آئے

مہتر چترال کا پوتا تیرے انتظار میں تھا

دربند میں تمہاری لاشیں بکھری ہیں

تم مہتر کو غدار سمجھتے تھے کیا ایسا ہوا

تم خوامخواہ مار کھانے کو آگئے

ترجمہ:

تم اتنی دور سے یہاں کیوں آئے
محمود شاہ تم دیوانے تھے
اب کوؤں اور گدھوں کے مزے ہو گئے ہیں
تم مہتر کو غدار سمجھتے تھے کیا ایسا ہوا
تم خوامخواہ مرنے کے لئے آگئے

اپنی فتح و کامرانی پر اپنے وطن کے محافظ شہیدوں پر ہر زبان میں بے شمار گیت ملتے ہیں۔لیکن یہ اپنی قوم کا پہلا گیت ہے جو دشمنوں کی لاشوں کو دیکھ کر ان کے حملہ آور بادشاہ کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے۔اس میں زہریلا طنز ہے اور جارحیت کا انجام دکھا کر جنگ باز طالع آزماؤں اور ملک گیری کی ہوس رکھنے والے حریص حکمرانوں کو عبرت دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔(56)

کھوار لوک دانش:

علاقے کی دیگر زبانوں کی طرح کھوار میں بھی لوک دانش کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

☆ باعزت آدمی کو کوڑے کے ڈھیر میں تلاش کرو
☆ نیند موت کا چھوٹا بھائی ہے
☆ پانی پانی پکارنے سے پیاس نہیں بجھتی
☆ ریچھ مسجد میں نہیں آتا اور مولوی پہاڑ پر نہیں چڑھتا
☆ ریچھ موت کو سر پر دیکھ کر پامیر کو دوڑتا ہے
☆ ایک لکڑی بیکار، دو ہوں دھواں، تین ہوں شعلہ جب چار ہوں تو آگ بنتی ہے
☆ سانپ جڑی بوٹیوں سے جتنی بھی نفرت کرے، وہ اس کے راستے میں آتی رہتی ہیں
☆ دو آنے کا بندر، میری چار آنے کی رسی لے بھاگا
☆ دیگچی نے کہا، میرا پیندا سونے کا تھا، چولہا کہنے لگا
''میں بھی کہیں گیا نہیں تھا، تیری اصلیت مجھے معلوم ہے''
☆ جھوٹ کا راستہ مختصر ہوتا ہے
☆ یتیم کا بکرا بھی ریوڑ سے دور رہتا ہے
☆ چھوٹے بچے کو دوڑنے سے لگاؤ ہوتا ہے، سر کے بل گرنے کی پروا نہیں ہوتی

☆ تھوڑا ہو مگر ہموار ہو
☆ بیٹی کے عوض بیٹا (گھر داماد) خریدنا
☆ دریا پار کرتے ہوئے دعا سے زیادہ لاٹھی کام آتی ہے
☆ آٹے کی قلت پر حلوے کا مطالبہ
☆ مرغابی کی چونچ کیچڑ میں ہوتی اور دُم آسمان کی طرف (57)

کھوار کہاوتوں کا ایک مجموعہ افسر علی خان نے بھی مرتب کیا ہے۔ جس سے لوک دانش کے مزید بیانیے سامنے آئے ہیں مثلاً

☆ گاؤں کا سربراہ اگر صحیح ہوتا تو میرا سہاگہ چوری نہ ہوتا
☆ پرندہ اپنے پروں سے اڑتا ہے
☆ پہلی بیوی جان پر اور دوسری گھٹنے پر پیوند جیسی ہوتی ہے
☆ پشاور سے میں آیا ہوں اور سفر کی روداد میری بیوی بیان کر رہی ہے
☆ دریا پار کرنے کے لئے سورۃ یٰسین کی تلاوت نہیں بلکہ ایک بڑے ڈنڈے کی ضرورت ہوتی ہے۔
☆ میرا کوئی محبوب نہ تھا، تب بھی میں زندہ تھا
☆ دھوبی کے کام کا، عید کے دن پتہ چلے گا
☆ مُلّا کی باتیں، ضرور سنو، مگر اس کے کاموں کو مت اپناؤ
☆ سونا مل گیا، اسے رکھنے کے لئے تھالی نہ ملی
☆ علاج سے احتیاط بہتر ہے
☆ سچائی کی لکڑی پانی میں نہیں بہتی
☆ ہاتھی کے لئے چھلکے میں پانی
☆ سُرخ زبان سر پر ڈنڈے برسائے
☆ بھیڑ اور موتی کا کیا رشتہ
☆ لقمہ قبلہ تبدیل کروا سکتا ہے
☆ جیسی سنگت، ویسی رنگت
☆ بندر کو سرخ کپڑا، خوبصورت لگتا ہے
☆ بیوہ آسمان پر ہل چلا سکتی ہے
☆ واخان سے تعلق رکھنے والے شخص کو اگر اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھاؤ تو وہ لگام تھامنے کی کوشش کرے گا۔ (58)

پالولا لوک دانش:

چترال کی لوک بولیوں میں پالولا کا ذکر کیا جا چکا ہے یہ زبان بھی علم وحکمت اور لوک دانش کے موتیوں سے مالا مال ہے۔اس زبان کے حروف تہجی ترتیب دیئے جا چکے ہیں۔چترال کی تحصیل دروش میں عشریت کے مقام پر انجمن ترقی پالولا، اس کی ترویج واشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ایف ایل آئی کے پلیٹ فارم سے پالولا ضرب الامثال کا ایک مجموعہ اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے جسے جناب نسیم حیدر نے ترتیب وترجمے کے عمل سے گزارا ہے۔ہم یہاں پالولا لوک دانش کی وساطت سے پالولا لوک بیانیہ کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

☆ چھلنی لوٹے پر ہنستی ہے، کہ تجھ میں دو سوراخ ہیں
☆ گدھا اپنے کان کو نہیں جانتا
☆ میں ماموں کا چرواہا ہوں اور ماموں پورے گاؤں کا چرواہا ہے
☆ عید گزرنے کے بعد مہندی کو دیوار پر لگا دو
☆ مجھ پر سورج کی روشنی پڑی ہے
☆ انگلی سے سورج کی روشنی نہیں چھپا سکتے
☆ گدھے کی پیشانی پر محراب کہاں ہوتی ہے
☆ اپنا وطن، ہر ایک کو کشمیر لگتا ہے
☆ جنازے سے مدد مانگنا
☆ ہر گجر اپنی لسّی کی تعریف کرتا ہے
☆ سانپ ایسی جگہ پانی پیتا ہے، جہاں کوئی نہ ہو
☆ ایک آدمی بھوک سے مر رہا تھا، دوسرا اس کے تکیے کے نیچے روٹی تلاش کر رہا تھا
☆ بھیڑ اون کی تلاش میں نکلی، کسی نے پکڑ کر اس کے بال کاٹ لیئے
☆ ریچھ کے کاٹے کا علاج، ریچھ کی ہڈی کا گودا ہی ہے
☆ اس کی جیب میں چوہے ناچتے ہیں (59)

کیلاشہ لوک بیانیہ:

چترال کی زبانوں میں ایک اہم زبان کیلاشہ بھی ہے۔گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ تا حال اس کا تحریری ورثہ موجود نہیں ہے لیکن کیلاشہ لوگ اپنی منفرد اور جداگانہ تہذیب کے حامل ہیں اور ان کی سینہ بہ سینہ چلی آرہی روایات ہیں۔کیلاشہ کے قبول اسلام کا تفصیلی ذکر کئے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی بعض روایات محفوظ ہیں اگر چہ ان

کے کئی تہذیبی عناصر کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ایسی ہی ایک روایت بوڈا لک ہے جسے احمد فراز نے اپنی ایک طویل نظم میں قلم بند کیا ہے۔

اکبر ایس احمد کے لفظوں میں کافرلوگوں کی ایک نہایت ہی عجیب اور دلچسپ رسم کا آغاز ہوتا ہے۔ چرواہوں میں سب سے زیادہ خوبصورت، قوی اور جوشیلے جوان کا انتخاب بھی کیا جاتا ہے۔ جسے ''بڈا لک'' کہتے ہیں' موسم گرما کے مہینوں کے دوران اسے پہاڑ پر بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے خاص خوراک دودھ اور مکھن وغیرہ مہیا کیا جاتا ہے۔ چراگاہوں سے بکریوں کے قافلے کی واپسی پر'' بوڈا لک'' کو پہاڑوں سے نیچے اتار کر گاؤں میں لایا جاتا ہے جہاں وہ گاؤں کی ان عورتوں کے لئے اپنی خدمات مہیا کرتا ہے جو خاوندوں سے کوئی بچہ جننے کے قابل نہ ہوسکی ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی قدیم رسم ہے جسے بہت سے کافرلوگ چھوڑ چکے ہیں۔

لوگوں کے مشہور عقائد کے تحت کالاش معاشرت میں سال میں کئی تہوار منائے جاتے ہیں۔''پول تہوار'' کے پس پردہ بھی توہم پرستی کے راہنما عقائد کا عمل دخل ہے۔ یہ تہوار''بوڈا لک'' کی واپسی کی خوشی میں منایا جاتا ہے۔ پول تہوار سے اندازاً چھ ماہ پیشتر بستی کا خوبصورت اور تنومند نوجوان جسے بستی والے منتخب کرتے ہیں وہ پہاڑوں میں چلا جاتا ہے بقول ڈاکٹر ایس احمد''بوڈا لک'' کیلاشیوں کا سماجی ادارہ ہے اور جو بھی مرد بوڈا لک' منتخب ہوتا ہے اسے منتخب عورت کا خاندان اپنے لئے بڑا اعزاز سمجھتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کیلاش معاشرت میں''بوڈا لک'' کا یہ سماجی ادارہ اب ختم ہو چکا ہے لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ اب بھی یہ ادارہ موجود ہے لیکن اردگرد کے ماحول کے میل جول کی وجہ سے''بوڈا لک'' کا یہ ادارہ پہلے کی طرح سرعام متحرک نہیں جو 'بوڈا لک' کی رسم کا جواز فراہم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس طرح کیلاش میں بہتر اور صحت مند نسل جنم لیتی ہے۔لہٰذا بستی کے منتخب نوجوان بوڈا لک کو یہ سماجی ادارہ حق دیتا ہے (60)

کافرلوگوں میں "بوڈا لک' کے حوالے سے کئی لوک گیت بھی مروّج ہیں۔ جن میں لڑکیاں'بوڈا لک' کی طلب کے گیت گاتی ہیں۔ایسے ہی ایک گیت کے بول ہیں:

اے "بوڈا لک' تم دلدلوں میں پھر رہے ہو

اور گائے کا تازہ دودھ پیتے ہو

ذرا یہ تو خیال کرو میں اس وقت برف سے ڈھکے پہاڑوں میں کانپ رہی ہوں۔خشک میوے، انگور اور سیب کھاتی ہوں اور تمہارے انتظار میں دن بسر کر رہی ہوں مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم کب واپس آؤ گے اور کیا تم آتے ہی چلم جوش کے تہوار پر اپنی بانہوں میں مجھے لے لو گے۔

میں تمہارے لئے ہر روز اپنے بالوں کے کنڈل بناتی ہوں، اور میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔تم آؤ گے تو میں تمہیں ان آنکھوں کی گہرائیوں میں جذب کرلوں گی۔

تم نے چھ مہینے تک بڑا دکھ اٹھایا ہے اور میں تمہاری ٹانگوں کی ساری تھکن نچوڑلوں گی۔ مجھے یہ بتاؤ تم کب آؤ گے۔(61)

خیبر پختونخوا

کوہستان کالوک بیانیہ

ثقافتی اور لسانی تنوع:

کوہستان پختونخوا کا وہ منفرد علاقہ ہے جو صوبے کے کئی دوسرے علاقوں کی طرح لسانی تنوع سے مالا مال ہے۔ کیلون آر رینش (Calvin R . Rensch) سانڈرا جے ڈیکر (Sanbdra J Decker) اور ڈینئل ایچ ہالبرگ (Deniel H Hallberg) نے اپنی کتاب لینگویجز آف کوہستان میں کوہستان کی زبانوں کی تفصیل بیان کی ہے (62) رینش نے ان زبانوں کو کالامی/ردیر کوہستانی اور تو روالی میں تقسیم کیا ہے۔ دیگر زبانوں میں وہ پشتو اور گوجری یا کھوار بولنے والوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ سانڈرا جے ڈیکر شو جس زبان کا ذکر کرتا ہے جبکہ ڈینئل ایچ ہالبرگ انڈس کوہستانی، چلاسو گاورواور بٹیری زبانوں کی تفصیل اوران کے استعمال کی نشاندہی کرتا ہے۔

کوہستان کو ہم تین علاقوں:

1۔ اباسین یا انڈس کوہستان

2۔ دیر کوہستان اور

3۔ سوات یا کالام کوہستان

میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان علاقوں اوران میں بولی جانے والی زبانوں کی مزید تفصیل میں جاننے کے لئے معروف سکالر محمد پرویش شاہین کے مقالے ''بحرین کا نسلی اور لسانی جائزہ'' کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ پرویش شاہین کے مطابق:

سوات کی حسین وجمیل اور ہر موسم اور ہر لحاظ سے سیاحت کے لئے بے مثل ومثال پندرہ دیگر وادیوں میں سے ایک وادی بحرین ہے جس کا قدیم نام بھوٹال تھا اور قریب ترین نام برانیال (Baranial) تھا جب کہ اس کا موجودہ نام بحرین (Bahrain) ہے جو سوات کے صدر مقام سیدو شریف سے شمال کی طرف 66 میل کے فاصلے پر سطح سمندر سے 4500 فٹ اونچائی پر واقع ایک دلکش وادی ہے جہاں دو بڑے دریا، دریائے سوات اور دریائے درال کا پانی آپس میں ملتا ہے اور گنگا جمنا کا ایک خوب صورت منظر پیش کرتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر بادشاہ سوات نے 1923ء میں اسے بحرین کا نام دیا تھا۔ بحرین چاروں اطراف پہاڑوں سے گھرا ہوا علاقہ ہے جس کے گردو نواح میں سرسبز وشادات جنگل اور کافی دور تک وادی میں لہراتا ہوا دریائے سوات نہایت دلکش منظر پیش کرتا ہے اور اسی دریا نے بحرین کو دو حصوں مشرقی بحرین اور مغربی بحرین میں تقسیم کر دیا ہے۔ بحرین جس کا کل رقبہ ایک ہزار مربع میل ہے، جو بہترین چراگاہوں اور مرغزاروں سے ڈھکا ہوا ہے، جس میں کمیاب قیمتی درختوں (Coniform) کے گھنے جنگلات ہیں جب کہ پہاڑوں کے دامن (Oak) کے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔

یہی بحرین کوہستان جس کی کل آبادی 70 ہزار ہے اور جس کے مشرق میں انڈس کوہستان مغرب میں دیر کوہستان اور جنوب میں میدانی سوات واقع ہے۔ جس طرح کہ اس حسین وادی میں بہت سی قومیتیں، نسلیں اور خیل (Sub Tribe) رہتے ہیں تو اسی طرح یہ حسین وادی مختلف زبانوں، زبانچوں اور بولیوں کا ایک چڑیا گھر ہے۔ ایک عجائب گھر ہے اور ایک جنگل ہے۔

نام:

بحرین، برانیال اور بھوٹال تو اس وسیع وعریض وادی میں ایک گاؤں اور ایک دیہات کا نام ہے، جو کہ پوری وادی کا صدر مقام ہے، جہاں خوب صورت اور بھرے بازار اور نفیس ریسٹورنٹ اور ہوٹلز موجود ہیں۔ جب کہ پوری وادی کو توروال کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی ایک مرکزی گاؤں ہی کا نام ہے۔ اس وادی میں رہنے والوں کو توروالی، کوہستانی اور ان کی زبان کو کوستنی (Kostani) یا کوہستانی جب کہ علاقے کو بحرین کوہستان، توروال اور زبان کو توروالی Torwali کہا جاتا ہے۔ (63)

رزوال کوہستانی نے پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا صوبہ سرحد میں ''انڈس کوہستان'' کے زیر عنوان زیادہ تفصیل اور وضاحت سے کوہستان کی مقامی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق:

شِنا کوہستانی، بٹیڑی، گباری اور چھلسیو یہاں کی مقامی زبانیں ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں جو دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں پشتو، گوجری اور پہاڑی زبان شامل ہے۔ لسانی شناخت یا درجہ بندی کے اعتبار سے شِنا کوہستانی، گباری، چھلسیو اور بٹیڑی زبان کو لسانی گروہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کوہستان کے بازاروں میں رابطہ کی زبان شنا اور کوہستانی ہے۔ جبکہ سرکاری دفاتر میں اردو اور پشتو میں رابطہ کاری کی جاتی ہے۔ تعلیمی سطح پر اردو مروج ہے۔ اس کے علاوہ کوہستان کے بعض دینی مدرسوں میں عربی اور فارسی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔ تاہم آج کل مقامی علماء شنا یا کوہستانی زبان میں دینی علوم پڑھاتے ہیں۔

شِنا (شُنا):

شنا آریائی زبانوں کے مشرقی لسانی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ زبان نصف ضلع کوہستان کے علاقہ درہ مد خیل، کولئی، پلاس، جلکوٹ، کیہالی (کمیلا) ہربین اور شتیال کی وادیوں میں بولی جاتی ہے۔ کوہستان سے باہر یہ زبان ضلع چلاس، ضلع استور، ضلع غذر کے کچھ حصے، ضلع گلگت کے زیریں حصے (آدھا گلگت) بلتستان میں ست پارہ جھیل سے اوپر واقع گاؤں، کھڑمنگ، کچورہ، آزاد کشمیر (مظفر آباد) کی تحصیل آٹھ مقام کے علاقہ جات، پھلوائی، مرناٹ اور تاؤبٹ، ضلع چترال میں گوش، پریگل، بیوڑی وادی، کلکلک، عشریت اپر دیر کوہستان کے مقام کلکوٹ، مدین کے علاقہ بشیگرام، افغانستان کی کنٹر وادی میں ساؤ کے مقام جموں کشمیر میں وادی گریز، تلیل، دراس، داہنو اور لداخ کے بعد مقامات پر مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان کے کئی لہجے پائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات کے لہجوں میں

کافی بُعد پایا جاتا ہے۔ جدید تحقیقات نے لسانی شواہد اور فنی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ شنا زبان کا لسانی ڈھانچہ اور صوتی عادت قبل از ہند آریائی لسانی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس زبان میں ہندکو، پنجابی، سندھی پشتو، بلوچی، گوجری، بروشسکی، سنسکرت فارسی اور عربی کے کثیر تعداد میں الفاظ پائے جاتے ہیں اور لسانی سرمایہ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تذکیر و تانیث اور صفاتی الفاظ کا اختتام عام اور متحرک پایا جاتا ہے۔ آوازوں کا نظام سُر اور تان کا حامل ہے سُر میں اتار چڑھاؤ سے معنوی امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اس زبان میں آج کل نثر ڈرامہ، نظم، قواعد، لغات اور کئی دوسرے موضوعات پر لکھا جا رہا ہے۔ تاہم اس کا متفقہ رسم الخط ابھی تک اختیار نہیں کیا گیا۔ اس زبان کا لوک ادب کافی زرخیز ہے۔ لوک گیت، داستانیں، لوک کہانیاں، پہیلیاں، اکھان اور منتر (دم) پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوک ادب بکھرا ہوا ہے اور منظم طریقہ سے محفوظ نہیں کیا جا رہا۔ مختلف وادیوں یا علاقوں میں اس زبان کے لہجوں کے مختلف نام پائے جاتے ہیں۔ (راز دل۔1996ء)

کوہستانی:

یہ زبان کوہستان کے مغربی کنارے پر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ وادی بنکھڑ دوبیر، جچیال، پٹن، سیئ، رزقہ، اور کھنڈ میں بولی جاتی ہے۔ کوہستان میں اس زبان کے تین لہجے پائے جاتے ہیں۔ جو پٹن، کھنڈیا اور بنکھڑ میں مروج ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے لہجے کالام کوہستان اور دیر کوہستان میں مروج ہیں۔ جو کالامی گاؤری اور بشکارک کے نام سے بھی موسوم کئے جاتے ہیں۔ کوہستان میں یہ زبان دو بڑے قبیلے منی اور منظر یے کی مادری زبان ہے۔ جو کھنڈیا، سیو، کیال، پٹن، جچیال، دوبیر اور بنکھڑ وادیوں میں آباد ہیں۔ کوہستانی اور شنا زبان میں لغوی، فونیائی اور صوریاتی اشتراک پایا جاتا ہے اس زبان میں کافی کم تحقیقاتی کام ہوا ہے۔ مولانا غلام عیسیٰ مرحوم نے اس زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور طبع کی ہے۔ ریڈیو پشاور پر اس زبان میں پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اس زبان کے بعض صرفی لاحقے گوجری اور ہندکو زبانوں سے میل کھاتے ہیں۔

ٹوچی (بٹیڑی):

یہ زبان بشام کے سامنے واقع بٹیڑہ کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ فونیائی، صوریاتی اور لغوی اعتبار سے یہ کوہستانی زبان سے قربت رکھتی ہے۔ تاہم اس کی اپنی انفرادی شناخت قائم ہے۔ اس زبان پر بہت ہی کم تحقیقی کام ہوا ہے۔ یہاں اس کے بولنے والوں کی تعداد تیں چالیس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ انڈیا میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے۔

بحوالہ: (http://www. ethnoloque.co/show_language asp)

یہ پشتو اور شنا زبان کے درمیان بولی جاتی ہے اور تیزی سے متاثر ہو رہی ہے۔ اس زبان کا رسم الخط اور تحریری ادب موجود نہیں۔ تاہم لوک ادب پایا جاتا ہے۔

چھلسیو:

یہ کوہستان کے چھلیس قبیلوں کی زبان ہے ج جوکلئی میں بھہارن، جلکوٹ اور گلگت میں جگلوٹ کے ایک دومقامات پر پائے جاتے ہیں۔اس زبان کے بولنے والوں کی کوئی گیارہ شاخیں پائی جاتی ہیں لیکن اکثریت اب اپنی زبان بھول چکی ہے۔کم وبیش ڈھائی تین ہزار کی تعداد میں اس کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔یہ زبان معدوم ہورہی ہے۔

گبارئی:

یہ گیارہ قبیلوں کی زبان ہے۔ جوکولئی میں مھہارن اور بیلہ میں بولی جاتی ہے۔لسانی اعتبار سے یہ کوہستانی لہجوں کے قریب ہے کوہستان میں یہ بولی آہستہ آہستہ معدوم ہورہی ہے اوراس کے بولنے والوں کی موجودہ تعداد دو ڈھائی سو کے قریب ہے۔

گوجری:

یہ گجرلوگوں کی زبان ہے۔اس کے بولنے والے کھنڈیا میں گبرال کے علاقہ ہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ دوسری وادیوں میں یہ لوگ بکھرے ہوئے ہیں۔گوجری بولنے والے زیادہ تر گھرانے ہزارہ پلین کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔یہ لوگ آپس میں گوجری بولتے ہیں لیکن دوسروں کے ساتھ کوہستانی یا شنا میں بات کرتے ہیں۔

پہاڑی:

یہ زبان ان شاخوں یا چھوٹے گروہ کی زبان ہے جو 1800ء کی قحط سالی کے دوران جموں نقل مکانی کے بعد ہزارہ اور پھر وادی پالس میں آ کر آباد ہوئے اور اب دوبارہ واپس اپنے علاقوں کی جانب ہجرت کررہے ہیں۔یہ لوگ وادی پالس میں درو میں آباد ہیں۔تاہم پہاڑی اس زبان کو بھی کہا جاتا ہے جو کہ ہندکو سے ملتی جلتی ایک زبان ہے اور مظفر آباد کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

پشتو:

کوہستان میں بعض لوگ پشتو بولتے ہیں۔یہ لوگ زیادہ تر بکھرے ہوئے ہیں۔تاہم مسی، گھمر ی اور وادی دوبیر کے مقامات پر اکٹھے رہتے ہیں۔ان کے قبیلے اخون، جاگوال، سید اور میاں گان کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔اشاعت اسلام میں ان کا کافی کردار رہا ہے۔(64)

توروالی لوک بیانیہ:

توروالی کلاسیکی شاعری کا ایک مجموعہ ''اینان'' کے عنوان سے ادارہ برائے تعلیم وترقی بحرین، سوات سے

شائع ہوا۔ کتاب کے مرتب و مترجم زبیر توروالی ہیں۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک لوک بیانیہ ہے کہ اس کلام کے شاعر گمنام لیکن آج بھی زندہ ہیں۔ ہم چند اشعار کی مثالیں پیش کریں گے۔ جو سماجی اور اقتصادی مشکلات کا کھلا اظہار ہیں۔

☆ میں کھانا نہیں کھاتی، امی مجھے اصرار نہ کریں، تجھے کیا پتہ ہے؟ شب غم ہے، آج یار کراچی چلا گیا۔

☆ میں بھلا دور اونچی پہاڑی چراہگاہ پر کیا جانوں کہ تو وہاں بیمار پڑا ہے۔ چاہئے تھا کہ مریض کو نیچے گاؤں لایا جاتا تب قبیلہ بھی گرد جمع ہو جاتا اور میں بھی پہنچ جاتی۔ مجھ سے یوں تیرا گلہ عبث ہے میرے پیار

☆ میرے شہزادے عبدالحکیم! میں شاید تیری ماں نہیں بن پائی، میں بے لباس پھرتی، کھانے کی بجائے گھاس کھاتی مگر دوسری شادی نہ کرتی۔

☆ میں پر امید تھا میری جان زرغونا! کہ میرا قبیلہ آفریدیوں کی مانند بہادر ہے اور تیری وصل کے لئے مجھے پناہ ملے گی مگر وہ تو اس راجپوت کی قبر کی طرح اندر سے کھوکھلا نکلا۔

☆ اس دنیا کے چمن کا باغبان عزرائیل آتا ہے اور بیچ میں سے اچھے لوگوں کو یعنی اصل مامیرا کے پھول توڑ کر لے جاتا ہے۔

☆ عزرائیل! تو تھکتا کیوں نہیں؟ اب بھی باری لگا تار رہتا ہے اب بس بھی کر تم نے تو میرے باپ کا گھر اجاڑ کے رکھ دیا۔

☆ قسمت کا لکھا ہے کہ میں گناہگار ہوں؟

☆ کتنی دور کھو گئی میری یمن کی رانی!

☆ احمد جان! بیٹا تمہاری امی نرگس کے پھول جیسی تھی اب ایرے غیرے پھولوں پہ مجھے پیار نہیں آتا (اس لئے میں دوسری شادی نہیں کرتا)

☆ ابو! مجھے ملاکنڈ کے گورے (اس زمانے کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ) سے شادی نہیں کرنی اس کی بجائے مجھے کسی مسجد کے طالب کو ہی اللہ کے واسطے دے دیں

☆ میرے کامل مرشد! اس دفعہ واپس ملاکنڈ سے گزارنے میں میری مدد کریو

اس کے بعد مزدوری کے لئے پھیکے بھدے بلوچستان آنے سے میری توبہ ہے

☆ تم تو بادشاہ کو جرمانہ دے کر چھوٹ کر آ جاؤ گے، میرے یار مشکل میرے لئے ہے کیونکہ میں ساری عمر کے لئے سؤ رموزی کی دشمن بن گئی۔

☆ تورکمر (جگہ) کی چٹانوں میں خود میری روح مقید ہے مگر دل ہے کہ یہاں بھی یاد کرتا ہے کہ کہاں رہ گئی کشمالا۔

☆ ملاح! جالے کو ہنر مندی سے پار کرواس پر سوار سب عاشق ہیں جو غریبی کے ہاتھوں نکلے ہیں اور ابھی مرنا نہیں چاہتے۔

☆ اوئے جمعدار خبردار! میرے محبوب کو مزدوری کے لئے جالکوٹ نہ لے جا! تو اپنا کمیشن مجھ محبت کی ماری پاگل سے مانگ۔

☆ دل جرمن جہاز کی مانند ہے۔تمام رات اُڑ کر غائب رہتا ہے اور صبح کاذب تک اپنی سوہنی کے درشن کر کے واپس آتا ہے۔

☆ دل کی مثال بچے کی سی ہے میری گول مٹول محبوبہ! یہ نصیحت نہیں مانتا۔اسے جھولے میں ڈال کر خوب نازنخروں والی لوری دو۔

☆ بدبخت رقیب نے محبوبہ جان کو میری غربت کی غمازی کی اور کان بھرے کہ ''گھیناء'' یعنی ایک گھٹیا ساگ کھاتا ہوں اور رات کو گون (بکری کے بالوں سے بنا دری نما کمبل) اوڑھ کر سوتا ہے تو کیا میں پیار کے قابل نہیں؟

☆ محمد یعقوب بیٹے! تیرے باپ کا اور کوئی آسرا نہیں۔صرف ایک کلہاڑی اور آری ہیں جنہیں آٹے کے انبار کے پیچھے رکھا ہے (اور جن سے لکڑی چیرنے کی مشقت کر کے تم لوگوں کا پیٹ پالتا ہوں)

☆ چوری چھپے کی یاری اچھی نہیں کشمالہ! ڈنکے کی چوٹ پر میدان میں آ اور لوگوں کے سامنے مجھے انگلی سے دکھا کہ میں نے تجھے چُن لیا تو بھی مجھے چُن۔

☆ ظاہر شاہ کہاں تخت پر براجمان ہو کر بادشاہ بن بیٹھتا وہ (اگر زندہ رہتا) تو یقیناً میری طرح بازاروں میں لکڑی بیچتا پھرتا۔

☆ میں تو کوئٹہ اور چمن گیا تھا مگر واپس (راولپنڈی سے بس میں بیٹھ کر دھوکے سے انڈس کوہستان پہنچا) اور تانگیر سے پہاڑوں کو پار کر کے آیا۔اب میں گاؤں میں کیا بہانہ تراشوں؟ بڑئی کے غوث! میری مدد کو پہنچو۔

☆ ڈرائیور کے ساتھ آشنائی کر مسکین شاہ۔دور پردیس ہے۔سفر کر کے تھک جائے گی تمہاری روح۔

☆ عاشقوں نے اتفاق سے پلوشہ کو بھلا دیا کیوں کہ اب نیا دور دورہ ہے اب ہم سب بدرینہ کے گن گانے لگے ہیں۔

☆ اپنی سوہنی کی مثال گویا مسجد مہابت خان کی سی ہے۔جس نے اُدھر پشاور شہر کو رونق بخشی ہے اور اس نے اِدھر موذی (رقیب) کے گھر کو چار چاند لگائے ہیں۔

☆ جانُو! میں قلم سے دستخط کرنا نہیں جانتی۔میری زبان پر اعتبار کر کہ تم سے نباہ کا وعدہ کرتی ہوں۔

☆ کہتے ہیں کہ ڈولائی والے مزدوروں کے واپس آنے کا موسم آ پہنچا۔مگر میں کس کا انتظار کروں؟ مجھ سے تو میرا آشنا روٹھا ہوا ہے۔

☆ شعر دکھ سے کہے جاتے ہیں جب دل میں غم کی آگ لگتی ہے۔ بھلا کون بد بخت غم کی یہ صدا خوشی سے نکالتا ہے۔
☆ زہر کھالیتا میں نہ کہ کھلیان میں مکئی کو بولیتا۔ تیرا شیشے جیسا بدن کام سے چُور چُور رہوتا ہے۔
☆ کشمالہ کے خاندان والو! مجھے لے جا کر جیل میں ڈال دو۔ پیار کیا ہے، گناہگار پر جائز سزا مقرر ہے۔
☆ عظیم خدا نے خیر کی میری کومل سی بیٹی کہ تیرا باپ (کوئٹہ میں کوئلے کی کان کے حادثے میں) نہیں مرا۔ ورنہ تو قبر کی ڈھیری کو ہی پہنچتی اور میرا چہرا کبھی نہ دیکھ پاتی۔
☆ میرا یہ زبانی بیان لے جا کر میری لیلیٰ کو بتا دیں کہ میں فارغ نہیں۔ دوسروں کا مزدور ہوں کوئلہ کھودتا ہوں۔ بس یہ میرے اوقات ہیں۔
☆ دل پر جھاڑیاں اُگیں۔ اب شاخیں میرے نتھنوں سے پھوٹنے لگیں۔ آخر کب تک اپنے باپ کا اجاڑ گھرانا سنبھالوں گی۔؟ اسے میری فکر ہے ہی نہیں۔
☆ مجھے اور شمیم آرا کو ایک ہی گور میں دفن کرو۔ گوشت کیڑے کھائیں گے مگر ہڈیاں پیار بھری باتیں کریں گی۔
☆ بیٹا گل نمیر! غربت تو نوجوانوں کی عزت ہوتی ہے پر میں تمہارے یوں منہ اندھیرے (قرض کی وجہ سے) مشقت پر نکلنے پر کڑھتی ہوں۔
☆ خالہ مجھ پر یہ کیا بیتی! میرا زرین شال جل گیا اب بس نام کی دھجی سے اپنے سر کو ڈھانپ رہی ہوں۔ (مراد پیارا شوہر مر گیا اب ایک نکما رنڈوا نباہ رہی ہوں)
☆ او چاند! جا ضلع دیر کے علاقے تھل لامتی میں چھڑ جا! وہاں رات نیلے آسمان کی روشنی میں میرا لعل دریا میں گیلیاں بہار رہا ہے۔
☆ ڈالی ڈالی گندم اُگا۔ سرسوں بھی کِھل اٹھا بہار آ ہی گئی۔ (میرے مرحوم بیٹے)
☆ ظاہر شاہ! پردیس میں تیرے باپ کی واپسی کا ٹکٹ اب بھی پورا نہیں ہوا۔ (65)

ماسلو چٹان۔۔ایک اور توروالی لوک بیانیہ:

(ماسلوٗ باٹ اس بڑی چٹان کو کہتے ہیں جس سے کبھی لوگ اپنے بزرگوں کو گرا دیتے تھے۔ اس کے معانی توروالی زبان میں ''آدمی گرانے والا پتھر'' ہے اور یہ پتھر آج بھی ماسلوٗ باٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔
پرانے زمانے میں لوگ اپنے بوڑھے والدین کو بیماری اور ضعیفی کی حالت میں اُٹھا کر لے جاتے تھے اور پھر انہیں ماسلوٗ باٹ سے نیچے پھینک دیا کرتے تھے)۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک آدمی اپنے والد کو اُٹھائے ماسلوٗ باٹ کی جانب جا رہا تھا کہ کندھوں پر والد کو ہنسی آئی۔ بیٹے نے اچانک ہنسنے کی وجہ پوچھی تو ضعیف العمر باپ نے جواب دیا، ''مجھے اس لئے ہنسی آئی کہ اگر میں نے اپنے باپ کو یہاں سے نہیں پھینکا ہوتا تو آج شاید تو مجھے یہاں سے نہیں پھینک دیتا۔ لیکن بس رسم ہے اور نیچے

گراتا ہے۔ کل تمہیں بھی تمہارے بچوں میں سے کوئی یہاں سے پھینکے گا۔'' بیٹے نے یہ سنا تو چونک گیا۔ اور کہا، ''یہ بات ہے تو میں آپ کو ہرگز نہیں گراؤں گا۔'' وہ باپ کو واپس گھر لے گیا اور کہیں چھپا کر اس کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ چونکہ حاکم کا حکم تھا کہ اگر کسی کے گھر سے کوئی ضعیف برآمد ہوا تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

ایک دن حاکم نے رعایا کو مخاطب کر کے حکم فرمایا کہ آپ لوگوں کو میرے دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک یہ کہ مجھے ریت کی مدد سے رسی بنا کر دیں اور دوسرا یہ کہ آسمان تک سیڑھی رکھیں۔ بادشاہ نے ایک دن کی مہلت دے دی اور کہا کہ کل تک ضرور کچھ کرنا ورنہ سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا۔

رات کو بیٹا پریشانی کے عالم میں پڑا تھا کہ بوڑھے والد کی اس پر نظر پڑی۔ پریشانی کی وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ حاکم نے انہیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ وہ ان سے آسمان تک سیڑھی اور ریت کی رسی بنوانا چاہتا ہے اور اگر وہ کچھ نہ کر سکے تو حاکم قیامت برپا کرنے والا ہے۔ والد بول اٹھے، ''یہ تو آسان کام تھا۔ کیا تم میں سے کسی نے جواب نہیں دیا؟ ہم کیا جواب دیتے؟ بیٹے نے پھر بے چینی سے پوچھا۔ والد نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔'' بادشاہ سے کہنا کہ یہ رسی ہم آپ کی خدمت میں بالکل بنا دیتے لیکن اس خوف سے کہ کہیں یہ ہمارے ہاتھوں پتلی یا زیادہ موٹی نہ بن جائے۔ لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بنیاد آپ خود رکھیں اور مزید ہم اسی طرح مکمل کریں گے۔ رہی بات سیڑھی کی تو آپ محض دو چار زینے بنا کر بنیاد رکھیں تا کہ چوڑائی کی مقدار میں ہم سے کمی بیشی نہ ہو۔ پھر ہم آسمان تک اس حساب سے بنا ڈالیں گے۔ اپنے حاکم کو بس اتنا کہہ دینا۔''

صبح لوگ بادشاہ کے دربار میں اکٹھے ہو گئے۔ بادشاہ نے اپنے کام کے بارے میں پوچھا کہ کیا سوچا ان لوگوں نے۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ یکا یک یہ جوان ایک کونے سے باادب مخاطب ہوا حضور گستاخی معاف، کافی غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کہیں انجانے میں ہم سے بھول نہ ہو جائے۔ رسی اپنی مقدار سے پتلی یا زیادہ موٹی نہ بن جائے اور سیڑھی تنگ یا زیادہ کھلی نہ ہو جائے لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں چیزوں کی بنیاد آپ اپنے ہاتھوں سے رکھیں۔ باقی مکمل کرنا ہم پہ چھوڑ دیجیے۔ حاکم بڑبڑایا ''باقی لوگ خاموش رہے مگر تم نے یہ جرأت کیسے کی؟'' نوکروں کو حکم دیا گیا۔ جا کر اس کے گھر کی تلاشی لو۔ اس نے ضرور کسی بڈھے کو گھر میں چھپا رکھا ہے۔'' نوکروں نے اس کے باپ کو گھر سے ڈھونڈ نکالا اور دربار میں پیش کیا۔ ''اچھا تو یہ سب تم نے سکھایا تھا بیٹے؟'' حاکم نے سوال پوچھا۔ ''ہاں میں نے ہی سکھایا تھا یہ سب۔ کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے ان بے گناہوں کو؟ کیوں اس مشکل آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ان بے چاروں کو؟'' باپ نے سختی سے جواب دیا تو بادشاہ نے دھیرے سے کہا، ''میں تو گدھوں کا گدھا تھا لیکن یہ لوگ میرے ہاتھوں برباد ہونے والے تھے۔ آپ کی وجہ سے محفوظ رہے۔'' اور ساتھ ہی حکم صادر کیا کہ آج کے بعد کوئی بھی اپنے بزرگوں کو ناسلوؤ چٹان سے نہیں گرائے گا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کی سخت سزا ہوگی۔ (66)

گاوری لوک بیانیہ۔۔کالام کوہستان کی روایتی تاریخ:

گاوری زبان کے نامور سکالر، محمد زمان ساگر نے گاوری زبان، تاریخ، لوک ادب اور ضرب الامثال کے حوالے سے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ کالام کوہستان کی روایتی تاریخ کے حوالے سے دو جلدوں میں ان لوک روایتوں کو جمع کیا ہے جو مجموعی طور پر ایک لوک بیانیہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ جلد اوّل، جو کالام خاص کے بارے میں ہے، دس سال قبل 2007ء میں اردو زبان میں شائع ہوئی تھی اور اب تک ہزاروں ناقدین فن سے داد سمیٹ چکی ہے۔ اسے فرنٹیئر لینگویج انسٹی ٹیوٹ (FLI) اور کالام کلچرل سوسائٹی نے مشترکہ طور پر شائع کیا تھا۔ یہ کتاب قیمتی تحقیقی مواد کی حامل ہے۔ اس میں مذہبی اور سیاسی صورت حال، تاریخی پس منظر، دستیاب دستاویزات سے آغاز کر کے سینہ بہ سینہ روایات کو قلم بند کر کے شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے مختلف ابواب میں ان روایات کے ذریعے قبائل کی تاریخ، ان کے شجرے، خیلوں کی تفصیل، عمایدین کی علاقہ بدری، کالام کی تاریخی مسجد کی تعمیر، انگریزوں کی آمد اور جہاز پر فائرنگ، قحط، وبا اور زلزلہ، کالام میں رائلٹی کی تقسیم اور آپ بیتیاں وغیرہ محفوظ کر دی گئی ہیں۔ ہماری رائے میں پوری کتاب ہی بے حد اہم اور مستند ہے۔ جس کی بنیاد پر کالام کا سچا لوک بیانیہ مرتب کیا جا سکتا ہے لیکن ظاہر ہے ہمیں خاصا اختصار سے کام لینا ہوگا اور نہایت اہم اقتباسات ہی شامل اشاعت کئے جا سکتے ہیں۔ ہم کھیسور سے ابتداء کرتے ہیں۔

نیچے دی گئی معلومات میں نے لاجیر خان، عمر تقریباً 100 سال، مقام کارگلو، کالام سے 16 ستمبر 2003ء کو لی ہیں۔ دوسرا انٹرویو میں نے اور گل رحمان صاحب نے نمروز خان سے لیا تھا۔ جن کی عمر کوئی اسی سال کے لگ بھگ ہے اور ان کا تعلق کالام کے موضع یا جگل سے ہے۔

''ہمارے دادا کا نام گرا ہے، وہ بریکوٹ سے دیر کوہستان گیا۔ دیر کوہستان میں یہ دو بھائی تھے ایک وہاں رہ گیا اور ایک ادھر آیا۔ وہ کالام کی کس نامی جگہ پر گیا۔ وہاں سے ہماری موجودہ نسل پلی بڑھی ہے۔ وہاں جب اس نے رہائش اختیار کی تو اسے دھوئیں کی بو آئی۔ اس نے جلدی سے راستے کے پیچھے ایک گڑھا کھودا۔ وہ اس گڑھے میں بیٹھا تو اس اثنا میں ایک شخص اس طرف سے گزرا۔ جب وہ شخص اس کے نزدیک آیا تو یہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دونوں نے مصافحہ کیا تو دوسرے شخص نے اس سے پوچھا کہ تم کدھر سے آئے ہو؟ اس نے کہا میں اسی مٹی سے نکل آیا ہوں میں ادھر سے ہی پیدا ہو گیا ہوں۔ وہ کھیس تھا۔ دوسرے شخص نے کہا میں پہلے آیا ہوں اس نے کہا کہ میں تو اس مٹی سے نکلا ہوں اس لئے میں یہاں کا باسی ہوں۔

دوسرا شخص کال تھا کالام خیل کا دادا دونوں کے درمیان کافی بحث اس علاقے کی ملکیت پر ہوتی رہی۔ آخر کھیس نے کہا کہ دو حصے میرے ہوئے اور ایک حصہ تیرا۔ کال نے کہا کہ اس علاقے کا نام میرے نام پر ہونا چاہئے۔

کھیس اور کین دو بھائی تھے۔ انہوں نے وہاں لاموئی میں جائداد تقسیم کی۔ کھیس کے کھیت میں ایک بڑی چٹان تھی۔ جب اس نے اسے نکالا تو وہ گر کر نیچے کین کے کھیت میں آئی۔ اس نے کہا کہ اس چٹان کو ہٹاؤ ورنہ میں

تمہیں جان سے مار دوں گا۔ کچھ ہوشیار لوگوں نے اس سے کہا کہ اس چٹان کو ہٹانا تو مشکل ہے لیکن اسے اگر زمین کھود کر دفنایا جائے تو ٹھیک ہوسکتا ہے۔اس نے رات کو کچھ لوگ اکٹھے کئے اور زمین کھود کر چٹان اس میں دفنا کر اس نے اس چٹان کے اوپر مٹی ڈال دی۔

جب صبح کی روشنی پھوٹی تو اس نے دل میں سوچا کہ اس بار تو میں بھائی سے بچ گیا لیکن اگلی بار بچنا مشکل ہے۔اس لئے اس نے وہاں سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ وہ وہاں سے ادھر کس کالام آپہنچا۔ یہاں آ کر اس نے کال کے ساتھ جائیداد تقسیم کی۔

کھیس کے تین بیٹے تھے، جافل، نیلا اور ایلا، ان تینوں بیٹوں کی اولاد کو کھیسور کہا جاتا ہے ان میں جافلور، نلیور، بزدر اور شنکوٹور شامل ہیں۔

کھیسور زیادہ ترشہو، آشورون، بنڑ کلے، کارگلو، گورکین، بافر، بیوں، کوکوئیل، کالام بازار، کس، کنئی اور اوشو میں آباد ہیں۔

کھیسور کی زبان گاؤری ہے اور لوگ بس یہی زبان بولتے ہیں۔ (67)

ڈومور خیل:

یہ روایتی تاریخ حاجی علیم اللہ صوبیدار نے فراہم کی ہے۔ جو کہ لورکس کے رہائشی ہیں۔

"ہم نے بھی اپنے بزرگوں سے اسی طرح سنا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد راجکوٹ (پاتراک) کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سے دو بندے ادھر آئے ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ چار بھائی ہوں۔ دو ادھر رہ گئے ہیں اور دو کالام آئے ہیں۔ ایک کو کالا ڈومور اور ایک کو لال ڈومور کہتے ہیں۔ یہ دو بھائی آ کر کالام میں آباد ہوئے ہیں۔ اس علاقے کا جو رواج تھا انہوں نے اب تک قائم رکھا ہوا ہے۔ پھر ہم اور بزدر خیل ہم جافلور کے ساتھ بھائیوں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارا سود وزیاں ان کے ساتھ ہے اس میں چار فریق جافلور ہیں اور دو ڈومور اور بزدر ہیں۔ ہمارا وقت اب تک اسی طرح گزر رہا ہے۔ جو آباؤ اجداد ادھر آئے ہیں ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ چار بھائی ہوں گے۔ دو ادھر رہ گئے اور دو ادھر آئے ہیں۔ ادھر بھی کالے اور لال ہیں اور ادھر بھی کالے اور لال ہیں۔ باقی کیا پتہ لگتا ہے کہ وہ دو بھائی آئے ہیں یا دو الگ الگ افراد آئے ہیں۔ انہوں نے یہاں سب سے پہلے انکر میں جائیداد لی ہے۔(68)

مدی خیل (مدیور):

یہ تاریخ کس کالام کے حاجی محمد امین اور عبدالمنان سے لی ہے۔

"ہم اصل میں مدی خیل قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہ عمران (شاہ میران) اس کا بیٹا تھا۔ شاہ عمران پہلے سوات آیا ہے مدی بابا جلالہ میں ہے۔ وہ پہلے سوات کے نیکپی خیل نامی علاقے میں آیا ہے۔ وہاں سے ہی دشمنی کی بنا

پر نکلا ہے۔ کسی مسئلے کی وجہ سے وہاں سے نکلا ہے۔ وہاں سوات میں بھی اس نے کافی عرصہ گزارا ہے۔ وہاں سے وہ کالام آیا ہے۔ تلوار اس کے بغل میں تھی اور کپڑے اسی طرح باندھے ہوئے تھے۔

انہوں نے اس سے پوچھا تم ملنگ تو نہیں ہو کیونکہ تلوار تمھارے بغل میں ہے تم کیا چاہتے ہو؟ ہم تمہیں فصل وغیرہ دیں یا کیا دیں کیونکہ یہ موسم خزاں ہے؟ اس نے کہا مجھے کچھ نہیں چاہئے بس میں تم لوگوں کا بھائی بننا چاہتا ہوں۔

وہ جب فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا مستعان رہ گیا۔ مستعان کے ہاں محمد دوران پیدا ہوا۔ محمد دوران میرے اپنے دادا کا نام ہے۔ محمد دوران سے میرے والد صاحب اور ان کے بھائی کل چار ہیں۔ پہلے بڑا بیٹا اس کا نام اسماعیل اور میرے والد کا نام محمد غنی تھا ملا ولی اور ایک اور تھے۔ وہ ملنگی میں نکلا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے لئے سب کچھ چھوڑا اور خود گم ہو گیا۔ اس کا ملنگی کا شوق تھا۔ اس کا مزاروں پر پھرنے اور ملنگ بننے کا شوق تھا بس وہ بن گیا۔ اس کے بعد ایسے حالات آئے کہ ہم گھر میں بھی ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ میرے والد صاحب نے جب حج کیا تو اس زمانے میں بادشاہ کی حکومت مدین تک تھی۔'' (69)

کالام خیل:

کالام میں رہنے والے کالام خیل کی روایتی تاریخ ملک میر صمد (مرحوم) سے لی گئی ہے۔ جن کا تعلق کس کالام سے تھا اور ان کی عمر تقریباً سو سال کے لگ بھگ تھی۔

''میری عمر کے بارے میں کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ اندازہ اس طرح ہے کہ یہ کالام کا گاؤں خراب نہیں ہوا تھا، یہ مسجد میری یاداشت میں تعمیر ہوئی ہے۔ ہمارے باپ دادا نے ملاکنڈ کا سرنگ کھود کر جب نہر کی تعمیر کی تو وہ مجھے یاد ہے۔ آگے اللہ کو معلوم ہے کہ کتنی پیڑھیاں بیت چکی ہیں۔

کال دادا چترال سے آ کر سری کالام میں بسا ہے۔ سری کالام میں سردیوں کی ایک رات بہت برف پڑی۔ وہاں پر کافی بڑی آبادی تھی۔ بقیہ لوگوں نے سستی کی اور وہ سو گئے۔ لیکن کال سیخ میں گوشت بھن بھن کر اوپر اپنے بیٹوں کو دیتا رہا۔ اس کے چھ بیٹے تھے۔ تین بیٹوں نے چھت صاف کی اور وہ تھک کر نیچے آ گئے پھر باقی تین بیٹے اوپر آ گئے۔ پھر سیخ میں گوشت بھون کر اوپر ان کو دیا۔ صبح اُٹھے تو باقی گاؤں برف کے نیچے دب گیا تھا اور اس کا گھر ہی قدرے بچ گیا تھا۔

جب موسم بہار آیا تو ایک دن اس کی بہو پانی لینے گئی۔ سری کالام کا پانی تھوڑا دور ہے۔ کوا اپنی چونچ میں گندم کا ایک خوشہ لایا اور وہ کوے سے وہاں چشمے کے پاس گر گیا۔ یہ لڑکی وہ خوشہ لے کر آئی اور کہا ابوا ایسا علاقہ بھی ہے جہاں یہ چیز (گندم) استعمال ہوتی ہے۔ وہاں سے وہ اُٹھ کر چل دیئے اور کارگلو آ گئے۔ یہ کارگلو نام اس نے استعمال کیا ہے۔

دہاں وہ چھوٹی نہر اس نے بنائی ہے اس کا نام کارگلو نہیں بلکہ کاک گلوئے ہے۔ یہ ویران رہ گیا ہے۔ کوؤں

نے ان کی فصل خراب کی ہے۔انہوں نے مکئی کاشت کی ہے یا گندم۔وہ اوپر آ کر شاہ بلوط کے جنگل میں آباد ہوئے ہیں۔وہاں سے وہ نیچے آ گئے ہیں اور وہاں سرحد پر چوکیداری کی ہے۔وہ یہاں کافی عرصہ رہا ہے۔یہ علاقہ ویران تھا۔کوئی یہاں نہیں رہتا تھا۔وہ ایک کھڈے میں بیٹھ کر ہر وقت راستہ دیکھتا رہتا تھا۔

کال کے چھ بیٹے تھے۔تین چترال گئے اور تین ادھر رہ گئے۔ان کی دو مائیں تھیں۔یہاں جو رہ گئے ہیں ان کی ماں کا نام راجیم تھا۔جو چترال گئے ہیں وہ مغلی (اسماعیلی) فرقے سے تعلق رکھنے والی بیوی کے بیٹے تھے۔وہ یہاں سے واپس ادھر گئے ہیں۔وہ ان سے کچھ زیادہ طاقتور تھے۔یہ راجیم دادی عقل مند تھی۔اس نے کال سے کہا اگر تم اپنی مرضی سے مال تقسیم کرو گے تو یہ لوگ راضی نہیں ہوں گے وہ تمام مال لے جائیں گے۔یہ مصلہ باتیں نہیں کرتا اس لئے وہ کسی کی خاطر نہیں کرے گا۔اسے لے کر دیودار کی گیلیوں پر مارو۔جب مصلے کی آواز آئے گی تو بکریاں بھاگ کر میدان کی طرف جائیں گی۔بھیڑیں بھاگ جائیں تو وہ اونچائی کی طرف جاتی ہیں۔ان سے وعدہ لو کہ جو جانور اوپر جائیں وہ تمہارے اور جو نیچے جائیں وہ ان بچوں کے جو میرے ساتھ یہاں رہنا چاہتے ہیں۔جانوروں میں سے بھیڑیں اوپر کی طرف گئیں ہیں جب کہ بکریاں نیچے کی طرف آ گئی ہیں۔ہم لوگ اب بکریاں زیادہ نہیں پالتے اگر پالیں تو ہمارے پاس بہت ہوں گی۔

کارگلو کے لاجبر خان کالام خیل کے بارے میں کچھ یوں کہتے ہیں:

''کالام خیل چترال سے آئے ہیں۔کال کے چھ بیٹے تھے۔تین ادھر آئے ہیں اور تین چترال واپس گئے ہیں۔سری کالام نامی جگہ پر پورا گاؤں برف تلے ڈوب گیا تھا۔اور یہی ایک شخص اپنے چھ بیٹوں سمیت بچ گیا تھا۔

جب وہ سری کالام سے نیچے ڈیشئی پہنچے تو ایک عورت نے بچہ جنا ہے کافی دن انہوں نے وہاں گزارے ہیں۔

ایک دن ایک بہو پانی لینے گئی ہے۔اس نے وہاں گندم کا ایک خوشہ پڑا ہوا دیکھا ہے۔یہ ایک کوا اپنی چونچ میں لایا تھا اور ادھر گرایا۔اس نے وہ اپنے سسر کو لا کر دیا کہ ایسی جگہ بھی ہے جہاں یہ فصل اگتی ہے۔اس نے بہو سے پوچھا کہ وہ کوے کس طرف گئے؟ اس نے کہا نیچے کی طرف گئے ہیں اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ بوریا بستر باندھو اور آؤ اس طرف چلتے ہیں۔

ان میں سے آدھوں نے کہا ہم نہیں آتے۔انہوں نے کہا ہم لوگ واپس چترال جانا چاہتے ہیں۔باقی تینوں نے کہا کہ ہم والد کے ساتھ نیچے اس علاقے میں جانا چاہتے ہیں۔اس نے کافی کوشش کی پر بیٹے نہ مانے۔آخر اس نے کہا آؤ میں یہ مال مویشی تم لوگوں پر تقسیم کرتا ہوں۔اس نے ان بھیڑ بکریوں کے بیچ میں جا کر آستین ہلایا تو آدھے نیچے کی طرف گئے اور آدھے اوپر کی طرف گئے ہیں۔چترال جانے والوں نے اپنی بھیڑ بکریاں لیں اور اس طرف چل دیئے جب کہ اس طرف آنے والے انہیں لے کر نیچے کی طرف آئے (70)

انگریزوں کی آمد اور جہاز پر فائرنگ:

میر صمد خان کہتے ہیں:

''جب جہاز آتا تو ہم اس پر فائرنگ کرتے۔ اس لئے کہ ہم انگریز کی حکومت قبول نہیں کرتے تھے۔ الیٹ نامی ایک انگریز آکر جہاز میں گھومتا تھا۔ وہ پیسے لایا اور غلام رسول ملک اس کے ساتھ مل گیا۔ ملک وظیف اللہ میاں کے ساتھ مل گیا۔ جب میاں کے پیسے تقسیم کئے گئے تو بارہ بارہ روپے ہمیں ملے۔ الیٹ کے اٹھارہ روپے فی فرد ہم نے وصول کئے۔ بچوں کو نہیں دیتے تھے بالغ افراد کو دیتے تھے۔ میاں کو تو کچھ نہیں ملا اور الیٹ کو شہو کے پیچھے ڈلیار میں کچھ درخت دیئے گئے۔

کشمیری آگئے۔ ہم نے اس طرح کے آرے، جبل اور کلہاڑیاں نہیں دیکھیں تھیں جیسی وہ لے کر آگئے۔ ہم نے کہا یہ لوگ کون ہیں؟ انہوں نے کہا یہ کشمیری ہیں۔ وہ درخت کاٹ کر جلدی سے اس چھوٹے سے جزیرے میں لے آئے۔ ہجبولوٹ چاچا اور شریف حاجی نے وہ درخت روک لئے اور کہا کہ ہم یہ نہیں لے جانے دیں گے۔ کیوں نہیں دینا چاہتے؟ یہ مجھے میرے دریا کے پیسے دے دیں ورنہ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ الیٹ کو ہم نے یہاں رکنے نہیں دیا وہ جا کر پشمال کے قلعے میں رہنے لگا۔

اس نے وہاں سے اوپر اپنے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ سیف اللہ نامی ایک کشمیری تھا۔ وہ پشمال میں نوکر تھا اس نے آکر کالامیوں سے کہا کہ حکومت تم لوگوں کو بہت غصے سے دیکھتی ہے۔ الیٹ کا وہ بہت خاطر کرتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ صاحب کی حکومت تھی اس شخص کو لے آؤ کس قسم کا آدمی ہے؟ پھر ہجبولوٹ اور غریب کو ادھر سے لے گئے۔ کیا تم اس دریا میں ہمارے درخت نہیں چھوڑتے؟ اس نے کہا نہیں۔ اگر تمہیں پیسے دیں تو پھر چھوڑو گے یا نہیں؟ میں نے تو پیسوں کے لئے ہی بند کیا ہے پھر کیوں نہ چھوڑوں۔ اس نے اسے دوسو چالیس روپے دے دیئے۔ وہ پھر امیر ہو گیا۔ اس وقت الیٹ کو تین روپے میں ایک درخت فروخت کیا تھا چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔''

''اس بارے میں نمروز خان کہتے ہیں:

''جب بھی کوئی جہاز آتا تو لوگ اس پر فائرنگ کرتے۔ بزرگ کہتے کہ اسے گولیاں نہ ماریں اور جہاز آسمان میں پھرتا رہتا تھا۔ وہ کبھی ایک طرف جاتا کبھی دوسری طرف جاتا اور یہ لوگ اس پر فائر کرتے تھے۔ اس زمانے کی بندوق کی گولیاں کہاں جہاز تک پہنچ سکتی تھیں۔

کنٹرئی نامی ایک بندوق تھی جس کی گولی ایک چھٹانک کے قریب ہوتی تھی اس کی گولی بندوق کی پائپ سے ڈالتے اسے (گھینیں توباک) کہتے تھے۔ اس کی گولیاں دور تک جا نہیں سکتی تھیں ویسے ہی لوگ اوپر آسمان کی طرف فائرنگ کیا کرتے تھے۔(71)

قحط اور وبا:

میر صمد کی زبانی:

''کہتے ہیں کہ گاؤں میں قحط شروع ہوا تو جو امیر تھے وہ اپنا مال ذبح کر کے کھانے لگے ایسا وقت بھی آیا کہ لوگ ذبح شدہ جانوروں کا جو خون تھا وہ بھی کھانے لگے۔ایک بندہ مرنے لگا تو اس نے دوسرے سے کہا اگر تم مجھے روٹی دو گے تو باڈونگ والی زمین تمہاری ہوئی۔اس نے روٹی دی تو وہ آدمی بچ گیا۔اس نے کہا ایک روٹی نہیں میں تمہارے سب بال بچوں کو روٹی دینا چاہتا ہوں وہ ایک سال قحط میں گزرا ہے باقی خوشحالی رہی ہے۔''

کارگلو کے لاجبر خان کہتے ہیں:

''ایک دفعہ کالام میں ایک مرض وبا کی صورت اختیار کر گئی۔اس مرض کو رنختی کہتے تھے۔اتنے لوگ مر گئے تھے کہ لوگ دفنا نہیں سکتے تھے۔ہم صرف دو آدمیوں نے اپنی ایک بہن کو دفنایا۔کارگلو میں، شہو میں اور آشوروں اور چراٹ میں قبرستان بھر گئے۔مٹیٔ میں بھی مر گئے۔یہ پتہ نہیں تھا کہ کس قسم کی یہ بیماری تھی۔بس اچانک مرتے تھے۔یہی کہتے کہ میرے بدن میں درد ہے میرے معدے میں یا پیٹ میں درد ہے۔کوئی ڈاکٹر یا حکیم اس زمانے میں نہیں تھا۔مٹیٔ میں ایک ملا تھا جو لوگوں کو جمال گھوٹا دیتا تھا۔جسے کھا کر اکثر لوگ مر جاتے اور کچھ ٹھیک بھی ہو جاتے تھے۔اس بیماری میں اگر کوئی شخص پانچ یا چھ دن سے زیادہ بچتا تو وہ بچ جاتا تھا۔ہمارے خاندان میں کوئی سولہ افراد فوت ہو گئے۔کریم دادا کی اولاد میں کوئی ساٹھ افراد اس بیماری سے وفات پا گئے۔آدھے سے زیادہ لوگ تو ہمارے اس جہاں سے چل بسے۔مصر حاجی صاحب لوگوں کے گھر میں سات افراد وفات پا گئے۔میری بیوی تو ٹھیک ہو گئی لیکن ایک بیٹا مرا۔میرا ایک بھائی بھی فوت ہو گیا۔حاجی شیرین کے گھر میں تین افراد فوت ہوئے۔سات لوگ سعد چچا کے گھر میں مرے۔جس سے پورے گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

عبدالقادر کے گھر میں اس کا بھائی فوت ہوا تھا۔عالم زیب لوگوں کے گھر میں سات افراد وفات پا گئے۔ایک گھر میں ایک ہی ماں سے چار بیٹے تھے، جب چاروں فوت ہوئے تو ان کا دروازہ بند ہو گیا۔اس طرح کی تکلیفات لوگوں نے کاٹی ہیں یہ بہار کا موسم تھا جب یہ بیماری پھیلی تھی۔صرف دو ماہ کے عرصے میں جو مرے تو مرے باقی جو بچ گئے وہ بچ گئے۔بڑی تعداد میں یہ لوگ اوشو، اتروڑ اور کالام میں مرے تھے اس وقت میں جوان تھا میں نے پہلی شادی کی تھی۔(72)

والی سوات کا ظلم و ستم:

محمد شریف عرف پہلوان کی زبانی،

''میں بہت طاقتور تھا اس لئے لوگ مجھے پہلوان کہتے تھے۔والی صاحب نے بھی مجھے اس لئے نوکری میں بھرتی کیا تھا۔ایک دفعہ میں پانچ من اخروٹ کاندھے پر اٹھا کر تحصیل سے بازار تک لے گیا تھا۔

حکومت کو لوگ نہیں مانتے تھے۔اس لئے کچھ لوگ دیر چلے گئے۔یہاں حریف اللہ اور زید اخون زادہ کی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی تھی۔سراج کو قتل کیا گیا اور زید جانوروں کے اصطبل میں چھپ گیا۔زید نے یہاں حکومت قائم کرائی اور اس علاقے پر پانی بند کیا گیا۔کچھ لوگ تو اس پار چلے گئے اور ہم لوگ کچھ شہو چلے گئے۔یہ علاقہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے ویران ہو گیا۔پانی کے لئے مجھے بھی حکومت گرفتار کر کے لے گئی اور تحصیل پشمال میں بند کر دیا گیا۔ میں صاحب حق صاحب کا دہقان تھا۔میں نے جب کھیتوں میں پانی لگایا تو مجھے گرفتار کیا گیا۔

پرانے زمانے سے آج کل کا دور اچھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل سب کچھ کالام ہی میں وافر مقدار میں مل جاتا ہے۔اس زمانے میں تنگی تھی۔اس ثور میں کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔میں اور غریب آ کر یہاں بیٹھے تھے۔ یہاں بہت زیادہ جھاڑیاں تھیں مجھے بند کر دیا گیا تھا۔اشرف ملک نے آ کر میرے لئے دس روپے دیئے اور مجھے چھڑا لیا''۔(73)

بادشاہ سوات کے حامیوں کے ساتھ جنگ:

ملک صمد خان کی زبانی:

''حکومت کے ساتھ جنگ میں میں خود شامل تھا۔ہم حکومت کو قبول نہیں کرتے تھے۔زید اخونزادہ جا کر حکومت یہاں لے آیا۔احمد شاہ ملک بھی کالامیوں سے تنگ تھا وہ حکومت کو یہاں لے آئے۔وہ حکومت کو جانیلز لے آئے، وہ ہم پر ظلم کرنے لگے اور پانی بند کر کے کس بند ہو گیا۔دیسان کا دریا روک کر پانی بند کیا گیا۔کس بند ہو گیا۔ہم نے آ کر پل گرا لئے۔میرے والد صاحب نے اگر کے پل کی ایک لکڑی چھوڑ دی اسے گرانے نہیں دیا۔ہم جا کر رات کو چوکیداری کرتے تھے۔ساٹھ افراد جا کر کھٹار نامی جگہ چوکیداری کرتے تھے۔ساٹھ افراد جا کر بیوں کوٹ کی چوکیداری کرتے تھے۔

اگر ہم کس میں ہوتے تو مچھر ہمیں کاٹ کاٹ کر ہمارا چہرا پھُلا دیتے۔جس دن بیوں کوٹ میں بیٹھتے تو اس دن ہوا کی وجہ سے مچھر ہمیں زیادہ نہیں کاٹتے۔ہم اس طرح باری باری ان دو جگہوں کی چوکیداری کرتے تھے۔ آخر انہوں نے دن کے وقت آ کر ہمارے کچھ گھر جلا دیئے۔جب گھروں کو آگ لگائی گئی تو ہم بھی یہاں سے چل دیے اور کھٹار میں ہماری جنگ چھڑ گئی۔ایک ہم میں نمروز ملک کا باپ ملک جمروز زخمی ہوا۔ہم نے بھی اس طرح ایک ملاخیل کو زخمی کیا۔

میرے ایک چچا کو ایک مّلا خیل نے گولی ماری وہ اس کی ٹوپی پر لگی اور سر میں لکیر سی بن گئی۔ایک اور چاچا نے آواز دی کہ داش کا بدلہ لیں۔اس شخص نے اس کو قتل کر دیا۔ہم نے کہا سچ مچ اس کے ماتھے پر لگی ہے یہ مر گیا۔میں نے اور محمد خان بھائی نے اس کا پیچھا کیا وہ جا کر دیوار پھلانگنے لگا تو ہم نے وہیں پر اسے گولی ماردی۔یہ گولی اس کی ٹانگ پر لگی اور وہ دیوار کے اس طرف گر گیا۔ایک جگہ سے ہم پر فائرنگ ہوئی اور ہم جا کر پن چکی میں چھپ گئے اور

وہ بندہ ادھر سے اٹھ کر بھاگ گیا۔

ہمارے یہاں کے کچھ کالامی جو جا کر آریانی میں رہتے تھے وہ بھی ہمارے خلاف لڑے۔ ہم نے ان سمیت سب کو بھگا کر جائل بنڑ کے قلعہ میں بند کیا اور ہم یہ جنگ جیت گئے۔ وہ حکومت چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد دسویں سال دوسری حکومت آئی۔ والی صاحب کی حکومت سب کالامیوں نے مل کر قبول کی۔ اٹھارہ، بیس سال اس نے حکومت کی۔ اس کے جانے کے بعد پاکستان وجود میں آیا۔" (74)

گاؤری لوک دانش:

سینہ بہ سینہ چلی آ رہی روایات ہی نہیں، گاؤری زبان میں لوک دانش کا خزینہ بھی موجود ہے اور گاؤری بولنے والوں کے "آباؤ اجداد کی ایک ایک بات ضرب المثل یا قولِ زرّیں" (75) کا درجہ رکھتی ہے۔ گاؤری ضرب الامثال میں پوشیدہ دانش، لوک بیانیہ کا اہم ترین حصہ ہے۔ بدقسمتی سے یہ بیانیہ گمنامی کا شکار ہے جس کی وجہ گاؤری زبان کی طرف ہماری عدم توجہی ہے۔ صورت جو بھی ہو، اس لوک دانش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں گاؤری کے چند نمائندہ ضرب الامثال درج کے جاتے ہیں:

☆ میں خان کو دیکھ رہا ہوں، اور خان آسمان کو دیکھ رہا ہے
☆ مینڈک اک مٹی کے ٹکڑے پر چڑھ کر کشمیر دیکھتا ہے
☆ بڑھیا کے مرنے کا دکھ نہیں مگر خطرہ یہ ہے کہ یوں عزرائیل عادی ہو جائے گا
☆ قبر تنگ تو ہے لیکن مردے کو برداشت کرنا پڑتا ہے
☆ پہاڑ کے بیچ میں راستہ ضرور ہوتا ہے
☆ عقل بیوقوف آدمی سے سیکھی جا سکتی ہے
☆ لوگوں کا تو پانی بھی جلتا ہے لیکن ہمارا تیل نہیں جلتا
☆ بھائی کا بدلہ تو لوں لیکن کیچڑ کہاں سے لاؤں
☆ فاصلہ چلنے سے کم ہوتا ہے اور مسئلہ بات چیت سے حل ہوتا ہے
☆ بلی، چوہوں کو، خدا کی رضا کے لئے نہیں پکڑتی
☆ ایک انسان، دوسرے انسان کے لئے آئینہ ہے
☆ بارش سے بھاگ کر آبشار تلے آنا
☆ بھیڑوں سے کون پوچھ کر ان کی اون کاٹتا ہے
☆ اللہ ہو کون سنا رہا ہے اور خیرات کون کھا رہا ہے
☆ موسم بہار کی لومڑی نے گرمی کی سختی نہیں دیکھی (76)

سوات کوہستان کی ایک لوک کہانی:

کہانی بحرین کے چالیس سالہ نذر گل سے روایت ہے:

''بہت پرانی بات ہے کہ سوات کوہستان کے گاؤں بحرین میں ایک طاقتور پہلوان رہتا تھا اس کا نام سُنے ملک تھا وہ وجیہہ قامت، خوبرو اور طاقتور آدمی تھا۔ وادی کی تمام لڑکیاں اس پر فریفتہ تھیں اور ہر کوئی اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُنے ملک کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حتیٰ کہ خوبصورت ترین دوشیزہ بھی اس کو راغب نہ کر سکی تھی۔ اردگرد کے سرداروں نے بھی اپنی بیٹیوں کے لئے پیغام بھجوائے۔ لیکن اس نے انکار کیا۔

کہتے ہیں جیسا قصہ میں بیان ہوا ہے کہ شائد کالام گاؤں میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کی خوبصورتی نہ صرف زبان زد خاص و عام تھی بلکہ علاقے کے شعراء بھی اس کے حسن پر مصرعے لکھتے تھے۔ اس کا نام گل ناز تھا۔ بہت سے سرداروں نے گل ناز کو شادی کے پیغام بھجوائے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ لوگ حیران تھے کہ گل ناز کس خوش قسمت انسان کو پسند کرے گی۔ گل ناز متفکر تھی کہ آیا شادی کر بھی پائے گی یا کہ نہیں۔

ایک دن جب سُنے ملک کو کالام دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس نے گل ناز کی ایک جھلک دیکھی۔ اس دن کے بعد سُنے مَلِک کے دل میں اس کے لئے کچھ تڑپ سی پیدا ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ وقت وہ گل ناز کے تصور میں رہتا تھا۔ نہ وہ کھاتا تھا نہ پیتا تھا بلکہ اس کے خیالات گل ناز پر مرکوز تھے۔ اس نے اپنی پوری کوشش کی کہ مختلف لوگوں کو ملے کہ گل ناز کے باپ کو سمجھائیں کہ ان کو شادی کی اجازت دے لیکن درمیان میں کچھ مشکلات حائل تھیں۔

سُنے مَلِک کا تعلق اس قبیلے سے تھا جس کے سرداروں نے گل ناز کے دادا کو قتل کیا تھا۔ سُنے مَلِک کے دوستوں نے اسے بہت سمجھایا کہ گل ناز کا خیال دل سے نکال دے لیکن وہ یہی جواب دیتا۔

''کہ میں گل ناز کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ صرف موت ہی اس کی یاد بھلا سکتی ہے''۔

بالآخر کافی جدوجہد کے بعد گل ناز کا باپ اپنی بیٹی کی شادی سُنے مَلِک کے ساتھ کرنے پر رضامند ہوا۔ مگر اس نے یہ شرط رکھی کہ سُنے مَلِک ایک دن نہر کھود کر موضع بو کے نزدیک ایسے مقام پر لائے کہ اس کا پانی تین پن چکیاں چلا سکے۔

سُنے مَلِک نے خوشی کے ساتھ یہ شرط قبول کی اور بو پہنچ گیا گل ناز بھی اس کٹھن کام کو دیکھنے کے لئے اپنے والد کے ساتھ آئی۔ کہانی اس طرح سے ہے کہ گل ناز نے وہاں پہنچ کر اپنی شال زمین پر پھیلائی تاکہ نہر اور پن چکیوں کا نقشہ دکھائے۔ سُنے مَلِک نے وقت ضائع کئے بغیر اپنے بازوؤں کے زور سے ایک دن میں نہر اور پن چکیاں تیار کر دیں جیسے کہ طے ہوا تھا۔

اس کے بعد سُنے مَلِک، گل ناز اور اس کے والد کے ساتھ کالام گیا اور دھوم دھام سے شادی رچائی۔ کچھ دن بعد میاں بیوی بحرین آگئے۔ اس کی اولاد آج بھی بحرین میں آباد ہے اور اس کو نیک کہتے ہیں۔

سُنے مَلِک اور گل ناز کی محبت کی یادگار یعنی نہر اور پن چکیاں آج بھی موجود ہیں۔(77)

حوالہ جات:

1۔ ثقلین بنگش، عوامی شعراء پشتو اکیڈمی پشاور بہ اشتراک لوک ورثہ اسلام آباد، 2008، ص 30
2۔ رضا ہمدانی (تلاش و ترجمہ) رزمیہ داستان، لوک ورثہ کا قومی ادارہ، اسلام آباد 1981، ص 150
3۔ ایضاً، ص 151-153
4۔ ایضاً، ص 154
5۔ ایضاً، ص 156-158
6۔ ہمیش خلیل، جنگی چار بیتے، پشتو اکیڈمی پشاور، بہ اشتراک لوک ورثہ، اسلام آباد، ص 41-42
7۔ رضا ہمدانی، رزمیہ داستانیں، ص 176-178
8۔ ہمیش خلیل، جنگی چار بیتے، ص 48-50
9۔ رضا ہمدانی، رزمیہ داستانیں، ص 183
10۔ ایضاً، ص 184-185
11۔ ایضاً، ص 213-214
12۔ ایضاً ص 290-291
13۔ ایضاً، ص 305-306
14۔ محمد عظیم آفریدی، آدم خیل آفریدی، تاریخ کے آئینہ میں، رحمان الدین آفریدی، 1999، ص 67-68
15۔ ایضاً، ص 71-72
16۔ ایضاً، ص 81
17۔ رضا ہمدانی، رزمیہ داستانیں، ص 426
18۔ محمد افضل رضا، پشتو لوک ادب، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، 1989، ص 163
19۔ ایضاً، ص 164-166
20۔ فارغ بخاری، پشتو لوک گیت، پشاور 1961، ص 114,116,118
21۔ ثقلین بنگش، عوامی شعراء، ص 32
22۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، پشاور شہر اور روایات، پشتو اکیڈمی پشاور بہ شراکت لوک ورثہ اسلام آباد، ص 6-7
23۔ ایضاً، ص، 13-14
24۔ سید خیال بخاری (پیش لفظ) مشمولہ روہی متلونہ (پشتو ضرب الامثال مع اردو ترجمہ) ترتیب و ترجمہ، محمد نواز طاہر، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی پشاور، 1975، ص 1
25۔ ایضاً، ص 12,11, 16, 28, 32, 52, 86, 108, 142, 176, 186, 208, 226
26۔ ایضاً، جلد دوم، 1983، ص 75,125,161,169,185,199,221,283,423
27۔ فارغ بخاری، سرحد کے لوک گیت، پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس، اسلام آباد، 1964، ص 181 -182

28۔ رضا ہمدانی (تلاش و ترجمہ) چاربیتہ ،لوک ورثہ کا قومی ادارہ اسلام آباد، 1978

29۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مختصر تاریخ، زبان و ادب ہندکو، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، 2010،ص 205-204

30۔ ایضاً، ص 226-214

31۔ فیاض عزیز، جھیلوں کی سرزمین وادی ء کاغان، راولپنڈی 1993، ص 33

32۔ ایضاً، ص، 219-218

33۔ ایضاً، ص، 228-227

34۔ ایضاً، ص، 232-230

35۔ ایضاً، ص، 237-234

36۔ ایضاً، ص، 241-238

37۔ لوک ورثہ، پاکستان کا ثقافتی انسائیکلو پیڈیا، جلد اوّل، شمالی علاقہ جات، عنایت اللہ فیضی، چترال، الفیصل لاہور، 2004، ص 324-323

38. Kendall D. Decker, Socio - Linguaistic of Northern Pakistan, Vol 5, Languages of Chitral, NIPS, SIL, Islamabad Contents.

39۔ شاہین محمد پرویش، زبانوں کی وادی: ششی کوہ، مشمولہ معیار، شمارہ-8 انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص 125-121

40۔ غلام عمر، چترال کی لوک کہانیاں، لوک ورثہ کا قومی ادارہ، اسلام آباد ص، 57-40

41۔ محمد عرفان (مرتب) کلیاتِ محوی چترار ی۔ت۔ن۔ص 153

42۔ ایضاً، ص، 156

43۔ ایضاً، ص، 151

44۔ شیرولی خان اسیر، ژورنامہ مترجم: بیگم شیر ولی خان اسیر، انجمن ترقی کھوار، چترال 2010ء، ص 49-48

45۔ ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی، زبان و ثقافت، فورم فار لینگویج انسٹیٹیوز، (FLI)، اسلام آباد ص 98

46۔ ایضاً، ص، 99 -98

47۔ فارغ بخاری، سرحد کے لوک گیت، ص، 265

48۔ ایضاً، ص، 266-265

49۔ ایضاً، ص، 268

50۔ ایضاً، ص، 271 -270

51۔ رحمت الدین اوچے داؤد، کھوار متال، انجمن ترقی کھوار، چترال، اپریل 1990ء، ص، 52-8

52۔ افسر علی خان، کھوار، متالاں گرزین (کھوار کہاوتوں کا مجموعہ) FLI، اسلام آباد، 2016ء ص

53۔ نسیم حیدر، پالولہ متلی، پالولا ضرب الامثال، ایف ایل آئی، اسلام آباد، 2012، ص، 81-1

54۔ شاہین محمد پرویش کافرستان، لاہور، 2014، ص، 138

55۔ ایضاً، ص، 144

56. Calvin R Rensch, Sandra J. Decker, Daniel G. Hallberg, Languages of Kohistan - NIPS, Quetta, Summer Institute of Languages, Islamabad, 2002, (reprited,pages 263)

57۔ شاہین محمد پرویش، بحرین کا لسانی اور لسانی جائزہ مشمولہ بازیافت، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، شمارہ 19، صفحات 26-9

58۔ ایضاً، ص،10

59۔ زروال کوہستانی، انڈس کوہستان، پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا، صوبہ سرحد، لوک ورثا اسلام آباد، الفیصل لاہور، 2007، ص، 362-360

60۔ زبیر توروالی، اینان، ادارہ برائے تعلیم و ترقی بحرین سوات، 2016، ص

61۔ رحیم صابر، کوکو باچا، توروالی لوک قصہ، توروالی لوک کہانیاں، ادارہ برائے تعلیم و ترقی، بحرین سوات، 2005، ص، 60-62

62۔ محمد زمان ساگر، کالام کوہستان کی روایتی تاریخ، فرنٹیئر لینگویج انسٹی ٹیوٹ و کالام کلچرل سوسائٹی، اسلام آباد، 2007 ص، 33-35

63۔ ایضاً، ص، 46

64۔ ایضاً، ص، 48

65۔ ایضاً، ص، 57-55

66۔ ایضاً، ص، 131- 129

67۔ ایضاً، ص، 136-134

68۔ ایضاً، ص، 150-149

69۔ ایضاً، ص، 157-156

70۔ محمد زمان ساگر، کالام کوہستانی متل، کالام کلچرل سوسائٹی، کالام، سوات، ت۔ن، دیباچہ

71۔ ایضاً

72۔ عنایت الرحمان، سوات کی لوک کہانیاں، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی، پشاور، 1993 ص،

چوتھا باب

سندھ کا لوک بیانیہ

سندھ کا لوک بیانیہ

سندھ پاکستان کا واحد صوبہ ہے جو لسانی وحدت میں اپنی مثال آپ ہے۔ ماں بولی سندھی، جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی، نسلی اور لسانی شناخت کی زبان ہے۔ لیکن سندھ کی لسانی وحدت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سندھ لسانی تنوع سے محروم ہے۔ سندھی زبان کے مختلف لہجے اس تنوع کی کہانی سناتے ہیں:

سندھ کا ثقافتی اور لسانی تنوع:

سندھ کے لسانی تنوع کے لئے سید مظہر جمیل نے لسانی اختلاط کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جس سے ان کی مراد سندھی زبان کے مختلف لہجے ہیں۔ ''ہر بڑی زبان کی طرح سندھی زبان بھی صرف اپنی قدیم ماہیت، اصلیت اور صوتی ساختیات کے اعتبار ہی سے تخصیصی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اپنے اثر و نفوذ کی ہمہ گیر وسعت، تنوع اور رنگارنگی کے لحاظ سے بھی ممتاز تشخص کی حامل ہے۔ تاریخی اعتبار سے کبھی سندھی حکمرانوں کا سایہء اقتدار عرب کے ساحلوں سے لے کر مشرق میں کشمیر کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا، باور کیا جانا چاہئے کہ وادیء سندھ میں گلہ بان قبائل، بنجاروں، کشتی رانوں، تاجروں اور دوسرے لوگوں کی آمد و رفت کے نتیجے میں ہمہ وقت برپا ہوتے رہنے والے معاشرتی اور تہذیبی اختلاط نے اس خطے میں بولی جانے والی بولیوں کے درمیان یگانگت اور باہمی اثر و نفوذ کی صورت ضرور پیدا کی ہوگی۔ چنانچہ ان زبانوں کو مشترکہ الفاظ اور ضابطوں کی کثرت نے آج تک ہم رشتہ کر رکھا ہے۔''(1)

اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے سید مظہر جمیل سندھی زبان کو چار طبعی اور جغرافیائی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ چاروں حصے صرف و نحو، لغت اور لسانی ساخت کے اعتبار سے دراصل ایک ہی زبان کی شہادت دیتے ہیں۔ البتہ سندھ کے مختلف قبائل پر جغرافیائی اور تہذیبی اثرات کے باعث ان کے لہجوں، روزمرہ کی بول چال اور محاوروں میں تھوڑا بہت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے سندھی زبان میں رنگارنگی اور تنوع کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ غلام علی الانہ سمیت سندھی زبان کے بیشتر ماہرین نے ان لہجوں کی الگ الگ نشاندہی کی ہے۔ جس کی بنیاد پر سید مظہر جمیل نے سندھی کے مندرجہ ذیل لہجوں کی تفصیل بیان کی ہے:

1۔ **سرو یا سرائی لہجہ:** شمالی سندھ میں بولا جاتا ہے جسے عرف عام میں اپر سندھ (Upper Sindh) کہتے ہیں، اس لہجے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سرائیکی زبان بولنے والے علاقے بھی کسی نہ کسی حد تک اس لہجے کے زیرِ اثر سمجھے جاتے ہیں۔ شمالی سندھ میں جو لوگ ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ جات کے علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں، انہیں عام طور پر ''سرائی'' کہا جاتا ہے جو سندھی اور سرائیکی زبانوں کے مخلوط

لہجے بولتے ہیں۔ سرائیکی زبان ہر چند وقت کے ساتھ ساتھ اپنی خودمختار حیثیت اور جداگانہ تشخص قائم کرنے میں کامیاب رہی ہے لیکن طبعی اعتبار سے سندھی اور سرائیکی زبانوں کا باہمی رشتہ غیر منقسم بھی سمجھا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے پنجابی اور سرائیکی کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم زمانوں سے یہ خطہ ذولسانی رہا ہے جہاں سندھی زبان کے ساتھ سرائیکی بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس علاقے کی سندھی زبان پر سرائیکی لہجے کی چھاپ بعید از قیاس نہیں۔

2۔ لاڑی لہجہ: سندھ کے زیریں حصوں میں بولا جاتا ہے جن میں ہالا، مٹیاری، ٹنڈو آدم کے علاوہ سندھ کے جنوبی اضلاع شامل ہیں۔ جیسے حیدرآباد، بدین، تھرپارکر، ٹھٹھہ اور کراچی وغیرہ

3۔ کوہستانی لہجہ: مغربی سندھ کا وہ پورا علاقہ جو بلوچستان سے ملحق ہے، بالعموم کوہستانی حصہ کہلاتا ہے جہاں قدیم زمانے سے بلوچی بولنے والے قبائل آباد ہیں، جو بلوچی زبان کے علاوہ سندھی زبان بولنے پر بھی یکساں طور پر قادر ہیں لیکن جداگانہ لہجے میں، ان کا یہی لہجہ کوہستانی سندھی کہلاتا ہے۔

4۔ وچولی لہجہ: سندھی زبان کا وہ مرکزی لہجہ ہے جسے سندھی زبان کا معیاری لہجہ قرار دے کر بالعموم تصنیف و تالیف کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اہل علم کی سرپرستی نے اسے زیادہ نکھارا اور سنوارا ہے اور پڑھنے لکھنے کی سرگرمیوں میں اس کی پیروی کو ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ شعر و شاعری، ادب و تحقیق، دفتری امور، علمی مباحث اور صحافیانہ سرگرمیوں میں بھی وچولی لہجے ہی کی پاس داری کی جاتی ہے۔ وچولی لہجہ ہر قسم کی جغرافیائی تقسیم اور محدودات سے بری الذمہ تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ''وچولی'' سندھی زبان کا سب سے زیادہ ثروت مند لہجہ بھی ہے کہ اسے ہر دور میں سندھی کا معیاری لہجہ تسلیم کیا گیا ہے۔(2)

سید عاصم محمود اور عامر حمید نے اپنی علمی کتاب ''پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا'' میں سندھ میں سندھی زبان کے گیارہ لہجوں یا بولیوں کا ذکر کیا ہے۔ جو سندھ اور بلوچستان میں بولی جاتی ہیں۔ ان لہجوں یا بولیوں میں سریلی سندھ (سرو یا سرائی) وچولی، لاڑی، تھری، کچھی، لاسی، جدگالی، کوہستانی، میمنی یا گجراتی کاٹھیاواڑی، فراکی اور کھیترانی شامل ہیں۔ فراکی اور کھیترانی سبّی اور کھیترانی بلوچستان میں بولی جاتی ہیں۔ سریلی کا تعلق شمالی یا بالائی سندھ سے ہے۔ وچولی سندھی، وسطی سندھ میں مستعمل ہے۔ لاڑی جنوبی سندھ کے علاقوں بدین اور ٹھٹھہ وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ تھری تھرپارکر اور بھارتی راجستھان میں بولا جانے والا لہجہ ہے۔ کچھی سندھی، کچھ کے ریگستان کی بولی ہے۔ لاسی کا تعلق لسبیلہ (بلوچستان) اور جدگالی سندھی بلوچستان کے غیر بلوچ لوگ بولتے ہیں جبکہ میمنی یا گجراتی، گجرات کاٹھیاواڑ سے آنے والے لوگوں کی بولی ہے۔(3)

وچولی یا وسطی سندھ کو بولی کا مرکزی اور معیاری سندھی کا درجہ حاصل ہے جس میں سندھی کا بڑا ادب تخلیق ہوا ہے۔

سندھ کی مزاحمت کا لوک بیانیہ:

سندھ صدیوں سے جس کی پیشانی لہولہان تھی اور لب نوحہ کناں۔ جسم زخموں سے چور تھا اور روح بیرونی تلواروں سے گھائل، جس کا دراوڑ لہو باہر سے آنے والے لٹیروں کے خلاف ابل ابل پڑتا تھا اور قاتلوں کے راستے میں دیوار بن جاتا تھا۔ سندھو ندی سے جس کی گہری سانجھ تھی۔ کل جس کا نام شاہ بھٹائی تھا آج جسے شیخ ایاز کہتے ہیں۔ کل جو دولھ دریا خان، دودا سومرا اور جام تماچی کے روپ میں جلوہ گر تھا۔ آج مائی بختاور اور بلو شہید کی صورت میں زندہ ہے۔

اس لہو نے کبھی ہار نہ مانی، کبھی سر نہ جھکایا، آریاؤں کے گھوڑے پوری وحشت کے ساتھ اس خطے کو روندتے چلے گئے۔ پھر ہنستے مسکراتے شہر مردوں کی ڈھیریوں (منجو دڑو) میں بدل گئے۔

موہنجو دڑو۔۔۔۔امن و امان اور سلامتی کا شہر۔۔۔۔تہذیب اور شائستگی کا گہوارہ۔۔۔۔حملہ آروں نے چند دنوں میں جسے روند ڈالا۔ آنے والوں کے ہل کی نوک تیز اور تیکھی تھی اور وہ زمین میں زیادہ گہری دھنس جاتی تھی۔ وہ گلہ بان تھے۔ وہ امن اور تہذیب سے نا آشنا تھے وہ تازہ دم تھے اور امن و شائستگی کے جامد فلسفے سے عاری، لیکن وادی سندھ کے باشندے پکے مکان بنا کر رہتے تھے۔ ان کی گلیاں کشادہ تھیں۔ ان کے یہاں کنوئیں اور حمام تھے۔ پارک اور سیر گاہیں تھیں۔ غلے کے گودام اور چراگاہیں تھیں۔ وہ چارپائیاں اور کرسیاں بناتے تھے۔ کمروں کو سلیقہ سے سجانا دراوڑ عورتوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ مرد شطرنج سے ملتے جلتے ایک کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے اور بیلوں کی لڑائیاں دیکھتے تھے۔ موجودہ سندھ اور پنجاب میں استعمال ہونے والی گاڑیاں اسی دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

وہ بھی ہل چلاتے تھے لیکن ان کے ہل کی نوک زمین میں زیادہ دھنستی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی تباہی میں سندھی ندی کی برہمی کے ساتھ ساتھ ان کے آلاتِ پیداوار کی فرسودگی بھی تھی۔ ارتقاء کی بازی ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور آریاؤں نے ذات پات کے نظام سے ان کی نا آشنائی اور ذاتی ملکیت کے تصور سے ان کی دوری کے ابتدائی اشتراکی سماج کو روند ڈالا۔ ان کا جمہوری طریق سیاست اور مادری نظام اب مزید آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔

تاہم ژوب کی وادی سے نکل کر منجو دڑو سے ہوتی ہوئی ہڑپہ تک پھیلی ہوئی یہ تہذیب بابل اور نیل کی تہذیب سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ اس دھرتی کے باشندوں نے سمیریوں کے ساتھ معاشی اور معاشرتی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ بیرون ملک تجارت عام تھی۔ اہل سندھ جو کپڑا مغربی ایشیاء اور مصر وغیرہ کو بھیجتے تھے۔ ان ملکوں کی زبان میں اس کپڑے کے لیے سندھو کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ عورتیں اور مرد یکساں طور پر خوش نما لباس اور زیورات کے دلدادہ تھے۔ ان کے پاس اپنی زبان تھی۔ اپنے دیوتا تھے وہ جس دیوی کی پوجا کرتے تھے اسے ماں کہتے تھے۔ ان کے پاس گھروں میں استعمال کے لئے طرح طرح کے برتن تھے۔ پتھر کی چکیاں تھی ماپ تول کے لئے ترازو اور پیمانے تھے۔ وہ لوگ ہتھیاروں کے استعمال سے واقف تھے۔ دراوڑ گبھرو جس کلہاڑی سے کاٹتے تھے، وہ آریاؤں کی

آمد سے دفاع کے لئے استعمال ہونے لگی۔ جس اوزار سے دراوڑ دوشیزہ فصل کاٹتی تھی اور جانوروں کو ہلاک کرتی تھی، وہ انسانی گردنوں پر آزمایا جانے لگا تھا لیکن اب ان کے ہتھیار کند ہو چکے تھے اور معاشرہ جدید آلات و پیداوار کا متقاضی تھا۔

اور جب زخموں سے چور کراہتی دھرتی سپت سندھ کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تو ایک نئی صبح طلوع ہو چکی تھی۔

دریا پر کشتی بانی کرتے ہوئے وادی سندھ کے لوگوں نے رگ وید کی تخلیق کی۔ ایک طرف نئے آبادکاروں اور پرانے باشندوں کے درمیان جھڑپیں اور لڑائیاں جاری تھیں اور دوسری طرف وادی سندھ کے نئے باشندے اپنی تقدیر اس دھرتی سے وابستہ کر رہے تھے۔ قدیم تہذیبی اقدار آہستہ آہستہ حملہ آوروں کے گرد ایک غیر محسوس حصار بناتی چلی جارہی تھیں۔ آریاؤں نے دراوڑوں کے دیوتاؤں کو اپنایا۔ شیو جی اور پاربتی آبادکاروں کے مذہب میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے جو زبان لکھی اس میں مقامی زبان کے الفاظ کی کثرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے رگ وید کے ساتھ اپنی زندگی اور موت کی سانجھ پیدا کر لی،۔ جو اس زمین کے نہ بن سکے وہ آگے میدانی علاقوں کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

فاتح قوم کے شاعروں نے جب رگ وید کے منتر تخلیق کئے تو ان کے دلوں میں سندھ کی دھرتی کے لئے فخر کے جذبات موجزن تھے۔ رگ وید کے ایک منتر میں ایک آریائی شاعر نے کہا:

''اے سندھو! سورج کی رہائش گاہ کی دھرتی پر تین جانب سے سات ندیوں کا پانی بہتا ہے۔ اس لئے تیرا پانی دوسری ندیوں سے زیادہ ہے۔''

''اے ورونا! تو سپہ سالار کی مانند ہے تیری شاخیں تیری فوجیں ہیں، تو اس دھرتی پر رہبر کی صورت میں سب سے آگے ہے۔''

''تیری آواز آسمان تک پہنچتی ہے۔ جب بادل گرجتے ہیں، تب سندھو ''ندی'' بیل کی طرح غراتی ہوئی بہتی ہے۔''

''اے سندھو! دیگر ندیاں گائے کی طرح دودھ دینے کے لئے تیری طرف دوڑتی ہیں، جیسے اپنے بچھڑوں کو دودھ پلانے کے لئے دوڑ رہی ہوں۔''

''ان ندیوں کی دونوں جانب سے تو رہنمائی کرتی ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ جنگ کے میدان میں سپہ سالار کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔''

''دھیان دو اور تسلیم کرو میری تعریف اے گنگا! اے یمونا! (جمنا) سرسوتی، ستادو (ستلج) پروشنی (راوی) اسکنی (چناب) وتستا (جہلم) ارگیکیا (بیاس) سوشوما (سندھو) کی طرف دھیان دو۔ (سات دریاؤں کی عظمت تسلیم کرو،

اے گنگا اے جمنا!!

''اے سندھو! پہلے تو ریش تاما سے ملتی ہے۔ پھر سرسوتی اور رسا سے اور سویتی سے، پھر اے سندھو! کبھا کابل سے گومتی (گومل) سے اور کرومو (کرم) سے مل کر نکلتی ہے۔''

''چمکتے پانی سے صاف اور شفاف، چھلکتی ہوئی تو میدان کی طرف جاتی ہے۔ خاموش نہ رہ سکنے والی سندھوندی! تو ایسی تیزی سے بہتی ہے جیسے آنکھ کسی خوبصورت گھوڑی کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔

گھوڑوں اور رتھوں اور سونے کے ہاروں کے مال غنیمت سے، پشم سے تنکوں اور پتوں سے نوخیز سندھو پھولوں کے لباس پہنتی ہے۔''

''سندھو کی رتھ کو گھوڑے فاتحانہ انداز اور طاقت سے کھینچتے ہیں، تو ہمارے لئے انعام لاتی ہے''۔

ان گیتوں میں نئے آباد کاروں نے جس انداز سے سندھوندی، اس کے دوسرے دریاؤں گھوڑوں اور رتھوں، میدانوں اور زیورات کے گن گائے ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنے والوں نے اپنی تقدیر کس حد تک اس دھرتی سے وابستہ کرلی تھی۔ سات دریاؤں کا یہ دیس صدیوں تک امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ لیکن ایک ایسا وقت آیا جب یہ دھرتی بیرونی حملوں کے طویل سلسلے کی آماجگاہ بن گئی۔ ایران، عراق، شام کے بعد یونان کا نوجوان سکندر مقدونی تمام دنیا کو تہذیب سکھانے نکلا اور دارا نے ایران کے دیس میں بہنوں، بیٹیوں اور محبوباؤں کی چنریاں تار تار کرتا پنجاب اور سندھ پر چڑھ دوڑا۔ سب سے پہلے اسے گجرات اور جہلم کے عظیم راجا پورس نے روکا۔ پھر راوی کے کناروں پر آباد جانگلیوں نے اس کے آگے سر جھکانے سے انکار کردیا۔ بعد ازاں ملتان کے کاٹھیا اور ملی قبیلوں نے حملہ آوروں سے اتنی خوفناک ٹکر لی کہ سکندر اپنے زخم چھپاتا ہوا آگے بڑھا۔ رہی سہی کسر سندھ نے پوری کردی۔ دو سندھی سادھوؤں کو لے کر سکندر جب واپس جارہا تھا تو اس نے راستے میں کرشن کے فلسفے کے بارے میں سوالات کئے۔

''کرشن کا فلسفہ یہ ہے کہ جب چیونٹی اپنے بل میں ہوتی ہے وہ سکندر جتنی عظیم ہوتی ہے۔''، ایک سادھو نے جواب دیا ''اور جب وہ اپنے بل سے باہر نکل آتی ہے تو سکندر سے بھی عظیم ہوتی ہے۔'' دوسرا سادھو بول پڑا۔ بابل پہنچ کر سکندر مر گیا۔

پھر چندر گپت موریا پورس کی بچی کچھی پنجابی فوجوں کی مدد سے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ پھر اشوک کی موت کے بعد باختریوں نے سندھ کو روندا پھر ساکا آئے۔ برہمنی دور کے اواخر سے مسلمانوں کے حملوں کا طویل دور شروع ہوتا ہے۔ سندھ کو دلی کے ماتحت صوبہ بنادیا گیا۔ لیکن سندھ نے اسے کبھی تسلیم نہ کیا اور بغاوتیں کرتا رہا۔ تیمور کے حملے کے نتیجہ میں سندھ نے خود مختار حکومت قائم کرلی۔ جام خاندان نے 351ء سے 1521ء تک حکومت کی۔ جام نظام الدین کے جانشین فیروز نے ٹھٹھہ میں مغلوں کو آباد ہونے کا موقع دے کر دریا خان کو ناراض

کر دیا۔ مغلوں نے شاہ بیگ ارغون کو سندھ میں چڑھائی کرنے کی دعوت دے دی۔ دریا خان نے ظالم اور سفاک لٹیرے ارغونوں کے خلاف داد شجاعت دیتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا۔ ارغونوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ ملتان تک وسیع کیا۔ پھر ترخانوں نے سندھ پر قبضہ کیا اور نادر شاہ کے حملے سے کچھ پہلے تک ظلم ستم کا بازار گرم رکھا۔ تاریخ میں ارغونوں اور ترخانوں کا دور ظلم اور بربریت کا بہت بڑا دور ہے۔ ترخانوں کے بعد مغلوں نے سندھ میں چالیس صوبیدار مقرر کیے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی بربریت نے وادی سندھ کے بدنصیب خطے کو بربادی کے کنارے تک پہنچا دیا۔ کلہوڑوں کے دور میں سندھ نے جو ترقی کی تھی وہ دو تین حملوں میں برباد کر دی گئی۔ تالپوروں کے عہد میں انگریزوں نے اپنے ظلم کا پنجہ سندھ کی چھاتی میں گاڑ دیا۔

پاری ننگر کے لوک بیانیے:

سندھ کی اس قدیم بندرگاہ کی بنیاد جو آج مکمل طور پر برباد ہو چکی ہے، پہلی صدی عیسوی میں پڑی۔ ننگر پار سے چودہ میل دور، ویرانہر کے پاس پائے جانے والے کھنڈرات ہی پاری ننگر کی بندرگاہ کی بربادی کا پتہ دیتے ہیں۔ منگھا رام اوجھا کی سندھی کتاب ''پرانو پارکر'' (پرانا پارکر) میں پاری ننگر کی منظوم روایات کا ذکر ملتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہاں پرماروں کی حکومت تھی، اگر چہ جین مت کا اثر و رسوخ بھی کافی تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں دہلی سے ہونے والے مسلمان حملہ آوروں نے پاری ننگر کو تباہ و برباد کر دیا۔ روایت کے مطابق:

''جب پارکر کے پرمار وہاں سے نکل کر گجرات کو چلے گئے تو چوڑا ذات کے دو ہزار پرماروں نے اپنے سردار ''موجوؔ'' کے ساتھ مل کر، گجرات آبسایا۔ ایک دن چوڑا ذات کا کوئی راجپوت شکار پر گیا۔ اس نے ایک تیتر پرندہ گھائل کر دیا جو اڑتے ہوئے آ کر پرمار راجپوتوں کے اوتارے میں گرا۔ چاوڑی راجپوتوں نے پرماروں سے وہ تیتر طلب کیا لیکن 'موجی' نے کہا کہ جس نے ہمارے گھر میں آ کر پناہ لی ہے اسے دشمن کے حوالے ہرگز نہ کریں گے۔ پھر بھلے وہ کوئی پرندہ ہی کیوں نہ ہو! یہ راجپوتوں کی شان کے مطابق نہیں کہ اپنی شرن (پناہ) میں آئے ہوئے کی سہائتا (مدد) نہ کریں۔ چنانچہ اگلے ہی روز چاوڑا سردار اپنی ٹولی کو لے کر جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ پرمار بھی لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ اب دونوں دھڑوں کے درمیان خون خوار مقابلہ ہوا۔ جنگ میں پانچ سو چاوڑے مارے گئے اور بقیہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیت پرماروں کی ہوئی۔ اسے واقعے کے باعث یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ ''چاہے پربت پھٹ پڑے، قطب ستارہ (جو محور کے شمالی سرے پر ہے) اپنی جگہ چھوڑ جائے گرنار قلعہ زمین بوس ہو جائے لیکن پرمار راجپوت اپنے دشمن کو کبھی پیٹھ نہ دیں گے۔ (4)

سڈونت۔ سارنگا لوک بیانیہ:

پہلی صدی عیسوی میں پاری ننگر پر سالیواھن نامی ایک بہت رعیت پرور مہربان راجہ، راج کرتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا۔ جس نام ''سڈونت'' تھا۔ اس وقت پاری ننگر میں اوسواڑ قوم والوں کی اکثریت تھی۔ جو بہت دولت مند

تھے۔ انہی میں سیٹھ پرم شاہ نامی ایک ارب پتی اوسواڑ، بھی رہتا تھا۔ جس کی ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام ''سارنگا'' تھا سارنگا، سارے پارکر میں تعریف وتوصیف کے ساتھ مشہور تھی۔ اس کی گول، حسین کاجل سے بھری آنکھیں گویا قہر تھیں۔ اس کا حسین ونازک جسم، مخمل سے بڑھ کر نرم وملائم تھا۔ سارنگا جب جوان ہوگئی تو اس کے حسن کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ ایک دن جب یہ سندری پاٹھ شالا میں پڑھنے جارہی تھی کہ تبھی ''سڈونت'' سامنے آ گیا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور آنکھوں کے تیروں نے دونوں ہی کو بے بس کرڈالا:

نینوں سے ملے نیناں، رس نینوں نے ٹپکایا

اور نینوں کے بانوں نے، پریت ڈور میں پرویا

آخر سارنگا کو سڈونت سے اتنی انسیت ہوگئی کہ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر گھڑی بھر رہنا بھی دوبھر ہوگیا۔ چنانچہ سارنگا جس پاٹھ شالا میں پڑھتی تھی اسی پاٹھ شالا میں سڈونت بھی آکر پڑھنے لگا۔ استاد کا ایک باغ تھا۔ شاگرد باری باری اس میں پانی دیا کرتے تھے۔ سڈونت اور سارنگا بھی پانی دینے کے بہانے باغ میں برہ کی باتیں کیا کرتے۔

جب سارنگا نے سولہویں سال میں قدم رکھا تو اس کے والدین نے اُجین نگری کے ایک مشہور ساہوکار سے اس کی شادی طے کردی لیکن سڈونت کی تمنا کا تیر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ ساہوکار جب بارات لے کر بیاہنے آیا تو سارنگا نے کسی ترکیب سے، چونری کے چار پھیرے ایک داسی سے دلوادئے، اس لئے کہ سڈونت کے سوا، اسے کسی کی محبت بھی قبول نہ تھی۔

پھر بارات روانہ ہونے سے پہلے پاری نگر کی پدمنی سارنگا نے اپنے محبوب کو پیغام بھجوایا کہ: ''وہ گاؤں کے گوندری والے دیوی کے مندر میں'' رات کو آکر اس سے ملاقات کرے''۔ سارنگا کو اسی مندر میں پوجا پاٹ کرنے کے بعد، بارات کے ساتھ روانہ ہونا تھا۔ سارنگا کا سندیسہ پاکر، سڈونت سورج غروب ہوتے ہی آکر دیوی کے مندر میں بیٹھ گیا۔ آدھی رات گزرگئی۔ تارے ڈوب گئے۔ پر محبوب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ سڈونت کے لئے انتظار کی گھڑیاں طویل ہوگئیں۔ رہ رہ کے وہ بار بار مندر کے دروازے کی طرف دیکھتا تھا۔ پر پجارن کا کوئی پتہ نہ ملا۔ ہجر کی تکلیف دہ اور دردناک حالت میں بے قراری جو بڑھی تو بھول سے اس نے نیند کی گولی کھائی اور بیٹھ رہا۔ وہ سمجھ یہ رہا تھا کہ بیدار رہنے والی گولی کھا رہا ہے لیکن محبوب کے خیال میں کھوئے ہوئے اسے پتہ ہی نہ چلا، اور نیند لانے والی گولی کھا کر سندرا دیوی کی گود میں مدہوش ہوکر سورہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سارنگا بھی چھم چھم کرتی آ پہنچی، اس نے اپنے محبوب کو بہتیرا ہی الٹ پلٹ کر اٹھانے کی کوشش کی مگر سڈونت کو تو ہوش ہی کہاں؟ آخر وقت پورا ہوگیا اور سارنگا اپنے محبوب کے ہاتھ پر شعر لکھ کر بارات کے ساتھ روانہ ہوگئی:

صبح کو جب سڈونت جاگا تو اسے بہت ہی افسوس ہوا۔ پھر اپنے ہاتھوں پر سارنگا سے ملنے کا پتہ نشان لکھا دیکھا۔

جوگیوں کا بھیس بھرا اور گھوڑے پر بیٹھ کر چل دیا۔

تن پہ مَلا بھبھوت اور لیا ہاتھ میں کشکول
سارنگا تیرے کارن بنا فقیر دلگیر

قصے کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاری نگر کی پدمنی، اُجین کی طرف جاتے ہوئے، پار کر کے آنے جانے والوں کو سدّ ونت کی نشانیاں دیتی گئی۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے دیکھا تو ایک ریباری بھینس کا دودھ دوہنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے جیسے ہی سارنگا کا حسین چہرہ دیکھا تو بیچارے کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ سارنگا کو دیکھا تو کہا:

(اے پار کر کے ریباری! تو یوں آنکھیں پھاڑ کر مجھے نہ دیکھ، دیکھ تو سہی، تو نے دودھ اُوندھا (گرا) دیا ہے۔ مہربانی کر کے، سدّ ونت آئے تو اس سے کہنا، سارنگا روتی ہوئی جا رہی ہے)

سارنگا کی بارات نے بالآخر ببول کے ایک بڑے درخت تلے پڑاؤ کیا۔ سدّ ونت، جو پیچھے پیچھے ہی لگا چلا آ رہا تھا، موقع پا کر اس درخت پر چڑھ گیا اور چھپ کر بیٹھ رہا۔ آدھی رات کو سدّ ونت کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا اور سارنگا پر گرا۔ سارنگا تبھی بول اٹھی کہ:

آم جیسی املی، توڑے نوسر ہار
رس وس تو سب چکھ چکا، اب کیوں رووے گنوار!

(اے آم کے درخت! تو کیوں رس ٹپکا کر میرے نوسر ہار کو بھگوئے دے رہا ہے، تو پہلے ہی بہت چکھے ہوئے ہے۔ او مورکھ! اب اس سے کیوں رو رہا ہے؟)

روپا شاسیٹھ کے بھائی، سارنگا کے دیور نے یہ دوھا سن لیا، چنانچہ صبح ہوتے ہی اس نے بھائی سے کہا:

(ارے بھیا! بھابی کے پہنے ہوئے کپڑے اور ریشمی چولا، سارے کا سارا مسک گیا ہے۔ ٹانکے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ بھابی خیریت سے نہیں ہے۔)

اس پر سارنگا کہنے لگی:

بودا کپڑا، اڑا رنگ، سینے والا بھی اڈھنگ، تڑ تڑ ٹانکے ٹوٹ گئے کروٹ لے انگ انگ!

(میرے پہنے ہوئے کپڑے ایک تو بہت دنوں کے پرانے ہیں اور دوسرے انہیں سینے والا درزی بھی بہت بے ڈھنگا ہے۔ کروٹ لیتے ہوئے ٹانکے ٹوٹتے گئے، اسی لئے کپڑوں میں یہ مسک جانے کے نشانات ہیں)

یوں ہی چلتے چلتے کچھ دن کے بعد یہ بارات اُجین پہنچی۔ سدّ ونت بھی پیدل چلتا پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر محبوب کے لکھے شعر تھے۔ اس لئے جس تلاؤ پر بھی پہنچتا۔ جانوروں کی طرح منہ پانی میں ڈال کر پانی پیتا، بالآخر سدّ ونت بھی اُجین آ پہنچا۔ جوگی کا بھیس بدلے، سارنگا کے سسرال کا پتہ نشان پوچھتا، جا کر اس کے دروازے پر صدا لگائی۔ سارنگا نے سونے کی تھال میں موتی بھرے اور جوگی کو دان کرنے آئی۔ دونوں کی نظریں ملیں

،ایک ہوئیں، تھال سارنگا کے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اور کوے آ کر موتی چگنے لے۔ اُجین نگری کا راجا یہ تمام منظر اپنے اونچے محل میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی رانی سے کہا:

اس نگری میں مورکھ بسیں چتر بسے نہ کوئی

کاگا موتی چگ گیا، کوک کرے نہ کوئی

رانی نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ:

اس نگری میں چتر بسے ، مورکھ بسے نہ کوئی،

بالا پن کی پریت ہے، میت ملاپ ہے ہوئے

دونوں محبت کرنے والوں کا وہیں دم آخر ہو گیا اور یہ پریمی جوڑا، آپس میں مل کر، ہمیشہ کے لئے ایک ہو رہا، دوسری رُوایت یہ ہے کہ سارنگا راجپوتانہ کی باشندہ تھی اور سڈونت خود بھی وہیں کا باشندہ تھا۔ سارنگا پاری ننگر میں روپا شاہ نامی سیٹھ سے بیاہی ہوئی تھی۔ یہ روپ متی حسینہ، راجپوتانہ سے روانہ ہوتے ہوئے ،اپنے محبوب سڈونت کو حسب ذیل سندیسہ دیتی ہے۔

پاری ننگر ، راہیں لمبی ، محبوباں کا دیس

جلدی آنا بالما ، بھر جوگی کا بھیس (5)

سندھی رزم نامے۔آغاز وارتقا:

سندھ میں اولین رزم ناموں کے آثار نویں صدی عیسوی میں ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں کی آمد سے قبل ہی گا تھا شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ سندھ اور راجستھان میں جنگی داستانیں عربوں کی ابتدائی فتوحات کے زمانے میں رائج تھیں۔ ان کے آثار بنوامیہ کے اقتدار کے خاتمے اور عباسی خاندان کے آغاز یعنی 750 عیسوی سے ملتے ہیں۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے دور میں سندھ کے گورنر موسیٰ بن یحیٰی نے 833-813 عیسوی کے دوران جب راجستھان پر حملہ کیا اور چتوڑ کے حکمران کھمان رائے کو قتل کر دیا تو اس علاقے کے ایک چارن (بھاٹ) دیش وجید نے ''کھمان راسو'' کے عنوان سے ایک رزم نامہ لکھا اور اس جنگ کا احوال بیان کیا۔ اس واقعہ کی تصدیق ٹاڈ، راجستھان کے بارے میں اپنی مشہور کتاب میں کرتا ہے۔ سندھی کے معروف عالم پروفیسر محرم خان کے بقول ''اس قسم کے رجز یہ داستان جنہیں ''تھر'' اور 'راجپوتانا'' میں راسو (رزم نامہ) کہا جاتا ہے، سلطان محمود غزنوی اور محمد شہاب الدین غوری کی فتوحات سے لے کر علاؤالدین خلجی کے حملوں تک کافی تعداد میں ملتی ہیں۔(6)

ان ابتدائی داستانوں کو اگر چہ من وعن تاریخ تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک بات یقینی ہے کہ مبالغہ آرائی کے باوجود ان کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان داستانوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سندھی عوام نے مسلمان حملہ آوروں کا ہر بار ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

پروفیسر محرم خان کی تحقیق کے مطابق ''سلطان محمود غزنوی نے جب تھر اور ریگستان پر حملے شروع کیے تو اجمیر کے راجہ بیسل دیو (1001) عیسوی اس کے مقابلے میں آیا۔ بیسل رائے کو شکست ہوئی اور وہ میدان جنگ میں ہی مارا گیا راجستھان کے ایک مشہور بھاٹ ترپتی نلھہ نے جو اس موقع پر موجود تھے۔ ''بیسل راسو'' نظم کی اور راجپوت قبیلے میں جوانمردی کے جذبات پیدا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں تمام راجپوت راجے مہاراجے، اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کی قیادت میں متحد ہو گئے لیکن بعد میں محمد غوری نے ترائین کی لڑائی میں ان سب کو شکست دی اور پرتھوی راج کو قید کر کے قتل کروا دیا۔ چند بردائی نام کے ایک چارن نے ''پرتھوی راج راسو'' لکھ کر پرتھوی رائے کو امر کر دیا۔ اسی طرح نالہ سنگھ بھاٹ کا وجیدراسو اور رنتھمبور کے راجہ ہمیر دیو کے سوگ میں جودھ راج چارن کا '' ہمیر راسو' اس وقت کے چارنوں اور بھانڈوں نے گایا جو عوام میں بڑا مقبول ہوا، اسی راجہ ہمیر دیو کی یاد میں اور بھی ایک '' ہمیر راسو'' مشہور ہے جو سارنگ دھر بھاٹ نے نظم کیا تھا اور اس میں بھی رائے ہمیر کی شکست و موت کا ذکر ہے جو اسے علاؤالدین خلجی کے ہاتھوں کھانی پڑی تھی۔ (7)

ایک اور چارن بھاگو بھان نے دودو سومرو اور علاؤالدین خلجی کی لڑائی کا احوال لکھا اور گا کر سندھ کے کونے کونے میں دوام بخشا۔ پروفیسر محرم خان بھاگو بھان سے بھی پہلے سمنگ چارن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سندھ میں عرب دور خلافت کے آخری ایام اور سومرو دور حکومت کے اوائل میں سمنگ چارن (950-1025)ء نام کے ایک مشہور شاعر گذرے ہیں جن کا غنائیہ کلام اور رس بھرے سندھی اشعار اب تک محفوظ ہیں۔ اس کے رزمیہ گیت خاص طور پر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بھاگو بھان سے کئی صدیاں پہلے بھی سندھی شاعری میں بلند پروازی، جوش و ولولہ اور گرد و پیش کی حقیقی روح اور عکس کے اعلیٰ نمونے موجود تھے۔ ان میں گہرائی بھی تھی۔ نیز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی وہ شاہکار تھے۔ اس لئے بھاگو بھان کو صرف 'جودھراج' اور 'جگ نائک' کا شاگرد سمجھنا یا اس کی داستان کو 'راجستھان راسو' کی نقل اور چربہ کہنا نہ صرف درست نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے۔ یہ داستان بہرحال سندھی شعر کے تدریجی اور فطری ارتقا کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس داستان نے سندھ دھرتی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور صحیح معنوں میں یہ داستان سندھ کی تہذیب و تمدن کی ترجمان، سندھی جیالوں کی سرفروشی اور ننگ و ناموس پر کٹ مرنے کی کما حقہٗ آئینہ دار اور نمائندہ ہے۔''

''بھگو فقیر سات پشتوں سے سومرو خاندان کا گویا گھر جایا بھاٹ تھا۔ اسی بنا پر اس کو اس خاندان میں مشیر اور سفیر کا مرتبہ حاصل تھا۔ دستار بندی کے مسئلے پر بھی بھاگو بھان نے چنیسر کے حق میں رائے دی تھی۔

اکثر کٹھن مراحل اور مواقع پر بھاگو بھان، ہمدردی، خلوص اور نمک حلالی کی جذبے کے تحت ان کی خانہ داری اور خاندانی الجھنوں کو سلجھانے اور سنوارنے کی ذمہ داریاں بھی خود سنبھال لیتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ جب حملہ آور شہنشاہ کا لشکر سرحدوں پر پہنچ جاتا ہے تو اسے روکنے کے لئے مصلحتاً چنیسر کے بیٹے ننگر کا نام تجویز کیا جاتا ہے

لیکن یہاں ایک گھریلو مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ننگر کی والدہ جو اپنے بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے اس سے اس سلسلے میں کون جا کر بات چیت کرے۔ تو اس وقت اس کام کے لئے بھی بھا گو بھان ہی تیار ہو جاتا ہے۔!

بھا گو بھان ننگر کے محل کی طرف چل دیا اور اس کی ماں سے کہا

ننگر ہی کو جنگ پر جانا ہے۔

ننگر ہی باپ سے سمجھوتہ کر کے اسے راضی کر سکتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہوا تو کم سے کم فوری طور پر خلجی کی فوج کی پیش قدمی کو تو روک سکتا ہے۔

گھمسان کی جنگ کے دوران 'بھا گو بھان' ہی سفیر کی حیثیت سے حملہ آور کے پاس جاتا ہے۔ وہاں چنیسر بھی موجود ہے جو خلجی کی قوت اور طاقت کے گھمنڈ پر بدزبانی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ لیکن بھا گو سب سپاہیوں کے سامنے چنیسر کے منہ پر کہتا ہے کہ

اے چنیسر! تمہاری دی ہوئی مٹی بھی میرے لیے سونا ہے
ایسا تو کسی سومرو نے نہیں کیا تھا
آخر نکلے نالوہارن کے بیٹے
تمہارے سر پر دستار بجی تھی
اور تم ماں سے پوچھنے چلے تھے
میں نے تمہیں بادشاہ بنایا
اور تم نے مجھے دھتکار دیا۔

الغرض اس سارے معرکہ میں بھا گو بھان کو جو منصبی کردار سونپا گیا تھا وہ اسے پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگ کے آخری لمحات میں وہ سوسوا سو خواتین کو اپنے ساتھ لے کر راتوں رات 'ابڑہ جام' کے پاس جاتا ہے اور 'سام' کے طور پر خواتین کو ان کے حوالے کرتا ہے۔ بھاگ فقیر کی نمک حلالی کا یہ مشہور تاریخی کارنامہ ہے۔ اس قسم کے تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے، کہ بھاگ فقیر شروع سے لے کر آخر تک خود جنگ کے میدان میں موجود تھا۔ اس لئے اس کی روایت اور بیان کی بنیاد بھی چشم دید واقعات اور ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ بھا گو بھان کے اخلاف بھی اپنے آپ کو 'بھاگ فقیر' کہلواتے ہیں وہ اب تک اس ویران ریگستان 'روپاہ ماڑی' اور 'دگھ کوٹ' کے اجاڑ کھنڈرات میں اپنے بہادر اور جری مربیوں کے مزارات کے مجاور بنے بیٹھے ہیں اور اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ وفادار لوگ اب تک اپنی آبائی نمک حلالی کی روایت کو گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اگلے وقتوں کے بھٹ، ڈوم چارن، مراثی، منگتے اور مگنہار، اس قسم کے قومی کارناموں کو محفوظ کرنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے تھے۔ جس دور میں نہ تو کتاب کا رواج تھا اور نہ ہی کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں کا وجود تھا۔ اس دور میں یہ چارن ہی متحرک

کتب خانے اور چلتی پھرتی عوامی لائبریریاں سمجھی جاتی تھیں۔ یہ داستان گو تاریخ کے اہم واقعات نہ صرف عوام تک پہنچانے کے لئے جمع کرتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو زبانی یاد کراتے اور انہیں وصیت کے طور پر ورثے میں دے جاتے تھے۔ پھر یہ نئے داستان گو ان چیزوں کی مزید تراش خراش اور آرائش و زیبائش کرنے کے بعد آنے والی نسلوں تک پہنچاتے تھے۔(8)

دودو چنیسر۔۔ایک عظیم لوک بیانیہ:

بھاگو بھان کی بیان کردہ داستان ''دودو چنیسر'' فقیر دوست علی اور ان کے ساتھیوں کی آواز میں 1974ء میں فوک لور ریسرچ سنٹر، اسلام آباد میں ریکارڈ کی گئی جسے اقبال جتوئی نے مرتب کیا۔ ممتاز سندھی شاعر امداد حسینی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ یہاں پوری داستان کو شامل کرنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ داستان کے مختلف اقتباسات سے داستان کے پیغام کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی جنگ کا قصہ ہے لیکن اپنے جوہر میں حب الوطنی کی کہانی ہے۔ بیرونی حملہ آور کے خلاف ڈٹ جانے کا رزمیہ ہے۔

سومرہ قبیلے کے دو بھائی، دودا اور چنیسر ہیں۔ بڑا چنیسر، چھوٹا دودا، ان بھائیوں کے درمیان دادا کی چھوڑی ہوئی دستار رکھی ہے۔ دادا کا تخت غیر آباد ہے، اسے آباد کرنا چاہئے۔ کس کو شہنشاہ بنانا چاہئے۔ دودا اپنے قبیلے کے لوگوں کو بلا کر یہ کوشش کرتے ہیں فقیر، اس بیت کو یوں سناتا ہے:

دو تین دن گزر گئے
بھونگر راؤ کو سوتے (مرے ہوئے)
دستار کے مسئلے کو لوگوں نے آن لیا (سلجھانا چاہا)
(یعنی اب راجا کون بنے؟)
دودل راؤ نے چاروں طرف نامے بھیجے (پیغام بھجوائے)
کچھ کچھ، بھیج (اور) کاچھے کی طرف

سردار مل بیٹھے (اور انہوں نے) کیا مشورہ کیا؟ دودا (ہماری) دادی پوتی سے ہے۔ چنیسر کی ماں لوہارن ہے۔ دستار دودل راؤ کو دی جائے، جو اس کا مستحق ہے اور جس کے سر پر سج سکتی ہے جبھی تو سالک نے کہا ہے:

اے غازی، ہمیشہ اصیل کے ساتھ رہو
جو لوہے کے تار کی طرح تپ جاتا ہے
لیکن عیب نہیں نکالتا
جو اصیل اور شریف ہیں
ہمیشہ انہی کے ساتھ رہو۔

دودا کے جسم اور روح کی ایک ایک تار، ایک ایک رگ ریشم کی ہے، دستار کا مستحق وہی ہے۔ کچہری میں (یہ) صلاح مشورے ہوئے، چنیسر نے سنا اور اس نے دل میں خیال کیا۔

''میں بڑا ہوں اور دستار کا مالک دودا بنتا ہے (میرے دل میں) ایک کانٹا سا چبھتا ہے۔ (میں) چلا جاؤں کہیں، دودا دستار باندھ لے، سارے سردار چلے جائیں (تو) پھر لوٹ آؤں گا''

وہ شکار کا بہانہ کر کے بکار کے جنگل کی طرف چلا گیا ہے۔ دودے کو خادموں نے بتایا کہ چنیسر ناراض ہو کر گھوڑے پر چڑھ کر بکار کے جنگل کی طرف چلے گئے ہیں۔ دودے نے دل میں خیال کیا۔

''پانی کے ہوتے تیمّم روا نہیں۔ بڑا بیٹھا ہے اور سردار مجھے دستار کا مالک بنا رہے ہیں اور اب میں سب سرداروں کی موجودگی میں چنیسر کے سر پر یہ دستار رکھوں تا کہ سب سردار دیکھ لیں۔''

دودل راؤ نے چنیسر کو خط لکھا

آؤ اور یہ دستار، یہ راج پاٹ سنبھالو

پلنگ پر پیر پھیلاؤ اور تخت پر بیٹھو

یہ دستار تمہارے سر پر اچھی لگتی ہے

آؤ ہم بھائی بھائی صلح کر لیں

ہمیں سرداروں سے کیا غرض؟

چنیسر نے خط کھول کر پڑھا اور دودا کو دعا دی:

(اور پھر) گھوڑے پر سوار ہو کر چنیسر بادشاہی دربار میں پہنچتا ہے۔ لیکن وہاں دربار میں گھوڑے کی باگ پکڑنے کے لئے کوئی نوکر نہیں اُٹھا۔ کیوں کہ لوگ چنیسر سے خوش نہیں تھے۔ دودے نے دیکھا سارے سردار ناراض ہو رہے ہیں، ان کے تیور بدل رہے ہیں۔ تب وہ گھوڑے کی باگ پکڑنے کے لئے اٹھا۔ ''آخر بڑا ہے اس کی عزت کرنا چاہئے۔''

سرداروں نے سوچا ''بھائیوں کی صلح ہو گئی اور ہم مفت میں خوار ہوئے۔''

چنیسر آتے ہیں (دربار میں) دودا ایک فقیر کو روانہ کرتے ہیں کہ (جا کر) دستار لے آؤ تا کہ چنیسر کے سر پر رکھی جائے۔ دستار بندی کی خوشی میں ساز بجتے ہیں۔

دودے نے دستار کی چنٹیں اپنے ہاتھ میں لیں اور کہنے لگا۔ ''بسم اللہ، دستار باندھو۔ یہ دستار تمہارے سر پر سجے، ہمیشہ قائم رہے اور تجھے عزت بخشے۔'' ایک دو پیچ بھی دیئے لیکن چنیسر کے من میں ابلیس نے یہ پھونکا۔ کیا پھونکا؟

''راج پاٹ، دیس پردیس، امیر وزیر سب کہتے ہیں کہ دودا، دستار باندھے۔ دودا کہتا ہے کہ چنیسر دستار

باندھے۔ اب کسی ہمدرد سے پوچھوں کہ دستار باندھوں یا نہ باندھوں۔''

اپنے من کو ٹٹولا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''آخر میری پیاری ماں ہے جس نے مجھے جنم دیا ہے اور (خوشی کا) یہ دن دکھایا ہے (میں نے) ابھی تک اس سے بھی نہیں پوچھا ہے کہ دستار باندھوں یا نہ، پہلے اس سے پوچھ لوں پھر آ کر دستار باندھوں گا۔''

(پھر اس نے) سر پر رکھی ہوئی دستار اپنے ہاتھوں سے اتار دی۔

سردار کہنے لگے۔ ''دودا ہم تو پہلے ہی چیخ چلّائے تھے۔ جو ماں سے پوچھ کر تخت پر بیٹھے وہ کل کس طرح راج پاٹ سنبھالے گا اور لوگوں کی دلجوئی کر سکے گا۔ ان سے انصاف کر سکے گا۔ وہ کیسے جنگیں جیتے گا؟''

چنیسر کی ماں تھی تو لوہارن لیکن تھی بڑی عقلمند۔ (ویسے) تھے تو وہ بھی سومرے لیکن کام لوہاری کا کرتے تھے۔

چنیسر نے کہا، ''ماں دستار کا سوال ہے۔ بتاؤ کیا کروں؟ خوشیوں کے ساز اسی وقت بند ہو گئے۔ (رانی نے) کنیز کو آواز دی کہ یہ خوشیوں کے ساز کیوں بند ہو گئے؟

بگل اور طبل کیوں بند ہو گئے
عقلمند رانی نے کنیز سے کہا
اے لکھماں، کہیں ایسا تو نہیں
کہ بھائی تخت کے مسئلے پر لڑنے لگے ہیں
جاؤ، معلوم تو کر آؤ
اے چنیسر تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں
آخر نکلے نا تم ایک لوہارن کے بیٹے
بچے جب کھیلنے جاتے ہیں
تو وہ ماں سے پوچھ کر تھوڑا ہی جاتے ہیں
اور تخت پر بیٹھ کر جو خود اتر جائے
وہ کبھی بادشاہ نہیں بن سکتا
وقت ہاتھ سے نکل جائے گا
اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔

چنیسر روانہ ہوا۔ دودے نے آواز دی:

''وقت ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے

چھوٹے بچے جب کھیلنے جاتے ہیں تو ماں سے پوچھ کر تھوڑا ہی جاتے ہیں۔ تم تو شہنشاہ بن

رہے تھے۔ تخت پر بیٹھ رہے تھے۔ اے چنیسر یہ کیا کر رہے ہو!
غصہ میں لال پیلا ہو کر
چلا چنیسر راؤ
کٹاریوں برچھیوں سے مسلح ہو کر
لمبا بھالا ہاتھ میں لے کر
دونالی بندوق بغل میں دابے
ننگر جو ابھی چھوٹا ہے
جھولا جھول رہا ہے
آ کر اس کی پیشانی کو چومتا ہے
اور خون کے آنسو روتا ہے:
اے ننگر! مرے ہوؤں کو تو لوگ رو دھو کر چپ ہو جاتے ہیں
لیکن زندوں سے بچھڑنا عذاب ہے
اگر پھر کبھی دگھہ کو لوٹنا ہوا بھی، تو
وہ تمہارے لئے ہوگا۔

دگھہ کوٹ میں کسی کو الوداع نہیں کہا، سوائے اپنے بیٹے ننگر کے، جس کو پیدا ہوئے تیرہ دن ہوئے تھے۔
اور ہاں دوسری جگہ کیا کیا ہو رہا ہے؟ شراب کے دور چل رہے ہیں،
ہر کوئی مٹکوں سے بھر کر دودے کو پلائے جا رہا ہے۔ اپنے طور پر دودے کو نشے میں مخمور کر کے اسے دستار باندھ دی گئی ہے۔

دودے نے ایک پیچ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں ڈالا، کیونکہ اس نے پہلے ہی کہا تھا: ''پانی کے ہوتے تیمم روا نہیں، بڑے کے ہوتے ہوئے دستار میں نہیں باندھوں گا۔'' مگر برادری نے یہ کام کیا۔ اور پھر نقارہ بجا: ''دودے کو تخت و تاج مبارک ہو''
چنیسر نے سنا۔

دو بھائی تو تھے ہی، لیکن تیسری بہن بھی تھی۔ شہزادی باگھل۔ اس نے سوچا: ''سردار آئے، بھائیوں کی آپس میں نہ بن سکی۔ چنیسر روٹھ کر جا رہا ہے۔ اور دودے کو خبر بھی نہیں۔ کیوں نہ دودے کو حقیقت سے آگاہ کروں کہ چنیسر روٹھ کر جا رہا ہے۔'' باگھی روتی ہوئی بھائی سے گلے لگ گئی۔
شہزادی اپنے بھائی کو احوال پیش کرتی ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

دودا! پلنگ پر پاؤں لمبے کر کے
تم کس لئے سوئے ہوئے ہو
تیرا بھائی جا رہا ہے
اور تمہیں معلوم ہی نہیں
سندھ کو ویران کر کے
رانیوں کا راؤ سومرا سردار جا رہا ہے!

شہزادی باگھی بپھری ہوئی شیرنی بن گئی اے دودا پہلوان! دستار باندھ کر تخت پر آرم کر رہے ہو۔
اب روٹھے ہوئے چنیسر نے کہاں پڑاؤ ڈالا؟ سب سے پہلے لکھی باغ ہے، جہاں وہ آ کر ٹھہرا ہے۔ تلوار کے دستے پر سر ٹکا دیا ہے۔ گھوڑا قاعدہ میں کھڑا ہے۔ اس کے اندر مہران کی موج ابھر آئی ہے کہ یہ کیا ہوا!
دودا جاگا تو سر پر دستار بجی دیکھی: ''ایسا کس نے کیا!'' خدا خیر کرے! دستار کا بوجھ سر پر ڈال دیا گیا۔ سامنے سرداروں کو دیکھ کر آواز دی۔

کوئی ہے جو جائے
میرے بھائی کو واپس لائے
ہر جھولی میں سونا بھر دوں گا
سارے دکھ درد دور کر دوں گا
یہ راج پاٹ اور جاگیریں
چنیسر خان آئے اور لے جائے

سب چپ چاپ کھڑے رہے۔ ایک شخص جس کا نام حیدر ہے اور اس کے سات بیٹے ہیں، ان کا خدا سے یہی سوال تھا کہ رب العالمین! دودا اور چنیسر شکار کھیلیں یا کشتی لڑیں اور ایک دوسرے کو مار ڈالیں یا ایک دوسرے سے دستار چھین لیں۔ اس دن رب العالمین نے ان کا سوال سن لیا تھا، وہ تن کر کھڑے ہو گئے اور یوں مخاطب ہوئے:
''دودا سردار! ہمیں اجازت ہو، تو ہم اسے لے آئیں' ہاں بھائیو تمہیں اجازت ہے''۔ ''پر ایک عرض ہے'' ''کہو!''
''اگر مہر و محبت سے پیش نہ آئے تو ہم اسے زبردستی لے آئیں؟'' ''جیسے بھی بن پڑے اسے واپس لے آ'' اجازت لے کر وہ روانہ ہوتے ہیں

سب نے اپنے تازے گھوڑے کھولے
سرکش گھوڑے دوڑ پڑے
دربانوں سے پوچھا

چنیسر راؤ کہاں ہے

وہ ہے چنیسر سومرا

۔۔دودے کا بھائی

ہاتھ جوڑے

''تمہیں محمد (ﷺ) کا واسطہ ہے

''ہمیں خالی ہاتھ مت لوٹانا

''بھائیوں کے آنے سے، جو

سب کچھ بھول جاتا ہے

وہ ہارتا نہیں ہے''

سب کچھ سن کر چنیسر نے کہا: تمہاری باتوں سے میرا دل جو پہلے اَڑ دل تھا اب موم اور مکھن سے بھی زیادہ نرم ہے۔ لیکن اگر مجھے لے جانا ہے تو یہ تو طاقت ہی کرے گی۔ زور آزمائی کے بغیر میرا ایک قدم بھی نہیں اٹھے گا۔ اندھا چاہے دو آنکھیں۔ ادھر غیر مسلح ایک چنیسر، ادھر نیام سے نکلی ہوئی سات تلواریں۔

دربان نے دودے سے کہا: اے سردار! ساتوں پہلوان، چنیسر نے مار ڈالے، یہ بات سن کر دودے نے سوچا: ''میرے باپ کا بیٹا ہے۔ بڑا بھائی ہے، میرے جانے سے ممکن ہے مان جائے اور لوٹ آئے۔''

دودا آتا ہے، فقیر بیت سناتا ہے:

دودے نے ہاتھ جوڑے (اور کہا)

اللہ کا نام لے کر آیا ہوں

تمہیں محمد مصطفیٰ (ﷺ) کا واسطہ

مجھے خالی ہاتھ مت لوٹانا

خدا ہی بہت جانتا ہے

کہ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں

میں اپنی بیٹی ''سونی'' تمہاری جھولی میں ڈالتا ہوں

لیکن چنیسر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے تو من میں کچھ اور ٹھانی تھی۔

''دو قدم چلا ہوں تو اپنی ایک بیٹی دے رہے ہو۔ کچھ اور آگے جاؤں گا تو دوسری بھی دو گے۔ اب اٹھا ہوا قدم نہیں رک سکتا۔

علاؤالدین کے ہاتھوں تمہاری رانی کو تمہارے پہلو سے نہ اٹھاؤں تو چنیسر میرا نام نہیں۔''

دودا پہلوان، جو چنیسر کو منانے کے سوسو جتن کر رہا تھا۔ جب چنیسر کی یہ باتیں سنتا ہے تو اس کے اندر سے آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے:

(دودا کہتا ہے) آخر نکلے نہ تم ایک لوہارن کے بیٹے
میری آنکھو سے دور ہو جاؤ
نہیں تو سر تن سے جدا کر دوں گا
لے آؤ اپنے پٹھان باپ کو
اپنی لوہارن ماں کے پہلو میں سلانے کے لئے

چنیسر روانہ ہو گیا۔ سات راتیں اور سات دن گزر گئے پر سفر ختم نہ ہوا۔ چنیسر نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ایک چوراہے پر آ کر رک گیا۔ چوں کہ چنیسر کو دہلی کا راستہ معلوم نہیں تھا، اس لئے وہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ دور سے کچھ لوگ دکھائی دیئے۔ کچھ آس بندھی۔ وہ لوگ علاؤالدین کے امراء میں سے تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے آرہے تھے:

''راستے تو سب دہلی کو جاتے ہیں۔ لیکن جس راستے سے دہلی قریب پڑتی ہے۔ اس پر ایک آدم خور ہے۔'' پھر ان کے گھوڑے رک گئے۔ چنیسر کو دیکھ کر ایک نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''جس آدم خور کا ذکر ہو رہا تھا۔ کہیں یہی تو نہیں؟''

دشوار گذار سفر طے کرتا ہوا چنیسر ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں علاؤالدین کے اونٹوں کا گلہ چر رہا ہے۔ چرواہا چنیسر کو اونٹوں کے قریب آنے سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ ان اونٹوں میں ایک بدمست اونٹ بھی ہے۔ لیکن چنیسر نہیں مانتا۔ اونٹ ایک اجنبی انسان کی بو پا کر مقابلے کو اتر آتا ہے۔ چنیسر نے لوہڑل کی جو دس سیر وزنی چھڑی کاٹی تھی۔ اب اس کے آزمانے کا وقت آ گیا تھا۔ اونٹ کا وار، خطا جاتا ہے اور چنیسر موقع پا کر لوہڑل کی دس سیر وزنی چھڑی اونٹ کے کوہان پر دے مارتا ہے جیسے کچے دھاگے پر تلوار کی دھار پڑے، اونٹ کا سر دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر جا پڑتا ہے۔

(اب) چنیسر آگے کو روانہ ہوا۔ دور سے دہلی شہر کی فصیل سے بلند و بالا عمارات سر اٹھائے کھڑی نظر آئیں۔

قلعہ کے برج نظر آ رہے تھے
اور فصیلِ شہر کا دروازہ بھی

(مختلف ڈرامائی واقعات سے گزرنے کے بعد، چنیسر علاؤالدین خلجی کے محل کے باہر پہنچ جاتا ہے)

بادشاہ کے حکم سے چنیسر کو دربار میں پیش کیا جاتا ہے۔ چنیسر نے آتے ہی اپنی فریاد پیش کی:

''ہمارے والد وفات پا گئے۔ مرنے سے قبل انہوں نے وصیت کی تھی کہ بیٹے اس دنیا کو بقا نہیں۔ دم کا

کوئی بھروسا نہیں میرے بعد اگر رشتہ دینا ہو تو علاؤالدین کو ہی دینا۔ کیونکہ یہ ہی تمہاری شایان شان ہے۔ والد کی وفات کے بعد جب یہ بات چھڑی تو دودا ناراض ہو گیا اور مجھ سے دستار چھین لی اور آپ کا رشتہ بھی داب لیا۔''

یہ سن کر بادشاہ حکم دیتا ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

چنیسر راؤ کو پانچ ہزار کا سپاہیوں کا لشکر دیا جائے
تا کہ وہ دودے کو نیچا دکھا سکے
اور اپنی دستار واپس لے سکے۔

یہ سن کر چنیسر نے سوچا کہ ''یہ مٹھی بھر سپاہی دودل راؤ کا تو بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔'' تو اس نے کہا اور فقیر بیت سناتا ہے:

(اے بادشاہ) اپنا پانچ ہزار کا لشکر میدان میں اتار دو
خدا جانتا ہے کہ میں اکیلا ہی ان کے لئے کافی ہوں

یہ سن کر علاؤالدین نے سوچا کہ ''یہ تو اکیلا ہی پانچ ہزار کے لشکر سے مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ دودا تو شاید اس سے بھی بڑا بہادر ہے۔'' یہ سوچ کر بادشاہ نے حکم دیا کہ ''اب جو بھی اسے (چنیسر کو) اپنے پاس رکھے گا اس کی خیر نہیں''

پھر چنیسر پورے چودہ سال دہلی میں چھپا بیٹھا رہا۔

دودے کو جب معلوم ہوا کہ چنیسر بادشاہ کے آگے فریاد گذار ہوا، لیکن اس کی سنی ان سنی کر دی گئی۔ تو اس نے چنیسر کو ایک خط لکھا۔

دودے نے کاغذ میں انگارے رکھ دیئے تھے۔ لکھا تھا: ''چنیسر! تم نے بادشاہ سے فریاد کی، لیکن تمہیں داد نہ ملی، یہ خچر خزانہ سے بھر کر بھیج رہا ہوں وہ دے کر علاؤالدین کو لے آؤ کیونکہ میدان جنگ ہی مردانگی کی کسوٹی ہے۔

چنیسر نے جو یہ پڑھا تو جل بھن کر راکھ ہو گیا۔ نامدار بیگ نے چنیسر کی یہ حالت دیکھی تو پوچھا:

''خیر تو ہے؟ کہیں بچھڑے ہوئے عزیز تو یاد نہیں آ گئے''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' چنیسر نے یہ کہہ کر خط نامدار بیگ کے حوالے کیا۔: ''اب یا میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا یا اکیلے ہی میدان جنگ میں مقابلے کے لئے جاؤں گا۔'' پھر دونوں آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ دونوں اس بات پر متفق ہوتے ہیں کہ کہیں سے شیر لائے جائیں۔ اور پھر چنیسر اس چشمے کی جانب چل دیتا ہے جہاں سے شیر پانی پینے آتے ہیں۔ چنیسر کسی صورت وہاں سے ایک شیر اور ایک شیرنی لے آتا ہے۔ اور علاؤالدین کے باغ میں چھوڑ دیتا ہے۔ شیروں کے خوف سے وہاں کوئی نہیں جاتا۔ دربان نامدار بیگ کے ہاں جاتا ہے۔ وہ اسے چنیسر کے پاس بھیج دیتا ہے۔ چنیسر نے دربان کی بات سن کر کہا۔ ''یہ تو آسان بات ہے۔ باغ کے چشمہ کو شراب

سے بھر دو، شیر اسے پی کر بدمست ہو جائیں گے، اور بھاگ جائیں گے۔'' چشمہ شراب سے بھر دیا گیا۔ لیکن شیر تو پہلے ہی بدمست تھے۔ شراب پی کر اور بھی بدمست ہو گئے اور سارا باغ تباہ کر کے رکھ دیا۔

نامدار بیگ نے سارے امراء کو پہلے ہی بہکا دیا تھا کہ ''شیروں سے کوئی بھی مقابلہ نہ کرے اور بہانہ بنائے کہ ہم نے ملازمت اس شرط پر کی تھی کہ انسانوں سے لڑیں گے نہ کہ درندوں اور جانوروں سے۔

علاؤالدین کے سارے امراء اور سرداروں نے جب یہ عذر پیش کیا، تو علاؤالدین نے اپنے بیٹے کو شیروں کو مار بھگانے کو بھیجا، وہ گیا لیکن شیروں کی دھاڑ سن کر ڈر کے مارے واپس لوٹ آیا۔ پھر نامدار بیگ کو بلایا گیا اور اس سے چنیسر کے لئے کہا گیا، وہ چنیسر کو اس شرط پر لے آتا ہے کہ 'علاؤالدین دودے پر لشکر کشی کرے گا۔

غیر مسلح چنیسر، علاؤالدین اور اس کے سارے امراء کے سامنے شیروں سے مقابلہ کرتا ہے۔ پھر کیا ہوا۔

(دودے کی سربراہی میں سندھ کے عوام کو کچلنے کے لئے) پورب اور پچھم سے آندھی اُٹھی

ایرانی بھی، افغانی بھی
اور ہندوستانی بھی
انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا
ہر ایک کے منہ پر دودے کا نام تھا

چاروں طرف کے ملکوں سے علاؤالدین نے لشکر منگوایا۔ پورا ایک سال لشکر جمع ہوتا رہا۔ اب علاؤالدین سندھ کی طرف روانا ہوتا ہے۔:

علاؤالدین آ رہا ہے
جو گیلی لکڑیاں بھی جلا دیتا ہے
یہ دریاؤں میں کود پڑتا ہے
یہ جہاں سے گذرتا ہے
وہاں کنویں سوکھ جاتے ہیں
اور پرندے اپنے گھونسلوں کو واپس نہیں لوٹتے
علاؤالدین آ رہا ہے
ہاتھیوں پر پانی کا کافی ذخیرہ ہے
بھورے کالے اور گندمی رنگ کے سردار ہیں
پورب پچھم، ایرانی اور قبائلی لشکر کا تو کوئی انت ہی نہیں
یہ 'باگھی' کا رشتہ لینے آ رہے ہیں

باگھی ان کے حوالے کرنا ہوگی

ورنہ پھر جنگ ہوگی

اور قلع پر تیروں کی بارش ہوگی

چودہ سال کے بعد دودے نے جو بھائی کا خط پایا تو پڑھ نہ سکا

کاتب خط پڑھتا ہے فقیر بیت سناتا ہے:

یہ خونی ہاتھوں کا لکھا ہوا خط ہے

(جو) وگھہ کوٹ پر آ پہنچے ہیں

یہ خط چنیسر نے لکھا

اور دودے نے پڑھوایا

آنکھ نے خون کے آنسو روئے ہیں

سارا کاغذ بھیگ گیا ہے

بھائی کی تحریر تھی۔ دودا پڑھ نہ سکا۔ یہ جدائی تو مقدر بن چکی تھی اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو یہ داستان گائی کیسے جاتی؟

دودے نے خط کا مضمون سن کر سارے سرداروں کو بلایا، مشورے ہوئے۔ سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ننگر کو بھیجا جائے۔

ننگر پہلوان چودہ برس کا جوان ہے۔ اب دولہا بننے والا ہے۔ جب چنیسر ناراض ہو کر جا رہا تھا تو دودے نے کہا تھا کہ ''میرے بھائی! تم مت جاؤ، دستار کے بدلے میں اپنی بیٹی تمھارے بیٹے کو دیتا ہوں''

چنیسر تو چلا گیا۔ وہ (دودا) مرد تھا اس نے اپنے وچن کی لاج رکھ لی۔

ننگر کی دلہن ونواہ میں بیٹھی ہے۔ اس کے بازو میں لال ڈورا پڑا ہوا ہے۔ سب سردار کہنے لگے کہ ''ننگر دولہا بننے والا ہے'' وہ جائے اور اپنے روٹھے باپ کو منا لائے۔

ننگر کو لانے کے لئے دودے نے فقیر کو بھیجا:

بھاگو بھان چل دیا

ننگر کی ڈیوڑھی کی طرف

اس کے ماتھے پر بالوں کی لٹ الجھ گئی تھی

اور وہ اپنا مخصوص ساز بجا رہا تھا

ساز کی آواز پہچان کر

حویلی میں لکھماں سے کہا گیا کہ

دروازے پر منگتا کھڑا ہے
جاؤ معلوم تو کرو کہ کیا بات ہے؟

فقیر کی ذات بھان ہے اور نام بھاگو یہ وہی فقیر ہے جس نے اس داستان کو گایا۔

نوکرانی بھاگی دوڑی آئی تو فقیر نے کہا۔ ''جاؤ ننگر کو بھیجو یا اس کی ماں کو بھیجو''۔نوکرانی نے کہا: ''ننگر تو اپنے دوستوں کے ساتھ دیراواہ پر نہانے گیا ہوا ہے۔'' اس کی ماں آتی ہے۔فقیر کا استقبال کرتی ہے اور آنے کا سبب پوچھتی ہے فقیر بیت سناتا ہے:

اے بھاگو بھان!
میں تمہیں مرحبا کہتی ہوں
دودا اور اس کے سردار تو خوش ہیں نا
سنا ہے کہ بکار جنگل میں
علاؤالدین لشکر انداز ہے
کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سارا کیا دھرا
میرے سرتاج (چنیسر) کا ہی ہے؟ ذرا اصل بات تو بتاؤ؟

فقیر تو آیا ہی اسی مقصد کے لئے ہے، وہ اپنا مدعا بیان کرتا ہے:

اے مریم! مجھے دودے نے تمہاری طرف بھیجا ہے
تم اپنے بیٹے کو بھیجو
تا کہ وہ روٹھے ہوئے باپ کو منالائے
اور جنگ کا بادل چھٹ جائے
یہی سب سرداروں کا متفقہ فیصلہ ہے
میرے ننگر کی ابھی عمر ہی کتنی ہے
اس کی تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگیں
اس کو اپنے لمبے بالوں سے کتنا پیار ہے!
وہ علاؤالدین سے کیا لڑے گا؟
اتنے سارے سردار اور سپاہی ہیں!
لال ڈورا باندھے ہوئے دولہا کو
کیسے جنگ پر بھیج رہے ہو؟

ننگر کے کچھ دوست جو پیچھے رہ گئے تھے، وہ اس سربستہ حقیقت سے ننگر کو آگاہ کرنے دوڑے:

ساز چپ ہو گئے اور سُر بجھ گئے

ننگر کے دوستوں نے اسے ساری حقیت سنائی

(اور کہا) اے ننگر! فقیر تیرے در پر آیا تھا

لیکن تمہاری ماں نے اسے دھتکار دیا

ننگر پہلوان جب یہ بات سنتا ہے، تو نہانا بھول جاتا ہے اور فقیر کے پیچھے جاتا ہے اور اسے راستے ہی میں جالیتا ہے:

(وہ) نہانا دھونا بھول کر نکل پڑا

دریا کے تیز بہاؤ کی مانند ہر چیز کو کاٹتا ہوا

جیسے شیر چھلانگیں مارتا ہے

یا ہرن چوکڑیاں بھرتا ہے

وہ بھاگے جا رہا ہے

آخر اس نے بھاگو بھان کو آلیا

اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا

اے بھاگو بھان! صد آفرین ہے تم پر

(میرا) دودا سومرو اور اس کے سردار تو خیریت سے تھے نا؟

تم میرے لئے آئے تھے تو مجھ سے ہی بات کرتے

عورتوں کے سروں پر تو چنری بجتی ہے، تاج نہیں

''اب میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔'' اور ننگر نے بھاگو بھان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ دونوں ننگر کے محل کی جانب روانہ ہو گئے۔ فقیر محل میں پہنچ کر کورنش بجالاتا ہے اور بیت سناتا ہے:

باغوں کے درمیان تیرا یہ محل

کتنی مہارت سے تعمیر کیا گیا ہے

پر اے سندھ کے دلیر سومرے!

تمہارے یہاں تو اب پھولوں جیسے شہزادے آکر محفلیں سجاتے ہیں!

یہ باتیں سن کر ننگر نے کہا: ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے لیکن تم نے اصل مدعا تو بیان کیا ہی نہیں، جس کے لئے تم آئے تھے!''

فقیر نے چنیسر کا لکھا ہوا خط، جو اس کے پاس تھا ننگر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ننگر خط پڑھتا ہے فقیر بیت سناتا ہے:

علاؤالدین کو اس کی موت یہاں کھینچ لائی ہے

میدان جنگ میں ہم اپنے علم گاڑ دیں گے
دشمن کے سر اس طرح کچلے جائیں گے،
جس طرح بیل کھلیان میں گھاس کو روندتے ہیں
دگھہ کوٹ میں خون کی ندیاں بہیں گی
اس کو تو ہم اپنی باندی بھی نہیں دیں گے
چاہے اس کے بدلے دنیا کی سلطنت ہی کیوں نہ بخش دے!

ننگر نے فقیر کو خلعت عطا کیا اور قیمتی تحائف دیئے۔ تحائف میں وہ گھوڑا بھی تھا، جس پر صرف ننگر خود سوار ہوتا تھا۔ اس کی لگاموں میں لعل جڑے تھے۔ ننگر نے فقیر سے کہا: ''تم جاؤ، میں کل صبح چچا کے حضور پہنچ جاؤں گا۔''

فقیر چلا گیا۔ ننگر نے اپنے دوستوں کو بلایا، دوست دو طرح کے ہوتے ہیں ایک خالی دکھاوے کے، دوسرے سرفروش، ننگر نے زمین پر تلوار سے ایک گول دائرہ کھینچا اور اس کے بیچوں بیچ تلوار گاڑ دی۔ دوستوں نے پوچھا: ''ننگر پہلوان یہ کیا ہے؟''

''ساتھیو!'' ننگر نے کہا ''یہ تلوار ہماری آن ہے، آج اپنی مونچھیں دودھ میں بھگو دو اور کل میدان جنگ میں لہو سے غسل کرنا'' پھر دوست اس دائرے میں یوں کود پڑے جیسے شمع پر پروانے۔

ننگر اپنے چچا کے حضور بڑی دھوم دھام سے پہنچا۔

دودے نے ننگر کو اپنے ساتھ تخت پر بیٹھنے کو کہا۔ لیکن ننگر نے کہا: نہیں چچا، میں یہیں ٹھیک ہوں'' دودے نے جب اصرار کیا تو ننگر نے کہا: ''چچا! اس تخت پر تو میرا باپ بھی نہیں بیٹھا، میں کیسے بیٹھوں!''

''اچھا تو تمہیں بھی اپنے باپ کا دکھ ہے؟'' دودے نے پوچھا

''ہاں چچا! مجھے بھی اپنے باپ کا دکھ ہے۔''

چچا! اس کا دکھ تو ہمارا مقدر بن چکا ہے
لوگ طعنے دیتے ہیں تو سوئے ہوئے درد جاگ اٹھتے ہیں
سینے میں دل ٹوٹ جاتا ہے
اور پھیپھڑوں میں دھواں بھر جاتا ہے
تم نے مجھے ''سونی'' کا رشتہ دیا ہے
اب تمھارے ہر حکم کی تعمیل میرا فرض ہے

''ننگر! کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کے ساتھ مل جاؤ!'' دودے نے پوچھا۔ ''نہیں نہیں، یہ وعدہ ہے، ننگر کا وعدہ! (چچا اب) ننگر کو الوداع کہو، اب میں لہو میں غسل کروں گا۔''

ننگر جانے کی تیاری کرتا ہے اور دودے کو اپنی ماں کے متعلق کہتا ہے کہ اس کا خیال رکھے جس نے اسے جنم دیا ہے۔
ننگر نے گھوڑے کی باگ موڑی۔ سارا لشکر باہر سے آیا لیکن ننگر محلّہ کے اندر والی ایک گلی سے۔ وگہہ کوٹ میں فرش تانبے کا تھا۔ ننگر وہاں سے ہوتا ہوا ایک اور گلی سے اندر آ گیا۔ گھوڑے کے ٹاپ کی آواز آئی۔ ننگر کی دلہن ونواہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جب یہ آواز سنتی ہے تو شہزادی باندی سے اس آواز سے متعلق پوچھتی ہے۔

ستون اکھڑ رہے ہیں
زمین کانپ رہی ہے
لکھماں ذرا خبر تو لے آؤ
کہیں علاؤالدین تو نہیں آ گیا؟
باندی نے دیکھا کہ ننگر آ رہا ہے
دلہن! تیری کلائیوں میں سونے کے کنگن ہیں
کانوں میں سونے کی بالیاں جھوم رہی ہیں
یہ تو چنیسر راؤ کا بیٹا ہے
اور دودل رائے کا بھتیجا ہے
اے دلہن یہ تو تیر دولہا آ رہا ہے

''یہی وقت ہے۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔ گیا وقت پھر واپس نہیں لوٹتا۔ کیا معلوم بچھڑے ہوئے پھر کب ملیں۔''

شہزادی گھونگھٹ کاڑھ کر یوں مخاطب ہوئی: اتنے سارے سردار ہیں، وہ تو جنگ پر نہیں جا رہے۔ تم لال ڈورا باندھے ہوئے۔ دولہا ہی کیوں جا رہے ہو؟
ننگر سوئی کے سوال کا جواب دیتا ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

گھوڑا اسوار کے بغیر نہیں دوڑتا
باز مٹھے کے بغیر نہیں اڑتا
ہم جان کا سودا کرتے ہیں
تم پر میرا تن من دھن سب قربان ہیں

شہزادی پھر عرض کرتی ہے فقیر بیت سناتا ہے:

تیری کلائی میں لال ڈورا بندھا ہوا ہے
اور تیری دلہن ونواہ میں بیٹھی ہوئی ہے

پونم کی رات کو تیرا بیاہ ہے
ڈھول اور تاشے خاموش ہو جائیں گے
شہنائیاں رو رو کر چپ ہو جائیں گی
سہرے کے پھول کملا جائیں گے
زیورات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے
اتنے سارے جہیز کا کیا ہو گا
خدا نہ کرے ، مجھے کالے کپڑے پہننے پڑیں!

پھر توبہ بھری اور کہنے لگی:

میرے منہ میں خاک
اس شان سے علاؤ الدین کے سامنے جاؤ
آسمان کی بلندیوں کو چھو آؤ
خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے
تمہارے لئے میں پھولوں کی سیج بچھاؤں گی
اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے بھی موت آ جائے
پھر قیامت کے دن ہمارا بیاہ ہو گا۔

(دلہن کو) الوداع کہہ کر آگے بڑھا تو پھوپھی باگھی کا سامنا ہوا۔
وہ بھی ننگر کو روکنا چاہتی ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

اے باگھل کے بھتیجے! کیا ایسا نہیں ہو سکتا
کہ مجھے ہی قربان کر دو
تا کہ لوگ مرنے سے بچ جائیں
(اور) جنگ کے بادل چھٹ جائیں

ننگر پہلوان یہ سن کر جواب دیتا ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

تمہارا دولہا تو کوئی سومرا ہی ہو گا
اسی میں ہماری شان ہے
تیری خاک میری آنکھوں کا سرمہ بنے
اگر ایسا نہ ہوا

تو پھر تمہاری شادی موت سے ہی ہوگی

ننگر پھوپھی کو الوداع کہہ کر اپنی ماں کی قدم بوسی کے لئے آیا۔ پھر والد کو خط لکھا کہ بابا! میں آرہا ہوں"

قاصد نے خط پہنچایا۔

ننگر دیراہ واہ پر منزل انداز ہو کر ایک فقیر کو باپ کی طرف بھیجتا ہے، کہ ممکن ہے وہ مان جائے۔

نولاکھ کا لشکر ہے، چنیسر خیمہ کے باہر بیٹھا ہے۔ محفل عروج پر ہے۔ چنیسر کی فقیر پر نظر پڑتی ہے تو سوچتا ہے۔ "چودہ سال گذر گئے، لیکن میرے لئے تو کوئی بھی نہ آیا اب جب جنگ ہونے کو ہے، تو دودا شاید ڈر گیا ہے۔"

چنیسر نے ناراض ہو کر سپاہیوں کو حکم دیا، کہ یہ فقیر جو ساز لئے آرہا ہے، اس کی خوب ٹھکائی کردو۔" یہ کہہ کر چنیسر خیمہ میں چلا گیا۔

بھان کو گھیر لیا گیا۔

وہ اس پر حملہ کرنے ہی والے تھے،

کہ بھاگو نے ان کے آگے سونے کے سکے پھینکے

دھن دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں

پھر وہ اسے زبان سے دھتکارتے رہے

لیکن ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہہ رہے تھے!

اسے چنیسر کے گھوڑے کے پاس بٹھا دیا گیا۔ اس نے سوچا۔ "سومروں کے ہاں تو میری بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ لیکن آج!؟ پر سچ کو کوئی آنچ نہیں، سچ کہہ دینا ہی چاہئے، پھر بھان کہنے لگے؟

اے چنیسر! تمہاری دی ہوئی مٹی بھی میرے لئے سونا ہے

ایسا تو کسی سومرو نے نہیں کیا تھا

آخر نکلے نالوہارن کے بیٹے!

تمہارے سر پر دستار بھی سجائی گئی تھی

اور تم ماں سے پوچھنے چلے تھے

میں نے تمہاری عزت افزائی کی تھی

اور تم نے مجھے دھتکار دیا

فقیر کے منہ پر کون ہاتھ رکھ سکتا تھا؟ چنیسر باہر آ گیا۔

اے بھاگو بھان! میں تمہیں مرحبا کہتا ہوں

دودا سومرو اور اس کے سردار تو خیریت سے تھے نا؟

ننگر اب کتنا بڑا ہو گیا ہے
میں نے تو اسے شیر خوار ہی چھوڑا تھا!

فقیر کو تو اپنا مدعا بیان کرنا تھا۔ سو اس نے کہا:

ننگر تو لال ڈورا باندھے ہوئے ہے
اس کی دلہن ونواہ میں بیٹھی ہے
پونم کی رات کو ان کا بیاہ ہے
اب وہ اپنے سر سے سہرا اتار کر
اپنے سرداروں کے ساتھ ویراواہ پر منزل انداز ہے
لال ڈورا باندھے ہوئے
دولہا اپنے باپ کے سلام کو آ رہا ہے

چنیسر دھاڑا! ''اے فقیر! ننگر کو رشتہ کہاں سے ملا؟ توزروں، گجروں، سموں یا سومروں کے گھرانوں سے؟

''نہیں نہیں''، فقیر نے جواب میں کہا، ''تم روٹھ کر جا رہے تھے۔ دودے نے اپنی بیٹی کے رشتے کی پیشکش کی تھی۔ وہ مرد تھا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اب تو ننگر دودے کا داماد ہے اور سونی تمہاری بہو ہے۔''

یہ سنا تو چنیسر نے کہا:

سونی میری بہو ہوگی
یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا
اگر مجھے معلوم ہوتا تو دہلی کیوں جاتا
اتنا لشکر کیوں لاتا!
لیکن اب تو بھاگی کا رشتہ
دے کر اسے لوٹانا پڑے گا

چنیسر نے کہا: ''اچھا اب تم جا سکتے ہو، ننگر سے میں خود ہی مل لوں گا۔''

فقیر روانہ ہوا، چنیسر خیمہ سے باہر نکلا اور خدا کے آگے اپنا دامن پھیلا دیا۔

اے مرے پروردگار!
دن نہ ڈوبے اور نہ مغرب میں ڈھلے یہ آفتاب
میرے سینہ میں آگ کا الاؤ دہک رہا ہے
سانس جلی جا رہی ہے

ہاں کہیں ایسا نہ ہو
کہ میری یہ آنکھیں ننگر کو دیکھ ہی نہ سکیں
اور میں دم توڑ دوں

چنیسر تیار ہو کر نامدار بیگ کے پاس آتا ہے: ''چلو میں تمہیں اپنا بیٹا ننگر اور دودے کا بیٹا منگر دکھالاؤں۔ایک کی عمر چودہ برس ہے اور دوسرے کی گیارہ برس، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کل جنگ میں مارے جائیں اور دل کی دل ہی میں رہ جائے''۔

نامدار بیگ ویسے تو دشمن کے نرغے میں جانا پسند نہیں کرتا، لیکن پھر چنیسر کی بات مان لیتا ہے، اور دونوں روانہ ہوتے ہیں۔

ننگر پہلوان ویراواہ پر منزل انداز ہے۔ وہ ہر خطرے سے بے پرواہ یوں سویا ہوا ہے جیسے میدان جنگ میں نہیں بلکہ اپنے محل میں سویا ہو۔

سوائی، سمیجہ جاڑیجہ اور منگر دودے کی ست رنگی چوسر کی بساط بچھائے کھیل رہے ہیں۔

اچانک منگر کی نگاہ چنیسر پر پڑتی ہے۔ دودا اور چنیسر ہم شکل تھے۔اس وجہ سے منگر کشمکش میں پڑ جاتا ہے کہ ''کہیں میرے والد تو نہیں آرہے ہیں''۔

چنیسر کو دیکھ کر منگر اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے:

شاید میرے والد آرہے ہیں
جو سب کے لئے خیر و عافیت کی علامت ہے
لیکن نہیں ، یہ چنیسر ہی تھا۔ دوست اسے کہتے ہیں!
یہ تیرے والد نہیں ہیں
بلکہ یہ تو چنیسر راؤ ہیں
اے ننگر اب جاگ بھی جاؤ
تیرے والد آگئے ہیں
ننگر نیند سے جاگ پڑا
دونوں باپ بیٹا بغلگیر ہو گئے
دو جسم ایک ہو گئے

''اے ننگر جنگ سر پر منڈلا رہی ہے۔میرے اپنے بھائی نے بھی مجھے دھتکار دیا۔سرداروں نے منہ موڑ لیا۔اور سب میری جان کے دشمن بن گئے۔مریم کے طعنوں نے میرے سینے میں آگ بھر دی۔اس نے کہا تھا کہ 'میں چنیسر کی

بہن ہوں، اور وہ میرا بھائی۔ چودہ برس تک میں دہلی میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اب باگھی کا رشتہ دیئے بنا مغل کو لوٹانا ممکن نہیں۔''

باپ بیٹے کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر ابل پڑا۔ بغلگیر ہوئے دونوں کو کافی وقت گذر گیا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لاکھ جتن کئے گئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ چنیسر اپنے دکھڑے رورہا تھا لیکن چنیسر کے منہ پر باگھی کا نام آتا ہے، تو ننگر اپنے باپ کو دور دھکیل دیتا ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

پھول دیتے ہیں جس طرح خوشبو،
روشنی آفتاب دیتا ہے
راہ چھوڑے جو باپ دادا کی
وہ تو کانٹوں میں جا الجھتا ہے
ایک سومرے سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے
جاؤ اور جو بھی جی میں آئے کرو
جان اپنی عزیز ہو جو تمہیں
میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ

باپ بیٹے کی یہ گفتگو جنگ کو یقینی بنادیتی ہے۔ دھرتی پر گھمسان کا رن پڑا ہے۔ چنیسر اور علاؤالدین پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ علاؤالدین ننگر سے باگھی کے رشتے کی بات کرتا ہے۔ ننگر جواب میں بادشاہ سے اس کی بھانجی یا بھتیجی کا رشتہ منگر کے لئے، اس کی بیٹی کا رشتہ خود اپنے لئے اور دودا کے لئے اس کی بہن کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ بادشاہ آگ بگولا ہو کر اس پر حملہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ننگر اور منگر کسی طرح علاؤالدین کے خیمے سے باہر نکل آتے ہیں۔ غصے میں بپھرا ننگر علاؤالدین پر تین بار حملہ کرتا ہے۔ لیکن ہر بار چنیسر آگے آکر اس کے وار خطا کروادیتا ہے۔ علاؤالدین کا دس لاکھ کا لشکر میدان میں اتر چکا ہے۔ گھوڑے پر سوار ننگر کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے۔ جنگ کے دوسرے مرحلے میں وہ بادشاہ کو للکارتا ہے کہ خود میدان میں اترو، ننگر تلوار پھینک کر دشمن سے گتھم گتھا ہو کر اس کے جسم کے پرخچے اڑادیتا ہے۔

ننگر نے کہا

لو یہ اپنا خان اٹھاؤ!

''علاؤالدین کے آگے لے جاؤ!''

کافی لشکر مارا گیا۔ باقی جو بچے تھے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے، ننگر اپنے خیموں کی طرف لوٹ آیا۔

اب نامدار بیگ، ہنبس پٹھان (جو اس کا بھانجہ ہے) کا بدلہ لینے کے لئے میدان جنگ میں اترتا ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے۔

منگر کام آچکا ہے۔ پٹھان کا لشکر بھی مارا جا چکا ہے۔ پٹھان بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ننگرا سے للکارتا ہے لیکن وہ خیمہ میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ ننگر کی للکار پر اندر سے جواب دیتا ہے: ''تمہیں خدا کا واسطہ، مجھے جان کی امان دے دو۔ مجھے بخش دو! میں تو تمہارے باپ کا دوست ہوں، تمہارا چچا ہوں، مجھے چھوڑ دو!

ننگر نے کہا: ''تمہارے ہاتھ سے جینے کی لکیر مٹ چکی ہے، اب تمہیں مرنا ہی ہوگا۔ اجل تمہارے دروازے پر کھڑی ہے اور تم زندگی کی بھیک مانگ رہے ہو! تمہیں باہر آنا ہی ہوگا۔''

اس نے کہا: ''اے ننگر! میرے لہو سے تیری تلوار کی پیاس اور بھڑک اٹھے گی۔ خدا کے نام پر مجھے جان کی امان دے دو یا خدا کے نام پر اپنا سر دے دو۔''

ننگر نے سوچا ''منگر کام آچکا ہے اب کس منہ سے واپس جاؤں گا؟ چچا کو کیا جواب دوں گا؟

اس نے دشمن کو پھر للکارا۔

(جواب ملا) اے ننگر پہلوان! میں تمہارا سامنا نہیں کر سکتا۔''

''پھر کس طرح مجھے شہید کر سکو گے، کیسے میرا سر لو گے؟''

وہ تھالی اور چھرا خیمہ سے باہر پھینکتا ہے، اور ننگر خدا کی راہ میں اپنے سر کا نذرانہ پیش کرتا ہے:

راہِ خدا تو حق و صداقت کی راہ ہے

سر اپنا جس میں دے دیا گبھرو جوان نے

دودے کی طرف ننگرا اور منگر کے لاشے بھیجے گئے

اب دودا میدان جنگ میں اترنے کی تیاری کرتا ہے

دودا گھوڑی پہ سوار ہے، اور وہ اتر، دکھن، پورب، پچھم یوں دوڑ رہی تھی، جیسے اس کے پر نکل آئے ہوں۔ دودے کی گھوڑی تانبے کے فرش پر کھڑی ہوئی تھی۔ جنگ کا پہلا دن ہے۔ چنیسر نے دودے کو پہلے ہی دن مروانے کی ٹھانی ہے۔ تانبے کا فرش بچھا دیا جاتا ہے اور اس پر زہریلے تیر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ حوض میں پانی بھر دیا جاتا ہے۔ گھوڑی جب اس جگہ پہنچتی ہے تو اسے اپنا تھان یاد آجاتا ہے۔ جنگ کی تھکی ماندی گھوڑی پانی کی طرف بڑھتی ہے اور پھر چاروں طرف زہریلے تیروں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ یوں سازش سے دودا پہلوان شہید ہو جاتا ہے۔ دودے کی لاش وگہہ کوٹ پہنچائی جاتی ہے۔

دودا جب جنگ پر روانہ ہو رہا تھا تو سب سومرا خواتین کو ابڑو کے ہاں سام لینے کے لئے بھیج دیا تھا۔ علاؤالدین کو جب یہ بات معلوم ہوتی ہے تو ابڑو کو کہلوا بھیجتا ہے کہ ''باگھی میرے حوالے کر دیا جنگ قبول کرو۔''

ابڑو جنگ قبول کرتا ہے۔ فقیر بیت سناتا ہے:

رات ڈھلی اور صبح ہوئی

ابھرا صبح کا تارا

غوث بہاؤالحق کا

گونج اٹھا ہے نعرا

ڈنکے پر ہے چوٹ پڑی

بجنے لگا ہے نقارہ

ابڑو ہے گھوڑے پر سوار

ہرے گلابی پیلے پرچم

لہراتے ہیں چاروں جانب

تیز کٹار اور چھرے چمکے

برچھیاں ابھریں بھالے چمکے

تلوار کے وار سہے

اتنی کسی میں تاب کہاں ہے

ان ماؤں کے صدقے جاؤں

جن کی گود میں ایسے بیٹے پروان چڑھے

دھڑ کہیں پہ سر کہیں پہ

دھول میں مل کر دھول ہوئے

گورو کی اب موت یہیں پہ

بارہ دن تک جنگ رہی تھی جاری

سالار اور سپڑ دونوں نے

اک ساتھ کیا تھا کاری وار

اور اک ساتھ شہید ہوئے دونوں۔

باگھی نے یہ صورت حال دیکھی تو محل میں لوٹ آئی اور خداوند کریم کے حضور اپنی عزت کے تحفظ کی دعا مانگنے لگی، جو مقبول ہوئی، دھرتی کا سینہ چاک ہو گیا اور باگھی ساٹھ سہیلیوں سمیت دھرتی کی آغوش میں سما گئی۔

علاؤالدین کے ساتھ صرف چھ سپاہی بچے تھے۔ باقی سب مر کھپ چکے تھے۔ علاؤالدین نے نئے شہر کو

گھیر لیا اور للکارا ''کوئی سومرو زندہ بچا ہے تو مقابلہ کو آئے۔
اور تو کوئی تھا ہی نہیں۔ دودے کے بیٹے بھونگر راؤ نے جنم لیا تھا اور ابھی اس کی عمر صرف سات دن تھی۔
کنیزیں دوڑی آئیں: ''شہزادی! علاؤالدین محل کی فصیل تک پہنچ گیا ہے۔!''
(شہزادی نے کہا) ''اس کے ساتھ کتنے سپاہی ہیں؟
(جواب ملا) ''اس کے ساتھ کل چھ سپاہی ہیں!''
شہزادی نے کنیزوں کو مسلح ہونے کا حکم دیا۔ ڈنکے پر چوٹ پڑی، جنگ کا نقارہ بجا، علاؤالدین نقارے کی آواز سن کر پوچھتا ہے: ''سومرے تو سارے مرکھپ گئے۔ اب کون ہے جو جنگ کا اعلان کر رہا ہے؟''
اسے بتایا جاتا ہے کہ: ''اب دودے کا بیٹا بھونگر راؤ اپنے سو سواروں کے ساتھ میدان جنگ میں اترنے والا ہے۔''
''سو سوار؟ اور ہم چھ سپاہی! ہم کس طرح مقابلہ کریں گے؟
علاؤالدین نے سوچا: ''بازی ہاری جا چکی ہے۔ ہم جنگ ہار چکے ہیں، فتح کا دعویٰ فضول ہے۔''
وہ دروازے پر لکھ دیتا ہے کہ ''میں یہ جنگ ہار چکا ہوں، فتح میرے نصیب میں نہیں تھی۔''
آخر کار اس نے کہا: ''اچھا اس سومرا کو بلاؤ تا کہ اس کے دو بول ہی سن لیں!''
ایک کنیز فولاد کے بندھن میں بندھے ہوئے بھونگر راؤ کو، جس کی عمر صرف سات دن تھی، سونے کی تھالی میں لے آتی ہے۔
''کیا یہی بھونگر راؤ ہے؟ علاؤالدین نے کہا ''اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اپنی شکست لکھ چکا ہوں۔''
پہلوان بھونگر راؤ انگڑائی لیتا ہے۔ تو فولادی بندھن ٹوٹ جاتا ہے اور ایڑیوں کی رگڑ سے سونے کی تھالی کے نقش مٹ جاتے ہیں۔
علاؤالدین ناکام و نامراد واپس لوٹ جاتا ہے۔''(9)

کونجی رن کی حقیقت:

درباروں کی ہدایات پر لکھی جانے والی تواریخ کا بیانیہ ریاستی بیانیہ ہوتا ہے، جو لوک بیانیہ سے متضاد ہوتا ہے۔ لیکن چند ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ریاستی بیانیہ لوک دوست بیانیہ بھی ہو سکتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کی سندھ پر یلغار کے حوالے سے تاریخ فیروز شاہی میں ایک واقعہ درج ہے جس کے مطابق فیروز شاہ جب ٹھٹھہ سے اپنے لشکر کے ساتھ گجرات کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں قحط اور بھی بڑھ گیا اور جانوروں کی بیماری بھی زیادہ ہو گئی۔
بیماری اور قحط سے فیروز شاہ کے لشکر کا یہ حال تھا کہ فوجی بھوک سے تنگ آ کر مردار جانوروں کا گوشت اور کچا چمڑا کھا کر اپنا پیٹ بھرنے لگے۔ جانوروں کی بیماری کی یہ کیفیت تھی کہ سارے لشکر میں ایک سواری کا جانور بھی

باقی نہ رہا، سارا لشکر پیدل سفر کر رہا تھا چونکہ یہ لوگ راستہ نہ جانتے تھے، انہوں نے راستہ بتانے کے لئے کچھ سندھیوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ یہ سندھی لشکر کے آگے چل کر راستہ بتا رہے تھے۔

ان سندھیوں نے سارے لشکر کو غلط راستے پر ڈال کر ایک جنگل میں پہنچایا، جس کا نام ''کونجی رن'' تھا، اس جنگل کا پانی اس قدر کھاری تھا کہ حلق سے ایک قطرہ بھی نہ اتر سکتا تھا۔ تمام لشکر اس جنگل میں پہنچ کر بہت پریشان ہوا۔ فیروز شاہ نے غصے میں آ کر اسی وقت چند سندھیوں کو قتل کر ڈالا۔ جو سندھی باقی بچے فیروز شاہ نے ان کو بلا پوچھا ''کہ آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم نے یہ جو کچھ کیا جان بوجھ کر کیا، جو لوگ ہمارے ملک کو فتح کرنے آئے ہوں، انہیں اس کے سوا ہم سے کوئی امید نہ رکھنی چاہئے۔ ہم اپنے بادشاہ اور ملک کے وفادار ہیں، اور ہمیں آپ کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہئے تھا۔ اب آپ اور آپ کا لشکر اس جنگل میں آ چکا ہے، جہاں سے زندہ سلامت نکلنا محال ہے۔ گو ہم جانتے ہیں کہ ہمارے دوسرے ساتھیوں کی طرح ہمیں بھی اپنی جان کی پروا نہ کرنی چاہئے۔''

سندھیوں کی اس بات کو سُن کر بادشاہ اور سارا لشکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ کیونکہ جہاں تک نظر جاتی تھی کھاری ہی کھاری پانی نظر آتا تھا۔ غرضیکہ طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانے کے بعد فیروز شاہ کا لشکر ''کونجی رن'' سے نکلا، اب یہ سب ایسے ہیبت ناک ریگستان میں پہنچے، جہاں میلوں کسی جگہ گھاس یا درخت نظر نہ آتا تھا۔

ان مصیبتوں سے بادشاہ اور لشکر دونوں تنگ آ چکے تھے یہاں تک کہ دہلی میں خبر مشہور ہو گئی کہ فیروز شاہ اپنے لشکر سمیت کہیں غائب ہو گیا۔

چھ ماہ کے بعد بادشاہ کو کسی نہ کسی طریقے پر اس لق و دق جنگل سے نکلنے کا راستہ معلوم ہوا، اور سب لوگوں نے اس مصیبت سے نجات پائی۔ (10).

مارئی۔۔ایک لوک بیانیہ:

سومرہ دور کا ایک کردار مارئی۔۔اس دور کا اہم ترین لوک کردار ہے۔ اس کا تعلق ننگر پارکر سے دس کوس کے فاصلے پر واقع بھالوا نام کے ایک گاؤں سے تھا۔ منگھارام اوجھا بتاتے ہیں کہ مارئی ریبارن تھی۔ ''ریبارنیں آج تک اونی چنی اور اس کا گھاگرہ پہنتی ہیں۔

شادی کے وقت بھی یہی لباس ہوتا ہے۔ البتہ کچھ بھرت بھرا ہوا ہوتا ہے۔ شادی کے وقت کالی چنری اور کالے گھاگرے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر جب مارئی کو اٹھا لے گیا تو ماروؤں نے اس غم میں کالا لباس پہنا تھا۔ راجپوت ریبارنیں ''جھار'' کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ مارئی بھی جب عمر کی وحشیانہ قید میں تھی تو جھانگیروں کو ''جھار'' (سلام) بھیجتی ہے۔

میرا بہت سلام کہنا، میرے ماروؤں کو
میں انہیں یاد کرتی ہوں جیسیں میرے گڈریے
مجھے ان کو دیکھے ہوئے بہت دن گزر گئے

بعض کہتے ہیں کہ مارئی کچھ کیرا کوٹ کے جام پھول کی بیٹی اور لاکھو کی بہن تھی۔ جام پھول کی پانچ رانیاں تھیں۔ جن سے پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ ڈولا راؤ کی بیٹی سے ''سانڈ''، چاوڑی سے ''سوز''، سوڈھی سے کھینرو، دھوٹ سے ''دھاؤ'' سوئل سے لاکھو، سوئل رانی کڑ دھر ریباری (قاصد) کو جھنگ سے ملی تھی۔ اس کا من موہنا حسین روپ دیکھ کر ریباری نے اسے جام پھول سے بیاہ دیا۔

کڑ دھر کو بن میں مل گئی اندر پری
سوغات سمجھ لے آیا اور بیاہی پھول سے

اس کا ملاحظہ ہو ایک بیت:

قاضی امرکوٹ کا، تو کچھ جانچ پرکھ
میرا ننھیال مردھر، ڈونگر کچھ، کا
پھول کی ہوں بیٹی، اور لاکھو کی بہن
تقدیر کے لکھے سے مصیبت میں پھنسی
بیٹھی پلنگ پاس، لوئی کیونکر لجاؤں

دوسری روایت یہ ہے کہ مارئی، جام پھول کی رکھیل میراڈی سے پیدا ہوئی ہے۔ جس زمانے میں امر کوٹ کی باگ ڈور، رانا چاند کے ہاتھ میں تھی تو لاکھو کی نیل گائیں ہر روز چاند کے باغ کی کچی کلیاں کھا جاتی تھیں۔ ایک دن ان چوروں کو گرفتار کرنے کے لئے چاند ایک برق رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر ان کے پیچھے لگ گیا۔

چاند نے کی چاہ، سیوا کی شنکر کی
اتر عرش سے نیچے ایک انمول گھوڑا

نیل گایوں کو اس نے کیرا کوٹ کے دروازے پر جالیا۔ پہریدادار نے چاند کی مشکیں کسیں اور لاکھو کے سامنے پیش کر دیا۔ لاکھو نے حکم دیا کہ رانا یہ ثابت کرے کہ اس کی گایوں نے واقعی کلیاں کھائی ہیں اگر ثابت کر دیا تو میں اسے اپنی بہن کا رشتہ دے دوں گا۔ ورنہ رانا مجھے رشتہ دے۔ رانا نے ان کے پیٹ چرواکر دیکھے تو واقعی کلیاں نکلیں جو ابھی تک ہضم نہیں ہوئی تھیں۔ وعدے کے مطابق لاکھو نے رشتہ دینا قبول کیا۔ رانا ایک ہی رات میں پالنے سوٹھر کے پاس بھالوا پہنچ گیا اور اس کے رتھ پر سوار ہو کر اسی رات کیرا کوٹ پہنچا۔ لاکھو کے دل نے اس رتھ کو پسند کر لیا۔ ''پالنے'' کو جب اس بات کی بھنک پڑی تو وہ راتوں رات بھاگ نکلا۔ اس وقت میراڈی اس رتھ میں سو رہی

تھی۔ جواس وقت گر بھ وتی (حاملہ) تھی۔ بیچ راہ میں وہ جاگ گئی لیکن وہ کجاوہ واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اوراس طرح میرا اڈی بھالوا پہنچی۔

بھالوا کی کیسی خوش نصیبی تھی کہ یہ ہیرا اس پالنے کی گود میں پیدا ہوا۔ دھیرے دھیرے ماری کی خوبصورتی کے آس پاس، دور ونزدیک، گن گائے جانے لگے۔ اسکے نوکر چاکر بھی ماری کا حسن دیکھ کرفخر کرتے۔ ہمیشہ ماری کی نظر داری چوکسی سے کرتے۔ بدلے میں انہیں آہ کے سوا کچھ نہ ملتا اور یہ سنگی ساتھیوں، سہیلیوں کے ساتھ سر پر بیلھڑو (اوپر تلے رکھے دو گھڑے) اٹھائے بنی سنوری چل دیتی کہ دیکھنے والے اوباش جل بھن کر خاک ہو جاتے۔ سولہویں سال پالنے نے اس پدمنی کی اپنے بھتیجے ''کھیت سنگھ'' کے ساتھ منگنی کر دی۔ ماری کی منگنی ہو جانے کے بعد پھوگ کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پڑ گیا اور بھالوا پر خاک ڈال، ڈھاٹ دھنی کے پاس جا پہنچا۔ ڈھاٹ دھنی، عمر سومرو، امیر امراء کو اچھی صلاحیں دے رہا تھا۔

پرناری کی پریت پانچ پر کاروں کھائے
دھن ہارے جوبن گھٹے، پنچوں میں پت جائے
جیتے جی کھائے کلیجہ، مر کے نرگ لے جائے

اتنے میں ایک تند و تیز اکھڑ شخص نے آ کر سلام کیا۔ بھری کچہری کی آنکھیں اس شخص پر کھُب گئیں۔ بیٹھے ہوئے لوگوں نے اسے اس کے انداز سے پہچانا، اس انجان شخص نے، بادشاہ کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ دوسروں کو نصیحت آمیز نکتے بتانے والا عمر، ایک بار پرائے اشارے کا مطیع ہو گیا۔ عمر کو عشق کے پھندے میں پھنسانے کے لئے پھوگ اپنا جال بچھانے لگا۔

میاں تم ملیر کے، سنو خبر چار
ماری نامی نیک عورت ہے شہر یار
سورج جیسی سرس، حسینوں کی سردار
سوہنی ناھیں سندھ میں ایسی کوئی مختار
چل تو سہی اک بار، چل کر دیکھو ماری

جب عمر نے پھوگ کی زبانی ماری کے حسن و ادا کے چرچے سنے تو انصاف کا گلا کاٹنے والا عمر، گنگا کے کپڑوں کی خوشبو پر غش کھا جانے والا، پرائی عزت لوٹنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً سے بیشتر تیاری کر ڈالی۔ دونوں آدمیوں نے امرکوٹ کی حد پھلانگی اور ننگر کے نزدیک پہنچ گئے۔ اک الھڑ معصوم اور انجان، گاؤں کی گوری کو کیا معلوم کہ آج کنوئیں پر نہ جانا چاہئے۔ سہیلیوں نے سورج نکلنے سے پہلے ہی آ کر پکارا۔ ماری بھی بنی سنوری چوڑی چھلا پہنے، کانوں میں جھالے، مانگ سجائے سرمہ لگائے تیار تھی۔ مٹکا سر پر اور گھڑا کمر پر رکھے۔ سہیلیوں کے ساتھ اٹھ کر

چل دی۔ لاڈلی ناز بھری کا کیا کہیے، قدم قدم پر قربان جائیے۔ ہر کسی کو چال دیکھ کر حیرت تھی۔ پر ماروی کا حسین چہرہ تھا ہی ملوکیت لئے ہوئے

جیسی صورت سورج کی ویسی مورت ماروی

کنواں تو بھالوا کے پہلو میں تھا۔ ساری ٹولی شوخیاں شرارتیں کرتی، وہاں پہنچ گئی۔ اپنے مٹکے گھڑے وہاں رکھ دیئے اور باری باری سے پانی بھرنی لگیں۔ آج کنوئیں پر ان البیلیوں کے سوائے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ یہ چنچل لڑکیاں پنگھٹ کی پُر بہار فضا میں بہت دیر تلک ایک دوسری کے ساتھ کھیلتی کودتی گاتی رہیں اتنے میں اچانک ایک شتر سوار آگے بڑھ آیا۔ پنگھٹ والا گھاٹ جو ذرا دیر پہلے پھولے نہیں سما رہا تھا، یکدم وہاں سناٹا چھا گیا۔ ساری کامنیاں یکا یک خاموش ہوگئیں۔ سوار نے آگے قدم بڑھائے اور ان سے پانی کا سوال کیا:

دیکھا منہ جو ماروی کا، عقل ہوئی خطا
چوڑیوں کو دعا دی سکھی رہو سدا
ہم مسافر پیاس سے جاتے ہیں مرے
پانی پلا بھی دو ہمیں، دیر کرو نہ اب
ماروی اٹھائے گھڑا، سامنے آئی عمر کے

ماروی جیسے ہی پانی پلانے لگی تو عمر کے جلوؤں سے سارا پانی نیچے زمین پر گر گیا۔ عمر کی ترچھی نگاہیں ماروی کے چہرے پر تھیں۔ وہ ذرا آگے بڑھا، چڑیا کو دھمکایا، شکاری باز ڈھٹ کو چل دیا۔ بھالوا کی گلی گلی میں رونا پیٹنا، چیخ و پکار "مارو! مارو" کا ماتم مچ گیا۔

عمر سومرو اس انجان دیہاتی لڑکی کو امرکوٹ لے آیا اور محلات میں لا رکھا۔ ماروی پرندوں میں پیدا ہوئی پدمنی، اسے عمر کے محلات ذرا بھی نہ بھائے۔ عمر سومرو نے اسے نیا ساز و سامان اور عمدہ طعام فراہم کیے لیکن ماروی روتی بلکتی ہی رہی۔ والدین اور سہیلیوں کی تمنا میں اس کا چہرہ کُملا گیا۔ حسین گھنیرے بال بے سنورے، بکھرے رہے۔ وہ عمر سے عرض کرنے لگی۔

نہ سنگی نہ ساتھی کوئی، نہ کوئی اپنا پرایا
نہ کوئی اونٹ مسافر، دیہاتی کوئی اپنا
نہ اپنے پیاروں سے کوئی اجازت لی
اللہ جانے میرے اوپر یہ کیا آفت پڑی
لال اوڑھنی میں نے یہ کیسی اوڑھی
کیسے اتاروں اوڑھنی، دادا والوں نے دی

ہاتھ میں کڑے، کان میں کرک، گلے میں کٹھمال پہنوں
زر، زیور، ہار اور ہنسلی پہنوں تو کیا رہے عزت مری
اڑ جا رے کاگا، میرا دل ہے بہت بے چین
قید سے مجھے نکالو، دل میرا ہاتھ سے جاتا ہے۔

دیہاتی لڑکی کو وطن کی تمنا تڑپا رہی تھی۔ عمر کی زور زبردستی کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود بار بار، رہ رہ کر وطن کی طرف دیکھتی تھی۔ رات کو دکنی جانب کی کھڑکی میں بیٹھی، اپنے دیہات کا فکر واندیشہ اور انتظار کرتی رہی۔ اس کی چادر بھیگ چکی تھی، اس کا دل چُور چُور تھا، بڑی بڑی حسین آنکھیں وحشت ناک ہوگئی تھیں۔ اپنے گاؤں کے غم میں، سہیلیوں کو یاد کرتی، بکری کے بچوں کی چھلانگیں، کبھی کچھ یاد آ کر اسے تڑپا رہا تھا۔ وہ اپنی رہائی کیلئے عمر کی منت سماجت کرتی رہی۔

سندھ کی سرزمین کی یہ سدا ملوک پدمنی، عمر کی وحشیانہ کارروائیوں کے باوجود اپنی پاکدامنی سے ذرہ بھر نہ ہلی۔ آخر کار ماری کی پاکدامنی دیکھ کر وہ لرز اٹھا اور ماری کو بہن مان کر اس کے سر پر اوڑھنی اُڑھائی اور بہت کچھ دے دِلا کر اس کے ملک پار کر پہنچا آیا۔ اونٹ پر آگے بیٹھی ماری نے، عمر کے انصاف کے گن گائے۔ سچ گنوان لاکھوں میں ایک لطیف شاہ بھٹائی نے دنیا کی اس پاکدامنی کا پیغام پہنچایا۔

جس پاکباز نے پاکدامنی نہ چھوڑی وہ تھی ماری
عمر کوٹ میں آ کر بھی اس نے لاج نہ چھوڑی
قید کی کوٹھڑی میں بند ہونے کے باوجود
وہ اپنی پاکدامنی سے ذرہ برابر بھی نہ ہلی

ماری کی کنڈی:

بھالوا میں، ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اب بھی وہ کنواں موجود ہے جہاں ماری اپنے ریوڑ کو پانی پلاتی تھی۔ اب وہ کنواں تباہ ہو چکا ہے۔ اس کنوئیں کا پانی بالکل کھاری تھا۔ اسی کنوئیں پر سے عمر نے ماری کو اٹھایا تھا۔ کنوئیں کے قریب ایک کنڈی یا کونڈی ہے۔ جس میں ماری اپنے ریوڑ کے لئے پانی رکھتی تھی۔ اس کے تین طرف کے حصے ابھی تک سلامت ہیں۔ اس کونڈی کی چوڑائی چار فٹ لمبائی چھ فٹ اور گہرائی ایک فٹ کے قریب ہے۔ (اس وقت کے کلیکٹر مسٹر چنا نے 1946ء میں اس کونڈی کی مرمت کرائی تھی۔) (11)

بیجل۔۔۔ سنگیت نوازی کا لوک بیانیہ:

سورٹھ رائے ڈیاچ کی داستان سندھ کا ایک ایسا لوک بیانیہ جس میں فن، فنکار اور فن کو سراہنے والے کرداروں کے درمیان ایک وحدت الوجودی رشتہ ہے۔ اس انوکھی داستان کو شاہ لطیف بھٹائی نے اپنے ایک لافانی

سُر سورٹھ رائے ڈیاچ میں منظوم کیا ہے۔ ہمارے عہد کے عظیم سندھی شاعر شیخ ایاز نے شاہ کے سروں کو اردو میں ترجمہ کیا اور شاہ کی بیان کردہ سندھی داستانوں کی دانشورانہ توضیح کی ہے، جو شاہ کی تفہیم کے لئے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیخ ایاز بتاتے ہیں۔

''کسی زمانے میں ''رائے ڈیاچ'' نامی ایک راجا جونا گڑھ پر راج کرتا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جو اولاد سے محروم تھی۔ ایک دن اس نے کسی فقیر سے یہ درخواست کی کہ اے خدارسیدہ بزرگ میرے حق میں یہ دعا کرو کہ میں اولاد سے محروم نہ رہوں۔ فقیر نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ تیری منہ مانگی مراد پوری ہوگی خدا نے چاہا تو تیرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، لیکن وہ رائے ڈیاچ کا سرتن سے جدا کر دے گا۔ یہ سنتے ہی راج کماری کی چیخ نکل گئی، اور بڑی گھبراہٹ میں یہ کہنے لگی ''ایسے لڑکے کا کیا ہوگا جو میرے بھائی کی جان کا دشمن ہو'' فقیر نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ بات آئی گئی ہوگئی لیکن پورے نو ماہ بعد راجکماری کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ راج کماری کو فقیر کی بات یاد آ گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس نوزائیدہ بچے کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا جائے۔

اس زمانے میں قریب ہی کے علاقے میں راجا انی رائے کی حکومت تھی۔ اس علاقے کی ایک ڈومنی اور اس کا شوہر دریا پر پانی بھرنے آئے تو ان کی نظر ایک بہتے ہوئے صندوق پر پڑی۔ ڈوم نے صندوق کو نکالا، اور جب اس کو کھول کر دیکھا تو کھلے ہوئے گلاب کی طرح ایک تروتازہ بچہ ہاتھ آیا۔ ڈومنی اور ڈوم اسے بڑے چاؤ سے گھر لے آئے، بڑے پیار سے اس کی پرورش شروع کی اور اس کا نام ''بیجل'' رکھا اور آبائی رسم ورواج کے مطابق اسے گانا بجانا سکھایا۔ جوان ہونے کے بعد بیجل بھی دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ ادھر ادھر مانگنے جاتا اور گانے بجانے کے طفیل کچھ نہ کچھ کماتا۔

ایک دن کسی جنگل میں کوئی سیلانی فقیر آیا۔ ہرن کا شکار کیا، اس کا کچھ گوشت بھون کر کھایا اور باقی ماندہ گوشت و پوست اور آنتیں کسی طرف جھاڑیوں میں ڈال کر چلا گیا۔ نہ جانے ان آنتوں میں کیا کرامت چھوڑ گیا کہ جیسے جیسے ان کو جنگل کی ہوا لگی، ان میں سے ایک دلکش نغمہ پیدا ہونے لگا۔ اس نغمے کو سن کر آس پاس کے چرند و پرند جمع ہونے لگے اور اس سحر آفرین نغمے سے ان پر ایک عجیب سی محویت طاری ہونے لگی۔ حسنِ اتفاق سے جنگل سے گذرتے ہوئے بیجل نے بھی یہ آواز سنی۔ قریب آ کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بڑی دیکھ بھال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ نغمہ ہرن کی آنتوں سے پیدا ہو رہا ہے۔ بیجل ان آنتوں کو اپنے گھر لے آیا۔ چنگ پر چڑھایا اور گز لے کر اسے بجانے بیٹھا تو ویسی ہی نغمگی ابھرنے لگی۔ اس نغمے کی اثر آفرینی سے بیجل سروں میں الاپتا اور جب اس کے آس پاس ہرن اور دوسرے پرندے وغیرہ جمع ہو جاتے تو ان میں سے چند کو پکڑ لیتا اور اپنے گھر والوں کی گذراوقات کے لئے لے آتا۔ رفتہ رفتہ بیجل کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

بیجل کی پیدائش کے دن راجا انی رائے کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ چونکہ راجا انی رائے کو سات

لڑکیاں پہلے ہی سے تھیں۔اس لئے اس نے اس نومولود بچی کو صندوق میں بند کرا کے دریا میں ڈلوا دیا۔یہ صندوق بہتے بہتے رائے ڈیاچ کی سرحد میں آ گیا۔جہاں رتن رائے نامی ایک کمہار کے ہاتھ لگا۔وہ کمہار اولاد سے محروم تھا اس لئے بڑے ارمانوں سے بچی کو گھر لے گیا اور اس کی نشو و نما میں دلچسپی لینے لگا۔اس نے اس بچی کا نام سورٹھ رکھا۔رتن رائے رائے ڈیاچ کی رعایا میں شامل ضرور تھا، لیکن پھر بھی راجا انی رائے سے اس کے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔ جب سورٹھ جوان ہوئی اور اس کے حسن و جمال کا شہرہ راجا انی رائے نے سنا تو رتن رائے سے رشتے کی خواہش ظاہر کی، جس کو اس نے بخوشی قبول کر لیا اور بڑی دھوم دھام سے تیاری کرنے لگا۔

رائے ڈیاچ کو جب اس واقعے کی خبر ملی تو بے حد ناراض ہوا، فوراً ہی رتن رائے کو طلب کیا اور بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کر یہ حکم سنایا کہ سورٹھ کو میرے حوالے کر دے۔سورٹھ بجائے راجا انی رائے کے رائے ڈیاچ کے ہاتھ لگ گئی۔راجا انی رائے نے جب یہ سنا تو آگ بگولہ ہو گیا، چنانچہ رائے ڈیاچ سے جنگ کرنے کے لئے ایک بڑا لشکر تیار کرایا اور جونا گڑھ کی طرف روانہ ہو گیا۔قریب قریب بارہ مہینے تک جونا گڑھ کا محاصرہ کئے رہا لیکن دال نہ گل سکی، آخر اپنے وطن لوٹ آیا اور انتقاماً ایک بڑے طشت میں بے بہا مال و گوہر رکھ کر تمام شہر میں اس طشت کو پھرایا، ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ جو کوئی رائے ڈیاچ کا سر لا کر میرے سامنے پیش کرے گا، اس کو نہ صرف طشت عطا کیا جائے گا بلکہ اس کے علاوہ بھی جو انعام چاہے گا بطور خاص عطا کیا جائے گا۔

بیجل کی بیوی نے جب یہ اعلان سنا تو پھولی نہ سمائی، زر و جواہر سے بھرا ہوا طشت یہ کہہ کر حاصل کر لیا کہ میرا شوہر یہ فرض انجام دے گا اور بہت جلد ہمارے راجا کی مراد پوری ہو جائے گی۔جب بیجل گھر آیا اور اسے یہ سب کچھ معلوم ہوا تو وہ بے حد ناراض ہوا، کہنے لگا ''مصیبت کی ماری تو نے یہ کیا کیا، اگر میں قول پر پورا نہ اترا تو راجا ہم سے کسی کو زندہ نہ چھوڑے گا۔'' آخر کئی دن کے سوچ بچار کے بعد بیجل اپنے ساز کو بنا سنوار کر جونا گڑھ کی طرف روانہ ہوا۔جونا گڑھ پہنچنے کے بعد ایک شام کو قلعے کے نزدیک پہنچا اور ساری رات بڑے والہانہ انداز سے چنگ بجاتا رہا۔ چنگ کی آواز رائے ڈیاچ نے رنگ محل میں بیٹھے بیٹھے سنی تو بے قابو ہو گیا۔اس نے محل کے ایک بالائی دروازے سے جھانک کر بیجل کو مخاطب ہو کر کہا ''مانگ جو تجھے مانگنا ہے۔'' بیجل نے جواب دیا ''مجھے آپ کے روبرو حاضر ہو کر کچھ عرض کرنا ہے'' رنگ محل کے خاص راستے سے بیجل کو بلانا ذرا دقت طلب تھا، اس نے لٹکائی ہوئی رسی کے ذریعے اس کو بلا کر شرف باریابی عطا کیا۔بیجل راجا کے سامنے حاضر ہو کر آداب بجا لایا۔راجا نے پھر سے کہا ''مانگ جو کچھ تجھے مانگنا ہے۔!'' بیجل نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا ''جو کچھ مانگنا چاہتا ہوں وہ مانگ تو لوں، لیکن سوچتا یہ ہوں کہ اگر وہ عطا نہ ہوا تو خواہ مخواہ تیرے جود و سخا پر حرف آئے گا۔'' راجا نے جواب دیا ''تو کوئی فکر نہ کر، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ تو مانگے گا، تجھے فوراً ملے گا'' بیجل نے دیکھا کہ اب تو اپنا کام بن گیا، ہاتھ جوڑ کر بولا ''اے سخی! میں دان میں تیرا سر مانگتا ہوں'' راجا نے مسکراتے ہوئے کہا ''تو نے مانگا بھی تو میرا سر مانگا! بھلے آدمی! ان چند ہڈیوں سے تجھے کیا حاصل

ہوگا!'' بیجل نے جواب دیا'' دینے والے کو اس سے کیا سروکار، میں عام بھکاریوں کی طرح مال و متاع کا طالب نہیں ہوں، تیرے سر کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔'' راجا نے بیجل کی یہ بات سن کر کہا'' اگر تیری مرضی ہے تو میں بخوشی اپنا سر تیرے حوالے کرتا ہوں۔''

رنگ محل میں ایک اجنبی آواز سن کر سورٹھ، رائے ڈیاچ کی بہن اور ماں وغیرہ سب جمع ہو گئیں، اور جب انہیں بیجل کی اس عجیب و غریب طلب کا علم ہوا تو سب نے اس کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن وہ کسی عنوان اور کسی بات پر تیار نہ ہوا۔

قول کے دھنی راجا نے بیجل کو اپنا سر دے دیا۔ جونا گڑھ میں آہ و بکا کا ایک حشر سا برپا ہو گیا۔ محل کے گوشے گوشے میں آنسوؤں کا سیال امڈنے لگا۔ بیجل کا دل و دماغ بھی بے قابو سا ہو گیا۔ اسے اس پر بے حد افسوس تھا لیکن اب پشیمانی بے کار تھی۔ کہتے ہیں کہ جب بیجل رائے ڈیاچ کا سر لے کر راجا انی رائے کے پاس پہنچا تو اس نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ'' اے بیجل! تو نے ایسے سخی کو نہ بخشا تو میرے ساتھ کیا اچھا سلوک کرے گا؟ آج سے تو میرے ملک میں رہنے کے قابل نہیں!'' بیجل غیر متوقع طور پر راجا انی رائے کی لعن طعن سن کر دیوانہ ہو گیا۔ ویسے ہی راجا رائے ڈیاچ کا سر ہاتھ میں لئے پھر جونا گڑھ کی طرف دوڑا۔ جب شہر میں داخل ہوا اور محل کی طرف دیکھا تو ہر طرف آگ کے لپکتے ہوئے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ رائے ڈیاچ کی چہیتی رانی سورٹھ ستی ہونے والی ہے۔ فوراً ہی والہانہ انداز میں آگ کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا، اور بغیر کسی پس و پیش کے دہکتے، دمکتے اور لپکتے ہوئے شعلوں میں کود کر اپنی جان بھی دے دی۔ (12)''

'' سُر سورٹھ'' کے اردو ترجمے کے چند اقتباسات بیانیہ کو واضح کرتے ہیں۔

سن لے ''سورٹھ'' کے خوبرو سرتاج — اک انوکھا سوال لایا ہوں
نرغہ ء دشمناں میں ہوں لیکن — تیرا سر مانگنے کو آیا ہوں
جلد سائل کو سرخرو کر دے — ورنہ محروم آرزو کر دے
پیاری 'سورٹھ' کے خوبرو سرتاج — میری جھولی کی بھی رہے کچھ لاج
چھوڑ کر میں ہر ایک دروازہ — سر جھکائے ہوں تیرے در پر آج

گم ہوں اس سوچ میں کہ اے 'بیجل' — کیا ہے یہ ساز اور یہ آواز
کس لئے اتنی دور سے آیا — کاش معلوم ہو مجھے یہ راز

سر کو تجھ پر نثار کرتا ہوں — لے یہ ناچیز استخواں لے جا
نہیں ایفائے عہد میں تاخیر — تو جہاں چاہے اب وہاں لے جا
یہ ترے کام آسکے شاید — جان حاضر ہے جانِ جاں لے جا

اور کیا دوں میں تجھ کو نذرانہ — سن کے یہ تیری سرمدی آواز
سر مجھے بارِ دوش ہے لے جا — ہے نہیں مجھ کو بار دوش پہ ناز

ایک سر کیا جو لاکھ سر ہوتے — وہ بھی قربان ساز پر ہوتے
لاکھ سر دے کے اے مغنی ہم — تیرے ممنون کس قدر ہوتے

سر بھی دینا قبول تھا اس کو — بڑھ کے 'خادم' سے تھی سخا اس کی
پوچھتا تھا 'ڈیاچ' 'بیجل' سے — در حقیقت جو تھی رضا اس کی
نیستی ہے کہ رازِ ہستی ہے — دل کی مستی عجیب مستی ہے

کتنی پر نور ان کی آنکھیں ہیں — بام و درجن سے جگمگا تے ہیں
کون جانے کہ مصلحت کیا ہے — جو یہ سائل محل میں آتے ہیں
بادشاہانِ وقت کس کے لئے — سَر جھکاتے ہیں سر کٹاتے ہیں

میرے دل میں اتر گئی ہر تان — ایک سر کیا ہزار سر قربان
لیکن ایسا عطا سے کیا حاصل — اور کچھ مانگتا مرے مہمان
بے بضاعت ہے ٹوٹنے کے بعد — آب و گل کا مجسمہ، انسان

چل بسا رات وہ مہاراجہ — سوگوار اس کی راجدھانی ہے
ایک سورٹھ ہی پہ ہی نہیں موقوف — اشکبار آج ہر جوانی ہے
جونا گڑج میں بلا کا ماتم ہے — نوحہ خوانی ہی نوحہ خوانی ہے
جانے کیا کر گیا وہ موسیقار — خاک میں مل گیا گُلِ 'گرناز'

ہاتھ ملتا ہے لے کے سر 'چارن' — کچھ نہ لیتا تو سب سے بہتر تھا
اس سخی 'ڈیاچ' نے دیا جو کچھ — صرف پاسنگ کے برابر تھا
لے کے آیا ہے سر کو اب واپس — حوصلہ دیکھئے، تو 'بیجل' کا
بڑھ گیا 'ڈیاچ' کی سخاوت سے — اور بھی اشتیاق سائل کا

راگ باقی رہا نہ رنگ کوئی — 'ڈیاچ' کے بعد مر گئی سورٹھ
اس جہاں فریب ساماں سے — دل گرفتہ گذر گئی سورٹھ
پائے گا آکے کیا ادھر 'بیجل' — کس کو لوٹائے گا یہ سر 'بیجل'

شاہ جو رسالو۔۔جدید عہد کا لوک بیانیہ:

اٹھارہویں صدی کے عظیم شاعر، عاشق اور انقلابی، شاہ عبدالطیف بھٹائی مکاں اور زماں کے دائرے سے بلند ہو چکے ہیں۔انہوں نے سندھ کی دھرتی پر جنم لیا اور اٹھارہویں صدی میں سندھ کے دکھوں کے جام پیئے لیکن جب انہوں نے اس زمین اور اس زمانے کو تخلیقی اظہار کے سانچے میں ڈھالا تو ان کی آواز صدیوں پر اور دھرتی کے کونے کونے تک پھیل گئی۔ جب آپ کی تخلیقی جڑیں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں اور جب آپ اس عہد کے لوگوں کی آسوں پیاسوں کے ترجمان بن جاتے ہیں تو آپ صرف کسی خاص خطہء زمین تک محدود نہیں رہتے ۔نہ کسی خاص زمانے کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔یوں بھی شاہ کا سندھ محض اٹھارہویں صدی کا سندھ نہیں تھا۔اس کے ڈانڈے ہزاروں سال قدیم زمانوں سے جا ملتے ہیں۔سندھ ایک عظیم تہذیبی امتزاج کے تجربے سے گزرا۔اس دھرتی نے ہزاروں برس سے مختلف قوموں، تہذیبوں، زبانوں اور مذہبوں کا ذائقہ چکھا ہے۔سبطِ حسن کے بقول ''اسوری، دراوڑ، آریہ، ساکا، کشان، ہُن، عرب، افغانی، ایرانی، ترک، مغل کون ہے جو یہاں نہیں آیا۔آخر خود شاہ کے اجداد بھی تو باہر سے آکر یہاں بسے تھے اور حالیہ دہائیوں میں سندھی پہچان کے سب سے بڑا نشان، سب سے بڑی علامت جی ایم سید کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔جنہوں نے شاہ کو اس طرح سمجھا جیسے سندھ کا ایک ہاری سمجھتا ہے اور سندھ کو اس طرح اپنے وجود کا حصہ بنایا، جیسے سندھ اور سید ایک ہو گئے ہوں۔''شاہ جو رسالو'' اس اجمال کی تفصیل ہے۔

پہلے کچھ پرانی روایات دہرالیں: شاہ لطیف سترھویں صدی کی آخری دہائی میں 1640ء میں ہالہ ضلع حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ان کی ولادت کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کے والد سید حبیب اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر کوٹری میں آباد ہو گئے۔شاہ کے آباؤاجداد پندرھویں صدی کے آغاز سے ہرات سے نقل مکانی کر کے سندھ میں آباد ہوئے تھے۔ان کے بارے میں یہ متھ تاریخی طور پر رد کی جا چکی ہے کہ وہ اُمّی تھے۔اس لئے اس پر بحث کر کے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ان کے عشق کی کہانی بھی بار بار دہرائی جا چکی ہے۔لیکن اسے ایک بار پھر دہرانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

''سید حبیب کے ایک خوشحال مرید مرزا مغل بیگ ارغون بھی کوٹری میں رہتے تھے۔مرزا کے گھر میں اگر کوئی بیمار ہوتا تو سید حبیب کو علاج اور دعائے صحت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ایک بار مرزا ارغون کی جوان بیٹی بیمار ہوئی تو حسب معمول سید حبیب سے درخواست کی گئی۔اتفاق سے ان کی طبیعت بھی اچھی نہ تھی۔لہٰذا انہوں نے شاہ

عبداللطیف کو مرزا ارغون کے پاس بھیج دیا۔ شاہ لطیف مسیحائی کرنے لگے تھے لیکن خود تپ عشق میں مبتلا ہو گئے۔ مرزا ارغون کو خبر ہوئی تو وہ شاہ لطیف کے خاندان کے درپے ہو گیا۔ سید حبیب نے بھی بیٹے کو سمجھایا لیکن ناکام رہے۔ آخر کار انہوں نے مجبور ہو کر کوٹری کی سکونت ترک کر دی اور دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔

اس حادثہ سے شاہ کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے گھر بار چھوڑا۔ فقیری بھیس میں جنگلوں، پہاڑوں کی راہ لی۔ جوگیوں کے سنگ پہاڑوں میں بسیرا کیا۔ وہاں سے ٹھٹھہ وارد ہوئے۔ مخدوم محمد معین سے دل کی روشنی پا کر گھر لوٹے۔ انہی دنوں دَل قوم کے سرکشوں نے مرزا مغل بیگ کی حویلی پر یلغار کر دی۔ گھر کے تمام مرد مار دیئے گئے۔ شاہ حبیب نے اپنے مرید کے لٹے پٹے خاندان کو سہارا دیا۔ جس سے متاثر ہو کر مرزا مغل کے گھر والے مرزا کی بیٹی سیدہ کی شاہ لطیف سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئے۔ ان کی شادی ہو گئی۔ یہ اٹھارہوں صدی کے ابتدائی برس تھے۔

پنجاب کے صوفی بزرگ اور اولین پنجابی شاعر بابا فرید گنج شکر شاہ لطیف سے پانچ سو برس قبل تیرھویں صدی میں گزر چکے تھے۔ ان کا ماحول مکمل طور پر عربی، فارسی کا ماحول تھا لیکن انہوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں پنجابی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، شاہ لطیف، بابا فرید کی شخصیت اور شاعری سے کسی حد تک آگاہ تھے۔ اس بارے میں تحقیق سے کچھ ثابت نہیں ہے لیکن انہوں نے سندھی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے سندھ میں بھی فارسی عربی کی روایت کے باوجود سندھی شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی لیکن یہاں اس بات کا تقابل دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس طرح تیرہویں صدی کا پنجاب اندرونی شورشوں اور منگول حملوں کا شکار تھا، اسی طرح شاہ لطیف اور بلھے شاہ کی اٹھارہویں صدی مغل سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ اور نادر شاہ ایرانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے چور چور تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پنجابی شاعر کے برعکس شاہ کی شاعری میں اس سیاسی افراتفری کے واضح اشارے نہیں ملتے۔ شاہ نے اپنے عہد کی خارجی شورش اور اپنے من کی داخلی کیفیت کو ملا کر وہ گہرائی پیدا کی جس کا جواب آج تک پورے برِصغیر میں پیدا نہیں ہو سکا۔

پنجاب میں شاہ کے دو ہم عصر شعراء گزرے ہیں، وارث شاہ اور بلھے شاہ دونوں کے یہاں اٹھارہویں صدی کی افراتفری اور شورش کے واضح اشارے ملتے ہیں کیونکہ وہ دونوں حملوں کے مراکز لاہور اور قصور سے تعلق رکھتے تھے جب کہ شاہ لطیف سندھ میں حملوں کے مراکز سے فاصلے پر تھے اس لئے ان کے کلام میں اس شورش کا واضح اظہار نہیں ملتا۔ اس حوالے سے سبطِ حسن کے خیال میں اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان ادوار میں عموماً وہی شہر اور دیہات متاثر ہوتے تھے جو فوجوں کی نقل و حرکت کے راستے میں پڑتے تھے۔ دور افتادہ بستیاں غنیموں کی دست بُرد سے بچی رہتی تھیں۔ لوگوں کی روزمرہ زندگی میں کوئی خلل نہیں آتا تھا اور نہ عوام کو اس سے دلچسپی ہوتی تھی کہ دہلی کے تخت سے کون اتارا گیا اور کس کے سر پر تاج رکھا گیا۔ بھٹ شاہ کی چھوٹی سی الگ تھلگ بستی کلہوڑوں کے مرکز شکار

پور سے سیکڑوں میل دور واقع تھی اس لئے عین ممکن ہے کہ اس بستی نے کلہوڑوں کی طاقت آزمائیوں اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے کوئی اثر قبول نہ کیا ہو۔ ورنہ شاہ لطیف کا ساذہین اور ذکی الحس شاعر جس نے فرنگی سوداگروں تک کا تذکرہ کیا ہے ملکی واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

جس طرح بابا فرید نے ملتان سے دور ایک ویران پتن پر ڈیرے ڈال دیئے تھے جو بعد میں پاک پتن کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح شاہ لطیف نے شادی کے کچھ عرصہ بعد کوٹری سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ایک غیر آباد مقام کو اپنا مسکن بنایا جو بعد میں بھٹ شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے والد سید حبیب 1752ء میں انتقال کے بعد یہیں دفن ہوئے۔

1707ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو شاہ لطیف صرف سترہ اٹھارہ برس کے تھے۔ سندھ میں کلہوڑا عہد پروان چڑھ رہا تھا۔ مغل صوبے دار یار محمد کلہوڑا کے بیٹے نور محمد نے اپنی جاگیر کو سیوستان اور ٹھٹھہ تک بڑھایا۔ 1739ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا تو سندھی عوام نے نور محمد کلہوڑا کی سربراہی میں ایرانی حملہ آور کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا لیکن وہ شکست سے دوچار ہوئے اور نور محمد کو تاوانِ جنگ کے علاوہ تینوں بیٹے بطور یرغمال نادر شاہ کے حوالے کرنا پڑے۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ 1747ء میں نادر شاہ کا قتل ہوا تو اس کے تینوں بیٹے ایران سے واپس آ گئے۔ نور محمد نے خراج دینا بند کر دیا۔ جس پر احمد شاہ ابدالی نے سندھ پر حملہ کر دیا اور سکھر، بھکر اور شکار پور جیسے اہم سندھی مراکز اپنے قبضے میں کر لئے اس اثناء میں شاہ لطیف 1752ء میں انتقال کر گئے۔

شاہ لطیف نے سندھی زبان کو بھرپور انداز میں اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان کا تصوف اقتدار کے مراکز اور درباروں سے دور پروان چڑھا۔ یوں بھی سندھ وادی میں تصوف کی تاریخ شہنشاہیت کی نفی کرنے، بیرونی حملوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے، قتل وخونریزی کو ناجائز قرار دینے، مذہبی منافرت سے بلند ہو کر سوچنے اور مظلوم عوام کے حق میں آواز بلند کرنے کی تاریخ ہے۔ اس پس منظر میں شاہ کی شاعری کا انوکھا رنگ ہے۔ وہ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ ان کی شاعری پر بھگتی کے گہرے اثرات پڑے۔ انہوں نے عشق و معرفت کے رموز سسّی پنوں، لیلا، چنیسر، سوہنی مہینوال اور عمر ماروی کے پردے میں بیان کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے راگوں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا۔ ان کی ہر داستان کسی نہ کسی راگ کی بنیاد پر ہے۔ حتیٰ کہ سر سورٹھ تو رائے ڈیاج اور گائیک بیجل کے حوالے سے موسیقی کی عظمت کا شاہکار ہے۔ شاہ کے وحدت الوجود کی بنیاد سندھ کی دھرتی ہے۔ سندھ سے ان کا وجودی رشتہ ہے۔ یہ تصور کہ کائنات اور تمام انسان، جلوہء خداوندی کے مختلف روپ ہیں، شاہ کی شاعری کا حقیقی جوہر ہے۔ جب کائنات کے ذرے ذرے میں اسی کا وجود پایا جاتا ہے تو مذہب اور رنگ و نسل کے جھگڑے کیا ہیں۔ میں اور تو کا فرق کیوں ہے اسی لئے شاہ کی داستانوں میں یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ کون سے کردار ہندو ہیں اور کون سے مسلمان۔ یہی وسیع المشربی ان کے کلام کی جان ہے۔

ہو گئے ایک مل کے ذات وصفات

مٹ گیا فرق عاشق ومعشوق

ہم ہی کوتاہ بیں رہے ورنہ

وہی خالق ہے اور وہی مخلوق

غیر محدود ہے جلال اس کا

دہر آئینہ جمال اس کا

روح انساں میں جلوہ فرما ہے

پرتو حُسن بے مثال اس کا

زندگی، موت، سانس، دل کی پھانس

کون جانے ہیں تیرے کتنے نام

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ شاہ لطیف زمان ومکاں سے ماورا ہیں۔ وہ ہر زمین اور ہر زمانے کے شاعر ہیں۔ اس لئے وہ آج کے بھی شاعر ہیں اور آج کے تمام تقاضوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔ اس تناظر میں، چند مثالوں کا ذکر کروں گا۔ جو آج کے سندھ کی جدوجہد کو شاہ سے جوڑتی ہیں۔ سب سے پہلے میرے پیش نظر سر ماروئی ہے جو آج کے سندھ کی بغاوت، آزادی اور وطن کی محبت کا سب سے بڑا استعارہ ہے۔ یہ کہانی آپ سب کو ازبر ہے، اس لئے میں نہیں دہراؤں گا۔ اور سر ماوئی سے چند اقتباسات پیش کروں گا۔

مجھے پیارے ملیر کی سوگند

جال میں تیرے میں نہ آؤں گی

اے عمر سوگوار آنکھوں سے

یوں ہی آنسو سدا بہاؤں گی

چھوڑ کر ماروؤں کی بستی کو

چین ہرگز یہاں نہ پاؤں گی

مجھ کو سولی ہے تیری سیج نہیں

جان پر اپنی کھیل جاؤں گی

اے عمر تیرا خلعت زرتار

میری لوئی کے سامنے بیکار

ریشمی لمس سے نہ کم ہوگا
دل سے ان پیارے ماروؤں کا پیار
اے عمر لاکھ درجہ بہتر ہے
سیم وزر سے مجھے وطن کی خاک
رنگ و روغن تجھے مبارک ہو
مجھ کو پیارے وہی خس وخاشاک

اب یہ منظر دیکھئے؛

کتنے خوش ہوں گے اے عمر وہ لوگ
رُت ہے برکھا کی آج کل گھر میں
کوئی کاٹے گا، کوئی کاتے گی
اون ہی اون ہوگا ہر گھر میں

کتنے خوش ہوں گے بُن رہے ہوں گے
نت نئی کملیاں وہ کھائر میں
کہتی ہوں گی ملیر کی سکھیاں
کاش آجائے ماروی گھر میں
اے عمر جھونپڑوں کا وہ سکھ چین
کیا ملے گا محل کے بستر میں۔

اور پھر ماروی پکار اٹھتی ہے؛

مٹا دو یہ درو دیوار زنداں
جلا کر خاک کر دو قصر وایوان

اس تناظر میں ماروی سندھ کی روحِ آزادی کا استعارہ ہے، وہ محبت کے نام پر جبر، آمریت اور اقتدار کو دھتکارتی ہے۔ شاہ کے کلام میں عمر سومرو کی طرح جبر اور ہوس کے کئی اور استعارے بھی ملتے ہیں۔ ننگل، چنزو، ہمیر سومرو اور ڈم وغیرہ، اس پس منظر سے پیش منظر میں آئیں تو لگتا ہی نہیں کہ شاہ لطیف گزری صدیوں کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام آج کے سیاسی سماجی، ثقافتی، لسانی اور اقتصادی، تقاضوں کا جیتا جاگتا اظہار ہے۔
شاہ لطیف نے زمین اور زمین والوں سے جس وابستگی کا درس دیا تھا، اسے ہم نے وابستگیوں اور تہذیبوں

کے تصادم میں بدل دیا ہے۔ اس وقت سندھ سمیت ہمارا پورا دیس دہشت گردی کی جس آگ میں جل رہا ہے، وہ شاہ بھٹائی کی تعلیمات سے منہ موڑنے کی وجہ سے ہے۔ اپنے ایک مضمون "شاہ عبداللطیف کی شاعری" میں سبط حسن اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ:

"زمین اور زمین والوں سے وابستگی کا جو تصور شاہ لطیف نے پیش کیا اس سے پیار اور محبت کے سوتے پھوٹتے تھے۔

وہ اس بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وابستگی کے دائروں کو ٹکراؤ کی بجائے تنوع کی ہم آہنگی کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

طرز عمل اور طرز فکر و احساس کا وہ انداز جو دوریاں پیدا کرے۔ شاہ لطیف کی تعلیمات سے کوئی میل نہیں رکھتا۔ شاہ لطیف کے ذہن میں وابستگی یا وفاداری کے دائرے تو ہیں لیکن ان کی وفاداری الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ مثلاً وابستگی کا ایک وہ دائرہ ہے جو فقط خاندان والوں تک محدود ہوتا ہے، دوسر دائرہ وہ ہے جس میں ہم کام کرتے ہیں یا روزی کماتے ہیں، تیسرا دائرہ محلہ داروں یا گاؤں والوں کا ہے۔ چوتھا دائرہ اس خطے کا یا علاقے کا ہے جس میں آپ آباد ہیں۔ پانچواں دائرہ پورے ملک پر محیط ہے اور چھٹا دائرہ پوری دنیا کو اپنے حلقے میں لے لیتا ہے۔ ان کے علاوہ اور دائرے بھی بنتے ہیں۔ مثلاً آپ کے ہم خیالوں کا حلقہ جس سیاسی، تہذیبی یا ادبی جماعت سے آپ وابستہ ہوں اس کا حلقہ، غرضیکہ ہر انسان بے شمار حلقوں سے وابستہ ہوتا ہے مگر ایک حلقے سے وابستگی دوسرے تمام حلقوں کی وابستگی کی نفی نہیں کرتی۔ وابستگی کی سطحیں الگ الگ ہوسکتی ہیں لیکن ان میں ٹکراؤ ضروری نہیں۔ رہ گئی وابستگی کی شدت سو اس کا انحصار انسان کے ذاتی تجربات، جذبات اور احساسات پر ہوگا۔

ان دائروں میں ایک دوسرے سے کہیں ٹکراؤ یا تصادم نہیں ہے۔ بلکہ یہ دائرے انسانی رشتوں کا اثبات کرتے ہیں۔ اس ملک میں ایک دائرہ مختلف مذاہب کا دائرہ بھی ہے۔ سندھ کا معاشرہ یا شاہ کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔ مثلاً ہم ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی، پارسی بھی ہیں، بہائی بھی، مسیحی بھی ہیں اور مختصر جماعت یہودیت کو ماننے والوں کی بھی ہے۔ یہاں سکھ بھی بستے ہیں اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والے ملکی یا غیر ملکی آبادی کے لوگ بھی ہیں۔ اس ملک کے بانی محمد علی جناح نے ان مذہبی دائروں میں آزادی سے زندگی بسر کرنے کی نوید سنائی۔ قائد اعظم نے غالبًا شاہ لطیف بھٹائی کو نہیں پڑھ رکھا ہوگا۔ لیکن انہوں نے ہر فرد کے لئے مذہبی آزادی کا جو اعلان کیا۔ وہ شاہ لطیف کی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔ میں اپنی بات مرحوم آغا تاج محمد کے اس چونکا دینے والے قول پر ختم کرتا ہوں:

"دنیا جوں جوں پرانی ہوتی جارہی ہے، اور سندھی زبان اپنی منزلوں سے گزر کر نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے اسی اعتبار سے شاہ صاحب کا کلام بھی روزمرہ، زندہ، جاوید ہوتا چلا جارہا ہے۔

'شاہ جو رسالو' جدید پاکستان کا لوک بیانیہ ہے۔

منصوری موج کا شاعر: سچل سرمست (1829-1739):

سچل کا دور اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کا درمیانی دور ہے جسے محمد ابراہیم جویو نے سندھ کا بحرانی دور کہا ہے۔ سچل کا ذکر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ان کا ذکر سامی کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ شاہ، سچل اور سامی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی وہ تکون ہے جس کا ہر کونہ سندھ کے وجود کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ کہنا بھی رسمی بات نہیں ہے کہ جتنی سچل کی آج ضرورت ہے۔ اتنی ضرورت ان کے اپنے زمانے میں بھی نہیں تھی۔ جویو صاحب کے لفظوں میں:

''شاہ، سچل اور سامی سندھ کی تاریخ میں ایک ہی دور سے تعلق رکھتے تھے بلکہ کم وبیش ہم عصر شاعر تھے۔ سچل اور سامی نے تو تقریباً ایک سو سال کی عمر پائی اور 1829ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سامی 120 سال کی عمر میں 1850ء میں انتقال کر گئے۔ درازا اور شکار پور کے درمیان صرف دو دن کا پیدل سفر ہے اور اگر سواری استعمال کی جائے تو ایک دن کا بھی سفر نہیں ہے۔ پھر ایک سو سال کی مدت تھوڑی مدت بھی نہیں جبکہ وہ عام آدمی بھی نہ تھے کہ ایک دوسرے کی باتوں سے ناواقف ہوتے جب یہ دونوں 22 سال کے نوجوان تھے شاہ کا انتقال ہو گیا''

ایک روایت کے مطابق شاہ نے جب پہلی بار سچل کو دیکھا تو وہ بے اختیار بول پڑے کہ ''یہ لڑکا ان تمام نقابوں کو الٹ دے گا جو ہماری آنکھوں پر پڑی ہوئی ہیں۔'' ایک اور روایت کے مطابق شاہ نے کہا تھا'' ہماری پکائی ہوئی ہنڈیا کا ڈھکن یہ کھولے گا''۔ پنجاب میں شاہ کے ہم عصر بلھے شاہ تھے جنہوں نے جب ان نقابوں کو الٹا تو ان کے محبوب شاہ عنائت قادری ان سے ناراض ہو گئے اور بلھے شاہ کو کہنا پڑا۔

کنجری بنیا میری عزت نہ گھٹ دی
مینوں نچ کے یار مناون دے

بالکل اسی طرح سچل نے بے خوف ہو کر تمام سربستہ رازوں کو کھول دیا تھا۔ اسی لئے سچل مذہبی حلقوں میں ناپسند کئے جاتے تھے۔ انہوں نے خود کو وقت کا منصور کہا جس نے سربستہ رازوں کو کھولنے کا انعام موت کی صورت میں قبول کیا تھا۔ سچل نے لکھا:

''منصور نے جو اس تاریک زمانے میں کیا وہی میں آج حکومت الٰہیہ کے لئے کر رہا ہوں۔
میں وہی بادشاہ ہوں، وہی بادشاہ ہوں وہی بادشاہ ہوں''

سچل نے یہ بھی کہا تھا

میرا چہرہ اسلام ، میرے گیسو کفر ہیں

سچل نہ شیخ تھے نہ مخدوم، وہ نہ قاضی تھے، نہ ملا، نہ مبلغ، چنانچہ

''ایک دن گمبٹ کی مسجد میں بہت سے علماء جمع ہوئے اور طے کیا کہ ایک وفد والئی ریاست خیر پور سے ملے اور ان پر زور دے کہ سچل کی یاوہ گوئیوں پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ والئی ریاست خیر پور سچل کا عقیدت مند تھا۔ اس نے وفد سے بڑی سختی سے کہا۔ آئندہ سے میرے سامنے ایسی بے بنیاد اور لغو شکایتیں نہیں آنی چاہئیں۔ لوگ میاں عبدالرزاق کی سرکردگی میں سچل پر پابندی عائد کرنے کا انتظار ہی کرتے رہے جب کہ وہ سچل سے متاثر ہو کر اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے حلقہ شاگردی میں شامل ہو گیا۔''

اگر حکمران سچل کے عقیدت مند نہ ہوتے تب بھی سچل نے ایسا ہی ہونا تھا۔ وہ سراپا تحیّر تھے:

کیستم ، من کیستم، من کیستم
در تحیّر مندیم ، من کیستم

(میں کون ہوں، میں کون ہوں، میں کون ہوں
میں حیرت کے عالم میں ہوں کہ آخر میں کون ہوں)

یہ تحیّر اپنی ذات کی پہچان سے پیدا ہوتا ہے۔ سچل کے اپنے لفظوں میں:

جیسے کہ سورج، روشنی کی تلاش میں متحیر ہے
مچھلی پانی کی تلاش میں ہے اور پانی ہوا کی
تارے کہکشاں کی اور موج سمندر کی
قطرہ بارش کی اور شاہ ، شہنشاہ کی
سب کچھ ذاتِ مطلق ہے جو متحیر ہے
سچو سے ، خود خدا نے ایسا کہا ہے

سچل نے کہا، دین اور کفر دام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''میں کافر ہی رہوں گا، خواہ میں کلمہ بھی پڑھ لوں، اور یہ کہتے کہتے جب سچل اس جہاں سے گزر گئے تو اس کے صرف چودہ سال بعد 1943ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ سچل بہت پہلے اپنے زندگی میں دُہائی دے چکے تھے۔

ہندو مسلمان، خود کو محبت کے دھاگے میں پرو لیں گے
اس سے پہلے کہ اتنی دیر ہو جائے اور سورج مغرب سے طلوع ہو

سچل نے اس داخلی انتشار اور ہندو مسلم تفرقے کی بار بار نشاندہی کی، جس کا فائدہ مغرب یا گوری اقوام کو پہنچ رہا تھا۔

سورج مغرب میں ٹھہر سکتا ہے

اور تب ممکن ہے کہ بہت دیر ہو جائے

اہل مغرب تاریکی میں تمہارے خزانے لوٹ لیں گے

وہ ترائی اور پہاڑوں میں تمہاری فصلیں اجاڑیں گے

مردان خدا اور اہل دانش و بینش

پہیلیوں میں بات کریں گے

وقت ہے کہ متحد ہو جاؤ

وقت ہے کہ تم جاگ جاؤ

سچل لکھتے ہیں:

مذہب نے دنیا بھر کے لوگوں میں شکوک پیدا کر دیے ہیں

سچل کی رندی اور مستی محبت اور عشق کی سرمستی ہے۔ جو منصور کا سر تن سے جدا کرتی ہے، جو بلھے شاہ کو محبوب کے در پہ نچاتی ہے۔ سچل کہتے ہیں:

بے شک یہی وہ شراب ہے جس نے

منصور کا سر تن سے جدا کیا

پیار پہلے سرشار کرتا ہے اور پھر کسی کے حواس پر چھا جاتا ہے

اے سچو! جنہوں نے یہ شراب گلے سے اتار لی ہے

ان کی گردنوں میں پھانسی کا پھندا پڑتا ہے

اس سے بھی آگے بڑھ کر سچل کہتے ہیں:

اے ملاّ! اگر تو اس شراب کا مزہ چکھ لے

تو تو ایک کونے میں جا کر اپنے چہرے پر سیاہی مل لے گا

اپنے حسن میں مگن اور گناہ و ثواب سے ماورا سچل، حقیقی انسان دوستی کے پرچارک ہیں۔ وادی سندھ کا یہ تصوف کثرت میں وحدت کی بات کرتا ہے۔ کثرت میں وحدت کی تلاش ہی سچی انسان دوستی ہے۔ کثرت میں وحدت ایک رنگا رنگی کا اظہار ہے۔ سچل کے مشہور بول ہیں:

"کبھی عیسیٰ، کبھی موسیٰ، کبھی فرعون کی شکل میں، مَیں نے حکمرانی کی

کبھی منصور، کبھی شمس الحق کی شکل میں مَیں نے خود مصائب و آلام کو دعوت دی

کبھی دارا کبھی سکندر کی طرح مَیں نے فرمانروائی کی
کبھی ایاز کبھی محمود اور کبھی خود کو مَیں نے غلام کہلوایا
کبھی لیلیٰ کبھی مجنوں بن کر مَیں سڑکوں پر پھرتا رہا
کبھی مَیں نے خود کو شداد کہا اور ایک نئی جنت کی تعمیر کی
کبھی وامق و عذرا کبھی شیریں اور فرہاد بنا
کبھی زلیخا کبھی یوسف بن کر مَیں نے مصر پر حکمرانی کی
کبھی مَیں نے خود کو رام، سیتا کبھی لچھمن، اور کبھی راون بنایا
کبھی نمرود بنا کبھی ابراہیم بن کر مَیں نے خود کو آگ میں جھونک دیا
کبھی داؤد کبھی سلیمان بن کر ہواؤں پر حکمرانی کرتا رہا
کبھی پنوں، کبھی سسی بن کر پہاڑوں مَیں مارا مارا پھرا
کبھی مَیں نے گھنٹیاں بجائیں، شنکھ پھونکے
کبھی مَیں نے قرآن کی آیتیں یاد کیں کبھی مَیں نے رقاص کی طرح رقص کیا
کبھی مَیں چیخا، چلایا، کبھی گردش میں رہا
کبھی مَیں نے حریر اور پرنیاں کا لباس پہنا، کبھی مَیں نے لباس کو تار تار کر دیا
کبھی معشوق، کبھی عاشق، مَیں آنکھوں میں سما گیا۔
کبھی مَیں نے نہ ختم ہونے والا وعظ کیا، کبھی مَیں نے رازوں کو افشاء کیا
اب مَیں خود کو سچو کہتا ہوں، کیا مَیں نے خود کو آشکار کیا ہے
اور روحانی سرمدی گیت گائے ہیں۔"

سچل سے پہلے شاہ کے پنجابی ہم عصر بلھے شاہ نے اسی کیفیت کا اظہار ذرا مختلف انداز میں کیا تھا۔ بلھے نے خود کو آشکار کرتے ہوئے کہا تھا:

ڈھولا آدمی بن آیا

یہی محبت کا راستہ ہے اور سچل کے الفاظ میں:

محبت کا راستہ ہی سب سے سچا ہے
دوسرے تمام راستے غلط اور گمراہ کن ہیں
یہی وہ مرتبہ ہے جس میں ڈھولا یا محبوب آدمی بن کر نمودار ہوتا ہے کہ
محبت کرنے والے ہی محبت کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں

فرشتے اور جنتیں اس نعمت سے محروم ہیں

اور جس نے محبت کا یہ بار اٹھایا وہ منصور ہوا، سچل نے محبت اور منصور کو ایک کر دیا۔ سچل، جس طرح محبوب کے حسن جہاں تاب کا ذکر کرتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ فرماتے ہیں:

''محبوب کے چہرے پر پسینے کی بوندیں بھلی لگتی ہیں
وہ یوں چمکتی ہیں جیسے پھول کی پتیوں پر شبنم کے ننھے ننھے قطرے
یہ چمکتے ہوئے موتی چاہنے والوں کے دلوں میں امنگیں جگاتے ہیں
حسینوں نے اپنے چہروں پر زلفیں بکھرا دی ہیں
جیسے سنبل نے صبح سویرے اپنی نرم نرم کونپلیں بکھیر دی ہیں
پری چہرہ نازنینوں نے اپنے کاکل اپنے گالوں پر بکھیر دیئے ہیں
یوں لگتا ہے گویا کالے زہریلے ناگوں نے چاہنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو''

ان خیالات کی تکرار ان کی اردو شاعری میں بھی ملتی ہے:

حیران ہوا، حیران ہوا، اس حسن پہ میں حیران ہوا
دل کس پہ مرا نادان ہوا، نادان ہوا، نادان ہوا
منصور ہو یا سرمد ہو صنم یا شمس الحق تبریزی ہو
اس تیری گلی میں اے دلبر، ہر ایک کا سر قربان ہوا
ہاں عشق کا تیرے ہے دعویٰ مسکین سچل کو میرے صنم
کیا خوب تیری اس الفت میں مسکین سے میں سلطان ہوا

اپنے سندھی کلام میں تو سچل ساری بات کو چند مصرعوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ شفقت تنویر مرزا کے خوبصورت ترجمہ میں دیکھئے:

سچو سارا سچ ہے کل کثرت کا رنگ
الفت آدم ساز ہے، ہنگامے رنگ برنگ
ہندو مومن بھول نہ، سیکھ اسی کے ڈھنگ
بن جا پھول گلاب کا منصور ہی تیرا رنگ

شفقت تنویر مرزا کے لفظوں میں:

''اسی نعرہ منصوری نے انہیں منصور، سرمد، شاہ عنائت شاہ شمس سے وابستہ رکھا۔ اسی نعرے کے باعث فرید الدین عطار، مولانا روم اور جامی ان کے مرشد ہوئے اور اسی باعث انہوں نے پنجابی کے بزرگ شاعر بلھے شاہ کے بارے میں کہا:

بلھے کوں بیراگی کیتو ای، جتھاں دا شہر قصور

بلھے شاہ برِصغیر پاک و ہند کے واحد شاعر ہیں جن کا ذکر سچل نے کیا اور اتنے احترام سے کیا۔
اس وقت سندھ اور پنجاب میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی گونج تھی۔ یہ مشترک مصیبت بھی سچل اور پنجابی شعرا بلھے شاہ، علی حیدر ملتانی، مولوی لطف علی بہاولپوری اور وارث شاہ کے موضوعات میں مشترک تھی۔ اس عہد کے سندھی اور پنجابی شاعروں نے کئی عوامی قصوں سسی پنوں، ہیر رانجھا، ڈھولا مارو یا ڈھول بادشاہ اور سوہنی مہینوال یا سوہنی میہار میں اشتراک کیا۔ تصوف میں وحدت الوجود یا ہمہ اوست اور ویدانت کا موضوع ان میں مشترک تھا۔

سچل کے سندھی کلام کے مرتب اور ممتاز عالم عثمان علی انصاری نے لکھا ہے کہ:

''سندھ کی ادبی دنیا میں سچل ہی ایک ایسا روشن ستارہ ہے جسے زاہدوں کا ایک گروہ محض اس لئے خراج تحسین پیش کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے کہ اس طرح ان کے اعتقاد کو ٹھیس لگتی ہے۔ سچل کے کلام میں تصوف کی اس قدر لاتعداد خوبیاں ہیں کہ وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلم گروہ کے دلوں پر بھی حکومت کرتے ہیں۔''

سچل کے ہیر رانجھو، میں پنجاب سے اشتراک کی گونج یوں سنائی دیتی ہے:

کان میں مندرے ڈال کے چھوڑی اپنی خانی
راوی رُخ سدھار گیا میرا جوگی جانی
چھوڑ کے چاہ پنجاب کی راوی اور گیا
بیٹھے سروں میں بنسری کی تان اڑاتا تھا
آخر اس نے منزل کر لی رنگ پور میں جا
انگ بھبھوت رما کر مانگے بھیک یہاں بنجارہ
اور لباس میں رانجھو آیا چھوڑ کے تخت ہزارہ
جان سکی نہ اس کو، اس نے مجھ برہن کو مارا
سچو جانا رانجھو نے جب حسن دکھایا سارا

اور اس ایک مصرعے میں سچل نے ساری کہانی کھول کر رکھ دی۔

پچھے جھنگ سیال، نُب نہ تخت ہزار جی
(تخت ہزارہ یاد نہیں اور پوچھے جھنگ سیال)

اور شاہ کا سندھ، سچل کے بولوں میں کیسے گونجتا ہے

کلیان ایڈوانی کہتے ہیں:

''سچل نے شاہ کے متعلق موضوعات کو، اپنے سُر کو ہیاری سُر مومل رانو، سر کھمبات، سر جوگ، اور سُر مالکوس میں چھونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اونٹ کی کینہ پروری، مومل کی رانو کی جدائی میں آہ و بکا، ماروئی کا ملیر کے لئے نالہ و شیون، جوگیوں کا مٹر گشت اور محبت کے پیغمبر کی حیثیت سے کوے کا کردار سچل کی شاعری میں ہندو جوگیوں کی شاعری اور ان سے تعلق کا اثر واضح نظر آتا ہے۔''

سچل کے دور کا معاشرہ، بحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔ سچل کو احساس تھا کہ سندھ کے عوام ان سے کیا چاہتے ہیں۔ سچل نے انہیں آگے بڑھنے کا، سلامتی کا ایک خواب دیا، خیر و برکت اور عافیت کا پیغام دیا۔ وہ ان محرومیوں سے آشنا تھے جنہوں نے سندھ کو بحران میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہمارے عہد میں سائیں جی ایم سید نے سیاست کی زبان میں اور شیخ ایاز نے شاعری کی زبان میں ان محرومیوں کی نشاندہی کی ہے۔ سچل سمجھتے تھے کہ سندھی عوام کی محرومیاں، وہ گہرے اور کاری زخم ہیں جو افلاس اور سیاسی بدبینی کسی معاشرے کو لگا سکتی ہے۔ وہ اس بات کو بھی سمجھتے تھے کہ شاعری کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے کیونکہ معاشرے میں حد درجہ احتیاج اور انتشار ہے۔ خوش قسمتی سے سچل سُر اور سوز کے رسیا لوگوں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ سچل نے تنہا رہ کر بھی تنہائی اختیار نہیں کی تھی۔ خود غرضانہ گوشہ نشینی کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر بچوں کی ہنسی کو اور زخموں کے کھلنے کو اور حسنِ یار کو اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کی کراہ کو زبان دینے پر قادر تھے اور ان کی علامتیں انفرادی نہیں ہوتی تھیں۔ ماروئی ملک ملیر اور ہیر جھنگ سیالاں کی بیٹی کا نام بھی تھا اور محبت کی اور انسان کی آزادی کے لئے وحدت الوجودی تڑپ کا بھی۔ سچل نے شاہ کے سُروں کی سورمیوں کو جب اپنے شعروں کا انگ سنگ بنایا تو وہ محبوب سے محبّ ہو گئیں۔ فارسی اور عربی کے زبان دان ہونے کے باوجود سچل نے سندھی میں جو کلام لکھا، شاید اپنے لوگوں سے جڑنے کے لئے یہ ضروری بھی تھا۔ انہوں نے معاشرے کی تفرقہ بازی کی تصویر کشی ہی نہیں کی بلکہ اس انتشار اور مذہبی تفرقے کو ختم کرنے کے لئے تخلیقی اور جمالیاتی تجویزیں بھی پیش کیں، وہ بہر حال اپنے عہد وفا کے پابند تھے اور داخلیت پسند سچل کا خارج سے، دنیا سے ایک جدلیاتی رشتہ بھی تھا۔ اپنی شاعری میں وہ اس کھردرے سچ تک پہنچے کہ لکھنے والا خاموش یا لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ شاعر کو بہر حال فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کو اپنی خاموشی پیش کرے یا اپنا کلام۔ بیسویں صدی کے ایک ادیب کے لفظوں میں انہوں نے کہا کہ لکھنے والا اگر ایک بار سختیوں اور دباؤ کو جھیل گیا تو وہ اس کٹھالی سے نکل کر یہ قبول نہیں کر سکتا کہ ایک بے دخل کسان کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے۔ سچل کے سامنے شاہ عنایت شہید کی جدو جہد تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اپنے لوگوں سے وفاداری باہر سے نہیں آتی، یہ انسانوں کے اپنے اندر ہوتی ہے۔ شاعر اور اس وفاداری کا ایک وحدت الوجودی رشتہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ معاشرے نے لوگوں کو انسانی شرف سے محروم

کر دیا ہے۔ اور ایک نئے منصور کی ضرورت ہے۔ سچل خود کو اپنے عہد کا منصور کہتے تھے۔ کیا خوب کہا بلھے شاہ نے::

''بُرا حال ہویا پنجاب دا

منہ بارہویں صدی پیاریا

سانوں آمل یار پیاریا

لیکن یار کہاں سے ملتا۔ وہ تو دُرّانی حملہ آوروں کے ساتھ ایران اور افغانستان کے بازاروں میں بکنے جا رہا تھا۔ اس کی زلفیں اونٹوں کے کجاووں کے ساتھ بندھی ہوئی اور چُنری تار تار تھی۔ بلھے کے ہم عصر شاہ عبداللطیف بھٹائی سندھ کی خوشحالی اور سارے عالم کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

ہم، محمد ابراہیم جویا کے ان الفاظ پر اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

''ایک طرف شاہ اور سچل تھے، جو قرآن کی تفسیر و ترجمہ کے ذریعے اہل سندھ، ہندو اور مسلمانوں دونوں کی روحانی اصلاح کر رہے تھے۔ دوسری طرف سامی تھے جو یہ کہہ کر کہ ویدن جو ویچار تو کھے سندھی میں سنایاں (آؤ میں ویدوں کی حکمت تمہیں سندھی میں سناتا ہوں) ہندو مذہب اور اس کی مقدس کتابوں اور افکار سے سندھی سماج کو باخبر کرا رہے تھے۔ عربی اور سنسکرت زبانیں جن میں یہ مقدس صحائف ہیں، مشکل زبانیں تھیں اور ہیں۔ یہ زبانیں ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے سمجھنا مشکل تھیں اور اس سے زیادہ مشکل انہیں اپنے آسمانی صحیفوں کو سمجھنے میں ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ ان کی نظر میں تمام حق ان کے اپنے اپنے صحائف میں تھا۔ جن کا ایک ایک لفظ سچا اور برحق تھا۔ جس میں تبدیلی ناممکن اور ان پر حرف گیری ممنوع تھی۔ اسی دور میں انہیں مقدس صحیفوں کے پیشہ ور سمجھانے والے (ملاّ، پنڈت) بھی موجود تھے جنہوں نے ان کی وضاحت اس طرح کی کہ سمجھانے والی بات کو گڈمڈ کر کے اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق قرآن، اور ویدانت کے الفاظ کو توڑ مروڑ دیا اور ایک دوسرے پر لعن طعن کر کے سندھی، سماج میں انسانی ہم آہنگی اور مفاہمت کے عوض تفریق اور فساد کا سبب بنے رہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے ریاست پہ قبضہ کر کے اس کی طاقت کو اپنے ہتھیار بنا کر چاروں طرف ذہنی پستی اور گھٹن کی دنیا قائم کر رکھی تھی۔ شاہ، سچل اور سامی سندھی سماج کو اس تفریق و فساد اور ایسی روحانی گھٹن اور پستی سے بچانا چاہتے تھے اور سندھی سماج میں امن و اتحاد، ذہنی آسودگی، اور ضمیر کی آزادی کی دنیا آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ نئی دنیا کے اس حسین خواب کی تکمیل کا احساس اور بے دھڑک جوش نے انہیں تمام عمر مضطرب اور کوشاں رکھا، اور وہ اس کے لئے اپنے وقت سے اپنی تمام توجہ کے ساتھ اپنا تانا بانا کر انسانی تہذیب کے اسی ایک بہترین اصول کو سمجھا کر نہ صرف سندھی سماج کے بلکہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں عظیم اور امر انسان بن گئے۔''

ان میں سے ایک امر انسان، سچل سرمست کیا آج بھی ہمارے درمیان موجود نہیں ہے اور ہماری پکار پر لبیک نہیں کہہ رہا؟

مجھے تو آج بھی پگل کی آواز میں یہ بول سنائی دے رہے ہیں۔

بن جا پھول گلاب کا، منصوری تیرا سنگ

سندھی لوک گیت:

لوک گیت اپنے جوہر میں از خود لوک بیانیہ ہوتے ہیں۔ سندھ بھی اس قومی یاداشت سے محروم نہیں ہے۔ ہمر چو، ڈھولو، مورو، چھلو، کوڈ ھانو، لوری اور ہو جمالو اس لوک بیانیہ کا اہم حصہ ہیں۔ یہ گیت محض سماجی اتار چڑھاؤ کا اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ مقامی تانا شاہی اور غیر ملکی حملوں کے خلاف بھی جرأتِ اظہار اور سور ماؤں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ھمر چو'ہم راہیوا چو'' (ساتھیو، آؤ) کا مخفف ہے۔ اس کی مثال دیکھتے ہیں۔

ساتھیو بھائیو آجاؤ کھیتوں میں
ہری ہری فصل خوب پکی ہے
ہم سب مل کر کھیت کاٹ لیں
فصل اگا لیں
ساتھیو، بھائیو، آؤ

کوئل کوکے باغوں میں — ھواللہ ھواللہ۔۔ ھمر چو ھواللہ۔۔۔
اونچی عمارت موہل کی — ھواللہ ھواللہ۔۔ ھمر چو ھواللہ۔۔
سفید پرندے جھیل کے اللہ — ھواللہ ھواللہ۔۔ ھمر چو ھواللہ۔
ملک کوئی برسا، مہران کا اللہ — ھواللہ ھواللہ۔۔ ھمر چو ھواللہ۔۔
کوئی مسافر رہ گیا سفر میں اللہ — ھواللہ ھواللہ۔۔ ھمر چو ھواللہ۔۔
کوئل کوکے باغوں میں — ھواللہ ھواللہ۔۔ ھمر چو ھواللہ۔۔

سندھ میں ترخانوں کا عہد سیاسی تشدد اور عوامی مصائب کا عہد ہے۔ بیرونی تسلط کے اس عہد میں، افغانوں نے مقامی آبادیوں پر جبر و ستم کے وہ مظالم ڈھائے تھے کہ عام لوگوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مقامی طور پر خود کو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ جانبازوں کے یہ جتھے عام بستیوں، گاؤں اور قصبوں کی حفاظت کرتے۔ ان مختلف گروہوں اور جتھوں کی متفقہ کمان، 'جمال' نامی ایک بہادر اور نڈر نوجون کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ جس نے مقامی سندھیوں کی تمام سرگرمیوں کا رُخ حب الوطنی کی طرف موڑ دیا تھا اور لوگوں میں خود حفاظتی کے ساتھ امن و امان کی اہمیت بھی اجاگر کی تھی۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں امن و امان بحال ہو گیا اور لوگوں نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ 'ہو جمالو' گیت جمال نامی اسی ہیرو کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ اس گیت کے بھی کئی کئی انگ مقبول ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں ترمیم و اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

کھٹی آیو خیر ساں	ھو جمالو، ھو جمالو
میرا جمالو خیریت سے فتح مند ہو کے آ گیا	ھو جمالو، ھو جمالو
جو چلا گیا تھا لاڑ کی جانب	ھو جمالو، ھو جمالو
میرا جمالو جتوں کے ساتھ	ھو جمالو، ھو جمالو
جس کی چھوٹی انگلی میں سونے کی انگوٹھی ہے	ھو جمالو، ھو جمالو
جس کے پیروں میں لاکھوں کی چمکتی جوتی ہے	ھو جمالو، ھو جمالو
جس کے دانت سونے کے	ھو جمالو، ھو جمالو
سکھر والے پل پہ	ھو جمالو، ھو جمالو
جس کے چھڑی ہاتھ میں	ھو جمالو، ھو جمالو

ھو جمالو، ھو جمالو، واہ جمالو، واہ جمالو(14)

اسی طرح ڈھولو۔۔مورو محبت کے گیت ہیں۔ یہ گیت کوہستانی علاقے کے قبائل خصوصاً برفت، بروہی، پالاری، خاص خیلی اور جوکھیا قبیلوں کا مشہور گیت ہے۔ سندھ کے جن علاقوں میں یہ قبائل رہائش پذیر ہوئے وہاں پر ''مورو'' گیت رائج ہوا۔ ''مورو'' محبت اور مجاز کا گیت ہے اس گیت میں جدائی، بے قراری، عشق و محبت، وصل و فراق، گلے شکوے بیان کئے جاتے ہیں۔ ''مورو'' درد کی آواز ہے۔

(1)

مورو کسی سے کم نہیں
ڈھولا مورو بیٹھی گا رہی ہوں
فریاد کر رہی ہوں
ڈھولا مورو بیٹھی گا رہی ہوں
مورو کسی سے کم نہیں

(2)

پیارے! سناؤ مورا کوئی
گاڑی کی ریل، ڈھولا آؤ سویر،
پیارے! سناؤ مورا کوئی
گاڑی کی سیٹی، ہوں تیرے لیے بیٹھی
پیارے! سناؤ مورا کوئی
گاڑی کا کڑ گا، مارتا ہے تیرا دھڑکا
پیارے! سناؤ مورا کوئی

ڈھولا! سناؤ کوئی مورا
شہر تو میرا ننگر، جلتا ہے میرا اندر،
ڈھولا سناؤ کوئی مورا
ننگر کا تھانہ، من میرا بیگانہ

ننگر کا اسٹیشن، بہاتا ہے تیرا فیشن

ڈھولا! سناؤ کوئی مورا۔۔(15)

''کوڈانو رکوڈھانو (لاڈ پیار، ڈُلار) سندھی لوک گیت ہے۔جس کے معنی ہیں لاڈ پیار۔کوڈھانو میں سندھی مائیں اپنے بچوں کو ڈُلار کرتے ہوئے دعائیں دیتی ہیں اور خوشی کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کا پیارا راج دلارا جلدی سے بڑا ہو،اسے خوشیاں نصیب ہوں،اس کی جلدی شادی ہو، چاند جیسی دلہن نصیب ہو،اس سے نسلیں پروان چڑھیں۔ ماں بچے کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے اس کے لئے دعا گو ہے۔

(کوڈھالو)

مورٹو رٹلے رانا

مور جھوم رہا ہے

مور جھوم رہا ہے رانا ، مور جھوم رہا ہے رانا

راناتم سے نسلیں ہوں گی، راناتم سے لاکھوں ہوں گے

چاچاؤں کے کندھوں پر، ماموؤں کے کندھوں پر

رانا رانا ، مور جھوم رہا ہے

نولکھا ہار بنوایا، سوسودے کے رانا

راناتم سے نسلیں ہوگی، راناتم سے لاکھوں ہوں گے

نتھ بنوائی، سوسودے کے رانا

راناتم سے نسلیں ہوگی، راناتم سے لاکھوں ہوں گے

کنگن بنوائے، سوسودے کے رانا

راناتم سے نسلیں ہوگی، راناتم سے لاکھوں ہوں گے

چوڑیاں بنوائیں، سوسودے کر رانا

راناتم سے نسلیں ہوگی، راناتم سے لاکھوں ہوں گے (16)

اسی طرح سنہارو، سہرا اور بھیلن جیسے مقبولِ عام گیت ہیں۔

بھیلن اونٹ چرانے والوں کا گیت ہے۔زبانی گیتوں کی روایت بھی توانا اور ثروت مند ہے۔جس سے خوبصورت لوک بیانیہ نمو پاتا ہے۔

مر ویسوں سندھ نہ ڈیسوں:

انگریز 1843ء میں سندھ پر ٹوٹ پڑے۔سندھ پر چارلس نیپیئر کا حملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ

انگریزوں کو کھلی جارحیت کی ضرورت اس لئے پڑی کہ وہ فریب کاری اور مزید معاہدوں کے ذریعے سندھ پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ نیپیئر نے جنگ سے پہلے میران سندھ کو جو نیا معاہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سندھ کے حاکم تالپور نہیں بلکہ انگریز ہیں لیکن یہ ذلت آمیز معاہدہ قبول کر لیا گیا۔ سندھ میں انگریزی حکمت عملی قابل نفرت ہی سہی لیکن اس معاہدے کو قبول کر لینا ذلت کی انتہا تھی۔ شائد میران سندھ اس طرح اپنا تاج وتخت بچانا چاہتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ برطانوی ریذیڈنٹ اوٹ رم پر مشتعل عوام کے حملے کے نتیجے میں نیپیئر نے جنگ کا اعلان کر دیا۔

1783ء میں بلوچی سرداروں نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ میر فتح علی خان تالپور نے کلہوڑوں کو شکست دینے کے بعد ایک مستحکم اور خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی لیکن یہ مستحکم اور خود مختار ریاست جلد ہی مختلف سازشوں کا شکار ہونے لگی۔ سندھ تین ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور تالپوروں کے تین خاندانوں نے انہیں آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ شہدادانیوں کا پایہ تخت حیدرآباد میں تھا۔ مانگانیوں کا میر پور خاص اور سہرابانیوں کا خیر پور تھا۔ میر فتح علی خان نے کابل کو لگان دینا منظور کیا اور کراچی پر قبضہ کر لیا۔ 1802ء میں جب میر غلام حیدر تخت نشین ہوا تھا تو اس نے کابل کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے لگان دینا بند کر دیا۔

1808-9ء میں انگریزوں اور میر صاحب کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا اس سے پہلے انگریز ایک معاہدہ سکھوں سے بھی کر چکے تھے انگریزوں نے جو معاہدہ میران سندھ سے کیا اس کی رو سے:

1۔ سندھ اور برطانوی حکومت میں ابدی رفاقت رہے گی۔
2۔ دونوں ملکوں کے درمیان کبھی جذبہ عناد پیدا نہیں ہوگا۔
3۔ حکومت سندھ 'فرانس کے قبیلے' کو سندھ میں داخل نہیں ہونے دے گا۔
4۔ انگریز میران سندھ کی مرضی کے بغیر سندھ کا آبی سفر نہیں کر سکیں گے۔
5۔ دونوں حکومتوں میں سفارت بدستور جاری رہے گی۔

لیکن انگریزوں نے اس کی خلاف ورزی کی۔ اس سلسلے میں باری نے اپنی تصنیف "کمپنی کی حکومت" میں ایک حکایت درج کی ہے۔

جب برنز اپنے دریائی سفر میں مصروف تھا، تو ایک سید زادہ ساحل دریا پر وضو کر رہا تھا۔ سید نے آنکھ اٹھائی تو اسے برنز دکھائی دیا۔ سندھ کی آزادی ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے دریائی راستہ معلوم کر لیا۔ سید زادہ چلایا لیکن محض دریائی راستہ معلوم کر لینے کے بعد آزادی ختم نہیں ہوئی۔ تالپور کا دور حکومت عوام دوستی کے جذبے سے یکسر عاری تھا۔ ہاری کی محنت کا پھل وڈیرا لے جاتا تھا اور وڈیرے کے سر پر ان ظلِ سبحانیوں کا سایہ تھا۔ جنہیں آج ہم "امیرانِ سندھ" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

رحیم داد خان مولائی شیدائی نے اپنی تصنیف ''تاریخ تمدن سندھ'' میں مغلوں اور کلہوڑوں کے عہد حکومت کو ہاریوں کے لئے بدترین دور قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق ہاری مکمل طور پر جاگیردار کے زیر اثر تھا۔ کھلے آسمان تلے قدامت پرست ہاری زمیندار کے فولادی پنجے میں گرفتار تھا۔ بے شمار زمینیں غیر آباد پڑی تھیں۔

اسی مصنف کے مطابق تالپوروں کے دور میں ہاری نسبتاً بہتر حالت میں تھا لیکن وڈیروں کی اس باہمی جنگ کا واقعہ اس کی نفی کر دیتا ہے۔

رحیم داد خان کا کہنا ہے کہ زمیندار ہاری کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ ہاری کی عزت سے کھیل سکے۔ ہاریوں کی شکایت پر امیر خاندان کے اکثر افراد آپس میں ٹکرا جاتے تھے ایک ایسی ہی جنگ میں دونوں طرف سے سات سو دس آدمی مارے گئے۔

رحیم داد خان کے مطابق ایک مرتبہ شہدادانیوں اور مانکانیوں کے درمیان ٹھن گئی۔ اس جنگ کا سبب دونوں قبیلوں کے ہاریوں کی باہمی تکرار کو بتایا جاتا ہے ''ول'' کی اس جنگ میں شہدادانیوں کے چار سو اور مانکانیوں کے تین سو آدمی مارے گئے۔

مصنف نے امیران سندھ کی حمایت کرتے ہوئے یہ بتانے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ مرنے والے سات سو دس آدمی کون تھے؟ ظاہر ہے وہ امیران سندھ کے بھائی بیٹے ہونے سے تو رہے۔ چونکہ تالپوروں کے عہد میں باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ اس لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ مرنے والے ہاریوں کے ہی بھائی بند تھے۔

انگریزوں نے سندھیوں کو اتنی جلدی شکست اس لئے دی تھی کہ تالپوروں کا کوئی باقاعدہ دستہ نہیں تھا۔ بقول رحیم داد خان کے تمام زمینیں زمینداروں اور جاگیرداروں کے قبضے میں تھیں۔ جن میں حکمران طبقے کے بلوچ سردار کثرت سے شامل تھے۔ جنگ کی حالت میں بھی یہی طبقے فوجی بھرتی کا کام سرانجام دیتے تھے۔ میر صاحبان ایسے موقعوں پر ایسے جاگیرداروں کو انعام و کرام سے نوازتے تھے۔ سردار اپنے حصے کے مقررہ سپاہی فراہم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کمپنی کے نئے ہتھیاروں کے مقابلے میں سندھی ہتھیار بے حد ناقص تھے۔ یہی سبب تھا کہ سر چارلس نیپیئر کی پانچ ہزار باقاعدہ فوج سے بائیس ہزار کا سندھی لشکر صرف تین گھنٹوں میں شکست کھا گیا۔ لیکن کیا شکست کا ایک سبب یہ بھی نہیں ہے کہ معاشی طور پر دبے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگ ٹھیکے پر سرداروں کی فوج میں بھرتی کئے گئے۔ وہ سرداروں کو بچانے کے لئے کیوں لڑتے۔ جب کہ سرداروں نے ان کے لہو اور ہڈیوں سے اپنے لئے عشرتوں کے محل تعمیر کر رکھے تھے۔ مظلوم عوام جانتے تھے کہ میر علی مراد خان جیسے لوگ اس دھرتی نے پیدا کئے ہیں جنہوں نے اپنے سر کو کاسہ گدائی بنا لیا ہے۔

رحیم داد خان کو گلہ ہے کہ تالپوروں کو مفت میں بدنام کرنے کے لئے انگریزوں نے یہ عذر تراشا کہ میروں کی حکومت شخصی ہے اور یہ کہ وہ (یعنی انگریز) تہذیب کے علمبردار ہیں۔ یہ گلہ شاید درست نہیں ہے کیونکہ انگریزوں کو

اس عذر لنگ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جبکہ وہ صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ ''ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم سندھ پر قابض ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ایسا ہی کریں گے۔''

اور بقول کلکتہ ریویو:

روایتی گرگ نے برہ کے خلاف الزام لگاتے ہوئے انتہائی ہوشیاری کا ثبوت نہیں دیا۔ جتنا کہ انگریزوں نے سندھ پر قبضہ جماتے وقت۔''

پھر انگریزوں نے امیران سندھ پر جو جبری معاہدہ تھوپا تھا اس پر تالپور سردار بڑی ایمانداری سے عمل پیرا رہے لیکن انگریزوں نے خود اپنے مفاد میں کئے ہوئے معاہدے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ 1932ء میں انگریزوں اور امیران سندھ کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے ''ہندوستان کے تاجروں'' کو دریائے سندھ سے گذرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن کوئی جنگی جہاز یا سامان اس راستے سے نہیں گزر سکتا تھا اور اس معاہدہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ کمپنی یا امیران سندھ ایک دوسرے کے علاقے کو حریصانہ نظروں سے نہیں دیکھیں گے لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ انگریزوں نے معاہدہ کیا ہی اس لئے تھا کہ سندھ کی طاقت کو استعمال کئے بغیر جس قدر جلد ممکن ہو سکے اسے ہڑپ کر لیا جائے۔

راگ رنگ اور عشرت میں ڈوبے ہوئے بلوچ سردار اس معاہدے پر پوری ایمانداری سے عمل پیرا رہے۔ وہ انگریزوں سے دشمنی مول لے کر اپنے رنگ میں بھنگ کیسے ڈالتے۔ 1838ء میں انگریزوں نے اس معاہدے کی خود ہی خلاف ورزی کی۔ جنگ افغانستان کے دوران ان کی فوجیں سندھ کے راستے سے گذریں۔ حیدر آباد میں ایک انگریز ریزیڈنٹ سندھیوں پر مسلط کر دیا گیا۔

باری کے لفظوں میں:

''پنجاب اور افغانستان سے دوستی کے لئے سندھ کی قدیم رفاقت کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ انگریزوں نے میران سندھ کو بتایا کہ طاقتور اور کمزور میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا اور یہ کہ قوت اپنے زور بازو سے ناتوانی کے خلاف سینکڑوں الزام تراش سکتی ہے۔ (کمپنی کی حکومت۔۔باری)

میران سندھ کمزور تھے۔ انگریزوں نے بھانپ لیا تھا کہ ان عوام دشمن سرداروں کو ان سے جنگ کے دوران اپنے لوگوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ پسے ہوئے اور تباہ حال عوام بہر حال تبدیلی چاہتے تھے خواہ وہ کسی نوعیت کی تبدیلی ہو۔ وہ اپنے عیاش حکمرانوں سے فوری نجات حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تین گھنٹوں کے اندر فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہو گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عام لوگوں کو بیرونی جارحیت زیادہ بری نہیں لگی بلکہ اس کے برعکس وہ نئے لٹیروں کو کسی حد تک نجات دہندہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں نے سندھی حاکموں کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے 1839ء میں انہیں ایک نئے معاہدے میں جکڑ لیا۔ اس معاہدے کے تحت میران سندھ نے انگریزی فوج کے

لئے ہر سال تین لاکھ روپیہ دینا منظور کیا۔ میرانِ سندھ نے اس معاہدے پر پوری دیانتداری سے عمل کیا لیکن کمپنی نے ان پر انگریزوں کے خلاف سازش کا الزام لگایا۔

ایلن برا کے لفظوں میں:

''اسے یقین نہیں آ سکتا کہ میران سندھ کمپنی سے دوستانہ تعلقات رکھ سکتے ہیں۔''

لیکن یہ حیلہ تراشی اس لئے تھی کہ انگریز بہر حال اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

''میران سندھ کی دولت پر ان کی نظر تھی۔ ملک کی معدنی دولت اور گھریلو صنعت سے ملک کو بے شمار آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ ٹھٹہ اور کراچی کاروبار کے دو بڑے مراکز تھے۔ جہاں مسقط، پورٹ عباس، بمبئی مالا بار اور دوسرے تجارتی علاقوں کے تاجر آتے جاتے رہتے تھے لیکن اب مزید حیلہ تراشیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ انگریزوں نے طاقت کے ذریعے سندھ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

انگریزوں نے اپنی طاقت کا استعمال کیا اور دو مختصر لڑائیوں کے بعد سندھ پر اپنا قبضہ جمالیا۔ قبضے کی ابتداء غلام شاہ کلہوڑے کے دور میں ہوتی ہے جب انگریز سندھ میں تاجر بن کر وارد ہوئے تھے۔

پہلی لڑائی 17 فروری 43ء کو میانی کے میدان میں شروع ہوئی، جس میں پانچ ہزار بلوچوں اور سندھیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ انگریزوں اور سندھیوں کے درمیان دوسرا مقابلہ نارجن جی گوٹھ کے قریب دبے کے مقام پر ہوا۔ دبے کی شکست نے سندھڑی کا پرغرور سر جھکا دیا۔

1938ء کے صلح نامہ کے بارے میں انگریزوں کا کہنا تھا کہ یہ سکندری دیوار کی مانند باوقار اور پشت در پشت نافذ رہے گا۔ معاہدے کے مطابق سر ہنری پاٹنجر کی جگہ میجر اوٹرم ریذیڈنٹ کراچی مقرر ہوا۔ پہلی بار سر چارلس نیپیئر 1842ء میں کراچی آیا اور علالت کے باعث وہاں کچھ دن مقیم رہا منشی بیتارام کے مطابق میروں نے اس کے اعزاز میں ہر طرح کی خدمت سرانجام دی۔ اس کی سواری کے لئے ایک سونے کی پالکی روانہ کی گئی۔ علی عباس خان اور دوسرے میروں نے اس کا استقبال کیا۔ اسی شان وشوکت کے ساتھ سر چارلس نیپیئر میروں سے ملاقات کے بعد ایک دخانی جہاز میں سوار ہو کر سکھر کے لئے روانہ ہو گیا۔

بعد ازاں کیپٹن اسٹانلے سکھر سے ایک نئے عہد نامے کو لے کر حیدر آباد پہنچا۔ یہ عہد نامہ قطعی طور پر یک طرفہ اور جبری طور پر شرائط کا حامل تھا۔ میر اس نئی مصیبت سے گھبرا گئے اور انہوں نے چارلس نیپیئر کے نام ایک پیغام میں حیرت کا اظہار کیا۔ میروں کے ایلچی دو مرتبہ نیپیئر کے پاس گئے کہ اس نئے عہد نامہ کا مطلب کیا ہے۔ جس کی شرائط میروں اور ان کے محکوم ملک کو نقصان پہنچانے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔

''مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔ میں فقط لارڈ ایلن برا کے احکام کی تعمیل کر رہا ہوں'' نیپیئر نے جواب دیا۔

نئے عہد نامے کے مطابق:

1۔ برطانوی امدادی فوج کے اخراجات کے لئے بجائے تین لاکھ روپیہ سالانہ کے میران سندھ کو اپنی مملکت کا ایک حصہ کمپنی کے حوالے کرنا پڑا۔
2۔ میران سندھ کو برطانوی جہازوں کے لئے ایندھن فراہم کرنا تھا۔
3۔ میران سندھ کو اپنے نام کا سکہ بند کرنا تھا۔

میر نصیر الدین خان نے اس معاہدے کو تسلیم کر لیا لیکن مشتعل اور طاقت کے نشے میں چور سر چارلس نیپیئر طاقت آزمائی پر تلا ہوا تھا۔ وہ سب سے پہلے خیر پور پر چڑھ دوڑا اور میر رستم خان کو اس کی موروثی حکومت سے بے دخل کر دیا گیا۔ شدید بارش اور طوفان میں میر رستم خان کو عورتوں اور بچوں سمیت ریگستان میں دھکیل دیا گیا۔ اسی دوران میجر اوٹ رم بمبئی سے سکھر آیا اور کوٹ ڈیجی میں سر چارلس نیپیئر سے ملا۔ اس نے بعد میں امام گڑھ کے قلعے پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ امام گڑھ کا قلعہ میر رستم خان کے بھائی میر محمد خان کے پاس تھا۔

سر چارلس نیپیئر منزل بہ منزل حیدر آباد کی طرف بڑھتا رہا۔ جب میروں کو اس کی خبر ملی انہوں نے سر چارلس نیپیئر کے پاس اپنے نمائندے بھیجے اور کہا کہ جب انہوں نے اپنی مرضی کے خلاف اس کی دھمکیوں میں آ کر نیا عہد نامہ منظور کر لیا ہے پھر وہ فوج اور توپوں کے ساتھ حیدر آباد کی طرف کیوں دوڑا آ رہا ہے۔ میروں کے نمائندے نے نیپیئر کو صلح نامے کے کاغذات بھی دیئے۔ نیپیئر نے کاغذات واپس کرتے ہوئے میروں کو اس کے حکم کی تعمیل کرنے کی ہدایت کی۔ اس نے حکم دیا کہ میر رستم خان کو حیدر آباد میں لایا جائے۔ جہاں اوٹ رم اس کے معاملات کا تصفیہ کرے۔

نیپیئر نے دھمکی دیتے ہوئے لکھا کہ وہ حیدر آباد پر فوری حملے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جو فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے لیکن اگر میر رستم خان اوٹ رم سے نہ ملا تو پھر اسے دشمن سمجھا جائے گا۔

آغا سلیم نے اپنے مضمون ''ہوشو شہید'' میں لکھا ہے:

''برصغیر میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں ہیں۔ وہ سب بادشاہوں یا کسی باغی شہزادے کے حکم پر لڑی جاتی رہی ہیں لیکن میانی کی جنگ تاریخ میں پہلی جنگ ہے جو کسی بادشاہ کے حکم پر نہیں بلکہ حب الوطنی کے جذبہ کے ساتھ لڑی گئی۔ یہ جنگ بادشاہوں کی نہیں بلکہ عوام کی جنگ تھی۔''

9 فروری 1943ء کو میجر اوٹ رم نے میروں سے ملاقات کی۔ میروں نے اسے بتایا کہ سر چارلس نیپیئر کی خبر پر بلوچ بہت برافروختہ ہیں۔ انہوں نے اوٹ رم سے نیپیئر کی پیش قدمی کو فوری طور پر رکوانے کی درخواست کی۔ نیپیئر کو میجر اوٹ رم کا پیغام ملا تو جنرل نے فی الفور خیمے اکھیڑ کر حیدر آباد کی طرف روانگی کا حکم دیا۔ اس صورت حال سے میجر اوٹ رم کو مطلع کیا گیا۔ میجر نے نیپیئر کے پاس اپنا ایک ماتحت افسر روانہ کیا لیکن بات پھر بھی نہ بنی۔ انگریز جو ہر قیمت پر جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ میر رستم خان کا بہانہ بنا کر آگے بڑھتے رہے۔ میر نصیر خان نے

میجر اوٹ رم سے پھر درخواست کی کہ اس بڑھاپے میں میر رستم خان کو باہر لانا مناسب نہیں ہے اور سر چارلس نیپیئر نے اس کی جائیداد پر قبضہ کیا ہے۔ وہ اس کے متعلقین کو واپس ملنی چاہئے۔ نیپیئر نے جواب میں کہا کہ میر رستم خان کے معاملے میں تصفیہ مسٹر اوٹ رم کو کرنا ہے لیکن میجر نے کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا۔ ابھی یہ معاملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ سر چارلس نیپیئر نے حیات خان مری کو جو حیدر آباد جا رہا تھا گرفتار کر لیا۔

اس خبر نے عوام کو آپے سے باہر کر دیا۔ بلوچوں نے میر رستم کے ساتھ ہونے والے ظلم اور حیات خان مری کی گرفتاری کا بدلہ لینے کے لئے میجر اوٹ رم پر حملہ کر دیا۔ میجر نصیر خان نے بلوچوں کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی، وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ انگریزوں سے دوستی کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اس نے ایک جانب بلوچ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ میجر اوٹ رم پر حملوں سے باز رہیں۔ اور دوسری جانب میجر اوٹ رم کو عوامی غیض و غضب سے خبردار کرتے ہوئے باہر نہ نکلنے کا مشورہ دیا۔ ایک خط کے ذریعے اس نے سر چارلس نیپیئر کو پھر درخواست دی کہ وہ اپنی پیش قدمی روک دے لیکن خط پڑھتے ہی نیپیئر نے خیمے اکھیڑ کر حیدر آباد کی طرف اپنی پیش قدمی تیز کر دی۔ یہ اطلاع ملتے ہی میر نصیر خان نے جنرل نیپیئر کو ایک اور خط لکھا کہ جب میروں نے اس کی مرضی کے مطابق اس کے تمام مطالبات منظور کر لئے ہیں۔ پھر وہ حیدر آباد کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے۔ اگر وہ زبردستی جنگ کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں وہ شہر کو چھوڑ کر کسی ریگستان میں بود و باش اختیار کرنے پر تیار ہیں۔ جہاں سے وہ دادرسی کے لئے اپنا وکیل لندن روانہ کریں گے۔

میر نصیر خان نے جنگ کو ٹالنے کے لئے انگریزوں کی ذلیل سے ذلیل شرائط پر صاد کیا۔ بادشاہ آخری وقت تک اس سچائی سے آگاہ نہ ہو سکا کہ اصلی طاقت انگریز نہیں بلکہ اس کے عوام ہیں۔ وہ جس جنگ سے گریز کر رہا تھا لوگ اس کے لئے بے چین تھے۔ عوام اس نکتے کو سمجھتے تھے کہ انگریز برصغیر کے کسی خطے کو آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

عوام اس جنگ سے دوہری آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہت اور میری کا تسلط ایک ظلم تھا اور انگریزوں کی غلامی دوسرا۔ گندم کی بالی اپنے محبوب ہاتھوں میں جانے کی بجائے مکروہ گوداموں میں قید تھی۔ امیران سندھ جنگ کو ٹال کر دھرتی کے بیٹوں کو ایک نئی غلامی میں دے رہے تھے آغا سلیم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ''میانی کی جنگ کسی بادشاہ کے حکم سے نہیں بلکہ حب الوطنی کے جذبے سے لڑی گئی۔ دھرتی نے اپنے بیٹوں کے لئے اپنی آغوش وا کر دی۔

میر نصیر خان مسلسل بے خبری کا شکار تھا۔ اس نے مشتعل بلوچوں کو میجر اوٹ رم پر حملہ نہ کرنے کا حکم دوبارہ صادر کیا۔ حالات بہت بگڑ چکے تھے۔ وقت گذر چکا تھا کہ امیر کے حکم کو مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کر لیا جاتا۔ چنانچہ 15 فروری کو بلوچوں کے ایک گروہ نے میجر اوٹ رم کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔ میجر اوٹ رم زخمی حالت میں اپنے

دو ساتھیوں کے ساتھ ایک دخانی جہاز میں بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ دو قیدی بلوچوں کے ہاتھ لگے۔ جنہیں امیروں نے رہا کر دیا۔ تب میر نصیر خان نے انگریزی فوج کی طرف ایک اور وکیل روانہ کر دیا۔ اس اثناء میں سر چارلس نیپیئر نے بلوچوں پر حملہ کیا۔ بے شمار بلوچ توپوں کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے۔ باقی ماندہ سپاہیوں کو قید کر لیا گیا۔ اس تازہ مصیبت سے میر نصیر خان کو بہت رنج ہوا۔ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ حیدر آباد میں قلعہ نشین ہو گیا۔ حیدر آباد میں بارہ ہزار سپاہی لڑنے مرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ میر نصیر خان نے ان کی پیش قدمی کو روک لیا۔ 18 فروری کو وہ سر چارلس نیپیئر کے خیمے میں گیا۔ اپنی تلوار کھول کر جنرل کے حوالے کی۔ جنرل نے تلوار واپس کرتے ہوئے اسے تسلی کے چند کلمات کہے۔ اس نے میر نصیر خان کو بتایا۔ کہ تمام معاملات 25 دن کے اندر اندر اس (میر نصیر خان) کی مرضی کے مطابق طے ہو جائیں گے اور اس کا ملک پہلے کی طرح اسی کے قبضہ میں رہے گا۔ اس ملاقات کے دوران میجر اوٹ رم بھی موجود تھا۔ دوسرے دن سر چارلس نیپیئر نے ریذیڈنسی میں قیام کیا اور میروں کی نگہبانی کے لئے ایک گارڈ مقرر کیا۔

یہ واقعات اس درخواست سے لیے گئے ہیں جو دیوان بیٹا رام کی تیار کی تھی۔ یہ درخواست فارسی میں تھی جسے بعد میں مسٹر ایسٹوک نے اپنی تصنیف میں شامل کیا تھا۔ اسی انگریزی ترجمے کو مرزا عباس علی بیگ نے سندھی میں منتقل کیا۔ جو ماہنامہ نئیں زندگی (سندھی) میں چھپا۔ ادارے کے مطابق میانی اور دبے کی لڑائیوں کے نتیجے میں میران سندھ کو جلاوطن کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ جہاں انہیں 1863ء تک نظر بند رکھا گیا۔ اس دوران بیشتر میر وہیں انتقال کر گئے۔ سندھ واپسی کے لئے انہوں نے انگریزوں کو متعدد درخواستیں بھجوائیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقامی سربراہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ مجبور ہو کر میروں نے اپنے تین ممتاز وکلاء اخوند حبیب اللہ، دیوان دیا رام اور دیوان بیٹا رام پر مشتمل ایک وفد ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں انگلستان بھیجا، مگر ملکہ تک اس کی رسائی نہ ہو سکی ، میروں کے مقدمے پیش کرنے کے لئے دیوان بیٹا رام نے یہ تفصیلی درخواست لکھی تھی جس میں انگریزوں اور میروں کے ابتدائی اختلافات، ان کی آپس میں لڑائیوں اور شکست کے بعد کلکتہ جلاوطنی کے واقعات وغیرہ کے پس منظر کو پیش کیا گیا۔

میانی کی جنگ کے بعد سندھ اور اہل سندھ پر وحشی حملہ آور کے مظالم، لوٹ مار اور ظلم تاریخ میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں تاریخ میں اس کی جو تفصیل درج ہے وہ یہ باور کرانے کے لئے کافی ہے کہ لٹیرا بننے کے لئے اجڈ ہونا ضروری نہیں ہے۔ علم وتہذیب اور شائستگی کے نام لیواؤں نے ہندوستان پر جو ظلم ڈھائے وہ وحشی قبائل کے مظالم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ بیگمات اودھ کا تاریخی معاملہ کوئی بھولی بسری کہانی نہیں ہے لیکن سندھ کے معاملے میں انگریزوں نے ظلم کی بہت سی نئی مثالیں قائم کیں۔ مورخ کا قلم جانبدار ہو سکتا ہے۔ اس کی تحریریں قوم پرستی کی لپیٹ میں آ سکتی ہیں۔ سر بیٹا رام کی درخواست میں انگریزوں کے بیان کردہ مظالم ''فریادی کی آہ وفغاں'' کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن آیئے دیکھیں خود انگریز اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

سر چارلس نیپیئر کی ڈائری پر ہی اکتفا کیا جائے تو ہماری بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ فتح سندھ کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

''ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے پھر بھی ہم ایسا کریں گے اور یہ ایک فائدہ مند، موزوں اور رحم دلانہ بدمعاشی ہوگی۔''

ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے۔ ''صدیوں کی تعلیم و تربیت بھی انگریزوں کی رہزن فطرت کو نہیں بدل سکی۔ ہندوستان میں جب کبھی کوئی انگریز کسی دولت مند ہندو یا کسی عالی شان عمارت کو دیکھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

کیسا اچھا شکار ہے مارنے کے لئے

کیسا اچھا محل ہے جلانے کے لئے

(کمپنی کی حکومت۔۔باری)

یہ انگریز کا اعتراف ہے جس نے خود سندھ کی لوٹ مار میں حصہ لیا اور پھر اس لٹے ہوئے صوبے کا پہلا گورنر مقرر رہوا۔

لارڈ ایلن برا کی معزولی کے بعد سر ہنری ہارڈنگ ہندوستان کا نیا گورنر جنرل مقرر رہوا۔ 30 ستمبر 1844ء کو نئے گورنر جنرل نے میروں کو ان کی درخواست پر بارکپور طلب کیا۔ جہاں ان کے دکھڑے سننے کے بعد اس نے کہا کہ بلاشبہ ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے لیکن اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر میروں نے اپنے تین نمائندے ملکہ وکٹوریہ کے پاس روانہ کئے۔ جو پردیس میں بھٹک بھٹک کر ملکہ تک رسائی حاصل کئے بغیر واپس آ گئے اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح کرنا مقصود تھا کہ فاتحین نے مفتوحین کے سلسلے میں ہر قسم کے اخلاقی ضابطے اور اصول اپنی رحم دلانہ بدمعاشی کی نذر کر دیئے۔ باری سندھ کے متعلق انگریز پالیسی کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' میں لکھتا ہے:

''سندھ کی برطانوی حکمت عملی اخلاقی طور پر قابل نفرت ہے۔ ایک آزاد ملک کو غلام بنانے کے لئے سازشوں کی فرضی داستان بنائی گئی۔ محض ایک فوجی افسر کی چند خواہشات کی تکمیل نے لاکھوں انسانوں کو نان جویں سے محروم کر دیا۔ حیدرآباد کے شاہی محلات کو جس بے جگری سے لوٹا گیا۔ اس کی مثال چنگیزی کارناموں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شاہی بیگمات کے جواہرات کا لوٹا جانا تو ایک لازمی امر تھا لیکن محض کپڑوں کے لئے بیگمات کو برہنہ کر دینا انسانی ذلت کی انتہا تھی۔''

17 فروری 1943ء کی منحوس شام ڈھل چکی تھی۔ حیدرآباد اور خیر پور کے میروں کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ سر چارلس نیپیئر فتح کی خوشی میں اپنے خون آلود ہونٹ چاٹ رہا تھا۔ کہ شیر کی گرج نے اسے دہلا دیا۔ میر پور خاص

کے مانکانی تالپور کی حکومت کا پھریرا ابھی لہرا رہا تھا۔ ابھی میر شیر محمد خان زندہ تھا۔ انگریزوں کو ابھی ایک اور جنگ لڑنی تھی، ایک اور معرکہ سر کرنا تھا۔

میانی جنگ انگریزوں نے اس لئے جیت لی تھی کہ حیدرآباد اور خیر پور کے والی عوام سے بہت دور بستے تھے اور انہوں نے اپنا اقتدار بچانے کے لئے آخر وقت تک انگریزوں کی دوستی کا دم بھرا تھا۔ انگریز سندھڑی کے سینے میں پے در پے خنجر بھونک رہا تھا اور حیدرآباد کا میر نصیر خان انگریزوں سے دوستی کے امکانات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انگریز ایک ایک کر کے سندھڑی کے اعضاء کاٹ رہے تھے اور حیدرآباد کے میر اپنے نام کا سکہ بند کر رہے تھے۔

لیکن میر پور خاص کے میر کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا خودمختار حاکم تھا اس نے انگریزوں سے جو معاہدہ کیا تھا، وہ ہتک آمیز نہیں تھا۔ اس نے انگریزوں کو رعایتیں ضرور دی تھیں لیکن اس کی شرائط اتنی کڑی تھیں کہ انگریز ان رعایتوں سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔

میانی کی جنگ میر نصیر خان کی شدید ترین خواہش کے باوجود نہ ٹل سکی۔ جب شیر محمد کو میانی کی جنگ کا علم ہوا تو وہ مدد کے لئے دوڑا لیکن میانی میں سندھڑی کی خون آلود آبرو تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو رہی تھی کہا جاتا ہے کی شیر محمد خان شکست کی خبر سننے کے بعد ٹنڈو الہ یار سے فوراً آگے بڑھ کر انگریزوں کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے لیکن انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا اور مشورہ دیا گیا کہ وہ فی الحال لوٹ جائیں۔

گل محمد مستوئی کے مطابق شیر سندھ کے جنگی صلاح کاروں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس وقت لڑنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے برعکس مرزا عباس علی بیگ اپنے مضمون ''دبے کی لڑائی'' میں کہتے ہیں کہ ''میجر اوٹ رم نے کسی ترکیب سے انہیں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔'' میر حاجی محمد بخش کے بیان سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ انگریزوں نے چالبازی سے شیر سندھ کو واپس جانے پر مجبور کر دیا لیکن انہوں نے اس سلسلے میں جو واقعہ درج کیا ہے وہ مختلف نوعیت کا ہے۔ ان کے مطابق نیپیئر نے میر صوبدادخان کو لالچ دیتے ہوئے کہا تھا ''اس ملک میں میرا کچھ نہیں ہے۔ حکومت تمھارے حوالے کر کے میں بمبئی لوٹ جاؤں گا۔ تم جیسے بھی ممکن ہو میر شیر محمد خان کی پیش قدمی رکواؤ۔''

میر صوبدادخان قرآن پاک کے ساتھ ٹنڈو الہ یار پہنچا اور شیر سندھ کو بتایا کہ انگریز ملک اس کے حوالے کر کے سندھ کو خالی کر رہا ہے۔ اگر بغیر لڑائی کے ملک اپنے پاس رہے تو پھر جنگ نہیں کرنی چاہئے۔ میر شیر محمد جانتے تھے کہ میر صوبداد اور انگریز دونوں جھوٹے ہیں لیکن قرآن کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے وہیں سے لوٹنا قبول کر لیا۔

بہرحال شیر سندھ نے پیش قدمی روک لی۔ کچھ مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر وہ اسی وقت تھکی ہوئی انگریز سپاہ پر ٹوٹ پڑتے تو سر چارلس نیپیئر کا بوڑھا لیکن مغرور سر خاک و خون میں لت پت دیدہ عبرت نگاہ ہوتا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ میانی کی فتح سے پہلے نیپیئر بلا روک ٹوک حیدرآباد کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا اور کہاں یہ صورت تھی کہ فاتح

شکست خوردہ ملک کے ایک حاکم کی پیش قدمی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جیتا ہوا نیپیئر ہاری ہوئی سندھڑی کے ایک بیٹے کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ یہی واقعہ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے جو حیدرآباد اور میرپور خاص کے حکمرانوں کی سیاسی اور عوامی پالیسیوں میں تھا۔ شیر سندھ، میر نصیر خان کی طرح کمزور اور دب جانے والے حکمران نہیں تھے۔

میر شیر محمد جب اپنی پیش قدمی کو روک کر واپس ہوئے اور میر صوبداد سیاسی فتح حاصل کر کے حیدرآباد پہنچا تو انگریزوں نے اپنی روایتی چالاکی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے محسن میر صوبداد خان کو گرفتار کر لیا۔ شیر سندھ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ فوراً مکار دشمن سے انتقام لینے پر تل گئے۔ ہوشو شیدی بھی تلوار میان سے نکالے شیر سندھ کے پاس پہنچ گیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ فی الفور جنگ کی تیاری کریں۔
اسی اثناء میں نیپیئر جو برابر میر شیر محمد کو جنگ سے باز رکھنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ آخر حیدرآباد سے چند میل کے فاصلے پر ناریجن.جی گوٹھ پہنچ گیا۔

میر شیر محمد خان نے جو حیدرآباد سے بارہ میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، 15 مارچ 1843ء کو نیپیئر کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ اگر وہ گرفتار شدہ میروں کو رہا کر دے تو اسے سندھ چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ اس پیغام کا جواب نیپیئر نے توپ کے گولے سے دیا۔ دبے کے میدان میں دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔ اب سندھی، جنگ میانی سے مختلف پوزیشن میں تھے۔ بلوچوں نے گیارہ توپوں سے حملہ کر دیا۔ انگریزوں کی توپوں نے سندھیوں کے بارود پر گولے برسائے اور بے شمار سپاہی شہید ہو گئے پھر نیپیئر نے پھلیلی کی طرف سے حملہ کر دیا لیکن اس جانب سے انگریزی لشکر کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ پے در پے پسپائی سے پریشان ہو کر نیپیئر نے سندھیوں پر کئی جانب سے حملہ کر دیا۔
شیدی غلام جرنیل ہوش محمد جس بہادری اور شجاعت کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ یہ حبشی غلام جو میر صوبداد کا نوکر تھا اور بقول مرزا عباس علی بیگ کے اسے لڑائی پر آمادہ نہ پا کر خود جنگ میں شامل ہو گیا تھا۔ نیپیئر کے لشکر پر قہر بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ جب انگریزی فوج کی شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے تو نیپیئر نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی آخری چال کو داؤ پر لگا دیا۔ طاقت کے استعمال کے باوجود واضح ناکامی کے بعد اپنی روایتی عیاری سے کام لیتے ہوئے اس نے چند غدار سندھیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ وطن فروش غداروں نے اپنے ہی بارود کو آگ لگا دی اور فوج بے کار ہو کر رہ گئی لیکن بلوچ جوانوں نے اپنے ابلتے ہوئے لہو کو بارود بنا لیا اور وہ بھالوں اور تلواروں سے انگریزی لشکر پر ٹوٹ پڑے۔
ہوشو نے صورت حال کو دیکھتے ہوئے شیر سندھ کو میدان جنگ سے دور نکل جانے کا مشورہ دیا لیکن اس نے جواب دیا، ''شیر محمد میدانِ جنگ کو چھوڑ کر مادر وطن کی مٹی کو شرمندہ کرے یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ انگریزوں کو شیر محمد کا زندہ جسم

نہیں بلکہ لاش ملے گی۔"

ہوشو نے اصرار کرتے ہوئے پھر کہا:

"سرکار، آپ سندھ کی امید ہیں آپ زندہ ہیں تو سندھ زندہ ہے۔ اگر آپ شہید ہو گئے تو سندھ کی قسمت کا ستارہ بھی ڈوب جائے گا اور آنے والی نسل کہے گی کہ بلوچ بزدل تھے۔"

آخر میر شیر محمد نے میدان چھوڑ دیا۔

خوفناک مقابلے میں میر غلام علی تالپور، ہوشو شیدی اور پانچ ہزار بلوچ سپاہی شہید ہوئے مرزا عطا محمد شکار پوری نے اپنی کتاب "تازہ نوائے معارک" میں لکھا ہے کہ جب انگریزوں نے میروں کو حیدر آباد میں قید کر لیا تو میر شیر محمد دبے میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ پہلے ہوش محمد ایک دستہ فوج لے کر لڑا اور شہید ہوا پھر میر غلام علی ابن میر عبداللہ تالپور، رحیم خان تالپور، کمال خان مری اور نومانی بلوچ تین سو سپاہیوں کے ساتھ پورے جوش وخروش سے لڑے اور انگریزی فوج کا کافی نقصان کیا۔ نیپیئر غصے میں سر کے بال نوچنے لگا اس جنگ میں محمد خان ٹھوڑھو، میر خان محمد اور غلام لغاری انگریزوں کے ایما پر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے بارے میں سارنگی پر گائے جانے والے چند اشعار ان کے مکروہ کارناموں کی طرح ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شاعر علی کہتا ہے:

"لغاریوں نے مقابلہ کیا لیکن ٹھوڑھے کو تو دیکھو برے منہ والا نواب ٹھوڑھا سب سے پہلے بھاگا اس نے اپنی بدکاری سے تمام ٹھوڑھوں کو بدنام کیا۔ میر کا لاکھوں روپیہ کھا کر ایک کوڑی کا بھی کام نہ کیا۔

احمد لغاری کے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کے منہ پر مونچھ ہے نہ داڑھی ہے۔

وہ جھوٹے علی مراد کا بکا ہوا آدمی ہے۔

اس نے اپنے بھائیوں کو بھی رلایا اور دوسرے بچوں کو بھی۔ شاعر ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ خواہ دوسرے لوگ ناراض ہوں مرد کے قول میں جھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ میں جھوٹ کا پول کھول رہا ہوں۔

غلام محمد لغاری بھاگ گیا۔ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بھاگ گیا۔

میر نصیر خان سے قول کر کے پھر گیا

شاعر اپنے میر سے سچ بولتا ہے

خان محمد اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور پوری زندگی تلوار اٹھانے سے توبہ کر لی۔ دوست محمد بھی احمد خان کو لڑنے کا کہہ کر بھاگ گیا۔"

اس سے پہلے کہ ہم میر شیر محمد کی ان سرگرمیوں کا ذکر کریں جو انہوں نے دبے کا میدان چھوڑنے کے بعد دکھائیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دبے کی جنگ میں سندھیوں کی شکست کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تا کہ ان

غلطیوں کی نشاندہی کی جا سکے جن کے باعث انگریز، حریت پسند سندھیوں کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔

ہم پہلے میانی کی شکست کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے کہہ چکے ہیں کہ میر نصیر خان کی اپنے عوام سے دوری اور جنگ سے سندھی میروں کا مسلسل گریز میانی کی شکست، کے بڑے اسباب ہیں۔ ہم اس سبب کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ عوام کی معاشی تباہ حالی اور ان کے خلاف جاگیرداروں کے مکروہ ہتھکنڈوں نے بھی انگریزوں کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میانی کی جنگ تو محض ایک دکھاوا تھا۔ انگریز عملاً اس سے پہلے ہی سندھ کے دو بڑے حصوں حیدر آباد اور خیر پور میرس پر قابض ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں ہمیں ان تمام شرمناک معاہدوں کو نہیں بھولنا چاہئے جو وقتاً فوقتاً سندھ پر ٹھونسے جاتے رہے تھے۔ چنانچہ میانی کی جنگ دراصل انگریزوں کی طاقت کا ایک نمائشی مظاہرہ تھی جس کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر بربریت کو بروئے کار لا کر لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ میانی کی جنگ سے پہلے ہی سر چارلس نیپیئر کے نام ایک درخواست میں میر نصیر خان نے سندھ کے لئے ''محکوم'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ سندھ عملاً جنگ میانی سے پہلے ہی فتح کیا جا چکا تھا لیکن میر پور خاص کے حاکم شیر محمد کی صورت حال مختلف تھی اس نے انگریزوں سے کوئی ایسا ذلت آمیز معاہدہ نہیں کیا تھا جس کی رو سے انگریز میر پور خاص کی ریاست پر اپنا تسلط قائم کر سکتے۔ اس کے لئے انہیں دبے میں ایک جنگ لڑنا پڑی، جو انگریزوں نے مقامی سرداروں کی غداری کے باعث جیت لی۔

سندھ کی سلطنت کو تین تالپور خاندانوں نے آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ مولائی شیدائی اپنی تصنیف ''تاریخ تمدن سندھ'' میں لکھتے ہیں کہ ''میر علی مراد خان مانکانی اور میر سہراب خان خیر پوری'' کے مرنے کے بعد تالپوروں کی نا اتفاقی سے انگریزوں کو تالپور میروں پر دباؤ ڈالنے کا سنہری موقعہ ہاتھ آیا۔ اب ''تاریخ سندھ'' کے مطابق حیدر آباد اور خیر پور کے میروں نے انگریزوں کی فرمان برداری تسلیم کر کے اسلحہ ان کے حوالے کر دیا۔ میر حاجی محمد بخش خان تالپور اپنے ایک خطبے میں سندھ کے میروں کے اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے ہمیں بتاتے ہیں کہ حیدر آبادی میروں کے ساتھ شیر سندھ کا اصل اختلاف ان کی انگریز نواز پالیسی سے تھا۔ اسی سلسلے میں حقائق درج ذیل ہیں۔

''کچھ فائل انگریزی ریکارڈ'' کے مطابق جب کچھ میں انگریز زور پکڑ رہے تھے تو میر پور خاص والے میر علی مراد خان نے حیدر آباد حکومت پر زور دیا کہ سندھی میروں کے لئے اکٹھے ہو کر کچھ کے راجہ کی مدد کرنے اور انگریزوں کو روکنے کا یہی مناسب وقت ہے لیکن حیدر آباد سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا۔ حیدر آباد کے میر صاحبان مکار اور عیار انگریز کو روکنے سے میر صوبدار کی طاقت کو کچلنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ 39-1836ء کے دوران انگریزوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے سندھ کو زیر کرنا شروع کر دیا۔ حیدر آباد کے میروں کو میر صوبدار خان کی طاقت کو کچلنے کے لئے انگریزوں کی مدد درکار تھی۔ میر حاجی محمد بخش خان تالپور کے لفظوں میں شیر سندھ اس بات کے سخت مخالف تھے۔ یہی سبب تھا کہ میر صوبدار خان اور میر فتح علی خان نے شیر سندھ کی حمایت کی جب کہ میر نور محمد خان اور میر نصیر

خان اپنی انگریز دوستی کے سبب میر شیر محمد کے دشمن بن گئے۔ انگریزوں نے افغانستان پر چڑھائی کے دوران گزرگاہ سندھ کو روندا۔ حیدرآباد کے میروں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ جب شیر سندھ نے انگریزوں کو راستہ دینا مناسب نہ سمجھتے ہوئے انگریزی لشکر کو روکا تو نور محمد اور نصیر خان بجائے اس کے کہ میر شیر کا ساتھ دیتے، الٹا انگریزوں کی نظر میں سرخرو ہونے کے لئے شیر سندھ کے خلاف فوج کشی پر تیار ہو گئے۔ اس کے برعکس جب میر نصیر خان میانی کی جنگ ہار رہے تھے تو انگریزوں نے شیر سندھ سے خائف ہو کر انہیں لکھا کہ آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ جس کے جواب میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف فوری لشکر کشی کا فیصلہ کیا اور ایک خط کے ذریعے انگریزوں کو اس فیصلے کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

''تمہارے پاس جو حیدرآبادی میر صاحبان قید ہیں، ان کو آزاد کر دو ورنہ تلوار کی دھار ہی فیصلہ کرے گی۔ میری طرف سے اسے اعلان جنگ سمجھا جائے۔'' (تاریخ مالکانی تالپور۔ مہر کاچیلوی)

چنانچہ میر شیر محمد نے جنگ کی اور شکست کے بعد روپوشی کے دوران برسوں تک انگریزوں کو سندھ سے نکالنے کی تدابیر کرتے رہے۔ دبے کی شکست کے اسباب یقینی طور پر وہ نہیں ہیں جو جنگ میانی کے ہیں۔ شکست کا ایک سبب یہ تھا کہ تینوں بلوچ ریاستوں کا آپس میں اتفاق نہیں تھا۔ میر شیر محمد نہ صرف یہ کہ حیدرآبادی میروں کی انگریز نوازی سے نالاں تھے بلکہ ان کا اراضی پر بھی اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اراضی کے سلسلے میں اختلاف کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میر شیر محمد میانی کی شکست کے بعد حیدرآبادی میروں کی مدد کے لئے لپکے، مگر بہت دیر ہو چکی تھی اور انہیں انگریزوں کی عیاری کے باعث راستے ہی سے لوٹنا پڑا۔

دبے کی شکست کا ایک سبب اپنے ہی سرداروں کی غداری تھی، دبے کی جنگ میں کچھ سرداروں نے اپنے ہی بارود کو آگ لگا دی۔ کچھ سرداروں نے اپنے سپاہیوں سمیت میدان جنگ چھوڑ دیا اور یوں واضح طور پر جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل گئی۔

شکست کا ایک سبب مہر کاچیلوی کے لفظوں میں یہ ہے کہ انگریزی لشکر تربیت یافتہ تھا، مگر بلوچی لشکر کو فوجی تربیت نہ ملتی تھی۔

جناب مولائی شیدائی نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ تمدن سندھ'' میں دبے کی شکست کا جائزہ لیتے ہوئے چند اسباب کی نشاندہی کرائی ہے۔ ان کے مطابق بلوچی فوج کسی ایک سپہ سالار کے ماتحت نہ تھی۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار کے حکم کے پابند تھے۔ جس سے اختلاف رائے پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اگرچہ میروں کی فوجی طاقت جودھ پور، بہاول پور، قلات اور ملتان کے مقابلے میں مضبوط تھی لیکن میروں کو نومڑیوں، جوکھیوں، کلمتیوں اور چانڈیوں نے عین موقع پر دھوکہ دیا۔ جہاں تک مولائی شیدائی کے ان اسباب کا تعلق ہے۔ یہ فوجی تربیت اور غداری کے زمرے میں آتے ہیں۔ جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ ان کے مطابق دبے کے میدان سے شیر سندھ کا جو سبب درج

کیا ہے، وہ یقیناً قابل توجہ ہے۔ ان کے مطابق دبے کے میدان میں شیر سندھ بعض امراء کے مشورے سے خفیہ طور پر جا چکے تھے اور میدان جنگ کی باگ ڈور ہوش محمد شیدی کے سپرد کر گئے تھے۔ بلوچی لشکر ایک غلام شیدی کی سپہ سالاری میں لڑنا اپنی ہتک سمجھ رہا تھا۔ شیدی نے کئی بار پیغام بھیج کر میدان جنگ کے آس پاس ٹھہرے ہوئے بلوچی سرداروں کو انگریزوں پر حملہ کرنے کی درخواست کی لیکن آقائی ذہنیت کے بلوچ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ شیدی کی شہادت کے بعد یہ بھی انگریزوں کے حملے سے نہ بچ سکے اور بری طرح شکست کھا کر منتشر ہو گئے۔

''لائن آف سندھ'' میں مہر کا چیلوی نے لکھا ہے کہ زمینداروں، جاگیرداروں اور ساہوکاروں کا طبقہ اپنے اقتدار اور ملکیت کو بچانے کے لئے غیروں کی غلامی قبول کر چکا تھا۔

میر شیر محمد دبے کے میدان سے نکلے اور میر پور خاص پہنچ گئے۔ پھر وہ جلد ہی امر کوٹ کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ اسی اثناء میں وفادار شکست خوردہ فوج بھی وہیں آ کر قلعہ نشین ہو گئی۔

15 اپریل کو انگریزوں نے امر کوٹ کا قلعہ فتح کر لیا لیکن امر کوٹ پر قبضہ ایک ہفتے تک مقابلے کے بعد کیا جا سکا۔

جناب مہر کا چیلوی کے مطابق شیر سندھ تھر میں قلعہ نوکوٹ منتقل ہو گئے۔ نوکوٹ سے بڑھ کر شہداد پور کے آس پاس آپ نے اپنے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں سے ٹکر لی۔ 6 مئی 1843ء کے اس تصادم میں آپ ایک غدار ملازم کے باعث پسپا ہوئے۔ سکرنڈ میں آپ کی انگریزوں سے چند جھڑپیں ہوئیں مگر کامیابی کی صورت نہ نکل سکی۔ جون کے آواخر تک شیر سندھ انگریزی جرنیلوں جنرل رابرٹ سن اور جان جیکب کے خلاف ہالا شہر کی ایک قریبی نہر کے کنارے معرکہ آزما ہوئے۔ یہاں بھی اپنوں کی غداری آڑے آئی۔ انگریزوں کے حاشیہ بردار اور خیر پور کے میر مراد علی خان تالپور نے شیر سندھ کے ساتھیوں نواب احمد خان لغاری وغیرہ کو ملازمتوں کا لالچ کے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ یوں میر شیر محمد تالپور نے سندھ میں اپنی آخری جنگ اپنے ساتھیوں کی غداری کے باعث ہار دی۔

لیکن آخری جنگ بھی ہار دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شیر سندھ نے سندھڑی کی غلامی کو قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے طویل گوریلا لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس میں انہیں ناکامی ضرور ہوئی تھی لیکن دل شکستگی بے وجہ تھی اس لئے انہوں نے سندھ چھوڑ دیا اور روپوشی کی زندگی اختیار کی۔ روپوشی جان بچانے کے لئے اختیار نہیں کی گئی تھی۔ سندھڑی پر قربان ہو جانے والے عظیم شیدی ہوش محمد شیدی کے الفاظ اب تک انہیں یاد تھے۔

''آپ سندھ کی آخری امید ہیں''

چنانچہ آپ سندھ سے نکل کھڑے ہوئے۔ انگریزوں نے شیر سندھ کی گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ اعلان بھی کیا جا چکا تھا کہ جو شخص میر شیر محمد خان کو پناہ دے گا۔ برابر کا مجرم گردانا جائے گا۔ میر صاحب کیٹی اور بدین سے ہوتے ہوئے ٹھٹہ میں دریائے سندھ کے کنارے ''چھرے جا پتن'' پہنچے۔ ایک ماہی گیر عورت نے

کمال دلیری سے کام لیتے ہوئے شیر سندھ اور ان کے دو ساتھیوں کو دریا پار کروایا۔ تاریخ میں اس بہادر عورت کو مائی بھاگو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہاں سے شیر سندھ کچھی کے علاقے میں پہنچے۔ ''تاریخ مانکانی تالپور'' کے مطابق شیر سندھ سرحدی بلوچوں کے بگٹی سردار کے مہمان بنے۔

شمالی سندھ کے بلوچ قبائل، بردہی، بگٹی، ڈومبکی، جھکرانی، مری، بجرانی اور بلیدیوں نے 1844ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ایک بار پھر اپنوں کی غداری آڑے آئی۔ والئی تالپور میر علی مراد خان اور نواب ولی محمد خان چانڈیو نے اپنی دس ہزار فوج کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی اور وطن کو آزاد کرانے والے مجاہدین کے خلاف بھرپور جنگ کی۔ بلوچوں نے بڑی بے جگری سے انگریزوں اور میر علی مراد خان کی مشترکہ سپاہ کا مقابلہ کیا لیکن شکست سے نہ بچ سکے۔

شیر سندھ یہاں سے قندھار روانہ ہوئے لیکن نام نہاد اسلامی سلطنت نے کوئی مدد نہ کی۔ بہت سے مورخین نے لکھا ہے کہ شیر سندھ پریشان حال وہاں سے لوٹے اور کوئٹہ میں قیام کیا لیکن گل محمد مستوئی نے مختلف بات کہی ہے۔ ان کے مطابق والی قندھار نے انہیں گرفتار کر لیا اور اس غریب الوطن آزادی کے پروانے سے پانچ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ انگریزوں نے شیر سندھ کے سر کی قیمت پانچ لاکھ مقرر کر رکھی تھی۔ کچھ عرصہ بعد شہر میں آگ لگنے سے بھگدڑ مچ گئی اور آپ موقع پا کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور پنجاب کی طرف روانہ ہو گئے۔ منزل منزل بھٹکنے کے بعد وہ پنجاب پہنچے۔ یہ وہ دن تھا جب پنجاب اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہا تھا۔ پنجابی حاکم شیر سندھ کی طرح مادر وطن کی آزادی کو بچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے تھے۔ پنجابیوں نے مصیبت کے ان دنوں میں بھی اپنے مہمان عزیز کو گلے لگایا۔ ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ ''چاہ میران'' میر شیر محمد تالپور کے نام سے منسوب ہے۔ حیدر ارشد اپنے مضمون چاہ میراں میں لکھتے ہیں کہ شیر سندھ نے قیام لاہور کے دوران شہر کے باہر اپنی سکونت کی جگہ پر ایک کنواں کھدوایا تھا یہی کنواں آج کل ''چاہ میراں'' یا ''میراں دی کھوئی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

1849ء میں پنجاب پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا لیکن اپنی سیاسی حکمت عملی کے باعث انہوں نے میر شیر محمد پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ انگریز سمجھتے تھے کہ ان پر ہاتھ ڈال کر وہ کسی نئی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ پہلے ہی وہ لاہور دربار کے بچے کچھے باغیوں اور ملتان کے دیوان مولراج کے ہاتھوں کافی پریشان ہو رہے تھے۔

ادھر شکستوں پر شکستیں کھانے کے باوجود میر شیر محمد خان نے انگریزوں کے سامنے سر نہ جھکانے کی قسم کھا رکھی تھی اور وہ اپنی تمام تر نفرت کے باوجود اگرچہ انگریزوں کا کچھ بگاڑ سکنے کی پوزیشن میں نہیں تھے پھر بھی ان کی خواہش تھی کہ وہ آبرومندانہ طریقے سے وطن واپس لوٹیں اور پھر سے جنگ آزادی کو شروع کر سکیں۔

آخر کئی پیش کشوں کے بعد کرنل لارنس نے شیر سندھ کو یقین دلایا کہ ان کے ساتھ آبرومندانہ سلوک کیا جائے گا۔

1854ء میں میر شیر محمد اپنے نظر بند بھائی میر شاہ محمد خان سمیت سندھ پہنچے۔ شہر کے عوام نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور جگہ جگہ ان کے اعزاز میں دعوتیں کیں۔ یہ شوکت وتکریم دیکھ کر انگریز ششدر رہ گئے۔

لیکن ڈسٹرکٹ کونسل تھر پارکر کے گزیٹیئر کے مطابق شیر سندھ کی اپنے وطن واپسی بالکل مختلف حالات میں ہوئی۔ گزیٹیئر کی رو سے شیر محمد کے محسن، نمک حلال اور وفادار ساتھی نواب امیر علی افاری حیدر آباد میں گرفتار کر لیے گئے۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو میر شیر محمد خان نے سندھ پہنچ کر اپنے آپ کو گرفتاری میں دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے اہل وعیال اور پچاس مسلح آدمیوں کو ساتھ لے کر حیدر آباد پہنچ گئے۔ انگریزوں نے پیش بندی کے طور پر شہر سے باہر خیمے لگوادیے تھے۔ شیر سندھ سے کہا گیا کہ وہ غیر مسلح ہوکر آگے بڑھیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اسی حالت میں آپ کو ایک خیمے میں نظر بند کر دیا گیا۔ بعد ازاں سر جان لارنس کی سفارش پر آپ کو میر پور خاص میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔

مہر کاچیلوی کا کہنا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی کے موقع پر انگریزوں کا وفادار رہنے کی وجہ سے میر صاحب کو برٹش حکومت نے کے سی ایس آئی کا خطاب دیا۔

ہم مہر صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ میر شیر محمد خان 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے وفادار رہے تھے۔۔ ہمارے اس بیان کی تائید مرزا گل احسن کربلائی بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق شیر سندھ نے 1857ء میں آزادی کی غرض سے لشکر اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا لیکن حیدر آباد کے میر ہز ہائی نس محمد علی خان نے بروقت یہ راز فاش کر دیا اور یوں ان کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہوگیا۔ انگریزوں نے شیر سندھ کے ارادوں سے باخبر ہونے کے باوجود اپنی سیاسی مصلحتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی برے ردعمل کا اظہار نہ کیا بلکہ ایک طرح سے ان کی دلجوئی اور خوشامد شروع کر دی۔

1862ء میں انگریزوں نے امر کوٹ میں ایک دربار منعقد کیا جہاں انہیں کے سی ایس آئی کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہ بھی منظور کیا کہ تمام افسران کے پاس چل کر آیا کریں گے اور انہیں کسی دفتر میں جانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ 1867ء میں دیگر وظائف کے علاوہ انہیں ''ستارہ ہند'' کا خطاب بھی ملا۔ ان نوازشوں اور خطابات کو بعض حلقوں میں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بجا طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تمام عمر آزادی کی جدوجہد کرنے والا مجاہد اچانک انگریزوں کا محبوب نظر کیسے بن گیا۔ یہ بات حیرت ناک ہے کہ اپنوں کی غداریوں اور مسلسل شکستوں کے بعد دوبارہ وطن واپس آ کر آباد ہونے والا شخص کیوں کر اس قدر عزت افزائی کا مستحق سمجھا گیا جب کہ اس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی انگریزوں کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ کیا اس خدشے کو درست مان لیا جائے کہ شیر سندھ نے آخر کار ہار مان لی تھی۔ خاموشی اختیار کر لی تھی اور اپنا انقلابی کردار بدل لیا تھا۔ یہ مسئلہ ابھی طے کیا جانا ہے۔ 1876ء میں آپ نے وفات پائی اور آبائی قبرستان چٹوری میں دفن کیے گئے۔

ہوش محمد شہید:

ہوشو غلام ابن غلام تھا اس لئے آج ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں ۔اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں، درباری مؤرخین کو ایک غلام کی زندگی سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ وہ کیوں یہ زحمت گوارا کرتے کہ ہوشو کن حالات میں پلا بڑھا تھا۔ وہ کون سے خیالات تھے جنہوں نے اسے فضاؤں میں آزادی کا پرچم بلند کرنے اور اپنا لہو اچھال دینے کی ترغیب دی تھی۔ آغا سلیم کے لفظوں میں بادشاہوں اور شہزادوں کی عظمتوں اور سازشوں کی داستانیں لکھنے والے درباری تاریخ نویسوں کو اتنی فرصت کب تھی کہ وہ ایک شیدی غلام کے بارے میں کچھ لکھتے۔

لیکن آیئے پہلے ان مختصر سی معلومات کو ایک نظر دیکھ لیں جو آغا سلیم نے اپنے مضمون ''ہوشو شہید'' میں یک جا کردی ہیں۔ ان کے مطابق ہوشو میر فتح علی خاں کے ایک آزاد کردہ غلام کا بیٹا تھا۔ سندھ کے تالپور امیر جن غلاموں کو آزاد کرتے تھے ان کی حضرت علی کے آزاد کردہ غلام قنبر کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ اسی نسبت سے ہوشو بھی ہوش محمد قنبر انی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہوشو میر فتح علی خان کے بیٹے میر صوبداد کا ہم عمر ساتھی اور خدمت گار تھا۔ میر صوبداد خان اپنی موقع پرستانہ روش کے لئے بے حد مشہور ہے۔ وہ 1801ء میں پیدا ہوا تھا۔ پیدائش کے فوراً بعد اس کے والد فتح علی خان وفات پا گئے اور یوں میر صوبداد خان اپنے چچاؤں کے ہاں پرورش پانے لگا۔ شاید اسے وہاں اپنے باپ جیسی محبت نصیب نہ ہوسکی۔ جس کے باعث وہ احساس کمتری کا شکار ہوگیا۔ جو کبھی کبھار مرگی کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ 1826ء میں جب اس کی عمر 25 سال تھی۔ اس نے اپنے چچاؤں کے خلاف بغاوت کی۔ اس کا خیال تھا کہ میر فتح علی خان کے بیٹے کی حیثیت میں تخت و تاج کا وارث اسے اور صرف اسے ہونا چاہئے تھا۔ ہوشو صوبداد کا خدمت گار تھا اور اس کی وفاداریاں دوسرے میروں کے مقابلے میں میر صوبداد خان کے لئے وقف تھیں۔ اسی لئے وہ صوبداد خان کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ ملک میں خانہ جنگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میر صوبداد خان کے دوراندیش چچا میر کرم علی خان نے حکمت عملی سے کام لے کر خانہ جنگی کو روکا اور میر صوبداد خان کو جاگیروں اور ملکی انتظام میں حصہ دے دیا۔ بظاہر میر صوبداد خان مطمئن ہوگیا لیکن اس کے دل میں سندھ کے تاج و تخت کا تصور برابر کروٹیں لیتا رہا۔ میر صوبداد خان نے اقتدار کی ہوس میں انگریز نوازی کو اپنا شعار بنا لیا اور مادر وطن کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ ڈاکٹر برنس سے لے کر سر چارلس نیپیئر تک انگریزوں کے ساتھ دوستی کے معاہدوں میں میر صوابداد خان اور اس کے مشیر کوڑے، نارسے اور منشی آوت رائے پیش پیش تھے۔ ان سازشوں کا نتیجہ میانی کی جنگ کی صورت میں نکلا۔ اس تمام عرصے میں ہوشو کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا، حالانکہ وہ میر صوابداد کی ملازمت میں تھا۔ شاید اس وقت تک اسے مادر وطن کی بجائے اپنے آقا سے وفاداری کا زیادہ احساس ہو۔ وہ سندھڑی کا بیٹا تھا اور میر صوبداد خان کا غلام۔ ان دنوں ہوشو پس منظر میں اپنے آقا کی خدمت کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

1838ء میں انگریزوں نے جب افغانستان پر چڑھائی کی تو وہ سندھ سے گزرے۔ معاہدے کی خلاف ورزیاں کر کے انہوں نے سارے سندھ میں آگ بھڑکا دی۔ تمام سندھی سروں کو ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکل کھڑے ہوئے ،لیکن میروں کی مصلحت نے بھڑکے ہوئے عوام کو اور آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اپنی فوج کشی کو قانونی حیثیت دینے کے لئے انگریزوں نے میروں کے ساتھ نیا معاہدہ کرنا چاہا اور جب انگریزوں کے سفیر اس غرض سے حیدرآباد پہنچے تو مشتعل عوام کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ جہاں سے بھی سفیر گزرتے بھڑکے ہوئے عوام انہیں گالیاں دیتے اور زمین پر تھوکتے۔ جب سارا سندھ بغاوت کی آگ میں جل رہا تھا۔ ہوشو کہیں خاموش بیٹھا تھا۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر بھی ہمیں ہوشو نظر نہیں آتا۔ سازشی شہزادوں اور سرداروں کے اتنے بڑے ہجوم میں وہ کیسے نظر آ سکتا تھا۔ جب انگریزوں نے خیرپور کے حاکم میر رستم خان کو معزول کر کے خان گڑھ کے قلعہ کو تباہ کر دیا اور حیدرآباد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور جب میروں کے سفیر ناکام لوٹے تو عوام کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ مشتعل عوام نے میر شہداد خان کی سرکردگی میں میروں کی تمام مصلحتوں اور معاہدوں کو توڑتے ہوئے انگریزوں کی ریذیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ میانی کی جنگ کا اعلان بن گیا۔ اس وقت بھی ہوشو ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ میانی کی جنگ میں بھی ہوشو غائب تھا۔ وہ کہاں تھا، کیا کر رہا تھا، اس کے جذبات کیا تھے۔ تاریخ ان باتوں کا کہیں پتہ نہیں دیتی۔ جہاں تک میر صوابداد خان کا تعلق ہے۔ اس نے انگریزوں سے اپنی وفاداری کا تعلق قائم رکھنے اور اسے مزید پختہ بنانے کے لئے میانی کی جنگ سے علیحدگی اختیار کئے رکھی۔ اس نے اپنے تمام آدمیوں کو جنگ میں حصہ لینے سے روک دیا۔ شاید میر صوابداد خان کی وفاداری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوشو بھی ان بدنصیب لوگوں میں سے تھا جو اس موقعہ پر وطن عزیز کی خدمت میں اپنی جان کا نذرانہ پیش نہ کر سکے۔ اس مسئلے پر تاریخ بالکل خاموش ہے لیکن آغا سلیم نے ہی اس دور کے ایک درباری شاعر سید احسن علی شاہ کا ذکر کیا ہے۔ اس شاعر نے لکھا ہے کہ ہوشو نے میر صوبداد خان کو کافی جوش دلایا۔ اس کی سوئی ہوئی غیرت کو جگانے کی کوشش کی۔ کوڑے، نار بیجے اور آوت رائے کی سازشوں سے خبردار کیا لیکن میر صوبداد خان پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس کے برعکس اس نے ہوشو کو قید کرنے کی دھمکی دی۔ میانی کی جنگ کا فیصلہ تین گھنٹوں میں ہو گیا۔ میر صوبداد خان نشان عبرت ہے کہ انگریزوں نے اس کی وفاداریوں کا اسے خوب صلہ دیا۔ دوسرے میروں کے ساتھ اسے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ایسا شخص جو انگریزی سازشوں میں براہ راست شریک رہا تھا، سب سے پہلے ان کے انتقام کا نشانہ بنا۔ انگریز اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جو شخص اپنوں کا وفادار نہیں ہو سکتا وہ ان کے ساتھ کیسے وفا کرے گا۔ چنانچہ تاریخ میں انگریزوں نے اپنے تمام وفاداروں کے ساتھ کم و بیش یہی سلوک کیا ہے۔ اب ہوشو کے لئے فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔ اس نے تمام زنجیریں کاٹ ڈالیں اور شیر محمد کے پاس پہنچ گیا۔ دبے کی جنگ میں سندھی لشکر انگریزوں پر ٹوٹ پڑا لیکن انگریز جلد ہی سنبھل گئے اور بڑے تحمل سے سندھی لشکر پر کئی جانب سے حملہ آور ہوئے۔

شکست کے آثار دیکھتے ہوئے ہوشو نے شیر سندھ کو مشورہ دیا کہ وہ میدان چھوڑ جائیں اور بچی کھچی طاقتوں کو اکٹھا کر کے دشمن پر آخری وار کریں۔ ہوشو کے بے حد اسرار پر میر شیر محمد نے دبے کا میدان چھوڑ دیا۔ اس سلسلے میں ایک اور روایت ہم تک پہنچی ہے جسے مہر کا چیلوی نے اپنی کتاب ''تاریخ مانکانی تالپور'' میں درج کیا ہے۔ اس حکایت کے مطابق ہوشو نے نہیں بلکہ نواب امیر علی خان لغاری نے میر شیر محمد خان کو میدان چھوڑ جانے اور ہوشو کو اپنے ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا۔

راوی کے مطابق کافی بحث کے بعد نواب امیر علی خان یہ کہتے ہوئے میر شیر محمد کے ساتھ ہو لئے کہ تاریخ نویس مجھے بھی تو معاف نہیں کرے گا۔''

لیکن تاریخ نے نواب امیر علی خان کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ وہ آخر تک سندھ کے وفادار رہے اور اس جرم کی پاداش میں آخر کار حیدر آباد سے گرفتار کر لئے گئے۔

میر شیر محمد کے میدان چھوڑ جانے کے بعد ہوشو نے بے پناہ بہادری کا مظاہرہ کیا اور ایک ایک شیدی مادر وطن کی آن پر کٹ مرا۔

بچے کھچے بارود کے خاتمے کے بعد بھی وہ دشمن کے سامنے ڈٹا رہا۔ اس نے اپنی تلوار سے ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ بے ہتھیار ہوشو فتح مند تھا اور دشمن کے سپاہی ہتھیاروں کے ہوتے ہوئے بھی خاک وخون میں تڑپ رہے تھے۔ اس نے دشمن کو دو میل پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور آخر کار 22 رجمنٹ کی ایک توپ نے اس کے بے قرار لہو کو فضاؤں میں اچھال دیا۔ مرتے وقت اس کے منہ پر وہی پرانا نعرہ تھا:

''مرویسوں پر سندھ نہ ڈیسوں'' (مر جاؤں گا لیکن سندھ حوالے نہیں کروں گا)

جنرل نیپیئر نے ٹوپی اتار کر ہوشو کی لاش کو سلام کیا۔ فوجی اعزاز اور توپوں کی سلامی کے ساتھ اسے دفن کیا گیا۔ ہوشو کی شہادت کے فوراً بعد جنگ ختم ہوگئی۔ دھرتی نے اپنے بیٹے کو آغوش میں لے لیا تھا۔ اب خاک وخون کے کھیل کا جاری رہنا بے فائدہ تھا۔ سندھڑی نے انگریزی سامراج کا غلام بننے سے پہلے ''غلام'' ہوشو کو اپنے کلیجے سے لگالیا۔ یہ زنجیریں نیپیئر نے سندھڑی کو پہنادیں۔

بائیسویں رجمنٹ کی ایک توپ نے ہوشو کی جان لے لی۔ اس کی روح کے ساتھ یہ خیال بھی فضاؤں میں بکھر گیا کہ نظر یہ مر نہیں سکتا۔ جذبہ ہلاک نہیں کیا جاسکتا۔ موت جسم تک قادر ہے اس سے آگے اس کے پر جلتے ہیں۔

ہوشو کے بارے میں شاعر علی نے لکھا:

''ہوش محمد قنبرانی حملے کرتا ہوا میدان میں آیا
اس دولہا نے آتے ہی میدان میں تباہی مچادی
شیدی نے اپنا سر قربان کر دیا

(دشمن کے) سیکڑوں سپاہی شیدی پر ٹوٹ پڑے

شیدی پر افسوس نہیں ہے

فتح تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے

مرد کا کام تو مقابلہ کرنا ہے

دیکھئے اس مردِ حر کے بارے میں دشمن کیا کہتے ہیں:

سر چارلس نیپیئر لکھتا ہے:

''میانی اور دبے کی لڑائیوں میں سپہ سالار قابلِ تعریف ہے۔ اس نے جنگ میں روح پھونک دی تھی۔ وہ حبشی غلام دل کا بہادر تھا۔ میروں کا یہ خاص نوکر میانی کی جنگ کے بعد اپنے بھائیوں سمیت ہمارے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے دبے کی لڑائی میں بہادری سے لڑتا ہوا بائیس رجمنٹ کی توپ سے مر گیا۔ دراصل ہوش محمد کے مرنے کے بعد میر شیر محمد کی شکست کے آثار نمودار ہوئے اور کئی گھوڑ سوار سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اگرچہ نیپیئر کے اس بیان میں واقعات کی کئی غلطیاں ہیں مثلاً ہوشو میانی کی جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح میر شیر محمد ہوشو کے شہید ہونے سے پہلے میدان چھوڑ کر جا چکے تھے لیکن ان غلطیوں کے باوجود جو بات قابل ذکر ہے، وہ دشمن کی زبان سے ہوشو کی بے مثال بہادری کا اعتراف ہے۔

ایک دوسرے انگریز نے ہوشو کی عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔:

''اس نے توپ چلائی۔ اس نے حکم دیا اور دوسروں کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ ادھر تھا۔ ادھر تھا ہر کہیں تھا۔''

''اس بہادر شخص نے جنگی مہارت کا ایسا زبردست مظاہرہ کیا جو کسی یورپی جرنیل سے بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے دوسرے شیدی بھائیوں کے ساتھ تھا اور جنگ میں سب سے آگے تھا۔''

ایک انگریز لیفٹیننٹ نے کہا:

''یہ ہوشو ہے سر بلند''

کیپٹن رچرڈسن سے میجر جیکب نے ہوشو کے لئے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''وہ بے رحمی سے لڑتا ہے۔ اس نے ہمارے کتنے ہی نائٹوں کو ہلاک کر دیا۔ اسے بجا طور پر قتل کر دو کیپٹن!

ایک اور انگریز پکارا:

''وہ جو مردوں کے درمیان کھڑا ہے۔ وہی اس سرزمین کا بہادر بیٹا ہے جو تنہا مادرِ وطن کے لئے لڑنے کی جرات کر سکتا ہے۔''

ایک جنگجو دیمیترس نے کیپٹن رچرڈسن سے کہا:

''کیپٹن! یہ ہوشو جس کا انگ انگ زخموں سے چور ہے جو سر سے پاؤں تک لہو میں رنگا ہوا ہے اگر چاہے تو

کلہاڑی کے ایک وار سے دھرتی چیر ڈالے۔ میں نے آج اسے گرجتے ہوئے سنا ہے۔ کیپٹن رچرڈسن یاد رکھنا! سندھ میں اس کی آواز صدیوں تک گونجتی رہے گی۔ میں نے اپنی زندگی میں ہوشو جیسا جرنیل نہیں دیکھا۔"

فتح سندھ کے بعد سر چارلس نیپیئر کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنے اولین اقدام کے طور پر کراچی کو سندھ کی راجدھانی بنا دیا لیکن نیپیئر اپنے مقبوضات میں زیادہ عرصہ نہ گزر سکا۔ 1847ء میں اسے مستعفی ہونا پڑا۔ سندھ کے نظم و نسق کے بارے میں سر بارٹرے نے لکھا تھا:

"جب میں 1851ء میں سندھ آیا تو سارے سندھ میں ایک میل بھی لمبی پکی سڑک نہیں تھی۔ نہ ڈاک بنگلہ تھا اور نہ کوئی سرائے نہ کچہری تھی اور نہ چوکی۔"

سر بارٹر کے اس بیان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تالپوروں کے عہد میں رفاہ عامہ کی حالت کیا تھی۔ ملک میں دولت کی فراوانی کے باوجود عام لوگوں کی فلاح کے لئے کوئی خاص انتظامات موجود نہیں تھے۔

انگریز میروں کی اندھی دولت کو حریصانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کلہوڑوں کے عہد سے انہوں نے سندھ میں تجارت کا جال بچھانا شروع کر دیا تھا۔ تالپوروں کے عہد میں وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے سندھ پر قبضہ کرنے کے اقدامات کرنے لگے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ فوج کشی کے بغیر ہی کسی طرح سندھیوں کو غلام بنالیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف اقدام بھی کئے۔

1827ء میں ڈاکٹر جیمز برنس میر مراد علی کے علاج کے بہانے حیدرآباد پہنچا اور یوں دربار تک رسائی حاصل کی۔ یہ وہی مراد علی ہے جس نے افغان کرنسی منسوخ کر کے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ 1831ء میں انگریزوں نے رنجیت سنگھ کو تحائف بھیجنے کے بہانے سندھیوں میں جہاز رانی کی۔ سندھ کی فتح کے لئے وہ سندھ کے آبی راستوں سے آگاہ ہونا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آبی راستوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے رنجیت سنگھ کو تحائف بھیجنے کا ناٹک رچایا۔

میروں کا دور خوشحالی کا دور گنا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک میں دولت کی کمی نہیں تھی لیکن یہ دولت عوام پر خرچ نہیں ہوتی تھی۔ میر فتح علی خان کی آمدنی اور خرچ کا تخمینہ دیکھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک کی آدھی سے زیادہ دولت میروں کے ذاتی اخراجات کے لئے وقف کر دی جاتی تھی۔

عربوں کے دور میں تخمینے کی رقم 27 لاکھ، مغلوں کے دور میں 23 لاکھ 20 ہزار اور کلہوڑوں کے دور میں 87 لاکھ روپیہ تھی۔ کلہوڑوں اور تالپوروں کے دور میں افغانوں کو خراج کی سالانہ رقم بھیجی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ میر فتح علی شاہ تک جاری رہا۔ میر فتح علی شاہ، احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو 9 لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ادا کرتے تھے لیکن میر غلام علی نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب اسے خراج ادا کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے جواب دیا: "وہ مرغی مرگئی جو سونے کا انڈہ دیتی تھی۔"

میر فتح علی کی وفات کے وقت خزانے میں 32 لاکھ روپیہ نقد موجود تھا۔ حکومت آمدنی کا چوتھا حصہ اوقاف پر خرچ کرتی تھی۔ میر غلام علی (جس نے افغانوں کو خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا) کے دور میں باجرہ اور جوار ایک روپے میں چھ سیر ملتا تھا۔

یہ سماج تھا اور یہ سماجی عوامل تھے جب انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا۔ انگریزی سامراج کی تبدیلیوں کے باعث طبقاتی تضادات ایک نئی شکل اختیار کرنے لگے۔ کسان جو صدیوں سے وڈیرہ شاہی کے ظلم کا شکار تھے اب دوہری غلامی میں آنے لگے۔ مقامی ظالم نے بیرونی ظالم کے آگے سر جھکا دیا۔ غریب عوام کچلے جانے لگے۔ انگریزوں نے میانی کی فتح کے بعد قلعے میں جو لوٹ مار کی تھی، اس سے انہیں تین کروڑ روپیہ حاصل ہوا۔ وڈیرے اس لوٹ مار سے بالکل متاثر نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے انگریزوں کے ساتھ اتحاد کرنا اپنے لئے وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھا۔ اس نئی صورت حال نے طبقاتی نزاع کو نئی صورت بخشی۔

اب کسان اور غریب کا اصلی تضاد صرف مقامی لیڈروں کے خلاف نہیں تھا بلکہ ان کی جنگ انگریزی سامراج کے خلاف بھی تھی اس لئے عوام نے باقاعدہ لڑائیوں کی بجائے گوریلا طریق جنگ کو اختیار کیا اور وقتاً فوقتاً مقامی اور غیر مقامی لٹیروں کو پریشان کرنے لگے۔ سندھ میں یہ تازہ صورت حال پیدا ہو رہی تھی جب انگریزوں نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ پنجاب جو ایک مدت سے سندھ کی طرح برطانیہ کے ساتھ دوستی کی پالیسی اپنائے ہوئے تھا اچانک انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

ماخذ:

1۔ عبرت کدہ سندھ۔ ای بی ایسٹ وک
اردو ترجمہ: سید محمد ضامن کنتوری

2۔ تاریخ تمدن سندھ (سندھی) رحیم داد مولائی شیدائی

3۔ جنت السندھ (سندھی) رحیم داد مولائی شیدائی

4۔ کمپنی کی حکومت۔ باری

5۔ ہوشو شہید (سندھی مضمون۔ ماہنامہ نئین زندگی) آغا سلیم

6۔ تاریخ مانکانی تالپور (مہر کاچیلوی)

7۔ لائن آف سندھ۔ (مہر کاچیلوی)

8۔ ''دبے جی لڑائی'' (سندھی مضمون) مرزا عباس علی بیگ

روپلو کوہلی کا لوک بیانیہ:

ننگر پارکر کا جری بیٹا، ہوشو شیدی کا پیروکار، ننگر پارکر بغاوت کے شعلے بھڑ کانے والا روپلو کوہلی عوام کی اجتماعی یادوں میں ابھی تک زندہ ہے۔ انگریزوں نے ننگر پارکر پر قبضے کے لئے انیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہی کوشش شروع کر دی تھی۔ تب انگریز سرکار نے یکم نومبر 1832ء میں ننگر پارکر پر چڑھائی کے لئے لشکر بھیج دیا۔ اس وقت ننگر پارکر کا حکمران رانو جگو جی تھا۔ لشکر کے آنے کا سن کر وہ بھاگ گیا۔ ویراواہ کا رانو، انگریزوں کا موافق تھا اور اس نے انگریزوں سے کوئی مقابلہ نہ کیا۔ جگو جی کی جگہ پر رانا کرن کو بٹھایا گیا اور اسے ڈاکوؤں پر نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ سوڈھو جگو جی میروں کے ہاتھ آ گیا، انہوں نے اسے گرفتار کر کے انگریزوں کے پاس بھیج دیا۔ انگریزوں نے اسے کچھ عرصہ قید میں رکھا اور آخر بھوڈیسر کا رانا مقرر کر دیا۔ 1833ء سے 1843ء تک میروں کی عملداری پارکر پر رہی اور وہ باقاعدہ لگان بھی وصول کیا کرتے تھے۔ میروں نے تھر میں قلعے بنوائے جن میں ان کی طرف سے کاردار رہتے تھے۔ البتہ پارکر میں کوئی قلعہ نہیں بنوایا۔

جب انگریزوں نے 1843ء میں میروں سے سندھ لے لیا تو ملک بھر میں ہر جگہ شورش برپا ہوگئی۔ بالخصوص تھر اور پارکر والے راناؤں نے آسانی سے تابعداری اختیار نہ کی اس لئے گورنمنٹ نے سہولت کی خاطر اپنے عملدار جگہ جگہ مقرر کئے اور پارکر والے حصے پر پہلے ایجنٹ کیپٹن اسٹینلے ریکس آئے۔ دوسرے ایجنٹ تروٹ صاحب آئے جو 1846ء سے 1871ء تک رہے۔ تروٹ صاحب نے 1856ء میں پارکر کو حیدرآباد ضلع کے ساتھ منسلک کر دیا۔ تروٹ صاحب کے بعد مسٹر پالن آئے جنہوں نے ننگر پارکر بازار بنوایا۔ آج تک اس بازار کو "پالن بازار" کہا جاتا ہے۔ (17)

پارکر کے سوڈھے ابھی تک خود مختار کہلاتے تھے اور انگریزوں کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ منگھا رام اوجھا کی فراہم کردہ تفصیلات میں بتایا گیا ہے کہ تالپور "میروں کی سند" کے مطابق پارکر کا رانا کرن سنگھ، سوزا چند اور رام پور گوٹھوں تک ننگر پارکر شہر کی آدھی ڈیوٹی اور پارکر کی ٹرانس ڈیوٹی کا حق دار تھا۔ ویراواہ کے سوڈھے کو ویراواہ گوٹھ معافی میں ملا تھا صحرا کی پیداوار بھی نذرانہ ملی تھی۔ اسے آدھے شہر کا محصول اور اپنے علاقے کے لگان کا چوتھا حصہ بھی ملتا تھا۔ سر چارلس نیپیئر نے 15 اکتوبر 1844ء اور مئی 1847ء میں دونوں جاگیرداروں کی سندیں سات سالوں تک قائم ٹھہرائیں اور ملنے والے محصول کا نصف کاٹ دیا۔ رانا کے پردھان اکمال دھیو کو موکرئی کا گوٹھ بھی سند موجب ملا تھا۔ مذکورہ بالا تینوں اور دوسرے سوڈھوں کو جو حق ملا ہوا تھا، انگریز سرکار نے اسے ختم کر دیا۔ بٹائی سے لے کر خاص حقوق کی وصولیابی کی ٹھاکروں پر کوئی بندش نہ تھی۔ وہ ناجائز طور پر چرائی اور دوسرے ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ پارکر کا حصہ 1856ء میں کمشنر کے حوالے کیا جا چکا تھا جو پہلے تروٹ صاحب، پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ کے ماتحت تھا۔ کمشنر نے حیدرآباد سے اپنے آدمی بھیجے اور ریونیو سروے جاری کیا۔ چراہگاہ کا ٹیک بھی اب حکومت نے اپنے لئے رکھا۔ افیم پر لائسنس بڑھ گیا۔ کیونکہ پہلے سوڈھے غیر قانونی افیم لا کر بیچتے تھے اور اس میں زبردست منافع تھا۔ کیپٹن ریکس کی

عملداری میں ننگر پارکر کے کارگزار برہمن تھے یہ سوڑھوں کے ساتھ بندھے تھے۔ پولیس کا عملہ بیشتر ٹھاکروں پر مشتمل تھا۔ رانا کرن تھے اور خبریں پہنچاتے تھے۔ تروٹ کو خبر ہوئی تو روپلے کو جاگیر کا لالچ دیا کہ رانا کا پتہ بتاؤ۔ مگر وہ رانا کا وفادار تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے تو اس کی کچھ خبر نہیں۔'' پھر اس پر کافی کچھ تشدد بھی کیا۔ ہاتھ کی ہتھیلیوں میں تیل ڈالا۔ انگلیوں پر بتیاں لگائیں اور آگ لگادی۔ لیکن روپلو پھر بھی اپنی بات پر ثابت قدم رہا۔ آخر تروٹ صاحب نے ہنس پری بائی اور سیٹھ مہاوجی کو بلایا، انہیں لالچ دیا، انہوں نے رانا سے دغا کرتے ہوئے اسے گرفتار کرادیا۔ اس کے بعد وزیرا اور دوسرے سوڑھے بھی گرفتار ہوئے۔ جنہوں نے اطاعت قبول کی انہیں آزاد کردیا گیا۔

بھوڈیسر کیٹھا کر، حملے کے وقت انگریزوں کے مددگار رہے اور کرنل ایونس نے 23 اگست 1859ء کو ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس نے سفارش کی کہ بھوڈیسر کا گوٹھ، جس سے سالانہ آمدنی تین سو روپے تھی، سوٹھاکروں کو ہمیشہ کے لئے دے دی جائے۔ انہیں بالآخر چھ ہزار ایکڑ جاگیر ملی۔ ننگر پارکر کے رانا اور ویراواہ کے ٹھاکروں نے اطاعت قبول نہیں کی چنانچہ انہیں پہلے سے جو جاگیریں ملی ہوئی تھیں، ضبط کرلی گئیں۔ ننگر پارکر کے رانا ویراواہ کے ٹھاکر لادھو سنگھ اور اس کے بیٹے اُدھے سنگھ نے پھر بھی اطاعت نہ کی۔ اُدھے سنگھ کو تروٹ صاحب نے بہتیرا للچایا اور اسے سندھ میں فرسٹ کلاس جاگیر اور ایک بنگلہ دینے کا وعدہ کیا لیکن وہ نہ مانا۔ اس لئے اسے عمر کوٹ میں بند کردیا گیا۔ رانا اور وزیر پر حکومتی مجرم ہونے کا مقدمہ چلا۔ جو 1860ء میں مکمل ہوا۔ رانا کو چودہ سال کی جیل اور وزیر کو دس سال کی جیل ہوئی۔ روپلے کوہلی کا نام امر ہوگیا۔ یہی اس کا انعام ہے۔ اس بلوے میں سوڑھوں نے جو بہادری دکھائی، اس کے بیت ابھی تک پارکر میں گائے جاتے ہیں۔(18)

جہاں تک خود روپلو کوہلی کا تعلق ہے عوامی روایات کے مطابق اسے عبرت ناک تشدد سے گزرنا پڑا۔ جب تک وہ انگریزوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا تو حکمرانوں نے اس کی بیوی کو دھمکی دی کہ اگر اس نے گرفتاری نہ دی تو اسے نشانِ عبرت بنادیا جائے گا۔ وہ خود کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے مسلسل انکاری رہا۔ روپلو کی بیوی نے اسے ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا کہ اگر تم نے ہتھیار ڈالے تو کوئی کوہلی عورت اپنے مرد پر اعتبار نہیں کرے گی۔ انگریزی قبضے میں آنے کے بعد بھی اس نے رانا کرن سے غداری کرنے سے انکار کردیا۔ اسے بدترین تشدد سے گزرنا پڑا۔ عوامی روایات کے مطابق روپلو کو، جس درخت پر پھانسی دی گئی اس کی لاش کافی عرصہ تک اس پر لٹکتی رہی یہ درخت ڈیڑھ صدی تک آزادی کے متوالوں کی زیارت گاہ بنا رہا اور اب سے چند برس بیشتر اس درخت کا وجود مٹ گیا لیکن روپلو اور اس کی بغاوت کی یاد کو نہ مٹایا جاسکا۔ ننگر پارکر کی یہ اب بھی مقبول ترین کہانی ہے۔

اس سے قبل 1857ء میں پورا سندھ آزادی کی اس جنگ میں کود پڑا تھا۔ کراچی کی قدیم ایمپریس مارکیٹ جو اس وقت ایک میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کررہی تھی، وہاں جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو توپ دم کیا گیا۔ دور تک سولیاں قطاریں نصب تھیں۔ حیدرآباد، میرپور خاص اور سندھ کے دیگر شہروں میں بھی یہ قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔

سندھی لوک دانش:

سندھی زبان لوک دانش کے حوالے سے بے حد امیر اور ثروت مند ہے۔ سندھی ضرب الامثال کے حوالے سے کئی کتابیں شائع کی جا چکی ہیں اور کافی کام محفوظ کیا جا چکا ہے۔ روزمرہ کی سندھی بول چال میں ان گنت ضرب الامثال سننے کو ملتی ہیں۔ ہم محفوظ شدہ خزانے سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

1۔ کام، کام کو سکھاتا ہے۔ یعنی کام کرتے ہوئے مہارت حاصل کرنا

2۔ وہ سکھر میں ڈوبی اور اسے (بچانے کے لئے) بکھر سے جال ڈالا جا رہا ہے

3۔ (آئے میر) بھاگے پیر

4۔ بہرا آدمی دو بار ہنستا ہے

5۔ اناج ہے تو ایمان ہے
(روٹی دین کا چھٹا رکن ہے۔ بابا فرید گنج شکر)

6۔ اچھا ساتھ پار اتارے، بُرا ساتھ ڈبو دے

7۔ ہر چیز کی زیادتی بُری ہے

8۔ غریب کی آہ، خدا کا قہر نازل کرتی ہے

9۔ اندھا ہاتھی لشکر کا زیاں ہے(19)

10۔ بھوک بُری بلا ہے، جو دانا کو دیوانہ کرتی ہے

11۔ دو بھائی، تیسرا حساب

12۔ سچ کڑوا، جھوٹ گڑ

13۔ دو خربوزے، ایک ہاتھ میں نہیں سماتے

14۔ دولت ناخن سے گوشت علیحدہ کرتی ہے(20)

حوالہ جات:

1۔ سید مظہر جمیل، مختصر تاریخ زبان وادب، سندھی، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد 2012،ص۔40

2۔ ایضاً، ص۔41-42

3۔ سید عاصم محمود، عامر حمید، پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا۔ سندھ، الفیصل، لاہور، لوک ورثہ، اسلام آباد، 2014، ص۔199-201

4۔ منگھارام اوجھا، پرانا پارکر (ترجمہ: ڈاکٹر سعدیہ نسیم) سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، 2010،ص۔ 44-45

5۔ ایضاً، ص۔ 44-49

6۔ اقبال جتوئی (مرتب) دودو چنیسر نیشنل انسٹیٹیوٹ آف فوک اینڈ ٹریڈیشنل ہیری ٹیج، اسلام آباد، 1995،ص۔12

7۔ ایضاً، ص، 13-14

8۔ ایضاً، ص، 15-20

9۔ ایضاً، ص، 29-92

10۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی، سندھ کی تاریخی کہانیاں نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ص۔ 139-140

11۔ منگھارام اوجھا، پرانا پارکر، ص۔ 90-95

12۔ شیخ ایاز (مترجم) رسالہ شاہ عبدالطیف بھٹائی، محکمہ سیاحت وثقافت، حکومت سندھ، کراچی، ص۔ 51-54

13۔ سید مظہر جمیل، مختصر تاریخ زبان وادب، سندھی، ص۔ 61

14۔ ایضاً، ص، 62

15۔ ایضاً، ص، 63

16۔ ایضاً، ص، 64-65

17۔ منگھارام اوجھا، پرانا پارکر، ص۔104

18۔ ایضاً، ص، 108-109

19۔ Rochi Ram Gajumal, A Handbook of Sindhi Proverbs, Karachi 1935 P- 1-128

20۔ سید عاصم محمود، عامر حمید، پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا۔ سندھ، ص۔ 218-220

پانچواں باب

پنجاب کا لوک بیانیہ

میر داد کی جدوجہد

پولیس اور میر داد

سیاسی صورت حال

3۔ پوٹھوہار کا لوک بیانیہ

میانوالی جیل

راولپنڈی جیل

جنگ مخالف لوک بیانیہ۔

4۔ پنجاب کی باریں اور ان کا لوک بیانیہ

گوندل بار

کڑانہ بار

ساندل بار

گنجی بار

لوک روایات

گامن سچیار

عالم شیر اعوان

محر مالک

5۔ لوک بیانیہ کی آڑ میں ریاستی بیانیہ

لائل کی مدح: چناب کالونی، لائلپور

پنجاب کا لوک بیانیہ

پنجابی۔مزاحمتی روایت:

پنجاب صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔اس تناظر میں جب ہم پنجابی لوک بیانیہ اور مزاحمت کی اصطلاحوں کو ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں تو ہم اس بنیادی نکتے کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اپنے مفہوم اور کردار کے اعتبار سے یہ دونوں اصطلاحیں ایک ہی مفہوم ادا کرتی ہیں۔ہم لوک بیانیہ اور مزاحمت کی اصطلاحوں کو ایک ساتھ استعمال کر کے اضافی لفظوں کا استعمال کررہے ہیں۔دراصل لوک بیانیہ میں مزاحمت کا مفہوم پہلے سے موجود ہوتا ہے۔کوئی لوک بیانیہ مزاحمتی ہوئے بغیر لوک بیانیہ کے مفہوم پر پورا نہیں اتر سکتا۔یہ مزاحمت سماجی اور مجلسی سطح پر ہو یا معاشی اور سیاسی سطح پر۔اسی طرح جب ہم لوک بیانیہ اور حب الوطنی کی ترکیبیں ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں تو پہلے والے مغالطے سے دوچار ہوتے ہیں۔کوئی لوک بیانیہ حُب الوطنی کے جذبے سے عاری نہیں ہوسکتا۔لوگوں کی آسوں پیاسوں کا ترجمان۔کوئی سچا شعر ہی زمین اور مٹی کی محبت سے سرشار ہونے کے بعد ہی دوسری زمینوں اور ان کی مٹی سے محبت کا حامل ہوسکتا ہے۔اس پہلو سے لوک بیانیہ،مزاحمت اور وطن کی محبت سے عاری نہیں ہوسکتا۔اب بحث کو اگر ہم پنجاب اور پنجابی کی روایت کے ساتھ جوڑ کر دیکھیں تو ہم اسی دلچسپ مغالطے کا شکار ہوتے ہیں۔پنجاب کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پنجاب کی تاریخ بیرونی حملوں اور یلغاروں کی تاریخ رہی ہے۔اس کے ساتھ ہی یہ بیرونی حملوں سے نبرد آزما رہنے کی تاریخ بھی ہے۔اس باب میں لوک بیانیہ کے پہلو سے ہم اس کی کئی مثالیں دیکھیں گے۔ہم ایرانیوں، یونانیوں،منگولوں،ترکوں،افغانوں اور انگریزوں کے خلاف صف آراء رہے۔ہمیں تعصب اور موضوعی بیانیوں کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پنجاب نے ہمیشہ حملہ آوروں کا ساتھ دیا ہے۔پنجابی لوک بیانیہ اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ایران کے دارا اور مقدونیہ کے سکندر نے پنجاب پر چڑھائیاں کیں جن کی پنجابیوں نے شدید مزاحمت کی۔یونانی حملے کی یونانی،(سکندر کے ساتھ آنے والے) مؤرخین،ایرانی،شاہنامہ فردوسی اور مقامی روایات اس کی الگ الگ کہانی سناتی ہیں۔خوش قسمتی سے سکندر کا حملہ پنجاب کے لوک حافظے میں ابھی تک محفوظ ہے۔

سکندر کے ساتھ آنے والے یونانی مؤرخین کے تفصیلی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی حملہ آور کا راستہ روکنے والے پنجابی راجہ پورس کو شکست ہوئی۔فردوسی کے شاہنامے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ راجہ پورس اور پنجابیوں نے ڈٹ کر سکندر کا مقابلہ کیا اور پنجاب ہی سے وہ زخمی اور دلبرداشتہ ہوکر آگے بڑھا لیکن جلد ہی اپنی مہم نامکمل چھوڑ

کر واپسی کی ٹھانی اور راستے میں ہی مر گیا۔ انیسویں صدی کے ایک عظیم جرمن فلسفی کارل مارکس نے اپنی کتاب "نوٹس آن انڈین ہسٹری" میں سکندر کو محض مقدونی اور پورس کو عظیم راجہ لکھا ہے۔

جہاں تک پنجاب کی مقامی زبانی روایات کا تعلق ہے۔ ان کا سراغ حالیہ برسوں میں ملا ہے۔ 2006ء میں پنجابی کے مایہ ناز نوجوان محقق سعید بھٹہ نے ایک اہم کتاب "کمال کہانی" (1) شائع کی۔ "کمال کہانی" میں پہلی داستان راجہ پورس کے بارے میں تھی۔ اکیسویں صدی میں دیا جانے والا یہ بیان کم و بیش تیئس صدیوں پر محیط ہے۔ اس داستان کے اردو ترجمے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "راجہ پورس محض بہادر ہی نہیں بلکہ اخلاقی سطح پر بھی سکندر سے بڑا سورما ہے۔ (2) ہم اپنی طرف سے یہی کہہ سکتے ہیں کہ 'کمال کہانی' سچ مچ کی کمال کہانی ہے۔ یہ "لوک ادب" زندگی گزارنے کے دوسرے طریقوں کے ساتھ ساتھ غیور لوگوں کے چال چلن کو بھی نکھارتا ہے۔ جو حملہ آوروں کے سامنے خم ٹھونک کر دھرتی کے تقدس کا بھرم رکھتے ہیں (3)۔ بیان کا انداز تو دیکھئے:

راجہ پورس:

"بادشاہ بہت ہوئے ہیں مگر اعظم کہلوانا بہت کم بادشاہوں کے حصے میں آیا ہے۔ دارا اعظم ایران کا بادشاہ ہوا ہے۔ پھر سکندر نے بھی خود کو اعظم کہلوایا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر اور اشوک اعظم نے بھی خود کو اعظم کہلوایا ہے۔

شاہ دارا ایران کا بادشاہ ہوا ہے۔ اس کی بادشاہت، ہفت اقلیم پر تھی۔ ولایتیں اس کے ماتحت تھیں۔ مقدونیہ کا بادشاہ فیلقوس ہوا ہے۔ فیلقوس سکندر کا باپ تھا۔ یہ فیلقوس شاہ دارا کو ٹیکس ادا کرتا تھا۔ اس وقت کے ٹکے کی بناوٹ میں انڈے کی مقدار کے برابر سونا استعمال ہوتا تھا۔ فیلقوس کی وفات کے بعد سکندر سترہ سال کی عمر میں بادشاہ بنتا ہے اور باپ کی گدی پر بیٹھتا ہے۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد دارا بادشاہ کے اہل کار آ گئے اور انہوں نے کہا "وہ انڈے دو" سکندر نے کہا۔ "ہماری انڈے دینے والی مرغی مر چکی ہے۔" وزیر، امیر اور مصاحب بول اٹھے۔ "سکندر ہوش سے بات کرو۔ ہم میں ایران کے ساتھ لڑائی کرنے کی ہمت نہیں۔" سکندر نے کہا "جتنا جینا ہے شیر کی زندگی جینا ہے۔ گیدڑوں والی زندگی مجھے نامنظور ہے۔ میں اپنے ملک کا پیسا ایک بادشاہ کے خوف سے دے دوں اور وہ بے کار چلا جائے۔ آخر کیوں دوں؟"

"ان دنوں ایران پر بہت عروج تھا۔ وہ اس طرح کے لوگوں کو اپنے مقابلے میں حقیر سمجھتے تھے۔ شاہ دارا سے ان اہل کاروں نے جا کر بات کی کہ سکندر باغی ہو گیا ہے۔ بغاوت ختم کرنے کے لئے شاہ دارا ایران سے چڑھا اور مقدونیہ کی سرحد پر اپنا جھنڈا گاڑا۔ ترقی پذیر قوم جفاکش ہوتی ہے۔ ایرانی قوم عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یہ شرابی، زانی اور عیاش ہو چکے تھے۔ سکندر کی قوم نے ایرانیوں کو پیچھے دھکیل کر ایران پر اپنا جھنڈا گاڑا۔ ان کی حالت ابتر کر دی۔ اتنے تک ایرانی جنگ سے تنگ آ چکے تھے۔ کیوں کہ وہ پہلے والی عیاشی باقی نہیں رہی تھی۔ اس وقت وہ نسوانی بانکپن کے متلاشی تھے۔ راگ رنگ میں پناہ ڈھونڈ تے تھے۔ جس وقت کوئی قوم زوال کا شکار ہوتی ہے تو وہ اخلاقی بدکاری پر

اتر آتی ہے۔ جس طرح آج مرغوں کی لڑائیاں کرواتے ہیں خیر جنگ ہو رہی ہے۔ شاہ دارا کے دو وزیر رات کے وقت میدان جنگ میں آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہمیں سکندر سے ملنا ہے۔ ہم شاہ دارے کے وزیر ہیں۔'' سکندر نے کہا'' تلاشی لینے کے بعد آنے دو۔'' انہوں نے کہا'' لاکھ روپیہ ہمیں دے دو ہم تمھاری خاطر دارے کو قتل کر دیتے ہیں۔'' سکندر نے لکھ دیا۔ صبح جس وقت فوجیں اکٹھی ہوئیں تو شاہ دارے نے تقریر کی جس طرح '' نادر شاہ دی وار'' والا بیان کرتا ہے۔

خانِ دوراں سپاہ کو بلا کر گزارش کرتا ہے

آج دلی کے تخت کے زوال کی انتہا ہوگئی ہے

آج یہ صدمہء عظیم سر پر آن پڑا ہے

یہ زر، فرزند اور مال کسی کے ساتھ نہیں جانا

کیا ہوگا اگر ایک سال مزید جی لیے؟

آج محمد شاہ کا نمک حلال کرو

دارا تقریر کر رہا تھا کہ کل تک یہ لوگ ہمارے غلام رہے ہیں، اور آج اگر یہی غلامی کا طوق ہمارے گلے میں ڈالیں تو دنیا کو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ اتنے میں دارا کی فوج میں سے دو دیو ہیکل بندے نکلے۔ گینڈے کی سی جلد والے۔ آن کر انہوں نے تلوار کا ایک ایک وار دارا پر کیا۔ اس وار سے دارا زمین پر گر پڑا اور وہ دوڑ کر سکندر کی فوج میں جا شامل ہوئے۔ فوجیوں کا جمگھٹا تھا۔ دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ایسے ہتھیار ہوتے تھے جنہیں ہاتھ میں پکڑ کر ہی لڑا جا سکتا تھا۔ ادھر سے دارا کی فوج لڑائی کے لئے نکلی۔ شاہ دارے نے ہاتھ کھڑا کیا: ''ٹھہرو'' یہ ٹھہر گئے۔ اس نے کہا: ''ہتھیار پھینک دو۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں، کہ سکندر جیسا سورما تمہیں نہیں ملے گا۔ تم قیامت تک لڑتے ہی رہو گے۔ گو سکندر میرا دشمن ہے مگر اتنا قابل ہے کہ اس کو بادشاہ ماننے سے ہی تم امن سے رہ سکتے ہو۔''

وہ مرا پڑا ہے مگر مخلوق کی بھلائی کے لئے۔ سکندر نے اس کی بات سن لی تھی۔ وہ دوڑا اور اس نے دارا کا سر جھولی میں رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے کہا: ''چاچا! مجھے یہ علم نہیں تھا کہ تو اتنا بلند پایہ آدمی ہے۔ تجھے نہیں مروانا چاہئے تھا مجھے معاف بھی کر اور کوئی نصیحت بھی کرتا جا۔ باپ تو مر چکا ہے تو ہی باپ بن۔'' دارے نے کہا۔ ''میری پہلی نصیحت تو یہی ہے کہ کسی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر دشمن کا سر اس طرح جھولی میں مت رکھنا۔ جس طرح میرا سر تو نے جھولی میں رکھا ہے۔ میرے پاس ہتھیار کوئی نہیں تھا ورنہ تمھیں مار دیتا دوسری نصیحت یہ ہے کہ یہ جو میری قوم ہے یہ تجھے شاہی نہیں کرنے دے گی اور نہ ہی میں انہیں کبھی بھولوں گا۔ تو ان کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ تو میری بیٹی سے شادی کرنے کی صورت میں ان پر شاہی کر سکے گا۔ تیسری نصیحت یہ ہے، جن دو وزیروں نے

مجھے مارا ہے تجھے پتہ ہے یہ کون ہیں اور مجھے کیوں مارا ہے؟" اس نے کہا: "نہیں۔" اس نے کہا "جس وقت میں نے جاوا سماٹرا پر حملہ کیا۔ یہ دونوں اس بادشاہ کے جدی پشتی وزیر تھے۔ انہوں نے مجھ سے لاکھ روپیا لے کر اپنا جدی پشتی بادشاہ مار دیا تھا۔ جن کے نسل در نسل وزیر بنتے آرہے ہیں۔ وہ ان کی نمک حرامی کر سکتے ہیں تو میری کیوں نہیں؟ مجھ سے اتنی نادانی ہوئی کہ میں انہیں قریب لے آیا۔ آج اسی قربت کی وجہ سے مارا گیا۔" سکندر نے دونوں قاتلوں کو بلایا۔ وہ آگئے اس نے کہا "بھئی لاکھ روپیہ جسے دینا ہے دے لو۔ یہ تو میں نے وعدہ جو کیا ہے۔" "جلاد" اس نے کہا "جی" دونوں کے سر کاٹ دو۔" ابھی دارا زندہ تھا کہ ان دونوں کے کٹے سروں سے خون رس رہا تھا۔ دارا سکندر سے خوش ہو کر مرا۔ سکندر نے ایران کی شاہی بھی یونان کے ساتھ ملا لی۔

سکندر کا استاد ہوا ہے ارسطو۔ بڑا سمجھدار آدمی ہوا ہے۔ اسی ارسطو کو سکندر نے اپنا وزیر بنالیا۔ نوشابہ نام کی ایک عورت یونان میں ہوئی ہے۔ کہتے ہیں اس کا حسن دنیا میں مانا جاتا تھا۔ وہ سکندر کی سہیلی تھی۔ سکندر نے ایران فتح کیا اور اسے بھی یونان سے بلوالیا۔ شاہ دارے کی بیٹی نے ارسطو کو بلوا بھیجا۔ اس نے کہا: "سکندر کے استاد ہو۔ باپ مر چکا ہے۔ تو میرا بھی باپ ہے۔ بات یہ ہے کہ عورت یہ بے عزتی تو برداشت کر سکتی ہے کہ سکندر میرے باپ کا قاتل اور میں اس کی بیوی ہوں مگر سوتن عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بات سکندر کو سمجھاؤ۔ اگر اس کو اپنانا ہے اسے ادھر مقدونیہ میں ہی رکھے۔ میرے روبرو میرے ہی شہر میں نہ آباد ہو۔" ارسطو نے کہا "غلطی میری ہے۔ میں نے اسے روکا نہیں، مگر اب تم یہاں ہی خاموشی اختیار کرو۔ اگر سکندر تک یہ بات پہنچی تو شاید وہ تجھے تنگ کرے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" ارسطو نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں اس کے ساتھ کیا حیلہ کروں؟

سکندر کا دھاوا بولنے کا ارادہ ہے۔ سکندر کا یہ دعویٰ تھا کہ دنیا پر ایک ہی بادشاہ ہونا چاہئے۔ سکندر نے دربارِ خاص لگایا۔ چیدہ چیدہ آدمیوں کو بلایا۔ ارسطو بھی موجود ہے۔ تمام فوجی افسران وہاں بیٹھے ہیں۔ سکندر نے پوچھا "میں دھاوا بولنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے اپنے اپنے خیالات سے آگاہ کرو کہ حملہ کروں یا نہ کروں۔" سارے وزیر دلائل دیتے رہے کہ ضرور دھاوا بولو کیونکہ تو طاقتور ہے۔ سکندر نے کہا "استاد جی آپ نے رائے نہیں دی" ارسطو نے کہا "بیٹا یہ لوگوں کے اپنے اپنے خیالات ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تو دھاوا بول۔ میں تجھے روکتا ہوں۔ تو دھاوا مت بول۔" "کیوں" سکندر نے پوچھا۔ ارسطو نے جواب دیا۔ "جس راجپوت قوم کے ساتھ تو ٹکر لینے جا رہا ہے۔ تو اس قوم کو نہیں جانتا۔ کبھی موقع بنا تو میں تمہیں دکھاؤں گا۔ راجپوتوں میں جو جتی ستی ہوتے ہیں وہ ساری زندگی شادی نہیں کرتے۔ اس قوم کے ساتھ تو ٹکر لینے جا رہا ہے۔ اور رنگ رلیاں لڑکیوں کے ساتھ مناتا ہے۔ جہاں تو ٹکر لینے جا رہا ہے وہیں خون کے فوارے بہتے ہیں اور جو تمہارے کرتوت ہیں یہاں شراب، راگ اور ناچ ہے۔ میں تجھے کہتا ہوں لڑائی مت کر، تیرا ملک تیرے لئے کافی ہے۔ یہیں کھاؤ پیو۔" سوچ بچار کے بعد سکندر کافی دیر بعد بولا۔ "استاد جی! اور مجھ میں کوئی برائی نہیں مگر نوشابہ کے لئے قسم اٹھاتا ہوں کہ اس کا پیار فراموش کر دوں گا۔" وہ چاہتا یہی کچھ تھا، اس

کی بات تسلیم کر لی گئی۔

دربار سے اٹھنے کے بعد گھر پہنچا تو نوشابہ ہار، سنگھار کر کے اس کے پاس پہنچی۔ سکندر نے منہ پھیر لیا سکندر کا منہ پھیرنا تھا کہ اس کے دل پر ٹھوکر لگی۔ حافظ برخوردار نے لکھا ہے۔:

آج یار ہنس کر نہیں ملا اور اس وجہ سے میں مصیبت میں ہوں
کسی رقیب نے میرے مرزےؔ کے دل میں رنج پیدا کر دیا ہے
یا تو میں پیدا ہی نہ ہوتی یا پھر نصیب نیک ہوتے
مریض کا بچنا محال ہوتا ہے جب طبیب ہی روگی ہو

کہتا ہے:

اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی اور اس کا لباس میلا کچیلا تھا
جاٹ غصے اور تکبر سے اسے دیکھ رہا تھا
اس کی نظروں میں التفات نہیں تھا اور طعنوں سے جلا رہا تھا
میں روزانہ تیرا منتظر ہوں کہ کبھی اپنے وطن راوی پر لے جا

نوشابہ رونا شروع ہو گئی کہ میرا کیا قصور ہے جو تم نے منہ پھیر لیا ہے؟ سکندر نے کہا: ''تیرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اپنے استاد ارسطو کے آگے قسم اٹھائی ہے کہ کسی عورت کی طرف نہیں دیکھوں گا۔'' نوشابہ نے کہا: ارسطو استاد کی اسی سال عمر ہے۔ ارسطو کو میں نے نہیں دیکھا اور مجھے اس نے نہیں دیکھا۔ میرے ساتھ چلے آؤ میں نے سنا ہوا ہے کہ باغ میں رہتا ہے۔ اگر وہ مجھے دیکھنے کے بعد ایمان کی حالت میں رہے تو میں تیری قسم اٹھاتی ہوں۔ اگر استاد جی خود مجھ پر فریفتہ ہو کر ڈھیر ہو جائے تو تیری قسم واپس۔'' سکندر کو یقین تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسی سال اُس کی عمر ہے اور س کے باوجود بھی وہ مجھے مشورے دیتا ہے۔ نوشابہ نے کہا: ''چل۔'' چل دیئے۔ سکندر کو نوشابہ نے درختوں کے جھنڈ میں بٹھا دیا۔ باغ کے درمیان ارسطوؔ کی دو منزلہ عمارت تھی۔ کتب خانہ کتب سے بھرا پڑا ہے اور وہ ساری کتابیں اسے ازبر ہیں۔ سامنے تالاب تھا، نوشابہ نے وہاں کھڑے ہو کر گیت گایا۔ ارسطو نے دیکھا کہ یا تو جنت کی حور بہشت کا راستہ بھول کر آ گئی ہے یا پرستان سے کوئی پری آ گئی ہے۔ آدم ذات تو نہیں ہے۔ وہ بے بسی سے اترا۔ جب قریب آیا تو اس نے پوچھا ''تمھاری تعریف؟'' نوشابہ نے کہا: ''میں تو ایک بدنصیب سی عورت ہوں، میرا نام نوشابہ ہے۔'''' وہ نوشابہ یونان والی؟'' اس نے کہا ''جی ہاں'' اس نے کہا: ''سکندر دوستی سے منکر ہو گیا ہے۔ میں اب کسی اور سے دوستی کروں تو اچھا نہیں لگتا۔ بے عزتی والی بات ہے۔'' میں نے کہا ''چلو عورت اور مرد ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔'''' وہ تعلق توڑوں تبھی میں سکندر کے استاد سے یاری لگاؤں۔ گھٹیا آدمی کے ساتھ بھی اب کیا لگانی؟ بابا ہنسا اور فرطِ انبساط سے اس کی داڑھ کے پیلے دانت بھی نظر آنا شروع ہو گئے۔ جہاں جہاں سے

دانت گرا تھا، بات کرنے کے دوران میں وہاں پر لعاب دہن کا تار سا بن جاتا۔ اس نے کہا،" زہے قسمت، تمھاری آمد سے بڑھ کر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔؟"

پاہنوں مُرشد کو یاد کرتی ہے کہ یارے کی بارات آئے

ارسطو نے کہا:" چل" اس نے کہا" مجھے اٹھالو" ارسطو نے کہا" تیری کشتی کنارے لگے (پیاروں کو دی جانے والی دعا)

کوئی

دیکھنے والا کیا کہے گا؟"

جو عشق میں ڈوب گئے وہی خطاوار ہیں

ان عشاق کے اجسام پر معمولی ماس ہی نہ رہا اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے۔

دکھ سکھوں پر غالب آ گئے اور سکھ ناپید ہو گئے

علی حیدر عاشقوں کی رمائی دھونیاں ویسے ہی اکارت ہو گئیں

نوشابہ نے کہا:" میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تو محبت کرے گا؟ کہ اسے داغ دار کرے گا۔" اس نے کہا" تم نے ٹھیک کہا ہے۔" بابا جھک گیا اور وہ اس پر سوار ہو گئی۔

کہتا ہے۔

عشق کھیتی باڑی کرنے والے لوگوں کے ہاں یا بازار میں فروخت ہونی والی چیز نہیں

عشق اندر سے جنم لیتا ہے جیسے بارود سے آگ نکلتی ہے

عشق بنیادوں کو ہلا دیتا ہے اور تباہ و برباد کر دیتا ہے

عشق کی وجہ سے عالم علم بھول جاتے ہیں اور بادشاہ تخت چھوڑ دیتے ہیں

عشق برقعے کا ستر پھاڑ دیتا ہے شرم و حیا جاتی رہتی ہے

یار کے کوچے میں عشاق ٹکڑوں کی گدائی کرتے ہیں

اس مقام پر علم مسخ ہو جاتا ہے۔ بابا جھک گیا اور وہ تیزی سے اس پر سوار ہو گئی اور اس نے کہا:" چل میرے گھوڑے" سکندر دیکھ رہا تھا۔ سکندر کا رنگ اس طرح ہو گیا جیسے:

پھالا آگ میں گرم ہو کر لال ہو جاتا ہے

" مجھے کیا کہا تھا!"

من مونڈا ہوا اور چہرے سے باریش اور دل سے راگ کا دشمن

بافندہ، خواجہ سراؤں کا نوکر باغ کا راستہ کیا جانے

نہ تو وہ کسی رنگریز کے پاس گیا ہے اور نہ ہی اسے شال اعزازیے میں ملی

یہ چھوٹے پیشاب سے بھری ہنڈیا ہے اس سے جامن لگانے کا کوئی فائدہ نہیں

سکندر آگے بڑھ آتا ہے۔ اس زمانے کا طریقہ تھا کہ جب لوگ استاد کو سلام کرتے تھے تو دایاں گھٹنا زمین پر رکھ کر کرتے تھے۔ مگر سکندر اس وقت سلام ادب سے نہیں طنزاً کیا تھا۔ داناؤں کے کیا کہنے؟ ایسے موقع پر کھڑے ہوئے وہ کہتا تھا۔ "سکندر بچے! اب بھی تجھے نصیحت نہ ملے تو تجھ پر افسوس ہے۔ میں نے اسی لیے تجھے کہا تھا۔ جو عورتوں کے ساتھ کھیلیں وہ سورے نہیں ہوتے۔ اب کوئی مجھے اپنی قوم کا سردار چنے تو کیا میں اس کے قابل ہوں؟ جو عورتوں کے ساتھ پیار کرتے ہیں وہ ذلیل ہو جاتے ہیں۔"

سکندر بولا: "استاد جی! تمھاری نصیحت نے اتنا اثر نہیں کیا جتنا اس مثال نے کیا ہے۔ بالکل تو نے ٹھیک کہا ہے۔ زمانے کا استاد ہوتے ہوئے بھی اس نے تیری عقل نکال لی۔" اور اس نے کہا "میرے لئے وہی قسم ہے"۔

بے چاری نوشابہ نے سکندر کے لئے کوشش کی تھی، نہیں تو ارسطو کو وہ کب قریب پھٹکنے دیتی تھی؟ بات وہیں کی وہیں رہی۔ نوشابہ نے سکندر سے پوچھا: "ایک بات مجھے بتاؤ۔ ہند پر جو حملہ کرنے لگے ہو۔ کوئی ایسا راجا بھی وہاں ہے جس سے تو خوف زدہ ہے؟" "ہاں" اس نے کہا: "راجا پورس جو بھیرے کا سردار ہے اس کی باتیں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ اس کا خیال آتا ہے تو جگر کانپتا ہے۔"

نوشابہ نے سوداگر کا لباس پہن لیا اور ساتھ سامان کے کارواں لدوا لئے۔ ایرانی سوداگر بن کر ہند کی طرف رجوع کیا۔

خواہ وہ مجھے اچھا سمجھے یا نہ سمجھے

میرے محبوب کی جوانی سدا قائم رہے

سکندر ابھی تیاریاں کر رہا تھا کہ نوشابہ پنجاب پہنچ گئی۔ نوشابہ جب پنجاب پہنچی تو اس وقت ساون کی پندرہ تاریخ تھی۔ جس شہر سے گزری عورتیں وہاں سولہ سنگھار لگا کر جھولے جھول رہی تھیں۔ نوشابہ نے پوچھا۔ "کوئی عید ہے؟" ہندو عورتوں نے جواب دیا۔ "جی آج رکھنی کا دن ہے" "رکھنی کس کو کہتے ہیں" جواب میں ان عورتوں نے کہا: "جب پندرہ ساون کی ہو تو یہ ہند کی عید ہے۔ جن بہنوں کے بھائی زندہ ہیں وہ ان کو گانا باندھتی ہیں اور وہ ان سے کچھ دان کرواتی ہیں۔ پھر خوشیاں مناتے ہیں۔ کپڑے پہنتے ہیں، کھانے پکاتی ہیں اور جھولے جھولتی ہیں۔ جن بہنوں کا کوئی بھائی نہیں وہ آج کالے کپڑے پہن کے ایک دوسری سے تعزیت کریں گی اور کوئی خوشی نہیں منائیں گی۔"

اللہ کرے تمہاری عمر دارز ہو، بہنیں بھائیوں کے مان پر جیتی ہیں۔

نوشابہ نے پوچھا: "راجے پورس کی کتنی بہنیں ہیں؟ انھوں نے کہا: "وہ بیٹی پیدا کرنا نہیں چاہتے، بہن کہاں سے ہو گی۔؟ "کوئی بہن نہیں اس کی؟" "اس نے کہا: "نہیں"

نوشابہ نے بیٹھ کر نولڑیوں والا گانا بنا دیا۔ جس میں راجے کی شایان شان یاقوت تھے۔ زرق برق لباس

پہن کے، گانا ہاتھ میں پکڑ کر راجے پورس کی حویلی میں آن پہنچی۔ راجا پورس اپنے شاہی محل میں بیٹھا تھا۔ سکندر کی طرف سے اعلان جنگ ہو چکا تھا۔ پورس نے میز پر ہند اور ایران کا نقشہ رکھا ہوا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سکندر اس راستے سے آئے گا۔ یہ دریا پار کرے گا۔ ادھر سے ہو کے آئے گا۔ پورس کا حکم تھا کہ کوئی آدمی اس وقت میری طرف نہ آئے۔ نوشابہ جس وقت محل میں داخل ہوئی پہرے داروں کی جرأت ہی نہیں ہوئی کہ پوچھیں تو کون ہے اور کدھر جا رہی ہے؟ حسن ایک ایسی خداداد چیز ہے کہ اسے دیکھتے ہی ہر ایک کا دل پسیج جاتا ہے۔ بیگمات والے محل میں داخل ہوئی تو وہاں جتنی رانیاں، مہارانیاں بیٹھی تھیں۔ سب نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ پتا کوئی نہیں تھا کہ یہ کون ہے۔ نوشابہ نے پوچھا: ''راجا؟'' انہوں نے کہا: ''محل میں بیٹھا ہے۔'' اور یہ آگے کی طرف چلتی رہی۔ وہ ایک دوسری سے پوچھتی تھیں کہ یہ کون ہے؟ اس کو یہ یقین تھا کہ پورس نے جس وقت میری طرف دیکھا عاشق ہو جائے گا، کیونکہ کوئی مرد ایسا نہیں جو میری طرف دیکھے اور عاشق نہ بنے۔ میں بھائی بنانے چلی ہوں اللہ کرے بچ جاؤں۔

جس وقت پورس کے محل میں پہنچی تو اس کا سایہ دیکھ کر پورس نے سر اوپر کیا۔ دیکھ کر پورس نے گردن جھکا لی۔ اس کی زندگی میں پہلا مرد تھا، جس نے دیکھ کر گردن جھکائی ہو۔ اس وقت حسن مات کھا جاتا ہے۔ جو بھی کام کوئی کرتا ہو، جہاں پروا نہیں، جہاں نیاز نہیں وہاں ناز نہیں ہو سکتا۔ ناز وہاں ہوتا ہے جہاں جچے۔ یہ رُک گئی۔ بہت وقت گزر گیا مگر اس نے پوچھا نہیں کہ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئی ہو۔ آخر کار غمگین ہو کر اس نے کہا: ''مجھے ایک عرض کرنی ہے۔'' راجے نے یہ نہیں کہا کہ حکم کر بلکہ اس نے کہا کرتی رہو عرض۔ نوشابہ نے کہا ''میں ایک ایرانی عورت ہوں اور اب پنجاب آ گئی ہوں۔ نوشابہ میرا نام ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ جب رکھنی کا دن آتا ہے تو آٹھوں پہر روتی رہتی ہوں۔ آج میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں اسے گانا باندھتی۔ اس سے دان لیتی۔ وہ مجھے دان کرتا۔ میں نے سنا ہے، راجا پورس کی کوئی بہن نہیں۔ تو مجھے یہ خیال آیا کہ جس طرح میری یہ حسرت رہتی ہے کہ میرا بھی کوئی بھائی ہوتا اس طرح اسے بھی یہ حسرت رہتی ہوگی کہ میری کوئی بہن ہوتی، گانا باندھتی، پیسے لیتی، میں وہ بہن ہوں جس کا کوئی بھائی نہیں۔۔ تو وہ بھائی ہے جس کی کوئی بہن نہیں۔ میں منت کرتی ہوں ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ میں گانا باندھوں۔ تو مجھے روپے دے۔'' پورس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پورس نے کہا ''بچاریو بہنو! آپ کو تو یہ حسرت رہتی ہوگی مگر ہم مردوں کو یہ حسرت نہیں رہتی اور خاص طور پر راجپوت قوم کو تو بالکل نہیں مگر میرے دروازے پر کوئی سائل آئے تو میں خالی ہاتھ کبھی نہیں لوٹاتا۔ یہ ہاتھ ہے، گانا باندھو اور رقم مانگو۔ بہن کہتی ہو تو بہن ہی ہو۔'' اس نے گانا باندھا۔ اس نے کہا ''کچھ مانگو'' ''مجھے شرم آتی ہے۔'' اس نے کہا: ''لکھ کر پیش کرو۔''

نوشابہ نے لکھا: ''سکندر یونانی تم پر حملہ کر رہا ہے۔ اسے قتل بھی نہیں کرنا اور نہ ہی قید کرنا ہے۔'''' پورس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں۔ اس نے کہا: ''بہن تو نہ بنی، جاسوسہ بن کے آئی ہو۔ مگر چھوڑو، میں راجپوت ہوں۔ راجپوت زبان کرے تو مکرنے کی بجائے موت قبول کر لیتا ہے۔ میں اس سے مکر نہیں سکتا۔ میں نہ قید کروں گا نہ قتل مگر

تمہیں بیٹھنا ہوگا۔ باہر نہیں نکل سکتی۔ تم پورس کی بہن ہو۔

سکندر ایرانی نے حملہ کر دیا۔ کابل، قندھار کے امیر سے کہا: ''مجھے راستہ دو'' اس نے کہا: ''بادشاہ تین شرطوں پر راستے مانگتے ہیں۔ اس شرط پر کہ جو ملک فتح کریں اس میں سے حصہ دیتے ہیں۔ حصہ دو گے؟'' اس نے کہا: ''نہیں'' دوسری شرط یہ ہے کہ جتنی ہماری فصل برباد ہو یا باغ اجڑیں گے تو ان کا تاوان دو گے۔'' اس نے کہا ''نہیں''۔ ''تیسری بات ہمت والی ہے'' اس نے کہا: ''میں ہمت سے سنوں گا۔'' ''جرأت ہے تو لڑ پڑو'' اس نے اپنی فوجوں کو بلایا اور کہا: بڑی بے عزتی ہے اس بادشاہ کی جو مقابلے میں کچھ بھی نہ کرے اور دشمن نقصان بھی کر جائے۔ ''وزیر نے کہا: ''سکندر کے ساتھ نہ لڑا جائے تو بہتر ہے۔ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ سکندر کی نظر ہندوستان پر ہے اور اس کی ٹکر راجپوتوں سے ہے۔ سکندر وہاں سے مڑے گا تو یہ رنگ نہیں ہوں گے۔ واپسی پر کہیں گے حصہ دو، نہیں تو ادھر سے ہم نہیں گزرنے دیتے۔ اس کے زوردار حملے کے سامنے نہ آ'' انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے جو راجا، مہاراجہ راستے میں آیا، ہتھیار پھینکتا گیا۔

سکندر ٹیکسلا تک آ گیا۔ راجا امبھی ٹیکسلے کا راجا ہوا ہے۔ اس نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ امبھی کے ہتھیار ڈالتے ہی سکندر کی نظر سومنات کی طرف ہوئی۔ مجھے اب کوئی روک نہیں سکتا۔ سکندر ویہت کی دائیں طرف رکا۔ اپنا ایلچی پورس کی طرف بھیجا کہ میں سنتا رہتا ہوں تم بڑے ضدی راجے ہو۔ میں سومنات کی طرف جا رہا ہوں۔ ہتھیار ڈالو جس طرح امبھی نے ہتھیار پھینکے ہیں۔ مجھے گزرنے دے۔ پورس نے جواب بھجوایا۔ ''امبھی راجا ضرور ہے مگر راجپوت نہیں۔ خاندانی نہیں، خاندان لڑنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ پہلا خاندانی راجپوت میں ہوں۔'' راجپوتوں کی آٹھ نسلیں ہیں:

راجپوت، ڈوگر، چوہان، راٹھور، تنوارے
بھٹی، چدھڑ، برس، راج دھانی برے؟
تخت حسن پور، بسرا پر فرمان روا رہے

پورس نے کہا: ''میں راجپوت ہوں۔ تم ٹکے مانگو گے میں انکار کروں گا۔ قربانی مانگو گے تو اتنی قربانیاں دوں گا کہ بھیرہ ڈھیر ہو جائے گا، اس وقت پہلا قدم رکھو گے۔ سومنات تمہیں دور نظر آئے گا۔ تم سمجھ رہے ہو سومنات یک گام باقی ہے۔''

لڑائی شروع ہو گئی۔ چار مہینے گزر گئے۔ سکندر کو پورس نے ویہت پار نہیں کرنے دیا۔ سکندر نے ایلچی بھیجے کہ ہتھیار پھینک دو۔ پورس نے کہا ''پھینکواؤ تو پھینکوں، کبھی راجپوتوں نے بھی ایسے ہتھیار پھینکے ہیں۔'' ان دونوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کبھی یونانی ویہت پار کر کے دو چار پنجابیوں کو مار ڈالتے تھے کبھی پنجابی دریا پار کر کے یونانیوں کو مار دیتے۔ ان جھڑپوں میں پورس کا بیٹا مارا گیا۔

سکندر نے سوچا، جو ایلچی بھیجتا ہوں وہ راجے کے رعب کی وجہ سے بات نہیں کر سکتے۔ کیوں نہ میں ایلچی بن کے جاؤں۔ اس کے ساتھ خوب باتیں کروں گا۔ آخر ہتھیار پھینک ہی دے گا۔ بیٹے کی موت سے بڑھ کر اس کا اور کیا نقصان ہوگا؟ وزیر، امیر روکتے رہے کہ سکندر مت جا۔ سکندر نے ایلچیوں والے کپڑے پہنے، عام سی تلوار لی، تھیلے کاغذوں سے ٹھونسے۔ سکندر بھیس بدل کر آن داخل ہوا۔ پیغام بھیجا کہ میں سکندر کا پیغام رساں ہوں۔ راجا پورس سے ملنا چاہتا ہوں۔ پورس نے عوام کو اٹھا دیا اور دربار میں صرف راجپوت رہ گئے۔ اردلی نے کہا: ''چلے آؤ'' یہ چلا آیا۔ سلام کیا۔ کرسی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ تھیلے میں سے ہاتھ ڈال کر چٹھی نکالی۔ اس نے کہا سکندر کی طرف سے لکھا ہوا ہے۔ پورس کے پنڈت وزیر سے اس نے کہا: ''چٹھی پڑھ کر سناؤ'' پنڈت نے کہا: ''جی، سکندر لکھتا ہے۔ کہ ایک بیٹا تمہارا تھا، وہ بھی مارا گیا۔ یہ بات تمہارے لئے کافی ہے۔ تم ہتھیار پھینک دو۔'' پورس نے ایلچی کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا: ''پیغام بر؟'' ''جی'' کیا کسی زمانے میں سکندر کا خاندان غلام رہ چکا ہے؟ مجھے ان الفاظ میں سے غلامی کی بو آتی ہے۔ کیا میرا بیٹا زنا کے ارتکاب پر مارا گیا؟ کیا بے غیرتی کی وجہ سے مارا گیا۔؟ کیا چوری کرنے پر مارا گیا۔؟'' قوم اور دھرتی کے نام پر مرنا راجپوت کا گہنا ہوتا ہے اور سکندر مجھے کہتا ہے کہ میں نصیحت پکڑوں۔ بیٹے کی لاش ہی مجھے کہتی ہے۔'' بابا'' جس راہ پر میں مرا ہوں تم بھی اسی راہ پر جان دو۔'' تمہارا بادشاہ بڑا کمینہ ہے۔''

ایلچی اٹھ بیٹھا۔ تلوار میان سے نکال کر کرسی پر ٹھونکی۔ اس نے کہا: ''ایک بار کمینہ پکارا ہے۔ میں اس کا نمک خوار ہوں۔ میرے ہوتے کمینہ مت پکارو۔ میں گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔'' راجپوت تپ گئے۔'' یہ کون ہے؟'' پورس نے زیر لب مسکرا کے کہا: ''میں نے سکندر کی پیٹھ پیچھے کمینہ نہیں کہا۔ میں سکندر کے سامنے اسے کمینہ کہہ رہا ہوں۔ کمینے نہیں تو اور کیا ہو؟ تمام وزیر ہائے ہائے کرنے لگے۔ یہ تو ایلچی ہے۔ اس نے کہا: ''ایلچی میرے پاس پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ یہ شاہی آگ ہے جو آگ کھاتی ہے۔ آگ آگ کو روک رہی ہے۔'' اس وقت سکندر نے ہاتھ مارا۔ عمامہ کھلا۔ داڑھی بناوٹی تھی۔ سر پر ایرانی تاج تھا۔ راجپوتوں نے تلواریں سنبھالیں۔ پورس نے کہا: ''خبردار! یہ سکندر ہے اور ایلچی بن کر آیا ہے۔ ایلچی کو مارنا راجپوتوں کا کام نہیں۔ پھر میرے جیسے کمینہ کوئی اور نہ ہوگا کہ سکندر کا ایلچی مروا دوں۔ جاؤ سکندر چلے جاؤ تم نے برا کیا ہے۔ تمہیں ہرگز نہیں آنا چاہئے تھا۔'' اس نے فوج کا دستہ بھیجا کہ اسے دریا پار کروا آؤ کہیں کوئی راجپوت اسے مار نہ ڈالے۔

راجا پورس نرم پڑ گیا کہ سکندر پر احسان کر کے اسے واپس ہٹایا ہے اور اب وہ لڑے گا نہیں۔ رات کو سکندر کی فوجیں دریا پار کر کے آن پہنچیں۔ لڑائی شروع ہوگئی۔ لڑتے لڑتے پورس کی فوج گھیرے میں آگئی۔ فوج میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ فوجی دوڑنا شروع ہوگئے۔ پورس دربار لگائے بیٹھا تھا کہ ایلچی آیا اور کہا سکندر کی فوجیں دریا پار کر چکی ہیں۔ دیہت کے کنارے والے جو فوجی تھے وہ گھیرے میں آچکے ہیں۔ پورس ہاتھی پر سوار ہو کر آیا۔'' نادر شاہ دی وار'' والا کہتا ہے:

چغتائی بادشاہ کی چڑھائی کرنے پر نقاروں سے دل دہلا دینے والی آوازیں آرہی ہیں
اس کے ساتھ ساڑھے سات لاکھ گھوڑے اور تمام راجدھانیاں ہیں
جیسے گھٹا میں بگلا آوازیں نکالتا ہے اس طرح نقیب آوازیں دے رہا ہے
جیسے ساون کی جھڑیوں میں پپیہا رت سے لطف اندوز ہوتا ہے
بڑی نوبتیں، گھڑیال اور نقارے بادلوں کی طرح گرج رہے ہیں
جھنڈوں کے پھریرے خوبصورت منظر پیش کر رہے ہیں۔
بگلوں کا شور ایسے تھا جیسے باغات میں کوئلیں بولتی ہیں
صیقل کیے ہوئے ہتھیار بجلی کی طرح چمک رہے ہیں
سجے ہوئے ہاتھی لشکر میں مستی سے آرہے ہیں
مہاوت ہاتھیوں کے سر پر بھاری کنڈے مار رہا ہے
ہاتھیوں کے سونڈ نو گز ٹیڑھے ہلوں کی طرح جھول رہے ہیں
ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پہاڑی اژدہے دم پی جاتے ہیں
ہاتھیوں کے سفید دانت اندھیرے میں بتاؤ کہ کیسے نظر آتے ہیں؟
جیسے قبر کا سفید مینار نظر آتا ہے
جیسے ٹڈی دل بڑی تعداد میں اکٹھا اڑ پڑتا ہے اس طرح بے شمار لشکر تھے
ہاتھی زور سے چنگھاڑ رہے ہیں اور گھوڑے ہنہنا رہے ہیں
لشکر کے چلنے سے آسمان تک گرد و غبار نظر آرہا ہے
چاند سورج آسمان اور تارے تک نظر نہیں آتے
دونوں بادشاہیاں چاروں اطراف پھیل چکی ہیں
چغتائیوں نے دریائے توی کے کنارے پر ڈیرہ جمالیا

جب پورس میدان میں داخل ہوا تو اس نے للکارا: ''سکندر، سکندر، سکندر''

سکندر گھوڑے پر سوار ہو کے آیا۔ پورس ہاتھی پر سوار تھا۔ پورس نے ہاتھ اٹھا کر برچھا نشانے پر مارنے کے لئے برچھا تولا۔ نشانہ باندھتے اس کی نظر گانے پر پڑی۔ آنسو بہہ نکلے۔ ہائے میرا قول، زبان تجھے کاٹ دوں اب سکندر کو ماروں تو مجھے راجپوت کوئی نہیں کہے گا۔ برچھا مار کر سکندر کا گھوڑا اس نے گرالیا۔ سکندر دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر دوبارہ آیا۔ اس نے برچھا مار کر دوسرا گھوڑا بھی گرادیا۔ اتنے میں چاروں جانب سے تیروں کی بارش ہونا شروع ہوگئی۔ تیروں کی بارش میں راجا پورس بے ہوش ہوگیا۔ راجے کی فوجیں بھاگ گئیں۔ سکندر راجے پورس کو

سونے کی زنجیر سے باندھ کر خیمے میں لے آیا۔ سکندر نے اپنے استاد ارسطو سے کہا: ''استاد جی! اس طرح کا انسان دنیا سے ختم نہیں ہونا چاہئے۔ لاکھ مرے لیکن لاکھوں کو پالنے والا رہنا چاہئے۔ اس طرح کے راٹھ لوگوں کو زندہ رہنا چاہئے۔ اس کا علاج کرو۔'' ارسطو نے نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد دوا تیار کی۔ سکندر نے پورس کو اٹھا کر دوائی دی۔ اچانک ارسطو نے کہا کہ اب ہوش میں ہے۔ پورس نے مڑ کر دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے چہار سمت سارے یونانی اور ایرانی سپاہی کھڑے ہیں۔ خود کو زنجیر میں بندھا دیکھا۔ اس وقت سمجھ گیا کہ میں قید میں ہوں۔

سکندر بولا: ''دیکھ رہے ہو کہ قید میں ہو۔'' اس نے کہا: ''ہاں'' تمہارے ساتھ میں اب کیا سلوک کروں؟ ''پورس نے کہا: ''جب سے پیدا ہوا ہوں میں نے یہ گردن کسی دشمن کے آگے نہیں جھکائی۔ میری زبان منت کی عادی نہیں۔ تم وہ سلوک کرو جو بادشاہ بادشاہوں سے کرتے ہیں۔'' تب لشکر سے اونچی آواز آئی: ''شاباش جوان کے بچے! کیا کہنے'' سکندر بولا: ''میں نے دنیا کے بادشاہ دیکھے ہیں مگر تم سا بہادر نہیں دیکھا۔'' پورس نے کہا: ''میں نے دنیا کے بادشاہ دیکھے ہیں مگر تم سا کمینہ نہیں دیکھا''۔ سکندر نے کہا: ''میں کس طرح کمینہ ہوں؟'' اس نے کہا: ''کمینے نہ ہوتے تو ایلچی بن کر میرے دربار میں نہ آتے۔ شیر کے لئے گیدڑ بننا طعنہ ہے میرا حق تھا کہ میں تجھے عمر بھر قید یا قتل کر دیتا مگر میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ یہ دوسرا کمینہ پن ہے کہ تم ہٹ کے لڑ پڑے۔'' سکندر نے کہا: ''تمہارے پہلے احسان کے بدلے میں نے تمہاری جان بخش دی ہے اور دوسرے احسان کے بدلے میں نے تمہارا ملک بخش دیا ہے اور اب میرے ساتھ صلح کرو۔'' پورس اس وقت مسکرا دیا اور کہا: ''صلح تب ہے جب تم مجھ سے کھانا کھاؤ۔'' سکندر نے کہا: ''منظور ہے۔''

پورس گھر پہنچ گیا۔ کھانے بن گئے۔ رات کے کھانے کے لئے سکندر کو شاہی محل میں بلایا گیا۔ سکندر کھانا کھانے بیٹھا تھا کہ بیگمات والے محل میں سے رانیاں، مہارانیاں، نوکریں، چاکریں نکل آئیں اور انہوں نے کنگو کی کٹوری پلٹ دی۔ ادھر سے طبل اور شادیانے بجنا شروع ہو گئے۔ سکندر نے پورس کے وزیر سے پوچھا: ''یہ کیا بات ہے۔ میں تو نہیں سمجھا۔'' اس نے کہا ''تمہیں مبارک ہو، راجا پورس تمہیں بہن کا رشتہ دے رہا ہے۔ راجپوت جس پر کنگوالٹائیں اسے بیٹی کا رشتہ دیتے ہیں۔'' سکندر کے لئے یہ خبر عید کے چاند کی سی تھی۔ راجپوتنی مل جائے تو اس سے زیادہ مجھے خدا سے کیا چاہئے۔ سکندر کی بارات آئی اور پورس نے استقبال کیا۔ سکندر کو پیغام ملا کہ یہ شاہی محل ہے جس میں تمہاری رانی بیٹھی ہے۔

سکندر محل میں داخل ہوا تو دلہن رانیوں جیسا لباس پہن کے بیٹھی ہے۔ نقاب اوڑھا ہوا ہے۔ جیسے پنجابی عورتیں اوڑھتی ہیں۔ سکندر نے نقاب اٹھایا۔ شکل، صورت دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔ رانی نے پوچھا: ''مہاراج خوشی کی رات ہے''

آج کی رات سہاگوں والی رات ہے کل پتا نہیں کیسا رنگ ہوگا
کہاں تم ہو گے کہیں میں ہوں، کہاں شمع ہوگی، کہاں پتنگا ہوگا

کوئی بات بتاؤ جو یاد رکھ سکوں؛ تمھارے ہجر میں جب میرا دل اداس ہو
اے میرے دوست! تیرے بغیر اور میری کوئی بہتر سنگت نہیں ہوگی
میں نے کانوں میں بندے (کنواری لڑکی کے کان کا زیور) ڈال رکھے ہیں
اور سر پر گھنے چھتے (کنواری لڑکی کے سر کے بال) ہیں
مجھے منگیتر کا شوق ہے اور بارات کا دن طے ہوگیا ہے
اے بابل! میرے شادی پھر کرنا تا کہ سکھیاں میرا جہیز دیکھ سکیں
سہیلیوں نے پینگھ بنوائی ہے اور سبھی جھول رہی ہیں
جب مجھ بدنصیب کی باری آئی تو اس کی رسیاں ٹوٹ گئیں

''یہ بات بتاؤ تم نے ٹھنڈی آہ کیوں بھری۔'' سکندر نے کہا: ''میں بتا تو دوں مگر تمہارے دل پر چوٹ لگے گی۔'' اس نے کہا: ''بات کرو۔ چوٹ کیوں لگے گی۔'' سکندر نے کہا ''میری ایک سہیلی تھی۔ صرف تمہارا اور اس کا زبان کا فرق ہے۔ لباس کا فرق ہے۔ شکل، عمر، قد، بت سب اسی جیسے ہیں۔ مجھے وہ بے چاری یاد آئی کہ میں اسے ٹھکرا کے چلا تھا۔'' یہ بات سن کے اس کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے کہا: ''تو اب پھر رو پڑی۔'' اس نے کہا: ''میں اس لئے روئی ہوں کہ میرا ابھی ایک دوست تھا۔ تمہاری شکل بھی اس جیسی ہے۔'' سکندر نے تلوار سنبھالی ''میں تو خوش ہو رہا تھا کہ راجپوتنی ہاتھ آئی ہے مگر یہ تو پہلے سے دوستوں والی ہے۔'' سکندر نے سوچا، اس سے پوچھ تو لوں کہ وہ کون تھا؟ سکندر نے پوچھا ''تمہارا وہ دوست کون تھا؟'' نوشابہ نے کہا ''تو بتا تیری سہیلی کون تھی؟'' سکندر نے بتایا: ''وہ تو یونان کی بہت مشہور عورت ہے۔ نوشابہ اس کا نام ہے۔ زمانہ اسے جانتا ہے۔'' ''اب تو بتا کہ تیرا دوست کون ہے؟'' نوشابہ نے کہا: ''فیلقوس کا ایک بیٹا تھا۔ مقدونیہ کا رہنے والا تھا اور سکندر اس کا نام تھا۔'' سکندر نے کہا: ''تیرا بیڑا غرق تم تو نوشابہ ہو'' نوشابہ نے کہا: ''میری بات سن: میں نہ ہوتی تو تم نے اب تک قتل ہو جانا تھا یا قید ہو جانا تھا۔ یہ تمام تر کوششیں میں نے کی ہیں تو تیری جان بچی ہے۔'' اس وقت سکندر نے اسے اپنی بیوی سمجھا، شادی تو ان کی پہلے سے ہو چکی تھی۔

بھیرے کے بعد سکندر نے ملتان پر دھاوا بولا۔ شورکوٹ روند کے آگے بڑھا۔ یہ کھنڈر اس وقت کے ہیں۔ ملتان فتح کرنے کے بعد خود زخمی ہوگیا اور باقی پنجاب کی طرف نہیں دیکھا۔ اندر سے ہار گیا تھا اور واپس اپنے دیس کی راہ لی۔ بابل پہنچا اور جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔ پورس کی اولاد میں سے بعد میں بھی بڑے بڑے سورمے اور زورآور پیدا ہوتے رہے ہیں(4)۔

اب پنجاب کے ایک اور سورما راجہ رسالو کی بات کی جائے جس کی داستان کے بہت سے حصے خیبر پختونخوا کے باب میں ہندکو لوک بیانیہ کے حوالے سے دیئے جا چکے ہیں لیکن راجہ رسالو کی داستان بنیادی طور پر سیالکوٹ (پنجاب) کی داستان ہے، اس لئے اس کے بعض اقتباسات اس باب میں بھی دیے جا رہے ہیں۔

راجہ رسالو کا لوک بیانیہ: ہ

جس دن کوکلاں پیدا ہوئی، خدا کرے ایسے دن کوئی اور جنم نہ لے
وہ صحن میں کھڑی آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہی تھی۔

رانی کوکلاں

''اپنے زیورات لے جا، میں نے انہیں پہنا تک نہیں۔
مجھے تو اپنا جوبن بیچنا ہے، جو بھی اس کا گاہک ہوگا لے جائے گا۔''

راجا رسالو

''اگر تجھے اپنا جوبن بیچنا ہے تو بازار میں جا کر بیٹھ جا:
تیرا حسین چہرہ تجھے بازار میں جگہ دلا دے گا
آنکھوں میں تھوڑا سا کاجل لگا لے اور آنکھوں سے تجارت چلا؛
کانوں کے ترازو بنا لے اور زلفوں سے ان میں رسیاں ڈال لے۔
جھکتے پلڑوں سے تولنا شروع کر دے؛ لاکھوں نہیں کروڑوں گاہک آئیں گے''۔

رانی کوکلاں

''اگر تو شکار کے لئے جا رہا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے چل
خود اپنے نیلے گھوڑے پر سوار ہو جانا، مجھے پیچھے بٹھا لینا
وہ دیکھ، ہرنوں کی ایک ڈار پربت کی اوٹ میں چر رہی ہے
گھوڑے سے اتر کر انہیں نشانہ بنا تا کہ تیرے نشانے کا پتا چل جائے
شکار کی دم کاٹ لینا اور اس کے ہونٹ بھی ساتھ نہ رہنے دینا
تیرے مارے ہوئے ہرن چار چار قدم کی چھلانگیں لگاتے ہیں
ہمارے مارے ہوئے ہرن ہمارے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں''
رانی آرائش و زیبائش کرنے کے بعد وہاں (جنگل میں) بیٹھ گئی تو ہرن اس کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔
رانی نے اپنے گلے سے ہار اتار کر اس کی گردن میں ڈال دیا؛
پھر راجا رسالو کو بلایا

راجا رسالو

''میرے ہرن! میرے پاس آجا؛

میں تجھے چرنے کے لئے چراہ گاہ دوں گا اور اس میں کنواں بھی لگوا دوں گا"۔

راجا نے اس کے کان اور دم کاٹ ڈالی اور اسے کن لنڈورا کر دیا

ہیرا ہرن

"میں کالے پہاڑ کا ہرن ہوں، بلندی سے یہاں آیا تھا

نہ میں نے تیرے کنویں کا پانی پیا، نہ تیری چراہ گاہ سے گھاس چری

تو نے مجھ بے گناہ کے کان اور دم کاٹی، مجھ پر کوئی الزام نہیں لگایا

مجھے ہیرا ہرن نہ کہنا، اگر میں تیرے محل میں رہزن نہ لے آؤں"

ہرن وہاں سے چل دیا اور دوسرے ہرنوں کے پاس پہنچ گیا۔

دوسرے ہرن

"کان اور دم کہاں کٹوا دی؟ تو نے تو ہرنوں کی عزت پر داغ لگا دیا۔

جو روٹی چوکے سے اٹھا دی گئی، پھر اسے وہاں کیسے رکھا جا سکتا ہے؟"

ہیرے نے انہیں یہ جواب دیا:

ہیرا ہرن

"میری بات سنو!

آؤ راجا ہوڈی کے باغ کو ویران کریں"

ہرن راجا ہوڈی کے باغ میں آ کر رہنے لگے

مالی

"راجا! تیرے باغ میں ہرنوں کی ڈار آ گئی ہے

ان میں ایک ایسا سرکش ہرن ہے کہ اس نے تیرا باغ اجاڑ دیا ہے

وہ مروا اور چنبیلی کھا گئے ہیں۔ انہوں نے آم اور انار توڑ ڈالے ہیں

اس ڈار کے ساتھ ایک ایسا سرکش ہرن آ گیا ہے؛

جو پیڑوں کو ایک ہی ٹکر سے گرا دیتا ہے

خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر، باغ بالکل ویران ہو گیا ہے۔

ہیرا ہرن

تو ٹھنٹھور کا راجہ ہے اور تیری تلوار چمکدار ہے

میں تجھے رانی کوکلاں کے پاس لے چلوں گا جو سونے کی مانند ہے"

راجا ھوڈی

''شکاری اُمید لے کر آتے ہیں مگر مجھے شکار نہیں کر پاتے
اُٹھ، گھوڑے پر سوار ہو جا اور میرے ساتھ چل۔''

راجا ھوڈی

''اے کالی پہاڑیوں میں بسنے والے طوطے
تیری پیدائش کی سرزمین کون سی ہے؟ کون سا شہر ہے؟ کون سا گاؤں ہے؟
تو کس کا طوطا ہے؟ تیرا نام کیا ہے؟
کون تجھے کھانے پینے کے لئے دیتا ہے؟ کون تیری پرورش کرتا ہے؟
ہم پانی کے پیاسے ہیں، ہمیں ڈول بھر کر پانی پلا دے
ہم تیری شہرت سن کر دور سے چل کر آئے ہیں''

طوطا

''میں پربت میں بستا ہوں، میں کالی پہاڑیوں میں رہتا ہوں
میں نے گورکھ کے ٹیلے پر جنم لیا تھا، وہ مشہور جگہ ہے
خدا مجھے کھانے پینے کے لئے دیتا ہے، وہی پروردگار ہے
راجا سرکپ کی بیٹی اس محل میں رہتی ہے
اگر بھلائی چاہتا ہے تو اپنے ٹٹو کو یہاں سے لے جا ورنہ ذلیل ہوگا
میں ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہوں، میں نے سچی بات کہہ دی ہے''

رانی کوکلاں

اے محلوں کے نیچے پھرنے والے! تو شریف آدمی ہے یا چور ہے؟
کیا تو کوئی آدمی گم کر بیٹھا ہے یا کوئی مویشی گنوا بیٹھا ہے؟

راجا ھوڈی

''ہم نے نہ کوئی آدمی گم کیا ہے، نہ کوئی مویشی گنوایا ہے
ایک کان کٹا اور دم کٹا ہرن جو میرا چور ہے، تیرے محلوں میں آ گیا ہے
یا میرا چور میرے حوالے کر دے یا اس کا پتا بتا دے
چوروں کا لباس میلا ہوتا ہے، نیک آدمیوں کی شان اور ہے

میں لکھ پتی ہوں، تو نے مجھے چور بنا دیا ہے
میں پانی کا پیاسا ہوں، مجھے ڈول بھر کے پانی پلا دے"

رانی کوکلاں

"پانی پی لے اور چلا جا، نہ میری طرف دیکھ، نہ اپنے آپکو بھول
میں جس شخص کی بیوی ہوں، تو اس کے پاؤں کے جوتے کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکتا"

راجا ھوڈی

"جوتوں کی قیمت چھ ٹکے ہے یا زیادہ سے زیادہ چار آنے
میرے گھر آ کر دیکھ لے، وہاں چودہ سا ٹھ پانی بھرنے والیاں ہیں"

رانی کوکلاں

"جنگل کی کوئی ہرنی ہی مجھ جیسی حسین ہو سکتی ہے۔"

راجا ھوڈی

"ہرنی کی کیا تعریف کریں جو گھاس اکھاڑتی پھرتی ہے
اگر وہ شکاریوں کے ہاتھ پڑ جائے تو اس کی جان ضائع جاتی ہے
شکاری تیری کھال اتاریں گے اور اپنے نیچے بچھائیں گے"

رانی کوکلاں

"تو کس پرگنے کا رہنے والا ہے؟ تیرا شہر یا گاؤں کون سا ہے؟
کس راجا کا تو بیٹا ہے؟ تیرا نام کیا ہے؟"

راجا ھوڈی

"بدنا میرا پرگنا ہے، وہی میرا شہر اور وطن ہے؛
میں راجا ھٹیا کا بیٹا ہوں، ھوڈی میرا نام ہے۔"

رانی کوکلاں

"میرے محل میں چلا آ تا کہ میں تیرا حال پوچھ سکوں
خوب صورت باغ کے اندر آم کے درخت کے ساتھ اپنا گھوڑا باندھ دے۔"

راجا ھوڈی

"عورتیں زہر ملی مصری ہوتی ہیں، انہیں احتیاط سے کھانا چاہیے
تو میرے محل میں آ جا وہاں میں تیری خاطر تواضع کروں گا"

رانی کوکلاں

''ساون کے بادل برس رہے ہیں اور زور شور سے برس رہے ہیں
درخت کونپلوں سمیت ڈوب گئے ہیں، ہاتھی پانی میں خوب نہاتے ہیں
گھڑا ڈھکنے سمیت ڈوب گیا ہے مگر چڑیا ابھی تک پیاسی ہے
بنیے کو اس کی دوکان میں لوٹ لیا گیا اور اس کے کپڑے چھین لئے گئے
یہ پہیلی بوجھ لے اور میری سیج پر آجا''

راجا ھوڈی

''اس پہیلی سے شبنم مراد ہے، اب کوئی اور پہیلی پوچھ!''

رانی کوکلاں

''پیدا ہوتے وقت وہ ساٹھ گز تھی، جوانی میں چار گز رہ گئی
باپ اور بیٹے دونوں کی ایک ہی عورت تھی''

راجا ھوڈی

''اس پہیلی سے چھاؤں مراد ہے؛ کوئی نئی پوچھ!
اگر تو سچی ہے تو اب مجھے اپنی سیج پر بلا لے''

رانی کوکلاں

''بیل زمین پر ہے، پھل آسمان پر؛ جو اس کی آبیاری کرے، اس کا پھل کھائے
ماں کنواری، باپ پیٹ میں اور بیٹے کو بیاہنے کے لئے جاتے ہیں۔
اگر تو یہ پہیلی بوجھ لے تو تجھے سیج پر بلا لوں گی۔''

راجا ھوڈی

''میں اسے نہیں بوجھ سکتا''

رانی کوکلاں

''اچھا، میری سیج پر آجا!''

''میں کھانڈ اور گھی ڈال کر چوری تیار کروں گی، میرے ہاتھ پر بیٹھ کر کھا لے
مینا کے مرنے کا غم نہ کھا، تیری چار اور شادیاں کرا دوں گی۔ میں مینا کو کیا مارتی، اس کے بدن میں تو پہلے ہی جان نہ تھی۔

طوطا اپنے پروں کو سنبھال کر محل سے اُڑ گیا۔

طوطا

''میں (اتنی تیزی سے) اڑتا ہوا تیرے پاس پہنچا ہوں کہ مجھے نیچے سے زمین نظر نہیں آتی تھی
تیرے محل میں ڈاکو داخل ہو چکے ہیں اور تو یہاں شکار کھیلتا پھر رہا ہے۔
خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، تیرا گھر اجڑ رہا ہے۔''

راجا رسالو

''آٹھ کنوئیں ہیں، نو کھڑکیاں اور ہر کھڑکی میں ایک مور بیٹھا ہے
اے طوطے! اتنے چوکیداروں کی موجودگی میں چور کیسے محل میں آ گیا؟''

طوطا

''ایک راجپوت گھوڑا دوڑاتا پہنچا،
اس نے تیرے ڈھول کو توڑ کر اس کے چار ٹکڑے کر دئے
رانی کوکلاں نے کمند پھینکی اور اسے محل کے اوپر چڑھا لیا
اور وہ دونوں مل کر چوپڑ کھیلنے لگے۔''

راجا رسالو

''کس نے میرے کنویں میں ڈول پھینکا، کون میرے دروازے پر آیا؟
یہ کس کی مسواک یہاں پڑی ہے، کس نے یہاں تھوکا ہے؟
کس نے یہاں آم کھائے ہیں، کس نے گٹھلیاں باہر پھینکی ہیں؟
کون میری سیج سے لطف اندوز ہوا؟ نواڑ ڈھیلی پڑی ہے''
رانی کوکلاں نے یوں جواب دیا:

رانی کوکلاں

''میرا جواب سن لو:
کنوئیں میں ڈول میں نے پھینکا تھا۔ یہاں طوطا اور مینا پھرتے رہے ہیں
یہ میری اپنی مسواک ہے، یہاں میں نے تھوکا تھا
میں نے بھوک کے مارے آم چوسے تھے اور گٹھلیاں دروازے سے باہر پھینک دیں
مجھے نیند آ گئی، اس لئے میں سیج پر لیٹ گئی؛ نواڑ کے ڈھیلے ہو جانے کا یہ سبب ہے

عین دوپہر کے وقت طوطوں کی ڈار آ گئی تھی؛
مینا اور طوطا لڑ پڑے تھے، میں نے انہیں چھڑایا
طوطے نے میرے بال نوچ ڈالے۔ مینا نے میرا ہار توڑ دیا
جن کے خاوند مر چکے ہوں، ان کا حال برا ہوتا ہے
تم مجھے اکیلی چھوڑ گئے تھے، تم نے میری خبر تک نہ لی"
رانی ساحرہ تھی، اس نے راجا (رسالو) کو پھسلا لیا
اس نے راجا ھوڈی کو چھپا دیا، اس کے اوپر چٹائی ڈال دی
راجا کا غصہ ٹھنڈا کر کے اسے سیج پر بٹھالیا۔
دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا، پھر شراب پی،
مگر طوطے نے ھوڈی کو ڈھونڈ لیا اور رانی کی عزت نہ رہنے دی۔

طوطا

"گھر آئے کو مارنا نہیں چاہئے، وہ سگے بھائی کی مانند ہوتا ہے"
راجا رسالو اور راجا ھوڈی گھر سے نکل کر جنگل کی طرف چل دئے
راجا ھوڈی کو سخت تیر لگا اور وہ مر گیا
راجا رسالو نے اس کا گوشت کاٹ لیا اور رانی کوکلاں کو کھانے کے لئے دیا۔
اس نے اپنے محبوب کا گوشت کھایا اور کھانے کے بعد مزہ پوچھنے لگی۔(5)

ناتھ لوک بیانیہ:

پہلے باب میں ناتھ جوگیوں اور سماجی تنقید پر مبنی ان شعری لوک بیانیہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کے مطابق ناتھ جوگیوں کا دور 850ء تا 1780ء بیان کیا جاتا ہے نویں صدی عیسوی موجودہ پنجاب کے ارتقاء اور ترقی کی صدی ہے۔ اس زمانے میں پنجاب ہند و راجستھان اور یوپی میں گوراجر، آہیر اور گکھڑ قبائل کا زور تھا۔ جس علاقے کو ہم آج پنجاب کہتے ہیں اس میں بولی جانے والی پراکرت کو اور زیادہ عوامی بنانے اور پراکرت کو اپ بھرنش بنانے میں ان قبائل کا اہم حصہ تھا۔ وہی اپ بھرنش جو آگے چل کر پشاچی اپ برنش کہلائی، دراصل نویں صدی کی پرانی پنجابی ہے جس میں ان دنوں پراکرت کے الفاظ کی کثرت تھی۔ بعد میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کا اضافہ ہوتا گیا۔ سنسکرت کے الفاظ اپ بھرنش کی صورت میں بگڑ کر موجودہ پنجابی بن گئی۔ گرجر اور آہیر اب گجر اور اہیر کہلاتے ہیں۔ اس دور کے لوک بیانیہ میں کان پھٹے جوگیوں اور مسلمان صوفیوں کا کافی اہم حصہ ہے۔ اہم ناتھ جوگی شاعروں میں گورکھ ناتھ، چرپٹ ناتھ، رتن ناتھ اور چورنگی ناتھ شامل ہیں۔

پنجاب کے ضلع جہلم میں گورکھ ناتھ کا ٹیلہ "ٹلہ جوگیاں" کے نام سے مشہور ہے۔اس ٹیلے کے علاوہ پشاور میں گورکھ ناتھ کی پیڑی اور بابا ناتھ رتن کا ڈیرہ ہے۔ابوہر میں چورنگی ناتھ کی دھونی اور سیالکوٹ میں ان کا کنواں ہے۔وہاں وہ پورن بھگت کے نام سے مشہور ہیں۔سابق ریاست چنبہ میں چرپٹ ناتھ کی پوجا ہوتی تھی۔ان چاروں ریاستوں کا گورو مچھندر ناتھ تھا جس کا تعلق راجپوتانہ سے تھا۔گورکھ ناتھ اس کا سب سے اہم چیلہ تھا۔گورکھ ناتھ کے پنتھ میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔انہوں نے راگ بھیروں میں ایک شبد اور کئی اشلوک لکھے۔

گورکھ ناتھ کی طرح چرپٹ ناتھ بھی صلح کل انسان دوستی اور مذہبی رواداری کی روایات کا حامل ہے اس کا کلام ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

جس کا کام سوئی سا جھے
اور کرے تو ٹھینگا باجے
ظاہرداری اور منافقت کا وہ سخت ناقد ہے
اندر گندا، باہر گندا
توں کیوں بھولیو چرپٹ اندھا
اپنے بارے میں خود کہتا ہے آتم جوگی، چرپٹ میرو ناؤں (6)
(آتم جوگی، چرپٹ میرا نام)

پنجابی قصے اور لوک بیانیہ:

ہیر رانجھے کا قصہ پنجاب میں سب سے زیادہ مشہور ہے اور اسے بے شمار شاعروں نے نظم کیا ہے۔لیکن جو شہرت اور عزت وارث شاہ کے قصے کو نصیب ہوئی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آسکی، ہیر وارث شاہ محض لوک کہانی کا منظوم بیان نہیں ہے۔اس میں وارث شاہ کا اپنا عہد جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ہیر وارث شاہ میں اس عہد کے تاریخی حوالوں کی کمی نہیں ہے وارث شاہ نے جب آنکھیں کھولیں، نادر شاہ کے حملے کا زخم ابھی تازہ تھا۔وارث شاہ نے جب لکھنا شروع کیا۔نادر شاہ کی لائی ہوئی بربادی کی گونج ابھی سنائی دے رہی تھی۔وہ نادر شاہ کے حملے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ے

نادر شاہ توں ہند پنجاب تھر کے
میرے باب دا تدھ بھونچال کیتو

احمد شاہ درانی کے حملوں کا ذکر وارث شاہ نے کئی مقامات پر مختلف انداز میں کیا ہے۔

1786ء میں احمد شاہ نے ہند پر چوتھا حملہ کیا۔اس حملے میں وہ پنجاب اور دتی کو آگ لگاتا متھرا اور بندران تک پہنچ گیا۔اس نے خوبصورت لڑکیوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے بڑے ہی اوچھے

ہتھکنڈے استعمال کئے اور قتل عام کا یہ عالم تھا کہ شہر میں راستہ چلنا مشکل تھا کیونکہ جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ ایک جگہ دو سو بچوں کی بے سر اور بے گور و کفن لاشوں کا ڈھیر دیکھا گیا۔ وارث شاہ اس المناک تباہی سے بھی باخبر تھا۔ وہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے۔

فوجاشاہ دیاں وارثا مار متھرا
مُڑ فیر لہور نوں آیاں نیں

ہیر وارث شاہ میں جگہ جگہ اس عہد کے پنجاب کی بربادی کے اشارے ملتے ہیں چند مثالیں دیکھیے

احمد شاہ از غیب تھیں آن پوسی
رب رکھ جنڈیالے نوں جاسیانی
سارے ملک خراب پنجاب وچوں
مینوں وڈا افسوس قصور دا اے

حکم ہوردا ہور اَج ہو گیا
اج ملی پنجاب قندھاریاں نوں

ہَین بدل وی وسدے ہونیویں
دھماں قہر دیاں دیس تے گھلیاں نی

سیہ فام مہاراجیاں ہندیاں تھیں
لیا راج افغانیاں درانیاں نے

مغل عہد میں پنجاب اکثر مرکزی حکومت کے خلاف بغاوتیں کرتا رہا اور دُلا بھٹی دیکھتے ہی دیکھتے عوام کا محبوب کردار بن گیا اور اس کی ذات کے ساتھ ان گنت کہانیاں منسوب ہو گئیں۔ ایسی ہی ایک حکایت ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ اسے تیوہار کا درجہ دے دیا گیا ہے اور پنجاب کے ہندو ہر سال جنوری میں لوہڑی کا تیوہار مناتے ہیں۔ اس موقع پر لڑکے گھر گھر جا کر لوہڑی (لکڑیاں، اوپلے وغیرہ) مانگتے ہیں اور ساتھ ایک گیت گاتے ہیں۔

سُندر مُندر ریئے ہو
تیرا کون وچارا ہو
دُلا بھٹی والا ہو

ڈُلے دھی ویاہی ہو

سیر شکر آئی ہو

کُڑی دے بوجھے پائی ہو

کُڑی دا لال پٹاکا ہو

کُڑی دا سالو پاٹا ہو

سالو کون سمیٹے ہو

چاچا گالی دیسے ہو

چاچے چوری کُٹی ہو

زمیندار سرائے ہو

گِن گِن پولے لائے ہو

سُندری کے ماں باپ گزر چکے تھے۔ایک چچا زمیندار تھا۔اس علاقے میں سے ایک بار اکبر بادشاہ کا گزر ہوا۔زمینداروں نے فیصلہ کیا کہ سُندری اس کی خدمت میں پیش کی جائے۔گاؤں کی سب سے خوبصورت (لال پٹاکا) اور سب سے غریب (سالو پاٹا) لڑکی کی حفاظت کون کرتا، آخر دُلے کو اس کی خبر ہوگئی۔اس نے فوراً سُندری کو بیٹی بنا کر اس کا بیاہ کر دیا۔جلدی میں شادی دھوم دھڑکے سے نہ ہو سکی ''سیر شکر'' کا اشارہ اسی طرف ہے۔اسد سلیم شیخ کی روایت کے مطابق مغل بادشاہ اکبر حافظ آباد اور جنڈیالہ شیر خان کے درمیانی علاقے میں اکثر شکار کے لئے آتا تھا ۔اس معمول میں ایک مرتبہ وہ شکار کر کے آیا تو اس کی نظر ایک پندرہ سالہ خوبصورت ہندو لڑکی پر پڑی۔اکبر اس پر فریفتہ ہو گیا اور لڑکی کے باپ مول چند عرف مولہ سے اس کا رشتہ مانگا۔مول چند اپنی لڑکی کو اکبر کے عقد میں دینے کے لیے کسی طرح سے بھی راضی نہ تھا مگر بادشاہ کے رعب و دبدبہ اور اس کے اقتدار کی طاقت سے خوفزدہ تھا۔چنانچہ اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ اپنی برادری سے پوچھ کر اس کو جواب دے گا۔اسی رات مول چند عرف مولہ اپنی لڑکی کو گھوڑے پر سوار کر کے پنڈی بھٹیاں کی طرف نکل آیا اور یہاں آ کر دلا بھٹی کو سارا قصہ سنایا اور اس سے پناہ لے لی۔ دلا بھٹی پہلے ہی اکبر بادشاہ کے خلاف برسر پیکار تھا۔اس نے اسی وقت پنڈی بھٹیاں کے نواحی گاؤں باغ کہنہ میں اپنے ایک ہندو دوست سندر داس کو اس کے بیٹے کے لئے شادی کا پیغام بھیج دیا۔سندر داس نے مول چند کی لڑکی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لئے قبول کر لیا۔جب اس کی اطلاع اکبر کو پہنچی تو وہ بڑا سیخ پا ہو گیا اور حافظ نامی جرنیل کو دلا بھٹی کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن دوسری طرف دلا بھٹی نے ہندو لڑکی کو اس کے ہم مذہب کے عقد میں دے دیا۔دُلا بار کی ثقافتی تاریخ میں یہ دن رقم ہو گیا اور ہر برس اس موسم میں ہندو دلا بھٹی کی جوانمردی، بہادری اور ہندو لڑکی کی عزت بچانے پر اسے خراج عقیدت پیش کرنے اور گیت گانے لگے۔یہ گیت آج بھی لوہڑی کے گیت کے طور پر مشہور ہے۔

سندر مندر یے کی لوک کہانی کو ایک ہندو شاعر جیون پرکاش نے کسی اور انداز سے روایت کیا ہے۔ جیون کے مطابق پنڈی بھٹیاں سے کچھ دور موضع کوٹ نکہ میں ایک ہندو پریوار تھا جو دکان کا کام کرتا تھا اور وہی اکیلا سارے گاؤں کو ضروری اشیاء فراہم کرتا تھا۔ اس گاؤں کا جو نمبردار مان تھا وہ بڑا نفس پرست تھا۔ وہاں اس کا بڑا دبدبہ تھا وہ جس کی چاہتا عزت لوٹ لیتا۔ سب گاؤں والے اس سے ڈرتے تھے۔ کوئی اس کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ ڈر کے مارے سب تھر تھر کانپتے تھے۔ اس نمبردار نے ہندو دکاندار کو بلا کر کہا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دے اور اگر انکار کرے گا تو میں زبردستی اس سے نکاح کرلوں گا۔ ہندو اپنی بیٹی کی شادی ایک مسلمان زمیندار سے نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سوچ کر جواب دیا کہ آپ جیسے کہتے ہیں وہی کروں گا مگر ایک بار مجھے اپنے رشتے داروں سے صلاح مشورہ کر لینے دیں۔ وہ تھا عقلمند۔ اس نے من میں سوچ لیا تھا کہ کس طرح اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ نمبردار مان گیا اور کہا کہ کچھ دنوں میں اس کا فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور تم کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی ہوگی۔ اس نے بڑی عاجزی سے اقرار کرلیا اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے بہانے وہ سیدھا دلا بھٹی کے پاس چلا گیا۔ اسے پہلے ہی علم تھا کہ دلا بھٹی بڑا غریب نواز ہے اور وہ سرکاری خزانے لوٹ کر بھی غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کسی بھی غریب چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ہو، سب کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ ہندو دکاندار نے ساری داستان دلا بھٹی کو سنائی۔ دلا بھٹی نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یہ تمہاری نہیں میری بیٹی ہے اور مجھے ہی اس کا حقیقی والد سمجھو اور میں خود ہی کسی ہندو لڑکے سے اس کی شادی کروں گا۔ تم واپس گاؤں چلے جاؤ اور اس نمبردار سے کہہ دو کہ فلاں دن برات لے کر آ جائے۔ باقی انتظام میں خود کروں گا۔ تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرو۔ دلا بھٹی نے اس کو پوری تسلی دے کر الوداع کر دیا۔

ہندو کو بڑی عزت نصیب ہوئی اور خوشی خوشی واپس گاؤں آ گیا۔ جب نمبردار ملا تو جیسا دلا بھٹی نے کہا تھا اس کو کہہ دیا کہ اگر آپ نہیں مانتے تو آپ کا حکم سر ماتھے پر۔ آپ فلاں دن اپنی بارات لے کر آ جائیں اور میری لڑکی کو بیاہ کر لے جائیں۔ نمبردار یہ سن کر مسرت سے ناچ اٹھا اور شادی کی تیاری کرنے لگا۔

ادھر دلا بھٹی لڑکی کا رشتہ کسی ہندو لڑکے سے طے کرنے کے لئے سانگلہ چلا گیا اور ایک اچھے امیر گھرانے کے بیوپاری کے لڑکے سے یہ رشتہ طے کر آیا اور وہاں ان کو بارات لانے کی وہی تاریخ دے آیا جو تاریخ ادھر نمبردار کو دی گئی تھی۔ بے شک دلا بھٹی کا اس سارے علاقے میں بڑا دبدبہ تھا لوگ اس کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن غریب اس کی فراخدلی اور غریب پروری کے بڑے دلدادہ تھے۔ وقت مقررہ پر جب نمبردار بارات لے کر پہنچا تو دلا بھٹی نے اپنے کچھ ساتھی بھیس بدل کر بھجوا دیئے تھے جو اس ہندو کی حفاظت کرتے رہے۔ نمبردار دلہا کے روپ میں مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا، گھوڑی پر چڑھ کر بڑی سج دھج کے ساتھ اپنے ہمراہ کچھ باراتیوں کو بھی لایا ہوا تھا۔ جب بارات دروازے کے پاس پہنچی ہی تھی تو دلا بھٹی کے شیر جوانوں نے اس کو بڑی مضبوطی سے پکڑ کر نیچے گرا لیا اور زمین پر لٹا کر

اوپر سے پولے (جوتے) برسانے شروع کر دئے اور پولے بھی ایسے پڑتے جیسے بادلوں میں بجلی کڑکتی ہے۔ پھر کہتے کہ تو شادی کرنا چاہتا ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ دے کہ یہ میری لڑکی ہے۔ تبھی معاف کریں گے۔ یا پھر تمہاری چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔ نمبر دار اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ کہ زمین پر ناک سے لکیریں نکال کر گڑ گڑا کر معافی مانگتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے معاف کر دو میں اس کو اپنی بیٹی ہی سمجھوں گا۔ ابھی نمبر دار پٹ رہا تھا کہ اتنے میں سانگلہ ہل سے بھی بارات وہاں پہنچ گئی اور خود دلا بھٹی بھی وہاں پہنچ گیا اور جب لڑکے اور لڑکی کے ہندو رسم کے مطابق پھیرے ہونے لگے تو لڑکی کے باپ کی جگہ خود دلا بھٹی وہاں بیٹھا اور خود لال رنگ کا ایک سالو (چادر یا دوپٹہ) جس پر پیلے (ریشمی دھاگہ) سے بڑی کاریگری سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے، لے کر اس میں گڑ کی ڈھیلی لے کر لڑکی اور لڑکے کو تحفے کے طور پر پیش کیے۔ یہ منظر اس وقت اپنی مثال آپ تھا۔ گاؤں والوں نے اپنی نظر سے تو دیکھا لیکن اردگرد کے لوگوں نے جب سنا تو وہ خوشی کے مارے ناچ اٹھے اور گیت گانے لگے۔ وہ دن کڑاکے کی سردی کا تھا لیکن اس مدھر سریلے اور دلکش گیت نے سب کے دلوں میں گرمی پیدا کر دی۔

سُندر مندر یے تیرا کون وچارا
ـ دُلا بھٹی والا
دُلے دھی ویاہی
بوجھے شکر پائی
بوجھے مار پٹا کا
کڑی دا ساہلو پاٹا
کڑی دا جیوے چاچا
ساہلو کون سیمٹے
چاچے چوری کٹی
زمینداراں لٹی
نمبردار سدائے
گن گن پولے لائے
اک پولا رہ گیا
سپاہی پھڑ کے لے گیا۔(7)

پنجابی لوک کہانیوں میں پردیس ایک اہم علامت ہے۔ ان کہانیوں کے تمام کردار پردیسی اور غریب الوطن ہیں۔ وہ بھٹکتے پھرتے ہیں اور منزل مراد کے لئے جدو جہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ راجہ رسالو دھن پوٹھوہار کی

پہاڑیوں سے نکل کر جگہ جگہ مظلوموں کے لئے لڑتا پھرتا نظر آتا ہے۔ ڈلے بھٹی کو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی سندری دکھائی دے جاتی ہے اور وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا آن کی آن میں وہاں آ پہنچتا ہے۔ ان کرداروں کی بھٹکن کی کوئی انت نہیں ہے۔ یہ اپنی جوہوں سے نکلتے ہیں تو پھر کہیں پردیس ہوتا ہے، دریا، ریگستان اور پہاڑ حدِ فاصل کا کام دیتے ہیں۔ ان کے اس پار پردیس ہے دریائے راوی کے بارے میں ایک لوک کہاوت ہے۔

جانی دھیئے راوی

نہ کوئی ونجی نہ کوئی آدی

پورن بھگت، راجہ رسالو، رانجھا، پنّل، اور ڈلا سب وطن سے بے وطن ہوئے، ڈلا پنجاب میں پیدا ہوا وہیں پلا بڑھا لیکن اس نے اپنے لئے زندگی کا ایک ایسا راستہ چنا جس نے اسے کہیں بھی ٹک کر نہ بیٹھنے دیا لیکن اس نے زندگی کے پرانے بندھے ٹکے اصولوں کو رد کر دیا۔ طبقاتی سماج کے غیر منصفانہ ڈھانچے پر کاری ضرب لگائی۔ یہ شہنشاہیت کا مرتد تھا اور اپنی زمین کا پھل بادشاہ کی جھولی میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ڈلے کی غریب الوطنی ہی دراصل اس کی بغاوت ہے۔ اس کا آگے بڑھنے والا ایک ایک قدم سماجی قدروں کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے۔ بار کا علاقہ اس کی غیر قانونی ملکیت ہے۔ بار سے آگے پرانی قدروں کا حکم چلتا ہے۔ جن سے وہ بار بار ٹکراتا ہے۔ اس تصادم اور انکار کا نام ہیر رانجھا کی کہانی میں عشق ہے۔ ہیر کی کہانی میں دریا بار کی جگہ لے لیتا ہے۔ دریا کے اس طرف ماں باپ کا حکم چلتا ہے۔ سماجی قدروں کا راج ہے۔ قاضی اور کیدو کی حکومت ہے اور دریا سے ادھر من کی مرضی، انکار اور بغاوت۔ یہی مہینوال کی کہانی ہے۔ رات سوہنی کو دریا کے طرف کھینچتی ہے اور دن سمجھوتے کی طرف۔ سسّی کے شہر بھنبھور اور پنوں کے شہر کیچ کے درمیان صحرا ہے۔ اس داستان میں صحرا دریا کی جگہ لے لیتا ہے۔

پنجابی لوک گیتوں کی کہانی بھی پنجابی کی کلاسیکی شاعری سے مختلف نہیں ہے۔ وار، ڈھولا، بولیاں، کہاوتیں اور گیت قریب، قریب وہی کہانی بیان کرتے ہیں جو بابا فرید سے لے کر خواجہ غلام فرید کے بولوں کا انگ سنگ بنی ہوئی ہے۔

ایک لوک گیت میں مغلوں کے بارے میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں واقعی بہو بیٹیوں کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ پانی بھرنے جانے والی ایک لڑکی کو ایک مغل ''شہسوار'' روک کر زبردستی ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

مغلاں نے گھوڑا اپیڑیا، گوریئے پانی نوں جا

گھوڑے تے پھڑ کے چاہڑھ لئی وے کوئی پیش نہ جا

لڑکی ساتھ جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ پہلے لڑکی کا باپ اسے چھڑانے کے لئے آتا ہے پھر بھائی آتا ہے، پھر محبوب آتا ہے۔ اس کا باپ، بھائی اور محبوب مغل شہسوار کو ہزاروں روپے دے کر اسے واپس لے جانا چاہتے

ہیں لیکن سب ناکام رہتے ہیں۔اس بے بسی کے عالم میں بھی لڑکی کا مغرور سر نہیں جھکتا وہ باری باری باپ، بھائی اور محبوب سے کہتی ہے:

جا بابل گھر آپنے، رکھاں میں تیری لاج

مغلاں دا پانی نہ پیاں، میں پیاسی مر جاں

جا ویرا گھر اپنے، رکھاں میں تیری لاج

مغلاں دا اَن نہ کھاواں، بھاویں بھکھی ہی مر جاں

جا کنت گھر اپنے، رکھاں میں تیری لاج

مغلاں دی سیج نہ چڑھاں، میں جیوندی ہی مر جاں

اس لڑکی کا نام سندری ہے۔وہ پیاس کے بہانے مغل شہسوار کو پانی لینے کے لئے بھیجتی ہے اور خود دیئے کی لَو پر جل مرتی ہے۔

مغل گیا وے پانئے نوں، کیتا دیوے دی لاج

دیوے دی وٹی لاسڑ موئی، وے رکھی راجے دی لاج

پنجابی وار۔۔ایک لوک بیانیہ:

مغلوں کے خلاف مزاحمت کی کہانیاں صرف پنجابی لوک گیتوں کا ہی نہیں لوک واروں کا بھی حصہ ہے۔ وار کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ جنگی واقعات کے منظوم بیان کو وار کہتے ہیں لیکن اس سیدھے سادھے جواب کی تشریح سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وار کب وجود میں آئی اور کون سے مختلف مراحل کو طے کر کے موجودہ شکل میں ہم تک پہنچی؟

وار پنجابی شاعری کی صدیوں پرانی صنف ہے۔وار کی جو مختصر تعریف ہم نے اوپر بیان کی ہے۔اس اعتبار سے تو رِگ وید کے ان منتروں کو بھی واروں کا نام دیا جا سکتا ہے۔جن میں دراوڑوں اور آریاؤں کے درمیان طویل خونی جنگوں کا ذکر ملتا ہے لیکن چونکہ یہ نظمیں وار کی مروجہ ہیئت اور طرزِ بیان سے مطابقت نہیں رکھتیں، اس لئے ہم انہیں وار کا نام نہیں دے سکتے۔وار کب شروع ہوئی اس کے متعلق ہم کوئی دوٹوک بات نہیں کر سکتے۔سجان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجابی شاعری کی یہ صنف امیر خسرو کے دور میں رائج تھی۔(1) چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت وار موجود تھی۔پنجابی لٹریچر کے مصنف سرے برایا کوف کے مطابق آٹھویں سے دسویں صدی تک وار جنم لے چکی تھی۔یہ دور ناتھ جوگیوں کی شاعری کا دور کہلاتا ہے۔سرے برایا کوف نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دیا پھر انہوں نے جن واروں کا ذکر کیا ہے۔وہ ان کے نظریئے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔یوں لگتا ہے کہ موصوف نے ایک بندھے ٹکے نظریئے کے چوکھٹے

میں ان لوک واروں کو فٹ کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً انہوں نے وار کے جنم کا بنیادی سبب بیرونی حملہ آوروں خصوصاً مسلمان حملہ آوروں کو قرار دیا ہے لیکن ثبوت کے طور پر ''ٹنڈے اسراج دی وار'' '' سکندر ابراہیم دی وار'' اور کچھ دوسری واروں کو پیش کیا ہے۔ ٹنڈے اسراج کی کہانی، پورن بھگت، رانی تکشیلا اور یوسف زلیخا کی کہانی سے بے حد ملتی ہے۔ جس کا بیرونی حملوں سے کوئی تعلق نہیں اِسی طرح '' سکندر ابراہیم دی وار'' دو مسلمان بادشاہوں کے درمیان جنگ کا حال بیان کرتی ہے اور دونوں کے درمیان وجہ نزاع ایک ہندو لڑکی ہے۔

لیکن سرے برایا کوف کے مفروضے سے اختلاف کے باوجود یہ ماننا ہی پڑے گا کہ وار کی ابتدا گورونانک کے عہد سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ گورو صاحبان نے جو واریں لکھیں ان کے ساتھ انہوں نے پہلے سے موجود واروں کا حوالہ بھی دیا۔ '' آسا دی وار'' کے لئے گرنتھ صاحب میں ہدایت کی گئی ہے کہ اسے ''ٹنڈے اسراج دی وار'' کی طرز پر گایا جائے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وار کا اولین دور گورو صاحبان کے عہد سے پہلے کا دور ہے۔ جس میں وار اپنی ایک مخصوص اور منفرد شکل بنا چکی تھی۔

وار کا دوسرا دور گورو صاحبان کا دور ہے یہ عہد وار کے لئے ایک نیا مزاج اور شعور ساتھ لایا۔ گورونانک سے پہلے وار محض رزمیہ شاعری تک محدود تھی گورونانک نے اسے ایک نیا موڑ دیا اور وار پہلی بار خارجی جنگوں سے نکل کر انسان کی داخلی کشمکش سے روشناس ہوئی۔ انسان کی باطنی اور روحانی کشاکش وار کا موضوع بنی لیکن تکنیک کے نقطہء نظر سے وار میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ البتہ ہر وار کے لئے مخصوص راگوں کا تعین کر دیا گیا۔ گورونانک صاحب کی بائیس واریں ایسی ہیں جو مختلف سترہ راگوں میں گائی جاتی ہیں۔ ان میں ماجھ راگ، گوجری، وڈھنس سورٹھ، بلاول، رام کلی، مارو بسنت، سارنگ اور ملار کافی مشہور ہیں۔

وار کا تیسرا دور ان واروں سے تعلق رکھتا ہے جو موضوع کے اعتبار سے تو رزمیہ شاعری کی ذیل میں آتی ہے لیکن ہیئت کے اعتبار سے ان میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ محمد آصف خان کے مطابق اس عہد میں واریں، دوہڑوں، ڈیوڑھوں اور بیتوں کی صورت میں لکھی گئیں۔ شاہ محمد کی ''سکھاں دی وار'' پہلے پہل ''ابیات شاہ محمد'' کے نام ہی سے مشہور ہوئی تھی۔ اس دور کو وار کے عروج کا دور کہا جا سکتا ہے۔ نجابت کی ''نادر شاہ دی وار'' وار گوئی کی تاریخ میں شاہکار حیثیت کی مالک ہے۔

وار کا چوتھا اور آخری دور ہیئت اور موضوع دونوں میں نئے تجربوں کا دور ہے۔ نجم حسین سید نے اس صنف میں بے شمار تبدیلیاں کی ہیں۔ پنجابی شاعری کی آٹھ سو سالہ روایت کا گہرا شعور لے کر انہوں نے ''ملتان شہر دی وار''، ''یار دی وار''، اور ''دُلّے دی وار'' جیسی شاہکار نظمیں لکھی ہیں۔ مشتاق صوفی کی طویل نظم ''سیّد دی وار'' وار کی جدید ترین صورت ہے۔ جس میں موضوع اور تکنیک کی جدت وار کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ نجم حسین سید اور مشتاق صوفی نے وار کی ہیئت اور موضوع کی پرانی روش کو ترک کر کے دراصل پنجابی شاعری کی روایت

سے اپنی واقفیت اور وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔

اس تفصیلی جائزہ کے بعد ہم وار کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ رزمیہ واریں

2۔ مذہبی واریں

3۔ رومانی واریں

لیکن یہ تقسیم ان میں کسی لمبے چوڑے فرق کو ظاہر نہیں کرتی۔ مثلاً مذہبی واروں میں جنگی واقعات پر مشتمل واریں بھی کہی جاتی ہیں اور محض روحانی مسائل بھی اس کا موضوع بنتے ہیں۔ شاہ چراغ کی ''امام حسین دی وار'' اور گورونانک کی ''آسا دی وار'' دونوں مذہبی واریں ہیں لیکن پہلی وار اپنے مزاج کے اعتبار سے رزمیہ ہے۔ جب کہ دوسری وار انسان کی باطنی کشاکش سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح رومانی واروں میں بھی مرزا صاحباں کی واریں، رزمیہ شاعری کا حصہ ہیں اور ہیر رانجھے کے بارے میں گائی جانے والی واریں محض عشقیہ واردات کا احاطہ کرتی ہیں۔

وار اور جنگ نامے میں بھی قدر مشترک رزم ہے لیکن تکنیک کے اعتبار سے جنگ نامے کسی خاص پابندی کے حامل نہیں ہوتے۔ ویسے واریں جمع کرنے والے علماء نے کہیں کہیں وار کے لئے جنگ نامے کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اگر چہ یہ بھی ہے کہ ہر جنگ نامہ وار نہیں ہوتا۔ رزمیہ واروں میں جنگ نامے کے عناصر تلاش کئے جاسکتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی فرق وار اور ''داستان گوئی'' میں ہے اگر مختصر ترین لفظوں میں اس فرق کو واضح کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ہر داستان وار نہیں ہوتی لیکن ہر وار میں داستان مل جاتی ہے۔ اس سلسلے میں داستان گوئی کے فن کا مختصر جائزہ پیش کرنا مفید رہے گا۔

پاکستان کا صوبہ خیبر پختونخواہ داستان گوئی کی عظیم روایات کا امین رہا ہے۔ پشاور اس کا مرکز تھا۔ پشاور کا قصہ خوانی بازار قصہ گوئی کی انہیں صدیوں پرانی روایات کو آج بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس بازار کا نام ہی اسی روایت کی آئینہ داری کر رہا ہے۔ بلوچستان میں بھی یہ روایت صدیوں پرانی ہے۔ بلوچی شاعری کی ایک صنف کا نام ہی ''داستان'' ہے۔ یہ صنف بے حد مقبول ہے اور بلوچستان کی سیکڑوں برس کی تاریخ اسی صنف کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے۔ قدیم ترین بلوچی شاعری میں بھی اس صنف کا وجود نظر آتا ہے۔ بلوچی شاعری میں ''لِلہ گراناز'' اور ''حانی شاہ مرید'' جیسی لوک داستانیں ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ آج بھی بہادرانہ کارناموں کے ذکر کے لئے اس صنف کا استعمال عام ہے۔ گل خان نصیر نے بلوچستان کی لوک داستان ''دوستین وشیریں'' (جو ایک رومانی داستان ہے) بھی اسی انداز میں رقم کی ہے۔

سندھ میں داستان گوئی کی روایت قدرتی طور پر پنجاب کی وار سے بے حد قریب ہے۔ دونوں میں حیرت انگیز حد تک مشابہت و مماثلت موجود ہے۔ پنجابی میں وار گانے کا جو انداز ہے وہی سندھی میں بھی ہے۔ سندھی میں

اس صنف کو قصو (قصہ) کا نام دیا گیا ہے۔ دودو چنیسر کا قصہ جس انداز میں گایا اور سنایا جاتا ہے اسی ڈھنگ سے ہم پنجابی میں ''دلا بھٹی یا شاہ داوٗد'' کی وار سن سکتے ہیں۔

وار کہنے والا فنکار نثر میں کہانی کو بیان کرتا جاتا ہے پھر وہ کہیں کہیں اسے وار کی مخصوص بحر میں گا کر سناتا ہے۔ وار کی زبان میں عام بیان کو ''وچار'' اور گائے جانے والے حصے کو ''کلی'' کہتے ہیں۔ سندھی ''قصو'' میں ٹھیک یہی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وار پاکستان کے تمام علاقوں میں کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے۔ خصوصاً سندھ میں یہ پنجابی وار سے بے حد قریب ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پنجاب میں وار کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ ''ٹنڈے اسراج دی وار'' سے لے کر ''سید دی وار'' تک پنجاب کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ واریں صدیوں پرانے واقعات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ آج بھی ہمیں کئی ایسی لوک واریں ملتی ہیں جو اپنی زبان اور ہنر کے اعتبار سے سیکڑوں برس پرانی ہیں پھر بھی ان کی تازگی اور توانائی برقرار ہے۔ صرف ایک مثال سے ہی اس بات کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

خان سلطان وڈ سورمے وچ رن دے گجے

خط لکھ ٹنڈے اسراج نوں پاتشاہی اجے۔

ٹکا سارنگ باپ نے، دتا بھر لجے

(ٹنڈے اسراج دی وار)

کئی ایسی واریں بھی ہیں جو ہیں تو کافی پرانی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بدلتی چلی گئی ہے کچھ نئی واریں بھی سننے میں آتی ہیں لیکن ان کے موضوعات کافی پرانے ہوتے ہیں۔ ''کیرو پانڈو دی وار'' اگر آپ سنیں تو آپ کا دھیان یقیناً ہزاروں برس پیچھے چلا جائے گا لیکن اس کی زبان کو دیکھ کر آپ کو صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اس وار کی زبان سو پچاس برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

پنجاب میں وار گانے کا فن بھی وار جتنا ہی پرانا ہے۔ دراصل وار کی تخلیق ہی اس لئے کی جاتی تھی کہ اسے گا کر لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اسی طرح لوک واروں کے ساتھ لوک سازوں مثلاً منڈل، ڈھولک، ڈھڈ گھڑے اور چمٹے وغیرہ کا استعمال بھی صدیوں پرانا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوک وار آج بھی اپنے اصل سازوں اور لوک دھنوں کے ساتھ سنی جا سکتی ہے۔

لوک وار گانے کا ایک خاص انداز ہے۔ وار گانے والے فنکار کہانی کو بہت سی ''کلیوں'' اور ''وچاروں'' میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ پھر وہ ایک ایک کلی کے ساتھ ''وچار'' سناتے ہیں ایک کلی پانچ سات یا دس بارہ سطور تک کی ہو سکتی ہے ''وچار'' کے بعد جب کلی گائی جاتی ہے تو شاعری کے ذریعے پوری بات سننے والے کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کلی کی اپنی مخصوص بحر کے علاوہ کبھی کبھی فنکار دوہڑے گیت اور بولیاں گا کر بھی کہانی کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ وار کی

زبان میں اسے شاعر کا قول بھی کہا جاتا ہے۔

وار گوئی کے فن کا آخری فنکار لائلپور (موجودہ فیصل آباد) کا غلام محمد رُلیا تھا۔ جس سے راقم الحروف نے پنتالیس برس قبل مغلوں کے خلاف مزاحمت کے حوالے سے دولوک واریں۔ وار دلّا بھٹی اور وار جیمل پھتا، لوک ورثہ کے لئے سنی تھیں۔ غلام محمد رُلیا نے اپنے اور اپنے فن کے بارے میں جو کچھ بتایا، مناسب ہوگا کہ یہاں اس کا بھی مختصر اذکر کر دیا جائے۔

غلام محمد رُلیا اور اس کے ساتھی (جو اس کے اپنے بیٹے اور بھائی تھے) پنڈ بھولے وال چک نمبر 9 ضلع لائلپور کے رہنے والے تھے۔ غلام محمد رلیا اور اس کا بھائی اللہ رکھا خان صاحب لوک واروں کے پرانے فنکار تھے۔

غلام محمد امرتسر کی تحصیل ترنتارن کے ایک گاؤں ''نوشہرہ پنوں دا'' میں 1914ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولا بخش تھا۔ غلام محمد کا بچپن مسجد اور مدرسے میں گذرا۔ قرآن کی تعلیم کے علاوہ انہوں نے ہندی اور گورمکھی کی تحصیل بھی کی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں انہوں نے گانے کی طرف رجوع کیا۔ ان دنوں لادھو بانیا جس کا اصل نام فضل دین تھا) وار کا بہت بڑا فنکار تسلیم کیا جاتا تھا۔ غلام محمد نے لادھو بانیے کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے پہلے وہ اپنے والد سے بھی گانے کا فن سیکھنے کے لئے رجوع کر چکے تھے۔ بعد ازاں وہ اس فن کے ایک اور بڑے استاد شیخ رانجھا کے شاگرد بنے۔ وہ 1932ء سے گا رہے تھے۔ میلے ٹھیلے اور شادیاں ان کے گانے کا بڑا مرکز رہیں۔ وار گاتے ہوئے سارنگی وہ خود بجاتے۔ ان کے جو ساتھی دوسرے سازوں کے ساتھ ان کی سنگت کرتے۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

اللہ رکھا خان صاحب	ڈھولک یا منڈل
عبدالغفور	ڈھڈ
منظور حسین	ڈھڈ
بشیر حسین	چمٹا

غلام محمد رلیا نے یہ واریں جس طرح گائیں تھیں اسی طرح اردو ترجمے کی صورت میں پیش کی گئی ہیں:

جیمل پھتا کا مزاحمتی لوک بیانیہ:

'' کہتے ہیں کہ راجہ اوداد یپ کے دونوں بیٹے راجہ جیمل اور فتح جنگ شہنشاہ اکبر کے درباری تھے۔ ان کا مغل دربار میں بڑا اثر رسوخ تھا۔ جس کی بنا پر دوسرے اُمرا ان سے حسد کرتے تھے چنانچہ ان کے خلاف ایک درباری سازش ہوئی۔ جس کے سرکردہ بیرم خان دُوتی اور حسن خان پٹھان تھے۔ انہیں اس بات کا بڑا دُکھ تھا کہ وہ پرانے درباری ہیں لیکن راجہ جیمل کو ان سے بڑا عہدہ حاصل ہے اور بادشاہ کو اس پر بڑا اعتماد ہے۔ مخالف امراء نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے، جس کے نتیجے میں راجہ جیمل بادشاہ کا اعتماد کھو بیٹھے اور اسے دربار

سے برخواست کر دیا جائے۔ بیرم خان دوتی نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ وہ جیمل کو دربار سے برخواست کرا دے گا جب اسے اپنے سارے ساتھیوں کی حمایت حاصل ہوگئی تو اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بھرے دربار میں کھڑے ہوکر بادشاہ سے فریاد کی اور اجازت ملنے پر یہ عرض کی:

''بادشاہ سلامت آج چار سال سے راجہ جیمل آپ کے دربار میں ملازم ہے۔ آپ کا رزق کھاتا ہے اور آپ کی دی ہوئی تنخواہ سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتا ہے لیکن آج تک اس نے کبھی آپ کو اپنے گھر کی کوئی بات نہیں بتائی۔

بادشاہ نے پوچھا: وہ کونسی بات ہے جو اس نے مجھ سے پوشیدہ رکھی ہے؟

بیرم خان دوتی نے عرض کی، حضور ایک تو اس کے پاس بہت بڑا جنگی نقارہ ہے، ایک اس کے پاس بڑا طاقت ور جنگی ہاتھی ہے، ایک اس کے پاس دریائی گھوڑا ہے، جو آپ کی سواری کے لائق ہے۔

بادشاہ نے پوچھا: اور چوتھی چیز؟

بیرم خان دوتی نے کہا، چوتھی چیز اس کے پاس بیٹی کی ڈولی ہے، اس کی بیٹی راجکماری صندلاں آپ کے حرم میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ راجہ جیمل نے یہ قیمتی اور نایاب چیزیں ابھی تک آپ کی خدمت میں خود پیش کیوں نہیں کیں۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر کہا، اس نمک حرام کو آلینے دو میں خود اس سے جواب طلب کروں گا۔ جب عام دربار لگا اور راجہ جیمل بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے اکبر کو سلام کیا۔ بادشاہ نے اس کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ راجہ جیمل نے پھر سلام کیا۔ بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ راجہ جیمل نے عرض کی: اے چھوٹی خدائی، اے زمین کے خلیفے، میں نے دو بار آپ کو سلام کیا ہے، آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے؟ مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔؟

بادشاہ نے جلال میں آ کر کہا: 'تم ہندو ہوتے ہی نمک حرام ہو۔'

راجے نے جواب دیا': ہم کیسے نمک حرام سمجھے جا رہے ہیں'۔

بادشاہ نے کہا': تمہارے پاس میری پسند کی چار چیزیں ہیں جو تم آج تک میرے پاس نہیں لائے۔'

راجہ جیمل بولا: 'بادشاہ سلامت! وہ کون سی چار چیزیں ہیں جو میں نے آپ سے چھپا رکھی ہیں؟'

بادشاہ بولا: 'تیرے پاس ہستاں کا نقارہ ہے، شونا ہاتھی ہے، دریائی گھوڑا ہے اور چوتھی چیز تمہاری بیٹی کی ڈولی ہے۔ جو میرے محل کے لائق ہے۔ تم نے آج تک یہ چیزیں مجھے نذر نہیں کیں۔'

جس وقت بھرے دربار میں بادشاہ نے جیمل کی بیٹی کا نام لیا تو راجے کو گویا اس نے کوئی غلیظ گالی دے دی۔ اس کے تن بدن کو یوں آگ لگ گئی جیسے خشک تنکوں میں کوئی چنگاری پھینک دے۔ راجہ جیمل کے پاؤں کو لگا اور سر سے شعلہ نکلا۔ اس کے جامے کے بند ٹوٹنے لگے۔ اس کا بھائی اس وقت موجود نہ تھا اور ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا

(کیوں کہ دربار میں کوئی ہتھیار باندھ کر آنا شاہی آداب کے منافی تھا) اس نے شیر کی طرح گرج کر جواب دیا: 'تم مغل ہو، ہم راجپوت ہیں اور بائیس راجدھانیوں کے وارث ہیں۔ ہم گڑھ چتوڑ کے سورے تمہیں کیسے بیٹی کا رشتہ دے دیں؟ ہمارے گرو کی دعا سے تمہیں سات بادشاہیاں دی گئیں تو آج تم بھرے دربار میں میری بیٹی کی ڈولی مجھ سے مانگ رہے ہو؟ رشتے تو وہاں کیے جاتے ہیں جہاں مل بیٹھ کر کھا سکیں، ایک پیالے میں پی سکیں۔ تمہارا ہمارا زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہاں ہمارا خاندان، کہاں تمہارا کنبہ۔ کیا تم اپنے آپ کو نہیں جانتے:

بادشاہ نے اس کا جواب دیا:

بولے اکبر بادشاہ سنیئے جی ملّا
کیہنوں بیٹی دیویں گا کون میتھوں بھلا
تیرے توڑاں گڑھ چتوڑ نوں وچ پھیراں ہلا
لشکر میرے بہت نیں، گھوڑے گز گلا
ایتھوں باندھاں تیریاں بنھ کے کابل نوں گھلاں
مینوں بیٹی دا ڈولا لے مل جے چاہوں بھلا

ترجمہ:۔ اکبر بادشاہ بولا: 'میری بات غور سے سن۔ تم آخر کس سے اپنی بیٹی بیاہنا چاہتے ہو، کوئی مجھ سے بہتر تمہاری نظر میں ہے؟ میں تمہارے گڑھ چتوڑ کو توڑ کر ویران کر دوں گا۔ میرا بہت بڑا لشکر ہے اور کئی سوار ہیں۔ میں تمہارے سارے کنبے کو قیدی بنا کر کابل بھیج دوں گا۔ اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو سیدھے سیدھے مجھے اپنی بیٹی کا رشتہ دے دو۔'

راجہ جیمل نے تاؤ میں آکر بادشاہ سے کہا: 'ہم ہندو ہیں تم مسلمان ہو۔ میں تمہیں اپنی بیٹی دینے پر ہرگز رضامند نہیں ہوں، یہ کہہ کر وہ دربار سے چلا گیا۔ گھوڑے پر سوار گھر کو جا رہا تھا اور اس کا دل بہت اداس تھا۔ گھوڑا بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اور سوار نے باگیں ڈھیلی چھوڑ رکھی تھیں۔ اس حالت میں جب اپنے دیوان خانے پہنچا تو اس کے بھائی فتح جنگ نے دیکھ کر بھانپ لیا کہ آج ضرور دربار میں کوئی بات ہوئی ہے۔ جب بھائی سے وجہ پوچھی تو اس کے آنسو نکل آئے۔ فتح جنگ نے طعنہ دیا: 'سورے کی آنکھ سے آنسو نہیں بہتا۔ وہ تو للکار کر اور بدلہ لے کر اپنا جی ہلکا کر لیتا ہے۔ اور پھر تم تو راجپوت سورما ہو۔ سورما لوگ انہیں کہتے ہیں جن کے بول تول میں برکت ہو، جن کی دیگ تیغ میں فتح ہو۔ تمہاری بہادری کیا ہوئی؟'

راجہ جیمل نے بھائی کو یوں جواب دیا:

بولے راجہ جیملا، پھتے دا بھائی
ویرا اس دربار وچ پت رہی نہ کائی
کسے دوتی دشمن نے بھر کے چگلی کھائی

میتھوں گج پت ہاتھی منگیا، گھوڑا دریائی

بادشاہ اوہ سخن بولدا ، گل کہی نہ جائی

بیٹی دا ڈولا منگ لیا، دھی جیمل جائی

ترجمہ:۔ راجہ فتح جنگ کا بھائی راجہ جیمل بولا: 'اے بھائی آج شاہی دربار میں ہماری بے عزتی ہوگئی۔ کسی دشمن نے بادشاہ سے بھر کر چغلی کھائی اور بادشاہ نے مجھ سے گج پت ہاتھی اور دریائی گھوڑا مانگ لئے۔ پھر بادشاہ نے وہ بات کہی جو میں زبان پر بھی نہیں لاسکتا۔ اس نے مجھ سے میری بیٹی راجہ جیمل کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لیا۔'

یہ سن کر راجہ فتح جنگ جوش میں آ گیا اور افسوس کرنے لگا کہ اتنی ہتک ہونے پر بھی اسلحہ نہ ہونے کے باعث راجہ جیمل بادشاہ کا خون نہ کر سکا پھر راجہ فتح جنگ نے اپنے بھائی سے پوچھا: 'تم قسم کھا کے بتاؤ کہ تم نے ہاں تو نہیں کر دی۔'

راجہ جیمل بولا: 'میں نہ کر آیا ہوں۔'

اس کے بعد دونوں بھائیوں نے دوسرے دن دربار جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ دونوں سورے نہائے۔ پوشاکیں پہنیں۔ گھوڑوں پر زینیں کسوائیں۔ سچے موتیوں والی نوٹنکی کمانیں لیں، عقاب کے پروں والے تیر لئے، جڑاؤ دودھاری تلواریں کمر سے باندھیں اور کٹاریاں لگا کر وہ سوار ہونے والے تھے کہ گھر کا برہمن آ گیا۔ راجہ جیمل نے اس سے شگون پوچھا تو برہمن نے جواب دیا:۔

بہمن جیمل دا بولدا، سچیاں دیوے سنا

کانچھی کرت دے پترے، مینوں گئے ہتھ آ

ایس پتری وچ ہارا ے کچھ دن نیوں کے لنگھا

تسی گڑھ میرٹے دے سورے اوہ وچ دلی بادشاہ

تسی دونوں کلے بھائی جے اوہدیاں فوجاں بے بہا

تہاڈیاں لے جاؤ باندھاں بنھ کے جے فوجاں گییاں چڑھا

ترجمہ:۔ راجہ جیمل کے برہمن نے سچی سچی باتیں سنا دیں۔ اس نے کہا: 'خوش قسمتی سے میرے ہاتھ یہ بے مثل نجوم کی کتاب آ گئی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت آپ کی قسمت میں شکست ہے۔ بہتر ہے کہ آپ کچھ دن سر چھپائے رکھیں۔ آپ گڑھ چتوڑ کے سورے ہیں اور وہ دلی کا بادشاہ ہے آپ اکیلے دو بھائی ہیں اور اس کی بے شمار فوجیں ہیں۔ وہ اگر اپنی فوجوں سے حملہ کرے گا تو آپ کو قیدی بنا کر لے جائے گا۔

برہمن کی بات کا دونوں بھائیوں پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے اپنی جان گنوانے کو تیار تھے۔ چنانچہ وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ آگے سے انہیں اپنی ماں آتی ہوئی دکھائی دی تو دونوں اتر کر اس کے قدموں میں گر گئے۔ اور اس سے دودھ بخشوانے کی التجا کی۔ ماں نے جب وجہ پوچھی تو جیمل نے دربار کی ساری

بات بتا کر اس سے پوچھا، تمہاری کیا مرضی ہے؟ اپنی پوتی کے بارے میں ایسی بات سن کر اس نے غصے سے کہا: اگر تم نے میرا دودھ پیا ہے تو ڈولی ہرگز نہ دینا۔ جاؤ اور ٹکرا جاؤ۔ چنانچہ دونوں سورے دلی جہان آباد کی طرف گھوڑے دوڑاتے گئے۔ راستے میں ایک جگہ بیرم خان دوتی اور حسن خان پٹھان بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر دونوں سورے ان پر پل پڑے اور وار کے مطابق:

موذی مار مکا دتے کیتے دو پھاڑے
جیمل پھتا راجپوت ، غیرت دے لاڑے

یعنی غیرت کے دولہا جیمل اور فتح جنگ راجپوتوں نے ان موذیوں کے دو ٹکڑے کر کے انہیں مار کے ختم کر دیا۔

جب دونوں بھائی دربار کے قریب پہنچے تو بادشاہ انہیں آتا دیکھ کر ہنسا اور دانشمند درباریوں نے سر پھیر لیا۔ بادشاہ نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جان کی امان پانے کے بعد بتایا کہ یہ گڑھ چتوڑ کے سورے ہیں۔ راجہ اودے دیپ کے بیٹے، یہ دربار میں داخل ہو کر مصیبت ڈال دیں گے۔ مغلوں کا خون پی جائیں گے۔ آپ یوں کریں کہ شہر کے بارہ دروازے بند کروا دیں اور ایک کھڑکی کھلی رہنے دیں۔ وہاں سے آ کر انہیں گھوڑے سے اترنا پڑے گا، گھوڑے سے اتر کر سوار کا ویسے ہی دماغ جگہ پر آ جاتا ہے اور پھر کھڑکی کی وجہ سے انہیں جھکنا بھی پڑے گا۔ یوں دربار کو سلام بھی ہو جائے گا۔ بادشاہ کے حکم پر سب دروازے بند کر دیئے گئے۔ جب دونوں سورے کھڑکی کے قریب پہنچے تو انہوں نے کھڑکی کے اوپر ہاتھ رکھ کر کبوتر کی طرح الٹی بازی لگائی اور پہلے پاؤں اور پھر دھڑ اندر کر کے دربار میں جا کھڑے ہوئے۔ دونوں کی آنکھیں مشعلوں کی طرح جل رہی تھیں اور چہرے شیروں کے رنگ کے ہو رہے تھے۔ سارا دربار گم سم ہو گیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ دونوں جوانوں کا رُخ شاہی تخت کی طرف ہے تو اس کا کلیجہ کانپ گیا۔ تخت کے پیچھے ثمن برج بنا ہوا تھا، جلدی سے اس کی سیڑھیاں چڑھ کے حرم کی طرف چلا گیا۔ اوپر جا کر اس نے ایک دریچہ کھولا اور اس کے پیچھے سے بولا:

ٹوڈرمل تے مان سنگھ ایہناں نوں منع نہیں کردے
میتھوڈردا کاشمیر، پہاڑ وی ڈردے
میں ماریا پُت فریدا، دُلا بار وچوں پھڑ کے
میں بنھ لیاندے جودھ ویر کراس سے ٹیکے
میں ماریا میر داد تلواریں لڑ کے
ایہہ دھمکی دیندے آ کے گھوڑے تے چھڑ کے
تنیوں جانوں ادے جیملا جے گڑھ رکھیں لڑ کے

ترجمہ: 'اے ٹوڈرمل! اے مان سنگھ! تم انہیں منع کیوں نہیں کرتے۔ مجھ سے سارا کشمیر ڈرتا ہے۔ مجھ سے تو پہاڑ بھی ڈرتے ہیں۔ میں نے بارے پکڑ کر فرید خان کا بیٹا ڈالا بھٹی مار دیا تھا۔ میں نے جودھ ویر کو گرفتار کیا تھا۔ میں نے تلوار سے لڑ کر میر داد کو مارا تھا۔ یہ مجھے گھوڑے پر چڑھ کر دھمکی دینے آئے ہیں۔؟ اے جیمل میں بھی تب تجھے مانوں جو تو لڑائی کرکے گڑھ چتوڑ کا قلعہ بچائے۔'

بادشاہ نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ راجہ فتح جنگ نے کمان کھینچ کر ایک تیر مارا۔ اسی طرح راجہ جیمل نے بھی اپنی کمان سے ایک تیر چھوڑا لیکن بادشاہ نے جھرو کہ بند کرلیا اور دونوں کے وار خالی گئے۔ اس کے بعد دونوں بھائی دربار سے نکل کر موتی بازار گئے اور سارا بازار لوٹ لیا۔ انہوں نے سیٹھوں کے سر قلم کئے اور غریبوں میں ان کی دولت تقسیم کی۔ اس کے بعد وہ گڑھ چتوڑ چلے گئے اور اپنے ساتھیوں کو بلا کر دیوان خانے میں جا بیٹھے۔

ادھر بادشاہ نے جب پھر دربار لگایا تو اس نے جیمل اور اس کے بھائی کو زیر کرنے کے بارے میں مشورہ طلب کیا ایک اکہتر سالہ بزرگ نے کہا: 'میں آپ کو ایک ایسا تعویذ دیتا ہوں جس سے کنوئیں کا پانی خون میں تبدیل ہو جائے گا اور اس میں کیڑے چلنے لگیں گے۔ اس سے دشمن کے آٹے اور کھانے میں لہو کا رنگ اور اس کی بُو آجائے گی۔' چنانچہ یہ بات مان کر اکبر بادشاہ نے اپنے ایک درباری ابوخان پٹھان کے ذریعے گڑھ چتوڑ کے کنوئیں میں تعویز ڈالوادیا۔ چنانچہ نلوں میں، گھڑوں میں، ہانڈیوں میں اور دودھ کے برتنوں میں لہو پھیل گیا۔ کیڑے آٹے کے ڈھیروں میں چلنے لگے۔ یہ سلسلہ آٹھ دن تک جاری رہا اور بہت سے بچے بھوک سے مر گئے۔ بڑے فاقوں کے باعث نڈھال ہو گئے۔ آٹھ دن بعد مغل فوجوں نے گڑھ چتوڑ پر چڑھائی کردی۔

چڑھ پیا اکبر بادشاہ ہاتھیاں نوں مدھاں پیائیاں

بھر کے نشے دیاں بوتلاں ہاتھیاں دے سنڈاں وچ دھائیاں

فوجاں اُتھوں چل کے گڑھ چتوڑ دے نیڑے آئیاں

ہاتھیاں تاک بھنے سنے سردلاں ہٹ ہٹ ٹکراں لائیاں

رانیاں اگڑ پچھڑ بنھ لیاں، راہ دلی دے پائیاں

فتح چند جیمل دیاں بنھ لیاں مشکاں بنھ ہاتھیاں تے پائیاں

بھوں کے دِلی جہاں آباد لے گئے اوتھے جا کے باندھاں پائیاں

رہندے کھوندے سارے ماردتے رانیاں مار مُکائیاں

جیمل تے پھتا ماردتے جواناں دیاں چھاتیاں وچ گولیاں لائیاں

اکبر بادشاہ نے باندھاں لے آندیاں، اللہ پاک دیاں بے پرواہیاں

ترجمہ: اکبر بادشاہ نے چڑھائی کردی۔ فوج کے ہاتھیوں کی سونڈوں میں نشے کی بوتلیں انڈیل کر انہیں مست کر

دیا گیا۔فوجیں چل کے گڑھ چتوڑ کے قریب آئیں تو ہاتھیوں نے ٹکریں مار مار کے دہلیزوں سمیت طاق توڑ دیئے۔ رانیوں کو آگے پیچھے باندھ کر دِلی کی طرف لے جایا گیا۔فتح جنگ اور جیمل کی مشکیں کس کے انہیں ہاتھی کے اوپر باندھ دیا گیا۔سب کو واپس جہاں آباد دِلی لے جایا گیا اور وہاں قیدی بنالیا گیا۔جو بچے کھچے تھے انہیں مار دیا گیا اور رانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔جیمل اور فتح دونوں جوانوں کی چھاتیوں سے گولیاں پار کر کے انہیں مار دیا گیا۔اکبر بادشاہ سب کو قیدی بنا کے لے آیا۔خدا کی ذات بڑی بے پروا ہے۔(8)

ساندل، فرید، دُلاّ۔ ایک کسان لوک بیانیہ:

غلام محمد رُلیا نے دُلا بھٹی کی مغلوں کے خلاف بغاوت کو لوک روایات کی بنیاد پر استوار کیا لیکن رُلیا کی بیان کردہ کہانی سے قبل دُلے کے پُرکھوں اور ساندل بار کے جنگل کا بیان ضروری ہے۔ان لوک روایات کو احمد غزالی نے اپنی بے مثل تحقیقی کتاب ''ساندل بار'' کا حصہ بنایا ہے۔روایت کے مطابق بجلی خان دلاّ بھٹی کا دادا تھا۔لوگوں میں ساندل کے نام سے مشہور تھا۔پنڈی بھٹیاں سے لے کر دلے والا تک کے میدانی سلسلے چونکہ اس کے زیرِ نگیں تھے۔اس لئے ''ساندل دی بار'' یا ساندل بار کا نام اس علاقے کی پہچان بن گیا۔لوک ادب میں نثری روایت کی نسبت شعری روایت کو زیادہ معتبر گردانا گیا ہے۔دلا بھٹی کا دادا ہی ساندل تھا۔اس بات کا رشتہ ''واروں'' سے جوڑا گیا۔سجاد حیدر (دراصل راقم الحروف) اس ضمن میں چند منتخب ''واروں'' کو نقل کرتے ہیں۔ان واروں کے ذریعے دُلے کی ماں اپنے جیالے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اپنا خواب بیان کرتی ہے، تاکہ وہ آنے والے خطرات سے آگاہ ہو کر حفاظتی تدابیر اختیار کرے۔اس ''وار'' میں ماں کی بے چین مامتا کی جھلک اور مستقبل کے بارے میں اس کے خدشات سموئے ہوئے ہیں:۔

تیرا ساندل دادا ماریا دتا بھورے وچ پا
مغلاں پٹھیاں کھلاں لاہ کے بھریاں نال ہوا
جے توں بیدر جپوت دی، سیوں کے گھڑی لنگھا
جمنا نے مر جاونا، مرداں دے بول دہن سر جا

ترجمہ: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مغلوں نے تمہارے دادا ساندل کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو تہہ خانے میں پھینک دیا ہے۔مغلوں نے تمہارے (متعلقین) کی کھالیں الٹی کھینچ کر اتروالیں اور اوران میں ہوا بھر دی۔تم اگر راجپوت کے بیٹے ہو تو سنبھل کر زندگی گذارو۔یوں تو سبھی زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں مگر مرد وہ ہے جس کا سر بے شک اڑا دیا جائے مگر اس کے قول اور باتیں ایسی ہوں جو ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں۔

بجلی خان عرف ساندل اور اس کے بیٹے فرید (یعنی دلا بھٹی کے والد) کو دہلی دروازہ لاہور کے باہر سرِ عام بغاوت کے الزام میں مغلوں نے پھانسی دے دی تھی۔ساندل کی یہ روایت پنجاب میں زیادہ مقبول ہے۔(9)

غلام محمد زلیا کی وار ''دُلّا بھٹی'' مذکورہ روایت کی تصدیق کرتی ہے جب کہ ایک اور روایت کے مطابق:

''مغلوں کے ابتدائی دور تک تو بار کے اس علاقے میں حالات پرسکون رہے لیکن سولہویں صدی کے وسط تک تخت دہلی کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے تمام برصغیر انتشار اور چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا جو کہ ریاستوں کے باہمی نفاق کی وجہ سے مغل حملہ آوروں کی یلغار کا باعث بنا۔ ان مغل افواج کا گزر پنڈی بھٹیاں اور اس کے نزدیکی علاقوں (ساندل بار) سے ہوتا تھا۔ اس زمانے کی زراعت بھی زوروں پر نہیں تھی جبکہ لوگ اپنی ضرورت کے مطابق اناج پیدا کرتے تھے اور سرسبز چراگاہوں کی وجہ سے مغل حملہ آور فصلوں اور چراگاہوں کو اجاڑ دیتے تھے اور آبادیوں میں لوٹ مار مچاتے اور گھوڑوں جانوروں کے لئے تمام اناج علاقے سے اکٹھا کر کے لے جاتے تھے، مداخلت کرنے والوں کا قتل عام کیا جاتا اور آبادیوں کو آگ لگا دی جاتی۔ یہ ایک نقطہ تھا جہاں سے مغلوں اور یہاں کے بھٹیوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ بجلی خان المعروف ساندل نے علاقائی خودمختاری اور تحفظ کے لئے اردگرد کے قبائلی سرداروں کو ساتھ ملا کر ایک چھوٹی سی فوج منظم کر کے مغل افواج پر چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ یوں بجلی خان عرف ساندل اور اس کے بیٹے فرید خان بھٹی کی بہادری اور شجاعت کا ڈنکا پورے علاقے میں بجنے لگا۔ چنانچہ آس پاس کے راجے اور سردار اس کی ماتحتی میں آنے لگے۔ پانی پت کی دوسری لڑائی سے پہلے مغل انتہائی افراتفری کا شکار اور کمزور پوزیشن اور مایوسی کی حالت میں تھے۔ بابر کو صرف 4 سال تخت نصیب ہوا۔ ہمایوں کو پندرہ سالہ جلاوطنی کے بعد صرف چھ ماہ تخت دہلی نصیب ہوا۔ ہمایوں کی چھ ماہ بادشاہت کے دوران اکبر بیرم خان کی نگرانی میں 23 جولائی 1555ء تا 13 فروری 1556ء مشرقی پنجاب کا گورنر رہا۔ اکبر نے پنجاب کی گورنری کے دوران انتہائی بہادر اور تجربہ کار جرنیلوں کی سرکردگی میں اپنی فوج مہم مغربی پنجاب ساندل بار کی طرف اکتوبر میں روانہ کی۔ مغلوں اور بھٹیوں اور ان کے حلیفوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ مغلوں کو فتح ہوئی اور قلعہ فرید (موجودہ جگہ قلعہ چاہ) پنڈی بھٹیاں کو تباہ کر دیا گیا۔ زخمی ساندل اور اس کے بیٹے فرید خان بھٹی کو شاہی قلعہ لاہور میں پیش کیا گیا مگر مغل فوج کو اناج کی فراہمی، خراج کی ادائیگی اور اطاعت قبول کرنے سے دونوں باپ بیٹوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان کو باغی قرار دے کر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اس پر بس نہیں ہوئی بلکہ مغلوں نے ساندل اور فرید بھٹی کی لاشوں میں بھس بھروا کر اس کی سرعام نمائش کی تاکہ حکومت کے خلاف سر اٹھانے والوں دوسروں کے لئے درس عبرت بنا دیا جائے۔(10)

مغل اعظم کے خلاف دُلّا بھٹی کے معرکے:

مغل شہنشاہت کے خلاف بغاوت کے جس ورثے کو لے کر دلا بھٹی پیدا ہوا۔ اس نے بغاوت اور نابری کے سلسلے کو امر کر دیا۔

''راجپوت کا سپوت، فرید خان بھٹی کا بیٹا، ماں لدھی کا لاڈلا اور ساندل خان کا پوتا اپنے دیوان خانے

میں بیٹھا ہے جب سے پیدا ہوا ہے گھونسے مار مار کے لوگوں کی گردنیں توڑ ڈالی ہیں۔اس کی اجازت کے بغیر کوئی چراہ گاہ میں مویشی نہیں چرا سکتا۔ بارہ گاؤں کا لگان بادشاہ پر بند کر دیا ہے جب سے جوان ہوا ہے سارے علاقے میں اس کی دھوم ہے۔اس وقت اپنے یاروں میں بیٹھا شراب پی رہا ہے۔داؤد خان ڈوگر، جمال خان، کمال خان، سُر مچو چوہڑا، کلا برولا، شلا مراثی، دولا کولا، پرتھا جٹ اور کھانباوزیر سب جوان بیٹھے تھے اتنے میں دُلے کی ماں آجاتی ہے اور دیوان خانے کے دروازے کی اوٹ سے اسے بلاتی ہے۔ دُلا ماں کو دیکھ کر کہتا ہے:' کیا لینے آئی ہو ماں؟ یہ مردوں کی محفل ہے یہاں تمہارا کیا کام؟' ماں کہتی ہے' بیٹا خفا نہ ہو، میں ایک پیغام دینے آئی ہوں'۔دُلا پوچھتا ہے' کیا پیغام ہے'۔ ماں کہتی ہے' تو میرا ایک ہی ایک سورما بیٹا ہے۔ باہر کو جاتے ہو تو تمہاری پشت دیکھتی ہوں گھر میں ہوتے ہو تو تمہارا مکھڑا دیکھتی ہوں۔تمہارے گھرانے کے چار بزرگ تھے۔ان چاروں کو مغلوں نے اُلٹی کھال اتروا کر اس میں بھس بھر دیا پھر انہیں میخوں سے لٹکا کر ہر روز تیروں سے انہیں چھلنی کرتے اور نشانہ بازی کی مشق کرتے۔ ان کی اتنی بے عزتی ہوئی ہے اور تم یوں اُلٹی چھلانگیں لگا رہے ہو' دُلے نے کہا' بس اتنی ہی بات تھی؟' ماں نے کہا' نہیں: میں نے آج فجر کو جو خواب دیکھا ہے وہ بھی تمہیں سنانا ہے' پھر اس نے بتایا:

ترجمہ: اے میرے بیٹے! میں بڑی عاجزی سے سچی سچی باتیں تمہیں بتاتی ہوں۔کل رات مجھے بڑا بُرا خواب آیا۔اس میں دیکھا کہ تمہارے محل کا ستون درمیان سے ٹوٹ گیا اور سارا محل دھم سے زمین پر آگرا۔تیرے چوبارے کا چھجا جہاں تم چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے گر گیا۔تمہارا بھورے رنگ کا، سفید دم والا بچھڑا مغلوں نے میدان میں لے جا کر ذبح کر دیا۔انہوں نے بھون بھون کر اس کی بوٹیاں کھائیں اور سیخوں پر اس کے کباب بنائے ۔انہوں نے تمہارے داداساندل خان کو مار کر اُس کی لاش تہہ خانے میں پھینک دی۔مغلوں نے (تمہارے بزرگوں کی) الٹی کھالیں اتروا کر ان میں ہوا بھر دی۔تم اگر راجپوت کے تخم میں سے ہو تو سنبھل کر اپنا وقت گزارو۔ سبھی پیدا ہوتے ہیں اور سبھی مر جاتے ہیں لیکن جن مردوں کے سر اڑا دیئے جاتے ہیں ان کے بول کبھی نہیں بھولتے۔

یہ سن کر دُلے نے ماں سے کہا۔'' ماں جب میں تیرے شکم میں تھا تم کیا کھایا کرتی تھی''۔ماں نے کہا،'' تمہارا دادا بھی تمہاری طرح ڈالیاں لوٹا کرتا تھا۔ میں وہ ساری نعمتیں کھایا کرتی تھی۔'' دُلے نے پھر پوچھا ۔'' ماں جب میں پیدا ہوا تو مجھے گھٹی کس چیز کی دی گئی تھی۔؟'' ماں نے بتایا'' تمہیں افیم گھول کر پلائی گئی تھی۔اور پھر سان چڑھی تلوار دھو کے اس کا پانی تمہارے منہ کو لگایا گیا تھا۔'' پھر اس نے پوچھا'' اور میرا نام دُلا بھی تم نے رکھا تھا؟'' ماں نے کہا'' ہاں''۔اس پر دُلا بولا۔'' تو پھر اس پر بھی تم مجھے نصیحتیں کر رہی ہو کہ میں اندر چھپ کر دن پورے کر دوں۔اگر تو چاہتی تھی کہ میں اندر گھس کر بیٹھا رہوں تو تمہیں چاہئے تھا کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے تم باتھو، سینٹری، بگھاٹ، سونچل اور تاندلا ساگ بھاجی بنا کے کھاتی، چولہے کی مٹی چباتی یا دیواریں کھرچ کر کوئلے نکال کر کھاتیں۔پھر میرا نام بھی نتھو یا گھسیٹا رکھنا چاہئے تھا۔تب میں ہر وقت تمہارے گھٹنے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا۔اب اس طرح پال کر جب موت

کی ساری نشانیاں تم نے خود پوری کی ہیں تو میں اندر کیسے بیٹھا رہوں''۔ پھر وہ مونچھ کو تاؤ دے کر تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر شیر کی طرح چنگھاڑا۔

ترجمہ: ''مجھے تو کوئی ایسا سورما نظر نہیں آتا جو دُلّے کا سامنا کر سکے۔ میں مغلوں کی بستیوں کو ویران کر دوں گا۔ میں ان کے قلعوں میں ابتری پھیلا دوں گا۔ میں سفید رنگ کے شیر کو مار کر اس کی کھال اپنے قدموں کے نیچے پھینک دوں گا۔ میں جدھر چاہوں گھوڑا پھیر کر لے جاؤں۔ دنیا میں میرا نام رہ جائے گا۔ اس کمینے بادشاہ میں بھلا یہ ہمت کہاں ہے کہ وہ چل کر دُلّے کے سامنے آئے''۔ لدھی نے پھر سمجھایا ''بیٹا: اتنا غرور نہ کرو۔ تم سے بڑے اس جہاں میں نہ رہے آخر موت نے انہیں مار دیا۔ میری آنکھوں کے اجالے اس فانی جسم پر غرور نہ کر۔ اپنے رب کو نہ بھلا۔ اپنی جوانی اور ان پیالوں کے یاروں پر اتنا مان نہ کر۔''

اپنی ماں کی نصیحت کے جواب میں بھی دُلّے نے یہی جواب دیا جیسے وار میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ: دلّا ماں کو طنز کر کے یوں مخاطب کرتا ہے۔ میرا نام تمہیں دلا نہیں کچھ اور رکھنا چاہئے تھا۔ میں تو بھٹی ہوں جو چاروں گاؤں شکر طرح ہاتھ میں مسل کر کھا جاتا ہے۔ میں اکبر کی ڈالیاں لوٹ لے جاؤں تو تب تم جانو گی کہ میں راٹھور راجپوت ہوں، میں کالی گھوڑی بکی پر سوار ہوں جو گرم رفتار سے سُم اٹھاتی ہے میں سفید رنگ کے شیر کا بیٹا ہوں اور میرے اطوار بھی شیر جیسے ہیں۔

جب ماں لدھی گھر کو چلی گئی۔ تو ایک مخبر نے دُلّے کو آ کے بتایا کہ تمہاری پنڈی میں بارہ ہزار کی ڈالی اتری ہے جو کوئی امیر بادشاہ کو پیش کرنے کے لئے لاہور لے جا رہا ہے۔ دُلّے نے اسی وقت بکی پر زین کسی اور مغلوں کے خیموں میں جا پہنچا۔ درباری امیر بگال ملکیرا کا سر تلوار سے اڑا دیا اور ڈالی لوٹ کر لے آیا۔ واپس آ کر اس نے امیر کا سر رومال میں لپیٹ کر میدھے کھتری کو دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ لاہور جا کر اس کی طرف سے یہ تحفہ بادشاہ کو پہنچا دے۔

جب میدھا کھتری مغل دربار میں پہنچا تو دربار میں امیر، وزیر، بہادر، اہلکار حضوری میں حاضر تھے۔ اجازت لے کر جب سیدھا تخت کے قریب گیا تو رومال کا پلو اُٹھا دیا اور بادشاہ کو مغل کا سر دکھایا۔ آم کی قاشوں کی طرح آنکھیں، مٹکے جتنا سر اور بیل گاڑی کے پہیے کے درمیانی چکر جتنی گردن بادشاہ کا یہ دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے تو سانس رُک گیا۔ اس نے میدھے سے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا؟ میدھے نے کہا پنڈی میں ایک جوان ہے۔ جو فرید کا بیٹا اور ساندل کا پوتا ہے۔ وہ لُوٹ کر زمانہ کھا گیا ہے کشمیر سے بگا ملکیرا آپ کے لئے بارہ ہزار کی ڈالی لا رہا تھا کہ اس نے لوٹ لی اور یہ بگے ملکیرے کا سر آپ کے لئے نشانی بھیجا ہے۔

یہ سُن کر پہلے تو بادشاہ چپ ہو گیا۔ پھر اس نے ایک تلوار اور ایک پان کا بیڑا درمیان میں رکھوایا اور کہا جو کوئی دُلے کو گرفتار کر کے میرے پاس لائے گا۔ میں اسے 36 ہزار کا منصب دار بناؤں گا۔ اس دوران مرزا نظام

دین گڑھ گندھالے کا قلعہ فتح کر کے شاہی اعزاز حاصل کرنے دربار میں داخل ہوا اور آتے ہی بادشاہ سے عرض کی بادشاہ سلامت اگر حکم ہو تو میں دُلّے کو گرفتار کر کے لاؤں۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور اجازت دے دی۔ چنانچہ مرزا نظام دین اس مہم پر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ بارہ ہزار فوجی، پانچ دور مار توپیں، بارود، سکّے کے میگزین اور تیروں کے بھتے تھے۔ یہ کیفیت وار میں یوں بیان ہوئی ہے۔

ترجمہ: جب مرزا نظام دین فوج لے کر چڑھا تو علاقے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ مہاوتوں نے ہاتھیوں کو تازہ سندور لگایا۔ ٹھیکری والا گاؤں سے جب پتن پار کیا تو سب کو فوج کے آنے کی خبر ہو گئی۔ مغل سرداروں نے علاقے میں پہنچ کر ہل چلانے والوں اور چرواہوں سے پوچھنا شروع کیا کہ دُلّا یہاں سے قریب ہے یا دور۔ جو دُلّے کے دوست تھے انہوں نے بتایا وہ تو بہت دور ہے مغل اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے کہ ہم ضرور پنڈی پہنچ کر دُلّے کے مکانات ڈھا کر انہیں چکنا چور کریں گے۔

ادھر تو بارہ ہزار کا لشکر دُلّے کو گرفتار کرنے کے لئے چڑھا آ رہا ہے۔ ادھر دُلّا دوستوں میں محفل جمائے بیٹھا ہے کہ قریب سے اس کے خاندان کا برہمن بغل میں پتری دبائے گزرتا ہے۔ دُلّے نے روک کر پوچھا تمہاری یہ پتری کیا بتاتی ہے۔؟ برہمن نے کہا اس میں بارہ سال پہلے کے حالات اور بارہ سال بعد کے ہونے والے واقعات کا پتہ ملتا ہے۔ دُلّے نے کہا مجھے پتری کھول کر دکھاؤ۔ آنے والی جنگ میں بادشاہ کو ہار ہے یا مجھے۔ برہمن نے دُلّے کے اس سوال کا جواب یوں دیا۔

ترجمہ: پربھا برہمن ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہے کہ میں سچی بات کہوں گا کیونکہ نجوم کی یہ نایاب کتاب میرے ہاتھ لگ گئی ہے اگر یہ پتری جھوٹ بتائے تو اسے آپ آگ میں جلا دیں یا پانی میں غرق کر دیں۔ بادشاہ کی فوجیں یہاں آ کر حملہ کریں گی۔ پہلے آٹھ دن آپ کی قسمت میں ہار لکھی ہے اس لئے آپ راوی کے بیلے میں ڈیرہ لگائیں۔ جب نویں دن آپ آ کے لڑیں گے تو خدا آپ کو فتح دے گا۔

یہ سُن کر دُلّے نے سوچا، میری ماں کو بھی بُرے بُرے خواب آ رہے ہیں اور یہ برہمن بھی بتا رہا ہے کہ مجھے پہلے آٹھ دن ہار ہے۔ یہ دونوں سیانے ہیں۔ ان کی بات مان لینی چاہئے۔ چل کے جھل کا کڑے (بیلے) میں شکار کھیلتے ہیں وہاں ماموں رحمت سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ اپنے یاروں کو ساتھ لے کر دُلّا اپنے ننہال چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مرزا نظام دین کی فوج پنڈی میں چڑھ آئی اور بستی کے گرد انہوں نے اپنے خیمے گاڑ دیئے۔ لدھی نے جب اپنے چوبارے سے خیمے لگے ہوئے دیکھے اور طبل بجتا ہوا سنا تو اس نے اپنی بہو پھُلراں کو بلا کر کہا۔ دیکھو بیٹی پھُلراں ان خیموں میں کتنا سامان بکھرا پڑا ہے۔ آج اگر میرا بیٹا یہاں ہوتا تو بادشاہ کی یہ ڈالی بھی لُوٹ لیتا۔ پھُلراں نے کہا ماں یہ ڈالی نہیں۔ یہ تو بادشاہ کی فوج ہے اب جا کے اپنے راٹھ بیٹے کو جگا کہیں سویا ہو گا۔ اسے جا کے بتا کہ جوان اس پر حملہ کرنے آ گئے ہیں۔ یہ سُن کر لدھی رونے لگی۔ دُلّا تو کہیں نہ ملا البتہ اس نے اپنے پوتے نور خان

کو آوازیں دے کر جگانے کی کوشش کی۔ نور خان، جس کی شادی کو ابھی دو دن ہوئے تھے۔ اندر سے کنڈی لگا کر کوٹھے میں سویا ہوا تھا۔ جب پھلراں نے جا کر اس کا دروازہ پیٹا اور واویلا مچایا تو وہ اُٹھ کر باہر آیا۔ پھلراں نے اسے بتایا کہ اُس کے باپ نے بارہ ہزار کی ڈالی لوٹ کر ایک درباری امیر کا سر کاٹا تھا اور یہ سر نشانی کے طور پر بادشاہ کو بھیجا تھا اب وہ تو اپنے ماموں رحمت کے پاس جا بیٹھا ہے اور شاہی فوج ہمارے دروازے تک آ پہنچی ہے۔ تم بھی اپنے باپ کے بیٹے ہو۔ اٹھارہ برس کے نو جوان ہو ایک ہلہ تو بولو اتنے میں تمہارے باپ کو بھی خبر کر دی جائے گی۔ نور خان نے صاف جواب دے دیا ''میں نہیں جاؤں گا'' اور پھر سو گیا۔

پھلراں نے سوچا مہرو پوستی سے مدد طلب کروں۔ اس کے بغیر مغلوں پر کوئی ہلہ نہیں بول سکتا۔ چنانچہ لدھی اسے بلانے گئی۔ لدھی کی آواز سن کر مہرو کی ترنگ ٹوٹ گئی۔ بولا ''لدھی آج بڑے پیار سے مجھے آواز دے رہی ہو۔ ماجرا کیا ہے؟'' لدھی نے کہا ''بیٹا بڑی مصیبت بنی ہے۔ آخر تم بھی راجپوت ہو اور میرے بیٹے ہی ہو۔ ایک ہلہ تو کرو۔'' مہرو نے بڑی بے رخی سے جواب دیا۔ ''تم لوگ جب ڈالیاں لوٹ کر لاتے تھے تو مجھے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔ آج مہرو بیٹا بن گیا ہے۔ میں تو جا کر مغلوں سے کہتا ہوں کہ چاہے ساری پنڈی ڈھا دیں۔ صرف میرا دیوان خانہ چھوڑ دیں۔'' یہ سن کر لدھی چھم چھم رونے لگی اور اپنی بہوؤں بیٹیوں کی عزت پر داغ لگنے کا ذکر کیا۔ یہ بات مہرو کو کھا گئی اور وہ بہوؤں، بیٹیوں کی عزت بچانے کے لئے لڑنے کے لئے آمادہ ہو گیا لیکن اس نے لدھی کو کہا کہ پہلے نشہ پورا کر لینے دے۔ چنانچہ لدھی نے خود اسے نشہ کرایا اور حقے پر آگ دھر کر لائی۔ مہرو نے جب آٹھ دس کش لئے تو وہ اٹھا اور اصطبل سے اپنا گھوڑا کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔ عقاب کے پروں والے سوا سوا پاؤ بھاری تیروں والا بھتہ لیا۔ ان تیروں کے منہ پر زہر کی پٹھ چڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں سچے موتیوں والی نوٹنکی تلوار پکڑی اور سنہری قبضے والا دو دھاری کھنڈا کمر میں باندھا پھر اپنے نفر سے کہا کہ مجھے رسے سے گھوڑے کے ساتھ باندھ دو۔ گھوڑے کا منہ مغلوں کے خیمے کی طرف کر دو۔ یوں مہر و ہلہ بولنے گیا۔

ترجمہ: مہرو پوستی کندھے پر بندوق رکھ کر حملہ آور ہوا۔ مہر و مغلوں پر پل پڑا۔ مہر و تلوار کا دھنی ثابت ہوا۔ اس نے بیکانیر کا صوبیدار مار دیا اور اس کی لاش روندی گئی۔ کچھ مغل فوجی مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے۔ مہر و ستر جوانوں کو مار کر شیر کا روپ دھار گیا۔ (وہ بولا) مجھے نشہ ٹوٹنے کے باعث واپس جانا پڑے گا۔ ورنہ میرا ہاتھ تلوار کے خوب جوہر دکھا رہا تھا۔ وہ دُلا تو گیدی نکلا میں ہی سچا راجپوت نکلا ہوں۔

مغلوں کی سمجھ میں یہ اسرار نہ آیا کہ دُلا اور اس کے ساتھی اگر پنڈی میں موجود نہیں ہیں تو یہ کیا آفت تھی جو ایک ہی ہلے میں ستر جوان اور ایک صوبیدار کو موت کے گھاٹ اتار گئی۔ جب دُلے کے دشمنوں نے انہیں یقین دلایا کہ پنڈی میں واقعی کوئی دُلے کا ساتھی موجود نہیں تو وہ اطمینان سے اپنے خیموں میں واپس آ گئے۔ لیکن انہوں نے گاؤں کا گھیرا تنگ کر دیا۔ لدھی پھر ایک بار مہرو کے پاس گئی اور اس سے ایک اور ہلہ بولنے کو کہا۔ مہرو نے پھر اپنا نشہ

پورا کیا اور لدھی سے کہا کہ وہ کہیں سے کوئی سانڈھ یا خچر لائے۔ جس پر وہ سوار ہو کر وہ جنگ کرنے جائے گا۔ جب لدھی نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا تو اس نے ایسا گھوڑا منتخب کیا جو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ساون بھادوں کا دریا چڑھا ہوا ہے اور سُم ایسے تھے جیسے چکی کے پُڑ ہوں۔ چنانچہ اس پر سوار ہو کر اور پانچ ہتھیار سجا کر مہرو دوسری بار مغلوں کی فوج پر حملہ بولنے گیا۔ اس بار بھی اُس نے کئی جوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور کئیوں نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ اس کے بعد مہرو نے پھر میدان جنگ میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ مرزا نظام دین نے جب اپنی فوج اکٹھی کر کے گنتی کی تو اس میں سے ایک سو ساٹھ جوان اور ایک صوبیدار کم نکلے چنانچہ مرزا نظام دین نے پنڈی پر دھاوا بول دیا۔

ترجمہ: مرزا نظام دین حملہ آور ہوا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہاتھیوں کے سونڈوں میں بھر بھر کے نشے کی بوتلیں انڈیلی جائیں۔ جب پُروا چلی تو ہاتھی مست ہو گئے اور انہوں نے ایسی ہٹ ہٹ کر ٹکریں ماریں کہ طاق دہلیزوں سمیت ٹوٹ پھوٹ گئے۔ ٹکے ٹکے کے سپاہی نے بھی من مرضی کی اور مغلوں نے آتش زنی کے ساتھ رانیوں پر ایسے کوڑے برسائے کہ وہ کونجوں کی طرح کرلانے لگیں۔ نندوں اور بھاوجوں کو انہوں نے آگے پیچھے باندھ لیا اس طرح مشکیں کس کے وہ انہیں لاہور لے چلے جو کارستانیاں بھٹی نے کی تھیں ان کا خمیازہ لدھی کو بھگتنا پڑا۔ لدھی نے بہت واویلا کیا اور پنڈی کے سردار کو آوازیں دے دے کر پکارا۔

جب فجر کے وقت قیدیوں کو باندھ کر لے جا رہے تھے تو دُلے کے گھرانے کی عورتوں نے رو رو کر بین کرنے شروع کر دیئے۔ ان میں لدھی کی آواز سب سے بلند تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر کہہ رہی تھی۔

ترجمہ: لدھی نے رو رو کے فریاد کی۔ بیٹا تم تو گھوڑی پر زین کس کر اپنے ننھیال چلے گئے اور وہ تمہاری ساری پنڈی لوٹ کر ہاتھیوں کی عماریوں میں ڈال کر لے گئے۔ اب تم کس منہ سے مجلسوں میں بیٹھو گے۔ اب تمہارا دنیا میں کیا نام رہے گا۔ تیری بہوؤں اور بیٹیوں کو یہ لوگ لے جا رہے ہیں۔ اب کیا شرم وحیا باقی رہ گئی۔ مرزا ہمیں قیدی بنا کر لے جا رہا ہے۔ ہماری راجپوتی کو تو داغ لگ ہی گیا تم بھی اگر راجپوت کے تخم سے ہو تو قیدیوں کو چھڑا کر دکھادو۔ سبھی پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن جن مردوں کے سر اڑ دیئے جاتے ہیں ان کے بول کبھی نہیں بھولتے۔

لدھی کی کوُک فریاد جب دُلے کے ایک دوست روڑ جٹ نے سنی اور قیدیوں کو دیکھا۔ تو اس نے سوچا میں اکیلا تو پوری فوج سے لڑ نہیں سکتا کیوں نہ دُلے کو فوراً خبر کر دوں۔ چنانچہ وہ ہرن کی طرح کلاچیں بھرتا چنیوٹ جا پہنچا اور دُلے کے ماموں رحمت کے دیوان خانے میں جا کر دُلے سے ملا اس وقت دُلا پانچ سو جوانوں میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ روڑ جٹ نے یوں پیغام دیا۔

ترجمہ: روڑ جٹ نے دُلے کے سامنے پھیر جا کر آہیں بھریں اور کہا تیرا بھید دشمنوں کو بتا دیا گیا اور مغل سب حال معلوم کر کے حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے چار بیلوں کا سہاگہ پھر کر پنڈی کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا ہے۔ انہوں

نے تمہاری ماں لدھی کو گرفتار کر لیا ہے۔ جس کی کوکھ سے تم نے جنم لیا ہے۔ انہوں نے تمہاری بہن سلیموں کو بھی پکڑ لیا ہے اور وہ تمہیں گیدی سمجھتی ہے وہ تمہارے بیٹے نور خان کو بھی ہتھکڑیاں پہنا کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے تمہاری بہو کو بھی قیدی بنالیا ہے۔ جس نے تمہارے گھر آ کر ابھی ایک چاند بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تمہاری رانی پھلراں کو بھی باندھ کے لے گئے ہیں جس کی سیج پر تم آن کر بیٹھا کرتے تھے۔ مغلوں نے سب کی مشکیں باندھ لی ہیں اور لاہور لے گئے ہیں۔ تم تو دلّی کے کنگرے ڈھانے کا ارادہ رکھتے تھے اب پہلے لاہور کے کنگرے تو ڈھاؤ۔ کل دوپہر تک یہ سارے بردے لاہور جا کر بکیں گے۔ اے دُلے دشمن کے دروازے پر جا کر یہ قیدی ٹکے ٹکے میں بک جائیں گے۔ اگر تم راجپوت کے تخم میں سے ہو تو قیدی چھڑا کر دکھاؤ۔

یہ سنتے ہی دُلے کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے مونچھوں کا تاؤ کھول دیا۔ پگڑی کا طرہ نیچا کر لیا اور قسم کھائی کہ جب تک قیدیوں کو چھڑا نہیں لوں گا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ جب وہ جانے کو تیار ہوا تو رحمت خان نے پانچ سو جوان اسکے ساتھ کر دیئے۔

ادھر مغل قیدیوں کو لے کر پنڈی لال خاں تک آ گئے اور وہاں آ کر ڈیرہ کیا۔ بزرگ سردار لال خان نے فوج اور اس کے ساتھ قیدیوں کو دیکھ کر حالات کا اندازہ کر لیا۔ اس نے نوبت بجوا کر اپنے گھرانے کے سب جوان اکٹھے کئے اور ان سے کہا کہ خبر لائیں معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ یہ اسی دُلے کے گھرانے کے لوگ قیدی ہو کر جا رہے ہیں جس سے ہماری خاندانی دشمنی ہے۔

بابا لال خان نے کہا بچوں دُلے سے ہماری دشمنی اپنی جگہ پر ہے لیکن یہ قیدی عورتیں بھٹیوں کی عزت ہیں۔ انہیں بچانا ہماری غیرت کا تقاضا ہے۔ بھٹیوں کو اس داغ سے چھڑانا چاہتے ہو تو قیدیوں کو مغلوں سے چھڑا لو چنانچہ لال خان کے گھرانے کے جوانوں نے حملہ کر دیا۔

ترجمہ: مغل شراب کے نشے میں چُور ہو رہے تھے۔ وہ کھیلوں میں مصروف تھے اور سامنے شطرنج کی بساط بچھا رکھی تھی۔ ان میں سے کئی بھانڈوں کی نقلیں اور ناچ کا تماشا دیکھ رہے تھے ایسے میں راجپوتوں نے ایک بھرپور حملہ کیا اور مغلوں کے سر یوں اڑنے لگے جیسے پیپل کے پتے ہوں پھر ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ سورمے خون میں نہا گئے۔

جنگ جاری تھی گولیاں برس رہی تھیں۔ جوان گھوڑوں سے گر گر کر موت کے منہ میں جا رہے تھے کہ دُلا راٹھ مغلوں کی موت بن کر میدانِ جنگ میں داخل ہوا۔

ترجمہ: دُلا سورما اللہ کا نام لے کر حملہ آور ہوا۔ وہ اپنی گھوڑی کو زور سے بھگاتا ہوا میدان جنگ میں داخل ہوا۔ دُلے نے جب سیدھے ہاتھ سے تلوار چلائی تو اتنے جوان ہلاک کر دیئے کہ میدان جنگ میں جگہ خالی ہو گئی۔ جب دُلے نے (اسے مارنے کی غرض سے) اپنی گھوڑی کا رُخ مرزا نظام دین کی طرف پھیرا تو اس نے (مرزا نے) اپنا ہاتھی بٹھا دیا اور لدھی کے قدموں میں گر کر دُلے کا بھائی بننے کی درخواست کی۔ لدھی نے بھی دُلے سے کہا کہ

شیر گرے ہوئے کو نہیں کھاتا چنانچہ دلے نے اپنی تلوار کے زور سے قیدیوں کو چھڑا لیا۔(11)

زوال کے دنوں کا لوک بیانیہ:

مغلوں کا عہدِ زوال شروع ہوا تو پنجاب بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔ قبائلی جنگوں نے زور پکڑا۔ اٹھارویں صدی خصوصاً ہلاکتوں اور خون خرابے کی صدی تھی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے اور داخلی قبائلی شورشوں کے باعث سب کو اپنی اپنی پڑ چکی تھی۔ شفقت تنویر مرزا کے بقول:

''مغل سرکار نہایت کمزور ہو چکی تھی۔ حکمرانوں کو عیش و عشرت سے فراغت نہ تھی۔ سرگودھا اور خوشاب میں کئی دھڑوں نے اپنی اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی۔ بلوچ، ٹوانے، اعوان، ہرل، بوسال اور خدا جانے کون کون۔۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پنجابی عوام کابل اور دہلی کے درمیان سینڈوچ بنے ہوئے تھے۔ نادر شاہ دہلی کے حاکموں کا تخت طاؤس ہی نہیں بلکہ بے شمار کاریگر، عورتیں، بچے اور کام کرنے والے قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا جن میں یقیناً بہت سارے پنجابی بھی ہوں گے۔ پنجاب میں مچی کھلبلی کے خلاف ایک صورت دوآبہ بست جالندھر کے ابراہیم خان، مغلانی بیگم اور آدینہ بیگ کی صورت میں اور دوسری صورت گورو گوبند کے سکھوں کی صورت۔۔ پہلی صورت وسطی پنجاب میں ناکام رہی۔ بہاولپور صوبہ ملتان، بھکر اور پشاور پہلے مغلوں سے آزاد ہوئے اور انہوں نے افغانوں کی سرداری قبول کر لی۔۔۔ احمد شاہ ابدلی اور اس کے بعد آنے والوں کی۔۔۔ یہ صورت تھوڑا ہی عرصہ برقرار رہی اور پھر احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ نے لاہور شہر کی چابیاں اپنے ہاتھوں چناب کنارے راجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں میں دے دیں۔(12)

صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے شفقت تنویر مرزا نے اس دور کے پنجاب کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔

''سرگودھا خوشاب میں مختلف قبیلوں میں جولڑائیاں لڑی گئیں۔ انہیں شاعروں نے نظموں، ڈھولوں اور سی حرفیوں کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ نوجوان محقق اور شاعر جاوید گنجھیرانے بڑی تعداد میں شعروں کو محفوظ کیا ہے۔

نجابت ہرل کے قبیلے ہرل اور بوسالوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اس جنگ کی وار اٹھارویں صدی کے شاعر میاں لال نے بنائی۔ یہ شاعر بھلوال کا رہائشی تھا مگر حافظ برخوردار والے قبرستان میں مدفون ہے۔

مذکورہ بالا لڑائی میراں والا ٹبہ (بھلوال) کے مقام پر ہوئی۔ بوسالوں کے ڈیڑھ سو کے قریب آدمی مرے جبکہ متیلا اور ہرلوں کے ساٹھ کے قریب بندے کام آئے۔

بھلوال اور پھالیے کے علاقوں میں کوٹ مومن کے آس پاس بوسالوں اور ہرلوں کی لڑائیاں جاری رہیں۔

''رنجیت سنگھ سے پہلے سکھ بھی مسلمانوں کی طرح جگہ جگہ سردار بن بیٹھے تھے۔ تبھی تو اس عہد کو بُرچھا گردی کہا جاتا ہے۔ یہ نجابت ہرل اور محمد دائم عرف میاں لال کے زمانے کی بات ہے۔ پھر رنجیت سنگھ آیا۔

ایک جانب بلوچ سیال اور بھٹی جبکہ دوسری جانب اعوان، ٹوانے، ہرل، گوندل، بوسال گتھم گتھا ہوئے

اور درمیان میں سکھوں نے اپنی الگ ہی دنیا بسا رکھی تھی۔

زمانہ رنجیت سنگھ کا، ملتان کا گورنر امیر چند اور دیوان لال سنگھ۔۔۔کوٹ مومن کے ملک لک نے بوسالوں کو دھوکے سے سکھوں کے ساتھ لڑ وا دیا۔ لک کا باپ لکھن خان لک ہرلوں کے ساتھ مل کر بوسالوں کے ساتھ لڑا اور مارا گیا۔ ملک لک نے بدلہ لینے کے لئے سکھوں اور بوسالوں کی لڑائی کروادی۔ میاں لال وار میں کہتا ہے کہ بوسالوں نے سکھوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ترجمہ: بوسالوں کے ارد گرد گاڑیاں اور توپیں آن پہنچیں۔ منہ پر تیوریاں چڑھائے ڈراؤنے منہ کئے، ڈھیروں اناج اور دیسی شراب ان کی خوراک تھی، دھاتی گولے اور دوسرا گولا بارود ان کے ہمراہ تھا۔

سکھوں کے ساتھ بوسالوں کی لڑائیاں کوٹ مومن سرگودھا اور گجرات کے درمیانی علاقوں میں ہوئیں۔ پھر اسی علاقے میں سکھوں نے چیلیانوالہ کے مقام پر انگریزوں سے شکست کھائی۔ یوں سکھوں کی قومی حکومت کا خاتمہ ہوا۔۔۔پھر بلوچ، ٹوانے سبھی انگریزوں سے جا ملے۔۔۔سردار جعفر خان بلوچ، ملک محمد خان ٹوانہ اور سردار فتح خان بلوچ ساہیوال۔۔۔اسی زمانے کے گروٹ کے شاعر شیر محمد اعوان (1799-1875) لکھتے ہیں۔:

ترجمہ: انگریزوں کا راج ملاحظہ کر چکے جنہوں نے تمام معاملات اپنے انداز میں سیدھے کر دیئے تھے یعنی پورے ملک میں بے شمار جیلیں اور قیدی تھے۔ مسلمان ایک طرف کر دیئے گئے جبکہ ہندو کراڑ روز بروز ترقی کرتا جا رہا تھا۔ خوشاب شہر کی کیا تعریف کروں جہاں خودسر لوگ رہتے ہیں۔ اس شہر میں ٹوانے گھوڑیوں کے سوار رہتے ہیں، انگریزوں سے جاگیریں لے کر ان کا ساتھ دیا۔ ان کا یہ سودا سراسر دنیاداروں جیسا ہے۔

مگر سرگودھا خوشاب کے سرداروں اور جاگیرداروں کی انگریز سے وفاداری کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی زندہ تھے جو زندہ ضمیر کہلاتے تھے۔ سرگودھا کے قدیم ویران شہر میانی کے شاعر اللہ دتہ 1857ء یا 1849ء کے لگ بھگ کہتے ہیں:

ترجمہ: جیٹھ کا مہینہ شروع ہوا تو ہم نے محبوب کو بہت اشارے کئے مگر اس نے کسی کا بھی جواب نہ دیا۔ ہنستے بستے شہر برباد ہو گئے ہیں۔ فسادات پھوٹ پڑے ہیں۔ پہلے حاکم اب بدل چکے ہیں۔ دراصل وہ کند ذہن تھے۔ اے اللہ دتہ! دنیا دنگے فساد کے باعث لوٹ لی گئی ہے۔ اب سرکار کے ہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

جیٹھ مئی جون کا مہینہ تھا۔ جب 1857ء کی جنگ ہوئی تھی۔ اللہ دتہ نے مغرور حکمرانوں کو شہر کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ دریاؤں کے درمیان آباد تھل صحرا، دوسری جانب سون سکیسر کی ہری بھری پہاڑیاں اور تیسری جانب جہلم اور سندھ میں سے نکلتے ندی نالوں کی بدولت سبز پوش کھیتوں والے علاقے اپنے سرداروں کی طرح غلامانہ ذہنیت نہ رکھتے تھے۔ جب انگریزوں نے پہلی بڑی لام کے لئے جبری بھرتی کی تو رانجھوں کے علاقے میں نادر حسین شاہ کو جبری بھرتی کرتے ہوئے عزت کی موت مرنا پڑا۔ ڈھولے کے شاعر شہابل خان ٹھٹھہ رہن وال میں

پلے بڑھے۔اس نے مہر نادر حسین کی جبری بھرتی اوراس کے قتل پر لکھا۔

ترجمہ:اس دن پیر بنگلے سے نکلا جیسے موت شان وشوکت سے نکلتی ہے۔سازشوں کے باعث پیر کا ہر حکم، نادر شاہ کو مرتے دیکھ کر حکم الٰہی کی طرح لوگوں میں خوف پیدا کر رہا تھا۔(13)

انگریزی دور کی فوجی بغاوتوں کا بیانیہ:

پنجاب میں 1857ء کی کہانی بس اتنی ہی نہیں ہے۔انبالہ انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں اپریل میں ہندوستانی سپاہیوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔19 اپریل کو انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگائی گئی۔میرٹھ کی بغاوت کی خبر پہنچتے ہی 11 مئی کو حالات خاصے نازک ہو گئے اور انگریزوں نے فوراً پٹیالہ، نابھہ، مالیر کوٹلہ اور فرید کوٹ کے علاوہ جاگیرداروں اور رئیسوں سے بھی امداد طلب کی۔انبالہ کے خزانے میں جتنا روپیہ تھا وہ دیسی گارڈ کی نگرانی سے نکال کر گورا گارڈ کے حوالے کر دیا گیا۔29 مئی کو نمبر 5 دیسی افسر بغاوت میں شامل تھے انہیں موت کی سزادی گئی اگر چہ یہاں کوئی خاص ہنگامہ نہیں ہوا لیکن 29 افراد کو موت کی سزادی گئی اور 135 قتل ہوئے۔

پنجاب میں فیروز پور اسلحہ اور سامان جنگ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں دیسی فوج میں مارچ 1857ء میں بے چینی کی لہر دوڑی۔ جب میرٹھ اور دہلی سے تشویشناک خبریں آئیں تو ایک رجمنٹ نے میگزین پر حملہ کر دیا لیکن میگزین کو بچا لیا گیا۔البتہ چھاؤنی کی بہت سی عمارتیں نذر آتش ہوئیں۔ان میں ایک گرجا بھی تھا۔اس پر انگریزوں نے تیرہ افراد کو پھانسی دی اور پندرہ کو گولی سے اڑا دیا گیا۔

میرٹھ کے ہنگامے کی خبر جالندھر 11 مئی کو پہنچی۔اسی روز ایک ہندوستانی افسر کو موت کی سزادی گئی۔شہر کی حفاظت کے لئے پھلور سے فوری طور پر توپیں منگوائی گئیں۔ کپورتھلہ قریب تھا وہاں کے راجہ نے حکومت کی ہر طرح سے امداد کی۔7 جون کی رات کو فوج میں سخت بے چینی پھیلی لیکن کسی قسم کی کارروائی کئے بغیر وہ چھاؤنی سے نکل گئی۔ایک تحصیل دار ضیاالدین نے مجاہدین کے موافق روش اختیار کی اوراسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

ہوشیار پور میں آتشزدگی کی پہلی واردات 3 مئی کو ہوئی۔13 مئی کو دلی اور میرٹھ کے ہنگاموں کی اطلاع پہنچی۔ڈپٹی کمشنر نے فوراً پولیس کی تعداد بڑھا دی اور تحصیل کی عمارت کی حفاظت کے لئے توپیں نصب کرا دیں۔ سپاہیوں کے خطوط کھول کھول کر پڑھے گئے تو معلوم ہوا کہ فوجیوں کے درمیان خفیہ نامہ و پیام جاری ہے۔راستوں کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا کہ مقامی لوگ باہر نہ جاسکیں اور باہر کے لوگ اندر نہ آسکیں۔

امرتسر میں 12 مئی کو میرٹھ اور دلی کی خبریں پہنچیں اور انگریز فوج نے حفاظت کے مکمل انتظامات کر لئے۔ بیراگی فقیروں کی ایک بڑی تعداد گرفتار کر لی گئی۔خزانہ قلعہ گوبند گڑھ منتقل کر دیا گیا۔چار نئی حوالاتیں قائم کی گئیں۔ سپاہیوں کو شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔نمبر 35 دیسی فوج کو بغاوت کے شبہ میں غیر مسلح کر دیا گیا۔9 جولائی کو نمبر 59 دیسی فوج کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ڈپٹی کمشنر کوپر کی رپورٹ کے مطابق ضلع میں 476 قتل ہوئے۔دو کو

پھانسی دی گئی۔ دو کی موت قید میں واقع ہوئی اور بارہ کو قید کیا گیا۔

سیالکوٹ میں جولائی کے مہینے میں اچانک یہاں فوج میں ایسی بے چینی پھیلی کہ سپاہیوں نے کئی انگریزوں کو قتل کر کے گورداس پور کا راستہ لیا۔ غالباً یہ لوگ دہلی جانا چاہتے تھے۔ اسی دوران میں جنرل نکلسن اپنے متحرک کالم کے ساتھ امرتسر پہنچا۔ اسے جب علم ہوا کہ فوجی گورداس پور روانہ ہو گئے ہیں تو وہ بھی امرتسر سے گورداسپور کی طرف بڑھا۔ فوجیوں نے 12 مئی کو گورداسپور سے 9 میل اوپر راوی کو عبور کیا۔ اسی مقام پر نکلسن نے ان پر حملہ کیا۔ تین سو کے قریب قتل یا زخمی ہوئے اور جو بچ نکلے انہوں نے جسر وتہ (جموں و کشمیر) کا رخ کیا۔ حکومت جموں و کشمیر نے ان لوگوں کو گرفتار کیا اور 600 آدمی انگریزوں کے سپرد کر دیئے۔ ان میں بہت سے صرف سائیس اور عام ملازم تھے۔ 126 فوجی تھے۔ ان سب کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

سیالکوٹ میں باغ کے دروازوں پر باغیوں نے اپنے اعلانات کے اشتہار لگائے تھے۔ ایک میں انگریزوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب میں لاہور کی طرف کوچ کروں گا تو تمہارے لئے بچ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ پنجاب کی فوج پوری کی پوری میرے ساتھ ہو جائے گی۔ یقین رکھو پنجاب کبھی تمہاری ملکیت نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس صوبے میں تمہاری ہڈیاں پسی جائیں گی۔ تم اپنی بھلائی پہچانو اور فوراً یورپ چلے جاؤ۔

جہلم بھی جو جب سے اب تک فوجی بھرتی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ بغاوت میں دوسرے اضلاع سے پیچھے نہیں تھا۔ 7 جولائی کو جہلم کی فوج میں سے ڈھائی سو سپاہی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ تصادم کے نتیجے میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ سپاہی مارے گئے۔ انگریزوں نے جہلم کا پل توڑ دیا۔ باقی لوگ جموں کی طرف نکل گئے۔ ان لوگوں کا تعاقب کیا گیا، کچھ تو بھاگ کر بچ نکلے لیکن چند ایک کو گرفتار کر لیا گیا۔ کئی روز تک فوجی عدالت میں ان کا مقدمہ چلتا رہا۔ انجام کار ان لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ جو لوگ جموں بھاگ گئے تھے وہ بھی ایک بیان کے مطابق ختم کر دیئے گئے۔

راولپنڈی کی دو رجمنٹوں کے 26 آدمی ہتھیار لے کر بھاگ گئے۔ اکثر تعاقب میں مارے گئے۔ جو گرفتار ہوئے انہیں موت کی سزا دی گئی۔ راولپنڈی میں ہونے والی دیگر بغاوتوں میں ملوث 108 افراد کو فوجی عدالتوں سے اور 237 افراد کو دیوانی عدالتوں سے سزائیں دی گئیں۔

ملتان اور ساہیوال میں دیسی فوج سے 18 جون کو ہتھیار لے لئے گئے۔ گوگیرہ میں جو فوج مقیم تھی اسے بھی غیر مسلح کر دیا گیا جس روز فوج سے ہتھیار لئے گئے اس روز رجمنٹ 69 کے چار سپاہی بھاگ گئے۔ ان میں سے ایک پکڑا اور اسے موت کی سزا ملی۔ پھانسی سے ایک رات پیشتر اس سپاہی نے جان بخشی کے وعدے پر تمام راز افشا

کر دئے۔ اس پر صوبیدار میجر ناہر خان اور بعض دوسرے افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ناہر خان پر 18 جولائی کو الگ مقدمہ چلا اور اسے 24 جولائی کو پھانسی دی گئی۔ ناہر خان کے ساتھ دس اور آدمیوں پر بھی مقدمہ چلا جنہیں موت کی سزا دی گئی۔

شملہ کے علاقے کسولی میں گورکھوں نے خزانہ لوٹا اور ہنگامہ آرائی کی۔ سپاتھو میں ایک شخص رام پرشاد بیراگی پر الزام لگایا گیا کہ اس نے خطوط کے ذریعے لوگوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیراگی کو انبالہ لے جا کر پھانسی دے دی گئی۔ عام شہریوں کی بغاوت میں لدھیانہ بھی پیش پیش رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے ضلع کے روسا کی امداد سے حالات پر قابو پائے رکھا اور خزانہ محفوظ رہا۔ ایک مولوی صاحب نے شہر کی آبادی کو جہاد پر آمادہ کیا۔ جب ادھر ادھر سے مزید ہندوستانی سپاہی یہاں آئے تو مولوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ان کے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دی۔ سبز جھنڈا تیار کیا گیا اور سب لوگ دلی روانہ ہو گئے۔ 17 جون کو ڈپٹی کمشنر نے شہریوں سے ہتھیار لے لئے جن سے گیارہ گاڑیاں بھر گئیں جالندھر سے فوجی یہاں پہنچے تو انہوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ان فوجیوں کو صرف گولہ بارود کی ضرورت تھی۔ دوسرے دن ان لوگوں نے قلعہ کو خالی کر دیا تو ڈپٹی کمشنر نے قلعہ کے ارد گرد تین تین سو گز تک سارے مکان مسمار کرا دئے۔

ہزارہ کی کررال قوم کے افراد نے مری پر حملے کا ارادہ کیا تو یہاں کے حالات بڑے تشویشناک ہو گئے۔ انگریزوں نے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی وسیع پیمانے پر حفاظتی اقدامات کر لئے۔ مری میں تین افراد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رسول بخش، ڈاکٹر سید امیر علی اور سید کرم علی۔

اول الذکر دونوں سرکاری ملازم تھے لیکن سید کرم علی قلعی گر کی حیثیت سے چکر لگایا کرتے تھے۔ سید کرم علی کو گرفتار کیا گیا اور 19 ستمبر 1857ء کو پھانسی دی گئی۔ ڈاکٹر رسول بخش اور ڈاکٹر امیر علی بھی گرفتار ہوئے۔ 17 اکتوبر کو ان لوگوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

فوجی اور شہری بغاوتوں کو کچلنے کے سلسلے میں انگریزوں کے مظالم کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ پنجاب اگر سچ مچ انگریز کا وفادار ہوتا تو کم سے کم اس صوبے میں ''بلیک ہول'' کی روایت نہ دہرائی جاتی۔ لاہور کی چھاؤنی کے باغیوں کا جو حشر کیا گیا اس پر برطانیہ کی پارلیمنٹ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

لاہور میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچتے ہی شہر میں صورت حال بگڑ گئی۔ افواہیں اڑنے لگیں تو شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ حفاظت کے لئے نئی فوج بھرتی کی گئی۔ فقیروں، درویشوں اور بیراگیوں کو شبہ میں پکڑا جانے لگا اور حکم دیا گیا کہ لاہور قلعہ میں اتنی خوراک جمع کر لی جائے جو چار ہزار آدمیوں کے لئے چھ ماہ تک کافی ہو سکے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں تو انگریز قلعہ بند ہو جائیں۔ 12 مئی کو فیصلہ کیا گیا کہ میاں میر کی دیسی فوج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ اس کے لئے ایسا منصوبہ تیار کیا گیا کہ چند اعلیٰ افسروں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

اس رات کو انگریزوں نے رقص کا اہتمام کیا اور رقص جاری تھا کہ گوراپلٹن کو پریڈ کے میدان میں پہنچا دیا گیا۔ توپیں جگہ جگہ نصب کر لی گئیں اور فوجیوں سے کہا گیا کہ مختلف مقامات پر دیسی فوج نے سرکشی کر لی ہے۔ آپ لوگوں سے ہتھیار لے لینے کا مقصد یہ نہیں کہ آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ آپ دوسرے رجمنٹوں کی پیروی کرنا بھی چاہیں تو نہ کر سکیں اور خطرے سے محفوظ رہیں۔ اس وقت انتظامات اتنے مکمل تھے کہ سپاہیوں نے بے چون و چرا اسلحہ واپس کر دیا۔

میاں میر کی غیر مسلح 26 رجمنٹ کے ساتھ اس کے بعد جو سانحہ گزرا۔ اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ غیر مسلح ہونے کے بعد فوجیوں کے جذبات بدستور تازہ رہے۔ یہاں تک کہ 30 جولائی کو رجمنٹ نے اپنے کمان افسر اور سارجنٹ میجر کو ہلاک کر دیا اور خود بھاگ نکلی۔۔۔ اور آندھی کے باعث بھاگ کر دریائے راوی کے کنارے جا پہنچی۔ ایک چوکیدار سلطان خان کی غداری کے باعث یہ لوگ گھیر لئے گئے۔ پولیس کے ساتھ سخت لڑائی میں رجمنٹ کے ڈیڑھ سو آدمی مارے گئے۔ باقی لوگ یا تو گرفتار کر لئے گئے۔ یا راوی کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر کا خیال تھا کہ انہیں اسی وقت موت کی سزا دی جائے لیکن سخت بارش کی وجہ سے معاملہ صبح تک ملتوی کرنا پڑا۔ صبح مزید چھیاسٹھ فوجی گرفتار کر کے لائے گئے اب دو سو بیاسی آدمی اجنالے کے تھانے میں جمع دشمن کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں صبح ایک برج میں بند کر دیا گیا۔ پھانسی دینے کے لئے بہت سے رسے منگوائے گئے تا کہ زیادہ تعداد میں بیک وقت پھانسی دی جا سکے۔ ضرورت پڑنے پر سب قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنانے کے لئے ایک اور دستہ منگوا لیا گیا۔ تھانے سے سو گز کے فاصلے پر ایک خشک کنواں تھا۔ لاشیں پھینکنے کے لئے اسے منتخب کیا گیا۔ یکم اگست کو تمام مسلمان سوار رخصت پر بھیج دیئے گئے۔ تا کہ وہ امرتسر جا کر عید منائیں۔ یہاں صرف کوپر تحصیلدار اور سکھ جوان یا سکھ رئیس رہ گئے۔ اجنالے کے اردگرد سخت پہرہ لگا دیا گیا تا کہ کوئی ادھر نہ آنے پائے۔ موت کی سزا دینے کا یہ طریقہ ٹھہرا کہ دس دس کی ٹولیوں میں قیدی باہر لائے جاتے۔ ان کے نام اور پتے لکھے جاتے اور انہیں اس جگہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا جہاں سپاہی انہیں گولی سے اڑانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

کوپر نے لکھا ہے کہ جب یہ لوگ مقتل کی جانب لے جائے جاتے تھے تو غصے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے ''تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔''

جب ڈیڑھ سو قیدی موت سے ہم آغوش ہو گئے تو گولی چلانے والے سکھوں کے دستے میں سے ایک کو غش آ گیا۔ چنانچہ سلسلہ قتل تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ دو سو بتیس قیدی مارے جا چکے تو معلوم ہوا کہ باقیوں نے برج سے نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ خیال تھا کہ دروازے کھلتے ہی وہ باہر کی طرف لپکیں گے اور لڑائی ہوگی۔ اس لئے پہرے کا خوب بندوبست کر لیا گیا تھا لیکن بند دروازے کے پیچھے قیدی تکان، گرمی اور دم گھٹنے کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ پینتالیس لاشیں باہر نکالی گئیں۔ اجنالہ کے بھنگیوں نے انہیں بھی اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ کنوئیں

میں پھینک دیا۔اس کنوئیں پر ایک اونچی قبر بنادی گئی اور انگریزوں نے اس کا نام ''مفسد گھر'' رکھا۔

لارنس اور منٹگمری کی طرف سے کوپر کو اس ''شاندار کارنامے'' پر خراج عقیدت بھیجنے میں کافی عجلت برتی گئی۔

لاہور کے حالات کے بارے میں 14 جون کو چیف کمشنر کے سیکرٹری نے جو رپورٹ حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کو بھیجی۔اس میں کہا گیا کہ ''لاہور میں فوجی عدالتوں کا کام جاری ہے۔گیارہ قیدیوں کو ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانے کے جرم میں موت کی سزا دی گئی ہے۔جسے جنرل گوون نے سزائے قید میں تبدیل کر دیا۔35 نمبر پیادہ فوج کے دو سپاہیوں کو انارکلی میں توپ دم کر دیا گیا۔کیونکہ وہ لوگوں کو بغاوت پر اکساتے تھے۔''

فوجیوں اور عام شہریوں کی ان بغاوتوں کے یہ واقعات ہفت روزہ ''لیل و نہار'' شمارہ 12 مئی 1957ء کے علاوہ مختلف سرکاری رپورٹوں اور تحقیقی مقالوں سے لئے گئے ہیں۔ان کی صحت پر شبہ اس لئے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے بیشتر واقعات خود دشمن کے بیان کردہ ہیں۔تاہم پنجابیوں کی خوش قسمتی کے باعث برطانیہ کی ایک لائبریری میں بیٹھا ایک جرمن فلسفی کارل مارکس ہندوستان کی جنگ آزادی کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔جنگ آزادی سے صرف آٹھ سال قبل انگریزوں اور پنجابیوں کے درمیان ہونے والی لڑائیاں بھی اس کے سامنے تھیں۔اس نے چیلیانوالہ کی لڑائی میں 2300 انگریزوں کے مرنے کی خبر بھی ریکارڈ کی تھی اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ پنجاب کی فتح نے ہندوستان میں آزاد حکومتوں کے تصور کو ماضی کی ایک یاد بنا دیا تھا۔اپنے ایک مضمون ''ہندوستانی فوج کی بغاوت'' میں اس نے لکھا تھا:

''سندھ اور پنجاب کی فتح سے برطانوی ہندوستانی سلطنت نہ صرف اپنی اصلی سرحدوں تک پھیل گئی بلکہ اس نے خود مختار ہندوستانی ریاستوں کے آخری نشانات بھی مٹا دیئے۔''

پنجاب کی فتح کے بعد پنجاب میں مدتوں تشدد کا بازار گرم رہا اور لوگ انتقام کا نشانہ بنتے رہے۔1855ء کے ایک واقعہ کو موضوع بناتے ہوئے مارکس نے لکھا تھا:

''انتہائی شدید جبری وصولی اور تشدد کی غیر معمولی کارروائیوں کو اعلیٰ افسران کس روشنی میں دیکھتے ہیں اس کا اظہار 1855ء میں پنجاب میں ضلع لدھیانہ کے کمشنر بریرٹون کے واقعہ سے ہوتا ہے۔پنجاب کے چیف کمشنر کی رپورٹ کے مطابق یہ ثابت ہوا کہ متعدد واقعات میں خود ڈپٹی کمشنر مسٹر بریرٹون کی مرضی یا ہدایات سے امیر شہروں کے مکانوں کی بلا وجہ تلاشی لی گئی۔ایسے موقعوں پر قرق کی ہوئی جائیداد طویل مدت تک قرق رہی۔بہت سے لوگ جیلوں میں بند کر دیئے گئے اور ہفتوں تک پڑے رہے اور ان کے خلاف کوئی چارج شیٹ نہیں تیار کی گئی اور خراب چال چلن کے لئے ضمانت کے قوانین کو بڑے پیمانے پر اور بلا امتیاز شدت کے ساتھ استعمال کیا گیا۔بعض پولیس افسر اور مخبر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ضلع ضلع پھرے جن کی خدمات کو ڈپٹی کمشنر نے ہر جگہ استعمال کیا اور یہی لوگ ساری اذیت کے خاص مجرم تھے۔

اپنی رپورٹ میں اس معاملے کے بارے میں لارڈ ڈلہوزی نے کہا ہے "ہمارے پاس ناقابل تردید ثبوت ہے۔ ایسا ثبوت جس سے دراصل مسٹر بریٹون بھی انکار نہیں کرتے کہ افسر موصوف بے قاعدگی اور غیر قانونی باتوں کی بھاری فہرست میں ہر بات کے قصوروار ہیں۔ جن کے لئے چیف کمشنر نے ان کو ملزم ٹھہرایا ہے اور جنہوں نے برطانوی انتظامیہ کے ایک حصے کو بدنام کیا ہے اور برطانوی رعایا کی بڑی تعداد کو سخت ناانصافی اور من مانی قید اور ظالمانہ اذیتوں کا نشانہ بنایا ہے۔" (ہندوستان میں اذیت رسانی کی تفتیش).

ہم یہاں صرف اس قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ "برطانوی انتظامیہ کے ایک حصے کو بدنام کرنے" اور برطانوی رعایا کی بڑی تعداد کو سخت ناانصافی اور من مانی قید اور ظالمانہ اذیتوں کا نشانہ بنانے میں لارڈ ڈلہوزی، حکومت ہند اور حکومت برطانیہ بھی اتنی ہی مجرم ہے جتنے مسٹر بریٹون یا ان جیسے دوسرے افسر۔" یہی تشدد کے واقعات تھے جو بڑھ کر ایک بڑی بغاوت کا باعث بنے۔ اپنی تحریروں میں مارکس نے جس کی طرف جگہ جگہ اشارے کئے ہیں۔

"پنجاب میں فیروز پور کے مقام پر 57 ویں اور 45 ویں دیسی پیادہ رجمنٹوں نے بغاوت کی لیکن اسے طاقت کے ساتھ دبا دیا گیا۔ لاہور سے غیر سرکاری نامہ نگار لکھتے ہیں کہ پورے کا پورا دیسی رسالہ علی الاعلان بغاوت کی حالت میں ہے۔"

"۔۔۔۔۔لیکن گھیرا ڈالنے والی فوج میں دیسی فوجوں کا آ کر شامل ہونے والا یہ حصہ بالکل ہی اور قطعی طور پر بھروسے کے قابل نہیں۔۔۔ یہ لوگ ایک طبقے کے طور پر بالکل ہی غیر وفادار ہیں اور فوج میں ان کا کسی گنتی میں ہونا تشویشناک بات ہونی چاہئے اور ایسا ہی ثابت ہوا۔ دوسرے پنجاب رسالے میں تقریباً ستر ہندوستانی نوجوانوں کو بے ہتھیار کرنا اور تین کو پھانسی پر چڑھانا، جن میں ایک بڑا دیسی افسر تھا، ضروری سمجھا گیا۔

"پنجاب میں بغاوت کے جذبے کو زبردستی دبایا گیا۔ سیالکوٹ میں اور جہلم میں بغاوت کو دبایا گیا۔"

"پنجاب کے بارے میں کہا گیا کہ وہاں پر امن وامان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ فیروز پور کے مقام پر 13 جون کو فوجی کارروائیاں ہوئی ہیں۔۔۔ یہ ماننا چاہئے کہ یہ بہت عجیب طرح کا امن وامان ہے۔"

"راولپنڈی سے خبر آئی کہ تین دیسی سردار سازش کر رہے ہیں۔ سر جان لارنس نے اپنے جوابی پیغام کے ذریعے حکم دیا کہ ایک جاسوس ان کے جلسے میں شریک ہو۔ جاسوس کی رپورٹ پر سر جان نے دوسرا پیغام بھیجا۔" ان کو پھانسی پر لٹکا دو اور سرداروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔"

"پنجاب میں دیسی فوجیں توڑ کر ہی کھلم کھلا بغاوت روکی جا سکتی ہے۔۔۔۔ اب انگریزی فوج کی اصلی پوزیشن کا ٹھیک ٹھیک پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ پنجاب میں اور راجپوتانے میں فلائنگ کارز قائم کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز نہ ہی اپنے سپاہیوں پر اور نہ ہی دیسی لوگوں پر اپنی بکھری ہوئی فوجوں کے درمیان

راستے کھلے رکھنے کے لئے انحصار کر سکتے ہیں۔

جموں وکشمیر، جند، نابھہ کرنال، کپورتھلہ اور کسی حد تک بہاول پور کی ریاست کے والیوں نے دلی کی فتح کے لئے انگریزوں کو اپنی فوجیں اور مالی امداد دی لیکن بعض ایسی ریاستیں بھی تھیں جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا اور جان و مال کی قربانی دی۔ تاریخ ،جھجھر کے نواب عبدالرحمٰن خان ،کلو کے پرتاب سنگھ اور بلبپ گڑھ کے ناہر سنگھ کو نہیں بھول سکتی۔ جن ریاستوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا وہاں بھی تھوڑے ہی عرصے بعد جذبات میں بے چینی محسوس کی جانے لگی۔ لکھنؤ پر حملے کی تفصیلات کا جائزہ لیتے ہوئے فریڈرک اینگلز نے سکھوں کی اس تبدیلی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''اور سب سے آخر میں سکھوں نے جس انداز میں بولنا شروع کیا ہے وہ انگریزوں کے لئے نیک شگون نہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی مدد کے بغیر، برطانیہ کے لئے ہندوستان کو قبضے میں رکھنا مشکل ہے اور اگر وہ بغاوت میں شامل ہو جاتے تو ہندوستان کم از کم کچھ عرصے کے لئے انگلینڈ کے ہاتھوں سے ضرور نکل جاتا۔ یہ بات وہ کھلم کھلا کہتے ہیں اور اپنے مشرقی انداز میں بڑھا کر کہتے ہیں۔ انہیں اب انگریز نسل بڑھیا نظر نہیں آتی جس نے مدکی ، فیروز شاہ اور علی وال کے مقام پر انہیں شکست دی تھی۔ اس یقین سے کھلی دشمنی تک مشرقی قوموں نے بس ایک ہی قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ ایک چنگاری ہی شعلے کو بھڑکا سکتی ہے۔''

''۔۔۔۔۔۔۔۔ہوسکتا ہے پنجاب کو بھی پھر جیتنا پڑے لیکن اچھے سے اچھے حالات بھی رہے تو بھی انہیں ایک لمبی اور پریشان کن گوریلا جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ہندوستانی دھوپ میں یورپیوں کے لئے کوئی قابل رشک بات نہیں۔

اپنے ایک اور مضمون میں اینگلز نے لکھا تھا:

''۔۔۔۔۔اس وقت یہ نفرت اگر چہ کمزور اور بے بس ہو، پھر بھی یہ اہمیت سے خالی نہیں جبکہ وہ خطرناک بادل بکھ پنجاب پر چھایا ہوا ہے''

عوامی بغاوتوں کا لوک بیانیہ:

مارکس نے بغاوت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''ہند میں بغاوت'' میں ایک جگہ بتایا ہے کہ ملتان اور لاہور کے درمیان مواصلات کے ذرائع آٹھ دن تک منقطع رہے۔ مارکس کا یہ اشارہ اس مشہور بغاوت کی طرف ہے جس کے نتیجے میں انگریز اسسٹنٹ کمشنر برکلے اور اس کے بے شمار فوجی مارے گئے تھے اور بغاوت کے لیڈروں کو خود بھی اپنی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں۔ اس بغاوت کا مرکز بار کا علاقہ تھا اور اس بغاوت کی کہانی پنجابی لوک گیتوں کی ایک صنف ''ڈھولوں'' میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہے۔ لیکن پہلے ہم ان انگریزی رپورٹوں کو دیکھنا چاہیں گے۔ جو جنگ آزادی کی کہانی حاکم طبقے کے نقطۂ نظر سے بیان کرتی ہیں۔

چیف کمشنر پنجاب سرجان لارنس نے حکومت ہند کے نام مندرجہ ذیل رپورٹ ارسال کی:

''اس ضلع (ساہیوال) کے تین قبیلے فتیانہ، بہاول کی سرداری میں، کاٹھیا، محمد کی رہنمائی میں جذبہ جہاد سے سرشار ہوکر اٹھے۔ کھرل قبیلہ، احمد خان کی سرداری میں بروئے کار آیا اور تینوں اکٹھے ہوکر انگریزوں سے الجھ گئے''۔

لیفٹیننٹ الفنسٹن کے پاس اطلاع پہنچی کہ فلاں فلاں قبیلے بگڑ گئے ہیں۔ اس نے فوجیں بھیجیں اور راوی کے کنارے جھڑپیں ہوئیں۔

اس کے بعد انہوں نے گوگیرہ پر سخت حملہ کیا اور نقصان پہنچایا۔ مسٹر برکلے مارا گیا اور ادھر سے خود احمد خان کام آیا لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔ باغیوں نے ہڑپہ اور چیچہ وطنی پر قبضہ کرلیا اور چیمبرلین اور اس کی فوج کو محاصرہ میں لے لیا۔ انگریزی فوجیں لاہور، ملتان اور گورداسپور سے پہنچیں اور صاحب کو محاصرے سے نکالا۔

پھر میجر چیمبرلین نے جلھی پر حملہ کیا۔ یہاں پر سخت لڑائی ہوئی اور باغیوں نے قلعے سے باہر نکل کر حملے کئے۔ اس کے بعد باغیوں کا نہایت منظم طریقے سے قلع قمع کر دیا گیا۔

ایک اور افسر کی رپورٹ ملاحظہ ہو:

''دوسرا ہنگامہ گوگیرہ میں برپا ہوا، جو راوی اور ستلج کے درمیان لاہور کے جنوب میں واقع ہے۔ سقوط دہلی کے ساتھ ہی 16 ستمبر کو محکمہ ڈاک کے ایک اہل کار نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے بیان کیا کہ ساحل کے ساتھ ساتھ لاہور اور ملتان کے درمیانی علاقے میں لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور باغیوں کی تعداد 1,25,000، ایک لاکھ پچیس ہزار ہے۔ (ضلع کی کل آبادی ساڑھے تین لاکھ تھی۔) تین گھنٹے کے وقفے سے ایک یورپین کمپنی، توپ خانہ اور دوسو سکھ سپاہی روانہ کر دیئے گئے تھے۔ باغی ہتھیاروں سے مسلح تھے جوانہوں نے پولیس سے چھین لئے تھے یا ملحقہ ریاست بہاول پور سے درآمد کئے تھے۔

یہ بغاوت بیس دن کی جدو جہد کے بعد فرو ہوئی جس میں ہمارا تھوڑا سا نقصان ہوا۔ اس غرض کے لئے یہاں پانچ سو فوجی دستے جمع کئے گئے تھے۔ اگر چہ ان دنوں امن وامان ہے لیکن بغاوت کی وجوہ کی تحقیقات ضروری ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ جب تک دہلی ہمارے قبضے میں آیا۔ اس وقت تک بغاوت فرو نہ ہوسکی۔''

ڈپٹی کمشنر گوگیرہ لیفٹیننٹ این ڈبلیو الفنسٹن کی ایک رپورٹ سے برکلے کی موت اور بغاوت کی دیگر تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔

''مجھے برکلے کا رقعہ ملا۔ وہ احمد خان کھرل پر قابو نہیں پا سکا۔ احمد خان کھرل اور برکلے دونوں آمنے سامنے تھے لیکن گولیوں کی زد سے باہر تھے۔''

احمد خان نے شاہ دہلی کی اطاعت کا ذکر کیا تو اس کے ساتھیوں میں جوش پیدا ہو گیا انہوں نے توڑے دار بندوقیں

چلائیں جن کا مؤثر جواب دیا گیا۔

اس اطلاع کے ساتھ لیفٹیننٹ مچل، بر کلے کی مدد کو بھیجا گیا۔ صدر مقام کے قیدی اور خزانہ خالی کر کے میں خود بھی بھاری جمیعت کے ساتھ ان سے جاملا''

''ہم لوگ دریا عبور کر گئے۔ دشمن پہلی بار کے ساتھ بھاگ اٹھا۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا۔ وہ ایک گاؤں جھامرہ میں جمع تھے۔ جہاں ہم نے سات سو مویشی قبضہ میں کئے اور جھامرہ کو نذر آتش کر دیا۔ دوسرے روز قابل وثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ احمد خان اپنے ساتھیوں سمیت موضع اکبر کے، کے قریب موجود ہے، کیپٹن بلیک اپنے ایک سو پچاس سواروں کے ساتھ لیفٹیننٹ جی چسٹر کے دستوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جہاں باغیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ رسالدار مارا گیا، کئی گھوڑ سوار گر پڑے اور گھمسان میں کافی نقصان پہنچا۔ اس مہم میں احمد خان کھرل، اس کا بھتیجا مراد اور سردار سانگ بھی شامل تھا۔

ملتان کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہے، جس میں ولی داد مردانہ حائل تھا۔

مسٹر بر کلے کو کوڑے شاہ روانہ کیا گیا لیکن وہ رابطہ پیدا نہ کر سکا۔ باغی اپنے قبائلی سرداروں بہاول، سجاول اور ولی داد کی قیادت میں جمع تھے۔ بر کلے کو مقابلے میں تھوڑی سی کامیابی ہوئی وہ دوسرے روز احتیاط کے بغیر جنگل میں داخل ہو گیا، جہاں باغیوں نے حملہ کر دیا۔ اس کے سپاہی منتشر ہو گئے۔ بر کلے کے بازو میں گولی لگی۔ اس نے اپنی تلوار سے حفاظت کی کوشش کی لیکن مراد فتیانہ کے نیزے کا وار مہلک ثابت ہوا۔

لیکن احمد خاں کھرل کی کہانی سرکاری رپورٹوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ سیکڑوں مقامی روایات نے اس مجاہد اور اس کے ساتھیوں کے گرد عقیدت کا جال بن رکھا ہے۔ بعض مقامی روایات کے مطابق یہ جنگ محض راجپوتی غیرت کا سوال تھی۔ انگریزوں نے احمد خاں کھرل سے اس کی گھوڑی مانگی تھی۔ اس نے انکار کیا جس کے نتیجے میں مہینوں تک جنگ ہوتی رہی۔

موچی والا (جھنگ) کے ایک ڈھولئی ماہمند (محمد) ولد امیر نور محرمی بلوچ کے لفظوں میں بر کلے آیا اور اس نے احمد خان کھرل سے گھوڑی مانگی۔ احمد نے انکار کیا۔ بر کلے نے کہا میں تجھے مروا دوں گا اور لندن سے فوج منگوا کر تیرے وقار کا خاتمہ کر دوں گا اور اگر تو گھوڑی دے دے تو لندن سے تجھے سند منگوا دوں گا۔ احمد خان کے پاس مورنی ذات کی خوبصورت گھوڑی تھی۔ بر کلے نے پولیس منگوا کر احمد کے گاؤں جھامرہ نزد منڈی تاندلیانوالہ کو لوٹ لیا۔ اس وقت احمد گاؤں میں نہ تھا۔

بار کے علاقے میں احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اسی طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ ڈھولوں میں بھی کم وبیش یہی خیالات ملتے ہیں۔ لیکن تاریخ ہمیں اس سے مختلف کہانی سناتی ہے۔ یہ بغاوت ایک شخص کے ذاتی وقار کا مسئلہ ہرگز نہ تھی نہ ہی یہ کسی ایک شخص کی خواہش پر شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

جنگ کا آغاز انگریزوں کو لگان دینے سے انکار پر ہوا۔ واقعات کے مطابق موضع سکھو کا (تحصیل پاک پتن) کے جوئیا قبیلے نے انگریزی حکومت کو لگان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ 8 جولائی کا واقعہ ہے۔ حکومت اس واقعہ کو دبانے میں کامیاب ہو گئی۔ اسی مہینے کی 26 تاریخ کو احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں نے ضلع کے صدر مقام گوگیرہ کی جیل پر حملہ کر کے تمام قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ احمد خان انگریزوں کی نگرانی کے باوجود خفیہ طور پر بغاوت کی تیاریاں کر رہا تھا اور گوگیرہ جیل پر حملہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ جیل کے تصادم میں انگریزی سپاہ اور مقامی قیدیوں کے پچاس سے زائد آدمی مارے گئے۔ حکومت قیدیوں کی رہائی سے زیادہ احمد خان کھرل کی روپوشی سے خوفزدہ تھی۔ اس کی گوریلا کارروائیاں حاکموں کے گرد گھیرا تنگ کرتی جا رہی تھیں۔ جب حکومت احمد خان گھرل کی سرگرمیوں کو روکنے اور اسے گرفتار کرنے میں پوری طرح ناکام ہو گئی تو اس نے ایک چال چلی۔ تمام مقامی سرداروں کو بلا کر سرزنش کر دی گئی کہ وہ ضلع کے صدر مقام تک محدود رہیں اور اگر کہیں بہت ضروری جانا پڑی تو حکام کی اجازت لے کر جائیں۔ اس چال سے حکومت کا مقصد یہ تھا کہ احمد خان کھرل کے ساتھیوں کی سرگرمیاں ایک جگہ تک محدود ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مجبور ہو کر گوگیرہ (ضلعی صدر مقام) اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے آئے گا اور گھیر کر مار لیا جائے گا۔ ان اقدامات کے ساتھ حکومت فوج کی تعداد میں بھی برابر اضافہ کرتی رہی۔

مگر حکومت کی یہ چال ناکام ہو گئی۔ احمد خان کھرل کو گرفتار نہ کیا جا سکا اور سرگرمیوں کا دائرہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ حکومت نے اب دوسری چال چلی اور دریائے راوی کے تمام سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ 17 ستمبر کو کمالیہ میں حکومت سے مذاکرات کریں۔ ان مذاکرات کے ذریعے حکومت ان سرداروں کو خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ 16 ستمبر کی رات احمد خان کھرل نے فرداً فرداً تمام سرداروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں مجبور کیا کہ وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات کا بائیکاٹ کریں چنانچہ بیشتر سردار اسی رات کمالیہ سے نکل کر اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ گئے اور جنگی جتھوں کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

سرفراز کھرل، جس نے پہلے 1831ء میں لیفٹیننٹ برنس کو لاہور کے سفر کے دوران کافی مدد دی تھی اور جو سکھوں کی دوسری لڑائی میں انگریزوں کی طرف سے لڑا تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو سارے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے فوری طور پر بغاوت کو روکنے کے سلسلے میں چند اقدامات کئے۔ ملتان ڈویژن کے کمشنر اور ہڑپہ تحصیل کے افسروں کو متوقع حالات سے خبردار کیا اور بیس سواروں کے ساتھ برکلے کو احمد کھرل کی گرفتاری کے لئے روانہ کیا۔ لیکن وہ احمد خان کھرل کو گرفتار کرنے کی حسرت دل میں لئے واپس گوگیرہ پہنچ گئے۔ ڈپٹی کمشنر الفنسٹن سرکاری خزانے اور صدر دفتر کو گوگیرہ سے ہڑپہ منتقل کرنے کے بعد برکلے کو ساتھ لے کر احمد خان کھرل کو مارنے نکلا۔ احمد خان اپنے گاؤں جھامرے میں نہیں تھا۔ ''منصف حاکموں'' (غالب کے لفظ ہیں) نے اپنے دشمن کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام گاؤں کو جلا دیا۔ اس یک طرفہ جنگ میں سات سو جانور اور بیس آدمی انگریزوں کے

ہاتھ لگے۔ احمد خان کی طاقت پر یہ ایک کاری ضرب تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ وٹو قبیلے کے سرداروں کو ساتھ ملا کر اس نے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کا منصوبہ بنایا۔ ادھر انگریز لاہور سے دھڑا دھڑ فوج منگوار ہے تھے ادھر، جھامرہ کو آگ لگانے کے بعد برکلے کوڑے شاہ پہنچ چکا تھا۔ وہ ہڑپہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملتان سے مواصلاتی رابطے بحال کرنے کی کوششوں میں مصروف بھی تھا۔

احمد خان کافی تیاری کے بعد گوگیرہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے چل پڑا تھا۔ برکلے بھی گوگیرہ پہنچ گیا لیکن ناسازگار حالات کے نتیجے میں گوریلا حکمت علمی کو اپناتے ہوئے احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں نے قریبی جنگلوں میں چھپنا مناسب سمجھا۔ جب الفنسٹن کو خبر ملی کہ کھرل اور وٹو، گوگیرہ سے چھ میل دور کشکوری کے جنگل میں چھپے ہوئے ہیں تو اس نے انہیں گھیرے میں لینے کا پروگرام بنایا لیکن کیپٹن بلیک اور لیفٹیننٹ جسٹر کو جنگل میں منہ کی کھانی پڑی اور انہیں بیس انگریزوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ حریت پسندوں کی طرف سے احمد خان اور سارنگ کھرل لڑتے ہوئے مادر وطن پر قربان ہو گئے۔

احمد خان کی شہادت کے بعد مراد فتیانہ برکلے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کوڑے شاہ کے قریب ایک بار پھر برکلے اور مجاہدین آزادی کا سامنا ہوا۔ اس جنگ میں برکلے اور اس کے پچاس آدمی مارے گئے۔ برکلے کی موت کی تفصیل ماچھی والا کا ماہمند ڈھولئی اس طرح بیان کرتا ہے۔

''مراد، برکلے کے سامنے آیا اور مراد کے حامی، انگریز کی یونٹوں سے لڑنے لگے۔ مراد کے پاس اس وقت سانگ (نیزہ بازی کا ہتھیار) اور برکلے کے پاس تلوار تھی۔ مراد نے سانگ ماری اور برکلے چالاکی کے ساتھ اچھل پڑا اور سانگ گھوڑے کی زین کو چھیرتی ہوئی نکل گئی۔ لڑائی کے دوران برکلے نے سانگ کا اگلا سرا پکڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچتا رہا تا کہ مراد قریب آ کر مارا جا سکے۔ اچانک ایک چرواہے سوجے بھادروں نے یہ دیکھا تو اس نے سوچا کہ اس سے تو مراد مارا جائے گا۔ وہ بھیڑیں چھوڑ کر ادھر کو بھاگا۔ اس کے پاس صرف ایک لاٹھی تھی۔ اس نے وہی لاٹھی پورے زور سے برکلے کے سر پر دے ماری۔ اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور مراد کی سانگ نے اس کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

یاد رہے کہ انگریزی رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ برکلے کے بازو میں گولی لگی جس سے وہ گر پڑا تھا اور مراد کی سانگ کا نشانہ بن گیا تھا۔

مراد فتیانہ، احمد کھرل کی موت کا انتقام لینے کے بعد روپوش ہو گیا۔ انگریزوں کے لئے برکلے کی موت ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے جھنگ سے بہاولپور تک لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ مراد کو گرفتار کرنے کے لئے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ حکومت نے اس کی جائیداد ضبط کر لی۔ اس کی اولاد کو جیل میں بند کر دیا، لیکن اس کے بیٹے اور بیٹی نے لاکھوں سختیوں کے باوجود اپنے باپ کا پتہ نہ بتایا۔ مراد فتیانہ مدت تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد پشاور

کے راستے افغانستان چلا گیا۔ مراد کی بیٹی حاملہ تھی۔ جیل میں ہی اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ مراد فتیانہ کا بیٹا اور بیٹی جیل میں ہی سختیاں برداشت کرتے کرتے آخر کار ختم ہو گئے۔

غداریوں کا لوک بیانیہ:

لیکن ہماری بات ختم نہیں ہو سکتی جب تک ہم مقامی غداروں کی بات نہ کر لیں۔ سرفراز کھرل کے علاوہ ملتان کے صادق محمد خان نے انگریزوں کے لئے نہ صرف ایک سو سوار بھرتی کرائے بلکہ گوگیرہ کی لڑائی میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ بھی دیا۔ بغاوت کچلے جانے کے بعد اسے ملتان کا انکم ٹیکس افسر بنا دیا گیا۔

دہاڑا سنگھ بھی انگریزوں کی طرف سے لڑا اور تین سو روپے سالانہ منصب کے علاوہ کشکوری اور دان مہر سنگھ کے گاؤں جاگیر میں پائے۔ مقامی روایت کے مطابق احمد خان کھرل کا قاتل رائے بیدی نامی شخص تھا۔

سردار نہال سنگھ کو اپنی خدمات کے صلے میں دس ہزار روپے نقد اور چھ ہزار روپے کی جاگیر ملی تھی۔ اس نے خفیہ خبر رسانی کے علاوہ فوج کی بھرتی کا کام بھی کیا۔

انگریزوں سے جاگیریں پانے والوں میں جیوے خان، سردار شاہ، مراد شاہ، بابا کھیم سنگھ، بابا سمپورن سنگھ، کنہیا رام، دھارا سنگھ، ماجھی سنگھ اور جماعت سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔

1857ء کی ناکام بغاوت کے بعد بھی آزادی کے پروانوں نے غیر ملکی حکمرانوں پر پلٹ پلٹ کر وار کیئے۔ نامدھاری یا کوکا تحریک کے مجاہدین توپ دم کیئے گئے۔ بیسیویں صدی کے آغاز میں نئی بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ 09-1907ء کے دوران باروں کے کسان اٹھ کھڑے ہوئے اور پگڑی سنبھال جٹا کے نعرے گونج اٹھے۔ 1913ء میں کینیڈا کے پنجابی محنت کشوں نے غدر پارٹی قائم کی اور انگریزی راج کا تختہ الٹنے کی ایک اور کوشش کی۔ 1914ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑی تو پنجاب کے کئی اضلاع میں فوجی بھرتی کے خلاف شدید مزاحمت ہوئی۔

پنجاب میں فوجی بھرتی کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کی تفصیل میں جانے کے لئے محض انگریزی ریکارڈ کو دیکھنا ہی کافی ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کے کسانوں کی اکثریت نے فوج میں بھرتی ہونے کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کے لئے جو جبری حربے آزمائے گئے۔ ان کی تفصیل ہم آگے جا کر بیان کریں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ لوگ فوج میں بھرتی ہوئے اور ان کی بھرتی کا سبب محض انگریزی جبر نہیں تھا۔ فوجی بھرتی کے سماجی اور معاشی عوامل ڈھونڈنے کے لئے ہمیں گزشتہ سو سال کے پنجاب بلکہ ہندوستان کی سماجی اور معاشی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ہوگی اور پہلی جنگ آزادی سے پہلی جنگ عظیم تک پنجاب میں وقتاً فوقتاً ہونے والی لوک مزاحمت کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔

رجنی پام دت اپنی کتاب ''نیا ہندوستان'' میں لکھتے ہیں کہ ''ہندوستانی صنعتوں کی اصل تباہی انیسویں صدی کے پہلے پچھتر سالوں میں ہوئی۔ بڑے بڑے صنعتی شہر، جن کی آبادی کبھی بہت زیادہ تھی تباہ ہو گئے۔ آبادی

شہروں کو چھوڑ کر دیہات میں جا بسنے پر مجبور ہوئی۔اس کے ساتھ ساتھ لاکھوں دیہاتی دستکار روزگار سے محروم کر دیئے گیے۔ چنانچہ زراعت پر گزارہ کرنے والی آبادی کا تناسب بہت بڑھ گیا۔ 1894ء میں سر چارلس ٹریسیلین نے دارالعلوم کی منتخب کمیٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہم نے ان کی صنعتوں کو ختم کر دیا ہے۔ان کے پاس اب کچھ نہیں رہا ہے۔سوائے اس کے کہ وہ اپنی زمینوں کی پیداوار پر گزارہ کریں۔''

ہندوستان میں ولایت کے بنے ہوئے کپڑوں اور برتنوں کی بڑی مقدار میں درآمد اور خود ہندوستان میں مغربی طرز کی بڑی بڑی کمپنیوں کے قیام نے بہت سی دیہی صنعتوں کو کم وبیش تباہ کر دیا۔ زرعی پیداوار کی قیمتیں بڑھ گئیں، جس کی وجہ سے بہت سے دستکاروں نے اپنا خاندانی پیشہ ترک کر دیا اور زراعت کی طرف رُخ کرنے لگے۔ زمین پر ضرورت سے زیادہ بوجھ پڑنے کا نتیجہ قحط کی شکل میں برآمد ہوا۔

کسانوں میں بے چینی کا ایک بڑا سبب زمین پر نا قابل برداشت بوجھ کا پڑنا تھا اور بھی بہت سے مسائل تھے جن کی طرف حکومت ہند حد درجہ بے نیازی اور لاپرواہی برتتی تھی۔

25 جون 1853ء کے نیویارک ڈیلی ٹریبیون میں مارکس نے حکومت کے اس مجرمانہ تغافل کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

''ایشیا میں زمانہ قدیم سے حکومتوں کے صرف تین محکمے چلے آرہے تھے۔ایک مالیات، یا ملک کی اندرونی آمدنی کے لوٹنے کا، دوسرا جنگ یا بیرونی ملکوں کے لوٹنے کا اور آخری رفاہ عامہ کا۔۔۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے دو یعنی مالیات اور جنگ کے محکموں کو جاری رکھا اور رفاہ عامہ کے کام سے بالکل غفلت برتی اور اس لئے ہندوستان کی زراعت جو برطانیہ کے آزاد مقابلے کے اصول پر نہیں چل سکتی تھی، تباہ ہونا شروع ہو گئی۔

ایک اور چیز، جس نے کسانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی وہ مالگزاری کا نظام تھا۔ پنجاب اور ہندوستان بھر میں صدیوں سے چلے آنے والے جمع بندی کے طریق کو فرسودہ قرار دے کر جو نیا طریق رائج کیا گیا وہ اتنا سخت اور غیر لچک دار تھا کہ زمینیں تیزی سے کسانوں کے ہاتھوں سے نکلنی شروع ہو گئیں اور جاگیر داروں کے لئے خود بخود راستہ صاف ہوتا گیا۔

بقول تھامس اور گیرٹ:

''پنجاب میں جمع بندی کا نیا طریقہ کار نافذ کر کے سکھ انتظامیہ، کاشت کاروں سے جتنا لیتی تھی اس کے مقابلے میں کچھ کمی کر دی گئی لیکن یہاں بھی مال گزاری نقدی کی صورت میں وصول کی جانے لگی۔ پیداوار کی کمی بیشی سے بے نیاز ہو کر وصولی کو اتنا سخت کر دیا گیا کہ پچھلی رعایتوں سے کسانوں کو جو فائدہ حاصل ہوا تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا۔

ہندوستان میں پنچایتی نظام کی انگریزی شکل بھی کسانوں کی عام بے چینی کا سبب بنی۔

مارکس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا:

''اگر کسی قوم کی تاریخ، معیشت کے ناکام اور سچ پوچھئے تو بے معنی اور عملی اعتبار سے نہایت ذلیل تجربوں سے بھری ہوئی ہے، تو وہ ہندوستان میں انگریزوں کے نظم و نسق کی تاریخ ہے۔ بنگال میں انہوں نے بڑے پیمانے پر انگریزی نظام اراضی کا مضحکہ خیز خاکہ اتارا ہے۔ جنوب مشرقی ہندوستان میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی قائم کئے ہیں۔ شمال مغرب میں انہوں نے پوری کوشش کی کہ ہندوستانی پنچایت اور زمین کی پنچائیتی ملکیت کو خود اس کی بے معنی نقل بنا کر چھوڑ دیں۔

لارڈ کارنوالس نے بندوبست دوامی کے ذریعے برطانیہ کی طرز پر جاگیرداروں اور ہندو بنیوں کا جو طبقہ پیدا کیا وہ کسانوں کی بے چینی کا سب سے زیادہ باعث بنا۔ اس طبقے کا مفاد اس میں تھا کہ انگریزی سامراج ہمیشہ قائم رہے تاکہ عوام کی لوٹ کھسوٹ میں کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہ ہو۔ یہ طبقہ سیاسی طور پر غیر ملکی آقاؤں کا حلیف بنا اور آزادی کی تحریکوں میں ارض وطن سے غداری کا مرتکب ہوتا رہا۔

بندوبست دوامی کے نفاذ کے باعث کسان غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیئے گئے۔ کسانوں کی مشکلات میں ساہوکاروں نے بے حد اضافہ کیا۔ بڑے بڑے انگریز مصنفین نے قرض کو لعنت قرار دیتے ہوئے کسانوں کی فضول رسومات کا جا بجا مذاق اڑایا ہے۔ انہوں نے اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے کہ ہندوستان کے عوام اپنی فضول خرچیوں کے نتیجے میں آئے دن مصیبتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ زمین سے لے کر ان کے ہل بیل تک قرق ہو جاتے ہیں اور انہیں ہل کی جگہ ہاتھوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ایک جنوبی ہندوستانی کسان عوت، ایک لوک گیت میں ساہوکار سے کہتی ہے کہ سب کچھ قرق ہو چکا اب یہ میری دو چھاتیاں رہ گئی ہیں انہیں بھی اپنے کھاتے میں درج کرلو۔

شادی بیاہ ماتم اور دیگر رسومات یقیناً فضول ثابت کی جاسکتی ہیں لیکن جہاں تک کسانوں کی تباہی کا سوال ہے، محض رسومات اس کا باعث نہیں ہیں۔ 1875ء کی رعیت رپورٹ میں شادی اور دوسری تقریبات اخراجات کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان اخراجات کی وجہ سے کسانوں کا بوجھ بڑھتا تھا لیکن اسے کسانوں کی تباہی کی اصل وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ 1880ء کے قحط کمیشن کی رپورٹ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ایک تہائی ایسے کسان ہیں، جن کے پاس زمین ہے، مگر وہ قرض میں اس بری طرح سے دھنسے ہوئے ہیں کہ ان سے نکلنا، ان کے لئے ناممکن ہے۔ پنجاب میں ساہوکارہ کے تسلط کو سمجھنے کے لئے ایم۔ ایس ڈارلنگ کی ان سطور پر محض ایک نظر ڈالنا ہی کافی ہوگا۔

''زمین رہن رکھنے کا جو طریقہ سکھوں کے زمانے میں شاذ ہی نظر آتا تھا۔ اب ہر گاؤں میں عام ہوگیا تھا۔

1878ء تک سارے صوبے کا سات فی صد رقبہ رہن ہو چکا تھا۔ 1880ء میں زمین کے مالک کسان اور ساہوکار کی غیر مساوی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا اور ساہوکار کو زبردست کامیابی ہوئی۔ تیس سال تک ساہوکار اپنے انتہائی عروج پر رہا۔ اس نے اپنی دولت میں بے حد اضافہ کیا اور بہت مالدار اور خوش حال بن گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنکروں اور ساہوکاروں کی تعداد ان کے لواحقین کو شامل کر کے 1868ء میں 53253 اور 1911ء میں 1,93,890 ہو گئی۔"

برطانوی ہندوستان کا کسان ان عظیم مسائل سے بار بار ٹکرایا۔ یہاں چند کسان بغاوتوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سب سے پہلے 1783ء میں بنگالی کسانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف مسلح بغاوت کی۔ 1857ء کی جنگ آزادی سے صرف دو سال قبل سنتھال کسانوں نے جاگیرداروں، ساہوکاروں اوان کی محافظ انگریز حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کی۔ جنگ آزادی نے پنجاب میں کسانوں اور دستکاروں کی ایک عظیم لہر کو جنم دیا جو کوکا (نامدھاری) تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ 1871ء میں نامدھاریوں کا انگریزوں سے براہ راست تصادم ہوا جس میں سرزمین پنجاب کے بے شمار سپوت شہید کر دیئے گئے۔ یہ تحریک بظاہر کچل دی گئی لیکن باقی ماندہ نامدھاری وقتاً فوقتاً شورش برپا کرتے رہے۔ یہ تحریک بظاہر مذہبی اور اصلاحی تھی لیکن اس کا کردار سامراج دشمن تھا۔ چنانچہ اسی لئے نامدھاریوں نے ہتھیار بند تحریک چلائی۔ وہ جہاں گوشت خوری، شراب نوشی اور بچپن کی شادیوں کے مخالف تھے وہاں انہوں نے سرکاری سکولوں، عدالتوں، ڈاک خانوں اور غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک بھی چلائی۔

1860ء میں نیل پیدا کرنے والے بنگالی کسانوں نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بڑی ہڑتال کی جس میں حکومت جھکنے اور کسانوں کے مطالبات منظور کرنے پر مجبور ہو گئی۔ 73-1872ء میں بنگال کے بینہ اور بوگرہ ضلعوں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ 1875ء میں پونا اور احمد نگر کے کسان اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بغاوت لگانوں، ساہوکار کی من مانیوں اور قرضے کے بدلے میں جائیداد کی قرقیوں کے خلاف تھی۔ مارواڑی اور گجراتی ساہوکاروں کو بھاگ کر جانیں بچانا پڑیں۔ کسانوں نے ان کے تمام کاغذات جلا دیئے۔ 1836ء سے 1896ء تک مالابار کے مسلمان کسان موپلوں کی کئی بغاوتیں ہوئیں۔ 1849ء کی بغاوت بری طرح کچل دی گئی۔ پولیس کے ایک ہی ہلے میں چونسٹھ موپلے مارے گئے۔ 52-1851ء میں پھر آگ سلگی۔ کسان موپلوں کی غصے میں بھری ہوئی ایک ٹولی نے کلکٹر کنولی کے بنگلے پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ انہیں پولیس اور فوج نے گھیر لیا۔ سات دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ موپلے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ لیکن کسی نے ہتھیار نہ پھینکے۔ 70-1860ء کے دوران تمام ملک زرعی پسماندگی کا شکار تھا۔ کسانوں کے لئے سرکاری ٹیکس ادا کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ قرض خواہوں کی طرف سے لئے گئے قرضے کے بدلے میں کسانوں کی جائیداد کی قرقی کے لئے عدالت کے جاری کردہ ڈگریوں نے ان کی مصیبتوں کو دو چند کر دیا۔ اسی طرح 1873، 1883، 1885، 1894، اور 1896ء میں انہوں نے بار بار بغاوتیں کیں۔ صرف 1873ء کی موپلا بغاوت میں ایک ہزار کسانوں کو درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ 80-1870ء میں ہندوستانی

کسانوں کی بے چینی نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس دور کے متعلق ریٹائرڈ آئی سی ایس، اے او ہیوم نے لکھا تھا:
''مجھے اس وقت بھی کوئی شک نہیں تھا اور نہ اب ہے، کہ ان دنوں ہم ایک بھیانک انقلاب کے سنگین خطرے کی زد میں تھے۔''

پنجاب میں بیسویں صدی کی ابتداء ہی کسان بغاوتوں سے ہوئی۔ ''انجمن محبان وطن'' کا قیام پنجاب کی سیاسی تاریخ میں ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس انجمن کی سرگرمیوں کا اندازہ ہم 07-1906ء کی بار کے علاقوں کی کسان بغاوت سے لگا سکتے ہیں۔
رجنی پام دت نے اپنے کتابی سلسلے ''نیا ہندوستان'' کے ایک پمفلٹ میں تحریک آزادی کو جن پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں 10-1905ء کا دور جدوجہد کی پہلی عظیم لہر کا دور ہے اور یہی وہ دور ہے جب پنجاب ایک مرتبہ پھر ہندوستان گیر سیاست کا محور بن گیا۔

پگڑی سنبھال جٹا:

پنجاب میں ''بار'' کے نام سے پکارے جانے والے علاقوں میں زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے مدتوں سے بنجر پڑے تھے۔ آب پاشی کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث یہ ٹکڑے قریب قریب ناقابل کاشت تھے۔ نہروں کی کھدائی کے بعد کسی حد تک آب پاشی کا مسئلہ حل ہوا تو زمینوں کی آبادکاری کا سوال پیدا ہوا۔ ایک وقت یہ تھی کہ جنگل کون صاف کرے۔ ان کاموں کے لئے محنتی کسان ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ مرکزی اضلاع کے کسانوں سے کہا گیا کہ وہ ان جنگلوں کو صاف کریں اور بنجر زمینیں آباد کریں۔ انہیں ترغیب دی گئی کہ بہت ہی آسان شرطوں پر ان کو ملکیت کے حقوق دے دیئے جائیں گے۔ کسانوں نے اپنی آباد زمینیں دوسرے ہاتھوں میں سونپ کر نئی زمینوں کی آبادکاری کا کام شروع کر دیا۔ جس لگن اور محنت کی ضرورت تھی اسے بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے ان جنگلوں کو سونے کے وسیع میدانوں میں بدل دیا۔ اب محنت کا پھل سامنے تھا۔ وہ نئی زمینوں کے مالک بننے والے تھے لیکن باری دوآب ایکٹ میں چند ترامیم کے ذریعے مقررہ شرطیں بوجھل بنادی گئیں نہری پانی کا ٹیکس بڑھا دیا گیا۔ قانون بنا دیا گیا کہ کوئی آبادکار سرکاری اجازت کے بغیر اپنی زمین میں سے درخت نہیں کاٹ سکتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زمین کے مالک آبادکار نہیں بلکہ حکومت ہے۔ انگریز چاہتے تھے کہ اس قانون کے ذریعے کسانوں کو کمزور کر کے بڑے بڑے انگریز اور ان کے حاشیہ بردار پنجابی جاگیردار ان زمینوں کے مالک بنا دیئے جائیں اور حقیقی مالکوں کو ان کے تحت مزارعین کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ ان سرکاری اقدامات نے کسانوں کو بھڑکا دیا۔ چناب کالونی اور باری دوآب کے کسان اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ آگ اور بھڑک اٹھی جب ضلع لائلپور کے متاثرین باغیوں میں شامل ہو گئے۔ اس آگ کے شعلے راولپنڈی تک گئے۔ بڑی بڑی کی کسان ریلیوں کے ذریعے کسانوں نے اپنی ناراضگیوں کا اظہار کیا۔ صوفی انبا پرشاد، لالہ لاجپت رائے، ضیاء الحق، بانکے دیال، اجیت سنگھ اور سید حیدر رضا اس

تحریک کے قائدین میں سے تھے۔ انہی دنوں "پگڑی سنبھال اوئے جٹا" کا گیت فضاؤں میں بلند ہوا جس نے پنجاب بھر میں بغاوت کی آگ روشن کردی۔ کسانوں کے ساتھ ساتھ شہروں کے پڑھے لکھے نوجوان بھی میدان میں کود پڑے۔ یہ بغاوت زور پکڑ گئی۔ تولائل پور کے قریب کسانوں نے ریل کی پٹریاں اکھیڑ پھینکیں۔ دیہات میں بچہ بچہ انقلابی گیت گانے لگا:

پگڑی سنبھال جٹا، پگڑی سنبھال اوئے
لُٹ لیا مال تیرا، کیتا بے حال اوئے

انگریزوں کے خلاف نفرت یہاں تک بڑھی کہ انہیں اپنی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی اور مجبور ہو کر انہوں نے بار کے قانون میں اپنی ترامیم واپس لے لیں۔

اس بغاوت کا مقابلہ 1855ء کی سنتھال کسانوں کی بغاوت سے کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سنتھالوں نے بھی بڑی محنت سے جنگل صاف کر کے زمینیں آباد کی تھیں لیکن انگریزوں نے ان سے وہ زمینیں چھین کر بڑے بڑے جاگیرداروں کے حوالے کر دیں اور انہیں جنگلوں کی طرف دھکیل دیا۔ دوسری مرتبہ انہوں نے جنگل صاف کر کے زمینوں کو قابل کاشت بنایا لیکن جاگیردار اور ساہوکار پھر آ دھمکے۔ اب کے نہ صرف ان کی زمینیں اور فصلیں ہتھیالی گئیں بلکہ ان کی عورتیں اور بچے بھی قرق کر لئے گئے۔ جس کے نتیجے میں بہت بڑی بغاوت رونما ہوئی۔ اس بغاوت میں پندرہ سے پچیس ہزار تک کسان شہید ہوئے۔ یہ بغاوت بری طرح کچل دی گئی۔ 07-1906ء کی بار کے کسانوں کی بغاوت میں کامیابی دراصل اس طبقاتی شعور کی کامیابی تھی جس کے نقوش دھندلے سہی لیکن آہستہ آہستہ ایک شکل اختیار کر رہے تھے۔

روزگار کی تلاش میں ملایا، ہانگ کانگ، شنگھائی، فلپائن، آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا اور جنوبی امریکہ جا کر آباد ہونے والے پنجابی کسانوں کو جب پردیس میں ہندوستان کی سیاسی غلامی کا شدت سے احساس ہوا تو انہوں نے 1913ء میں امریکہ میں غدر پارٹی بنائی۔ اس پارٹی کے انقلابیوں نے وطن واپس آ کر مسلح انقلاب کی کوشش کی۔ فوج کے کچھ حصوں کو ساتھ ملایا لیکن ان کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ سپیشل ٹریبونل کے ذریعے پہلے لاہور سازش مقدمے میں بیشتر انقلابیوں کو پھانسیوں کی سزائیں دی گئیں۔ "ریشمی چٹھیوں کی تحریک" بھی کچل دی گئی۔

1915ء میں ملتان میں بڑے پیمانے پر کسانوں کی بغاوت ہوئی۔ اوڈوائر نے اپنی کتاب "India as I knew it" میں اس بغاوت کا ذکر کیا ہے لیکن ہم نے اپنی معلومات کا انحصار مقامی روایات پر کیا ہے۔ مسلمان کسان ساہوکاروں کے ہاتھوں بری طرح لوٹے جا رہے تھے۔ یہ بات مشہور ہوگئی کہ انگریز جنگ میں ہار گیا ہے اور ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ کسان، دیہاتوں سے اکٹھے ہو ہو کر ملتان پہنچنے لگے۔ انہوں نے سرکاری دفاتر تباہ کر دیئے۔ یونین جیک جلا دیا۔ دکانیں لوٹیں اور حساب کتاب کے تمام کاغذات پھونک ڈالے۔ چار ہزار کسانوں کو

گرفتار کر کے ملتان کے بندی خانوں میں ڈال دیا گیا۔ پانچ سو سپیشل ٹربیونلوں کے ذریعے سزائیں دی گئیں۔ دیہات میں تعزیری پولیس چوکیاں بٹھادی گئیں۔

یہ دن تھے جب پہلی جنگ عظیم کے دیو نے انگریزی سامراج کی طاقت کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا اور اس کی ساری توجہ ہندوستان میں رنگروٹوں کی اندھادھند بھرتی پر مرکوز ہوگئی تھی۔

جبری فوجی بھرتی:

پہلی جنگ عظیم کے دوران بھرتی کے نتیجے میں ہندوستان بھر سے سات لاکھ چھبیس ہزار رنگروٹ بھرتی کیے گئے۔ ان میں سے تقریباً نصف یعنی ساڑھے تین لاکھ نفوس صرف پنجاب نے دیے۔ باقی صوبوں کے رنگروٹوں کی بھرتی کا تقابل کرنے کے لیے حسب ذیل گوشوارہ دیکھنا مفید رہے گا۔

صوبے کا نام	آبادی	رنگروٹوں کی تعداد
شمالی مغربی سرحدی صوبہ	30لاکھ	32000
پنجاب	240لاکھ	3,50,000
یوپی	460لاکھ	1,42,000
بمبئی	270لاکھ	35,000
بنگال	480لاکھ	6000
بہار اور اڑیسہ	380لاکھ	8000
مدراس	480لاکھ	46,000
سی پی	160لاکھ	5000
آسام	80لاکھ	1000
برما	130لاکھ	13,000
اجمیر	5لاکھ	8000

اوڈوائر کے لفظوں میں پنجاب نے لڑائی کے شروع میں ہی جوان اور افسر ملا کر، کوئی ایک لاکھ کی نفری میدان میں اتار دی۔ جنگ کے خاتمے تک پانچ لاکھ پنجابی فوجی الگ الگ پلٹنوں کے شعبوں میں خدمت کر چکے تھی۔ چار سالہ لڑائی کے دوران سارے ہندوستان میں کی گئی فوجی بھرتی کے نصف سے، پنجاب میں سے کی گئی بھرتی کی نفری تین لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ اپنی تصنیف ''جلیانوالہ باغ'' میں دی۔ این دت لکھتے ہیں:

''پنجاب کی آبادی تو تمام ملک کی آبادی کا تیرہ فی صد تھی لیکن فوجی رنگروٹوں کی بھرتی یہاں سے ساٹھ فی

صد ہوئی۔

1917ء میں فوجی بھرتی کا کام سول ایڈمنسٹریشن نے سنبھال لیا۔ مئی میں حکومت ہند نے ایک مرکزی فوجی بھرتی بورڈ قائم کیا۔ اسی طرح کے صوبائی فوجی بھرتی بورڈ قائم کئے گئے۔ صوبائی بورڈ کا سربراہ صوبے کا لیفٹیننٹ گورنر ہوتا تھا۔ اوڈوائر کے لفظوں میں ''ایک جولائی 1917ء سے لے کر ایک سال میں پنجاب میں سے دو لاکھ چار ہزار رنگروٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حکومت پنجاب کے ایڈیشنل سیکرٹری مسٹر ایل فرنچ کے مطابق جولائی 1917ء سے لے کر مارچ 1918ء تک 13610 کی ماہانہ اوسط بھرتی کے حساب سے کل بھرتی ایک لاکھ بائیس ہزار چار سو بانوے تک پہنچ گئی تھی لیکن مائیکل اوڈوائر کے حساب کے مطابق صرف سات مہینوں میں ایک لاکھ لڑاکا رنگروٹ سپاہی بھرتی ہوئے۔ فروری 1918ء تک بھرتی کی مہموں نے پنجاب کو ایک طرح سے تھکا مارا تھا اور مزید بھرتی کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار فوجی بھرتی کے معاملے میں بظاہر پنجاب کے زبردست جوش و خروش کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگ عظیم میں برطانوی سامراج کو شکست سے بچانے کے لئے پنجاب نے اپنے آخری بچے تک کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اگر ہم ان اعداد و شمار کو سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھیں تو یقیناً ہر کوئی اسی نتیجے پر پہنچے گا، لیکن اس زبردست فوجی بھرتی کے پیچھے چند ایسے معاشی، سماجی اور سیاسی عوامل کام کر رہے تھے جن کی طرف ہم اس مقالے کے پہلے حصے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ انگریزوں نے پنجاب میں جس قسم کی جاگیرداری کو رواج دیا تھا اس میں ایک آدمی سینکڑوں ہزاروں کسانوں کی محنت اور جان و مال کا مالک بن سکتا ہے۔ چنانچہ فوجی بھرتی کے سلسلے میں ایک آدمی کی رضامندی سیکڑوں ہزاروں افراد کی مرضی بن جایا کرتی تھی۔ جنگ کے ابتدائی سالوں میں تیزی سے ہونے والی فوجی بھرتی نئے جاگیردارانہ نظام کی مرہون منت تھی۔ انعام، جاگیر اور خلعت کے لالچ میں فوجی بھرتی کرانے والے کارکنوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے جاگیرداروں میں تبدیل ہو گیا۔ یہی جاگیردار اپنے سیکڑوں مزارعین کو زبردستی جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے۔

زمین پر پڑنے والے ناقابل برداشت بوجھ، بے کاری اور فاقہ کشی نے بھی لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا۔ ساہوکار کی زیادتیوں نے کسانوں کو فوجی بھرتی کی صورت میں راہ فرار مہیا کر دی۔ وہ ماہانہ تنخواہ میں سے اپنے سود در سود قرضوں کو چکانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

ڈیرہ غازی خان ضلع کی وار ہسٹری کی رپورٹ میں 1918ء کے ابتدائی دنوں میں بلوچستان کے مری قبیلے نے فوجی بھرتی کے کام میں مزاحمت کے سلسلے میں زبردست کردار ادا کیا۔ بلوچستان انتظامیہ کی درخواست پر حکومت پنجاب نے ڈیرہ غازی خان سے فوجی مدد بھیجنے کے ساتھ ساتھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اینڈریوز کی

سرکردگی میں پولیس اور بلوچ لیوی کے دستے بھی روانہ کئے سردار جمال خان لغاری اپنے قبیلے کے لوگوں سمیت اینڈریوز کی مدد کے لئے اس کے ساتھ تھا۔ ابھی یہ فوجی مدد برخان تحصیل پہنچی بھی نہیں تھی کہ مری اور دیگر قبائل نے پہلی مارچ کو گھر پر حملہ کر کے ڈاکخانہ، ریسٹ ہاؤس اور دوسری سرکاری عمارتیں جلا دیں۔ سرکاری اسلحہ لوٹ لیا۔ مری اور کھیتر ان قبیلوں نے پانچ مارچ کو اینڈریوز کو پسپا ہونے پر مجبور کر کے پوری تحصیل کو قبضے میں لے لیا اور تمام سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کھیتر ان لشکر نے کچھ اور سرکاری مقامات کو بھی لوٹا اور بارڈر ملٹری پولیس چوکیوں کو آگ لگا دی۔ پندرہ مارچ کو کھیتر ان اور مری قبیلے کے لشکر نے فورٹ منرو پل پر قبضہ کر کے سرکاری عمارتیں جلا دیں لیکن خود ایک حملے کا شکار ہو کر بھاری نقصان سے دوچار ہوئے۔ اس موقعہ پر بلوچ تمن داروں نے دروں کا دفاع کر کے انگریزوں کو مزید تباہی سے بچا لیا۔ کھیتر ان اور مری لشکر کی شکست نے اس علاقے میں انگریزوں کے لئے فوجی بھرتی کا راستہ صاف کر دیا۔ ہدیانی سرداروں کو سزائیں دی گئیں اور بھاری جرمانے کئے گئے کیونکہ انہوں نے بھی باغیوں کا ساتھ دیا تھا جب کہ گورچانی اور بزدار سرداروں کو وفاداری کے صلے میں لیفٹیننٹ گورنر کے دربار میں خلعتیں عطا کی گئیں۔

فوجی بھرتی کے خلاف ضلع شاہ پور کے لوگ بھی پیش پیش رہے۔ ''وار سروسز آف شاہ پور ڈسٹرکٹ'' کے مطابق مردوال کے اعوان عام طور پر قانون شکن ہوتے ہیں۔ مردوال میں فوجی بھرتی کے خلاف ہونے والی مزاحمت کو سختی سے کچلنے کے لئے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت متعلقہ افراد کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ جب سب انسپکٹر پولیس چند معززین کے ساتھ گرفتاریوں کے لئے مردوال پہنچا تو اسے ''ناگوار حالات'' کا سامنا کرنا پڑا۔ قریبی دیہات کے چند معززین کی مدد سے ڈپٹی کمشنر نے مردوال کا ایک ہنگامی دورہ کیا۔ گاؤں کے ''ہوش ٹھکانے'' لگا دیئے گئے اور سو آدمیوں کو زبردستی بھرتی کیا گیا۔

اسی طرح موضع لک میں بار کے ''جانگلیوں'' نے فوجی بھرتی کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ یہاں بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کئے تحت سرکردہ باغیوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے اور پولیس کی ایک بھاری جمعیت وہاں پہنچ گئی۔ حکام کو پولیس کی روانگی کے بعد گاؤں والوں سے شرافت کی امید تھی لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ لک، ہنگہ اور واٹی کے ایک ہزار ''شرپسندوں'' نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ بہت سے حملہ آور مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ قریبی دیہات کے شرفاء نے پولیس کی مدد کی۔ ٹوانوں کے علاوہ میکنوں، جھموں، سیدوں اور کلیاروں نے حالات پر قابو پانے اور علاقے کا امن وسکون تباہ کرنے والے باغیوں کو گرفتار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ میجر سر عمر حیات خان ٹوانہ اور آغا سعادت علی خان زاہد کی ''خدمات'' تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

ضلع شاہ پور کے ایک اور گاؤں ''بابک لڑکا'' میں بھی حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ لک میں باغیوں کے کچلے جانے کے باعث اس گاؤں کے لوگ خوفزدہ ہو کر فوج میں بھرتی ہونا شروع ہو گئے۔ مارچ اور اپریل 1918ء

میں کافی لوگ فوج میں چلے گئے لیکن چھٹیاں لے کر مفرور ہو گئے۔ گھلا پور کے گردونواح میں رانجھا قبیلے کے لوگوں نے بھرتی کے خلاف ''سازش'' کی۔ بھرتی کے سلسلے میں بھلوال کے تحصیلدار سید نادر حسین نے ''باٹک لڑکا'' گاؤں کا دورہ کیا۔ رانجھوں نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے انہیں پناہ دی اور وہ کئی مہینوں تک گرفتار نہ کئے جا سکے۔ دسمبر 1918ء میں انہیں چند شرفاء کی مدد سے پکڑ لیا گیا۔ سپیشل ٹربیونل نے ان پر مقدمہ چلا کر چار کو موت اور بارہ کو عمر قید کی سزا دی۔ شرفاء میں ایم شیر علی کے، ایم حسن خان اور تاج محمود ذیلدار کے نام قابل ذکر ہیں۔

27 نومبر 1923ء کے ''بمبے کرنیکل'' کے مطابق ضلع شاہ پور کے گاؤں ''ادیان'' کے لوگوں نے بھاگ کر بھرتی کے عذاب سے بچنے کی کوشش کی۔ تحصیل بھلوال کے گاؤں تخت ہزارہ میں عورتوں کو گالیاں دی گئیں اور انہیں کئی دوسرے طریقوں سے بے عزت کیا گیا۔ بوڑھوں کے چوتڑوں میں کانٹے دار جھاڑیاں چبھوئی گئیں۔

بھرتی کے خلاف لوگوں میں تناؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ گڑبڑ سے مجبور ہو کر حکومت پنجاب کو یکم اپریل سے 15 جون تک عارضی طور پر بھرتی کا کام بند کر دینے کی ہدایت جاری کرنا پڑی لیکن انہی دنوں جرمنی کے زبردست حملے کے نتیجے میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ حکومت پنجاب نے بھرتی روکنے کا حکم واپس لے لیا۔ برطانیہ کے وزیراعظم نے ایک اپیل جاری کی جس میں ہندوستان سے یکم جون 1918ء سے ایک سال کے اندر اندر پانچ لاکھ رنگروٹ بھرتی کرنے کا مطالبہ کیا۔'' مسٹر ایل فرنچ کے مطابق ''اس مطالبے کو پورا کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ بھرتی میں 25 فیصد اضافہ کر دیا جائے۔ وی این دت کا کہنا ہے کہ چار مئی کو پنجاب کے کمشنروں کی ایک میٹنگ میں بیس ہزار غیر لڑاکا اور ایک لاکھ اسی ہزار لڑاکا رنگروٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ یہ جاننے کے باوجود کیا گیا کہ پچھلے نو ماہ میں زبردست کوششوں کے بعد بمشکل تمام بھرتی کا کوٹہ پورا ہوا تھا۔

حکومت پنجاب نے جان لیا تھا کہ پرانے طریقوں سے بھرتی کا موجودہ مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چار مئی کی میٹنگ میں ڈویژنل کمشنروں نے سفارش کی کہ ایک ایکٹ یا آرڈی ننس کے ذریعے حکومت پنجاب کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ علاقے، ضلعے یا شہر میں اگر لوگوں کی رضامندی کے ساتھ ممکن نہ ہو تو جبری طور پر کوٹہ پورا کرے۔ جبری بھرتی کے لئے ایک بل کا مسودہ تیار کیا گیا۔ ''پنجاب فوجی بھرتی بورڈ'' کی طرف سے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس کے ضلعی ممبروں میں عمر حیات خان، رگھبیر سنگھ، مہدی شاہ اور لال چند غیر سرکاری نمائندوں کے طور پر شامل کئے گئے۔ اس سب کمیٹی نے پورے ہندوستان میں فوجی بھرتی کو لازمی قرار دینے کی سفارش کرتے ہوئے زور دیا کہ پنجاب میں اس پر فوراً عمل ہونا چاہئے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے حکومت ہند کو بھیجے گئے 15 جون کے ایک نوٹ میں سب کمیٹی کی لازمی اور جبری بھرتی کی سفارشات کی زبردست حمایت کرتے ہوئے انہیں جلد از جلد منظور کرنے پر زور دیا۔

مرکزی بھرتی بورڈ نے یہ سوچ کر کہ تمام ملک کے لوگوں پر جبری بھرتی کا قانون ٹھونسنا بے حد مشکل ہوگا' ان سفارشات کو رد کر دیا گیا۔

''اوڈوائر بنام نائر'' مقدمے میں بیان دیتے ہوئے اوڈوائر نے دعویٰ کیا تھا کہ بھرتی کے لیے طاقت یا جبر کا استعمال نہیں کیا گیا۔ صرف ایک بار کچھ آدمیوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہیں زبردستی بھرتی کیا گیا ہے۔

اوڈوائر کے مطابق'' پنجاب نے فوجی بھرتی کی کامیابی کے لئے پورا پورا زور لگایا اور جنگ کے آخری دنوں میں تو یہ بالکل تھک ہار گیا تھا۔ اگست اور ستمبر 1918ء میں اکیس اکیس ہزار سے زائد بھرتی کے ریکارڈ توڑے گئے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے رکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ضلع میں بھرتی دربار سجائے جاتے۔ ہونے والی بھرتی کے مفصل اعداد و شمار شائع کر کے پسماندہ اور غریب ضلعوں میں بانٹے جاتے۔ بھرتی کرانے والوں کو لمبے چوڑے انعام ملتے۔ نئے رنگروٹوں کی ابتدائی تربیت کے لئے اور انہیں پلٹنوں میں شامل کرنے کے لئے ڈپو قائم کیے جاتے۔ اس کے علاوہ ہر نئے رنگروٹ کو پچاس روپے خصوصی بونس دیا جاتا۔ ان ترغیبات کے نتیجے میں تذبذب میں مبتلا افراد بھی بھرتی ہو جاتے۔

ہرسنکرن نائر نے 1922ء میں'' گاندھی اور انارکی'' نامی ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں فوجی بھرتی کے سلسلے میں سر مائیکل اوڈوائر پر کچھ الزامات لگائے گئے تھے۔ اوڈوائر نے چیلنج کیا کہ اسے جان بوجھ کر بدنام کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ اس مقدمے کے دوران نائر نے بھرتی کے سلسلے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ باتیں کیں۔ نائر کے لفظوں میں ''لوگ اس جبر و تشدد کے باعث دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ دیہات کے لوگوں کو زبردستی پکڑ کر لے آتے اور خاردار جھاڑیوں سے ان کو پیٹتے۔ انہیں ان کی عورتوں کے سامنے الف ننگا کر کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ کر، اور سروں پر جوتے رکھ کر کھڑا کر دیا جاتا صفائی کے گواہ ولی نے اس بات کی تصدیق کی کہ لوگ بھرتی کرنے والے تحصیل داروں کو دیکھتے ہی گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔''

ولی نے اپنا بیان لکھواتے ہوئے کہا:

''وہ عورتوں سے کہتے ہم خاردار چاپے، ڈھینگرے اور جھاڑ جھنکاڑ لے آتے ہیں۔ ہم تمہاری شلواریں اور گھگھریاں اتار کر تمہیں ان پر بٹھائیں گے۔ پھر وہ انہیں رات حوالات میں بند کر دیتے اور ان کے کپڑے اتار کر انہیں جھاڑیاں اپنی ٹانگوں کے درمیان رکھنے پر مجبور کیا جاتا۔'' (''بمبے کرانیکل''27۔نومبر 1923ء)

''جلیانوالہ باغ'' میں دت لکھتے ہیں:

''مقامی جیلوں سے قیدیوں کو رہا کر کے انہیں بھرتی میں مدد دینے کے کام پر لگایا جاتا''

اوڈوائر بظاہر اس بات پر اڑا رہا کہ یہ تمام الزامات جھوٹے ہیں لیکن جلیانوالہ باغ کے حادثے کے بعد ہنٹر کمیٹی کے سامنے اس نے اپنی خفیہ گواہی میں اس بات کا ذکر کیا کہ لوگوں کو دبائے جانے کی چند شکایتیں اس نے سنی تھیں۔ ''ڈس آرڈر انکوائری کمیٹی'' کے سامنے شہادت دیتے ہوئے خان بہادر فضل حسین ممبر لیجسلیٹو کونسل نے بھی بتایا کہ یورپی افسروں اور ماتحت ہندوستانی عملے کے خلاف حکومت کو بھرتی کے سلسلے میں ان کے قابل

اعتراض طریقے اختیار کرنے کی شکائتیں ملی ہیں۔

لال سنگھ کی شہادت میں کہا گیا ہے کہ جب لوگوں کو معلوم تھا کہ رنگروٹ بھرتی کرنے والی ایجنسی خود حکومت ہے تو وہ شکایت کس کے آگے اور کیسے کرتے؟

پنجاب میں جبری بھرتی کے بارے میں میمورنڈم بھی ایسی ہی کئی کہانیاں سناتا ہے۔ یہ میمورنڈم پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کی بھرتی کے سلسلے میں ہدایات، فوجی خدمات کے بارے میں ان کے نوٹ اور 8 جون 1918ء کو قائم کئے گئے صوبائی بھرتی بورڈ کی سب کمیٹی کی قیمتی رپورٹ پر مبنی ہے۔ یہ میمورنڈم ظاہر کرتا ہے کہ سرکاری کارندوں میں اکثر اپنے اختیارات کا استعمال کرتے تھے اور کئی بار اس بات پر فساد بھی ہو جاتے تھے۔ شاہ پور کے ڈپٹی کمشنر نے اعتراف کیا کہ ان کے ضلع میں فوجی رنگروٹوں کی بھرتی کے سلسلے میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ 107 کو ناجائز طور پر استعمال کیا گیا۔ شاہ پور میں جبری بھرتی کی زبردست مہم کے نتیجے میں لوگوں میں وسیع پیمانے پر ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس ناراضگی کی تفصیل فضل حسین نے اپنے بیان میں وضاحت کے ساتھ بتائی ہے۔

''لوگوں کے وارنٹ جاری کئے گئے لیکن دیہاتیوں نے انہیں افسروں کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اس لئے انہیں گرفتار کرنے کے لئے پولیس کی بھاری جمعیت سے لوگوں پر چڑھائی گئی۔ پولیس کے آنے پر بلوہ ہو گیا۔ ڈیڑھ سو آدمی گرفتار کئے گئے۔ ان میں سے بیشتر کو بلوے میں حصہ لینے کے جرم میں سزائیں دی گئیں۔

ایل فرنچ، ایڈیشنل سیکرٹری حکومت پنجاب نے لکھا ہے کہ بہت سے لوگوں کو حلقوں میں بھرتی کے کام پر لگایا گیا تھا اور اس میں اس طرح کا ڈھکا ہوا جبر ضرور ہے۔

اٹک کے ڈپٹی کمشنر نے بھرتی کے مروج نظام کو جبری رضامندی کا نام دیا۔ ملتان ڈویژن میں کمشنر نے رائے ظاہر کی کہ ملتان اور مظفر گڑھ ضلعوں میں کئی مقامات پر رنگروٹوں کی بھرتی کے باعث گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اس نے کہا:

''اس ڈویژن میں لوگ رنگروٹوں کی بھرتی کرتے تھے۔ ان کا کام بڑا مشکل تھا۔ انہیں لوگوں کی رکھائی، لاپرواہی، جھینپ، حتیٰ کہ کھلی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جس کے باعث ملتان اور مظفر گڑھ کے ضلعوں میں بدقسمتی سے کئی مقامات پر فسادات ہوئے۔ خون خرابہ ہوا حکومت کی حکم عدولی ہوئی۔''

کمشنر ملتان نے ملتان اور مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنروں کو بھرتی کے لئے زیادہ سختی پر ٹوکا تھا لیکن وہ اپنے ایک نوٹ میں افسوس ظاہر کرتا ہے کہ:

''مجھے ڈر ہے کہ کچھ آدمیوں کو چھوڑ کر ضلع کے کھاتے پیتے لوگوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ اپنے خاندانوں کو بھرتی کرانے کی بجائے نچلے طبقے کے لوگوں کو یا تو دبایا گیا یا انہیں لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح کئی دیہات کے مکھیوں نے جب دھونس اور دھکے شاہی کا وطیرہ اپنایا تو کہیں کہیں بدامنی بھی

پھیلی۔ یہ رویہ صوبائی بھرتی فوجی بورڈ کے غیر سرکاری ممبران نے بھی محسوس کیا۔

''اس وقت رضا کارانہ بھرتی کا جو طریق کار رائج ہے اس میں خودسری اور دھکے شاہی کا دور دورہ ہے۔ ا س کے مقابلے میں اگر جبری بھرتی کی جاتی تو اس سے لوگ کم پریشان ہوتے۔ دوسرے نتائج سب کے لئے یکساں اور خاطر خواہ ثابت ہوتے۔

صوبائی بھرتی بورڈ کی سب کمیٹی کی میٹنگ میں سی ایم کنگ نے کہا:

''تذبذب میں مبتلا رہنے والوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ زمینداروں کو یہ شکایت ہے کہ ماتحت سرکاری عملے نے ہمیں تنگ کر کے زبردستی فوج میں دھکیلا ہے۔''

ڈس آرڈر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ (چھٹی جلد) کے مطابق چکوال تحصیل میں انکم ٹیکس لگائے جانے کے ایک مقدمے میں مدعی کی درخواست محض اس لئے رد کر دی گئی کہ نہ تو اس نے رنگروٹ بھرتی کرائی نہ جنگی قرضے میں حصہ ڈالا اور نہ ریلیف فنڈ میں کوئی رقم دی۔

جہلم اور راولپنڈی کے علاقوں میں فوجی بھرتی کے خلاف ایک ایک گاؤں میں مزاحمت ہوئی۔ تحصیل پنڈ دادن خان کے اکثر دیہات دباؤ اور مزاحمت کی شدید لپیٹ میں آئے۔ بے شمار مقامی روایات کے مطابق متعدد جھڑپوں میں دونوں طرف کے لوگ مرے۔ نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کرنے کے لئے ان کی نوجوان بہنوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ کئی لڑکیاں پراسرار طور پر غائب کر لی گئیں۔ کتنی ہی بوڑھی آنکھیں اب بھی چشم تصور میں اس عہد کی بربریت کو دیکھتی ہیں تو کانپ اٹھتی ہیں۔ راولپنڈی کے علاقے میں ان دنوں گائے جانے والے اکثر گیتوں میں زبردستی جنگ پر بھیج دیئے جانے والے بچوں کا دکھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

گڈی سرکاری پلاں توں لنگھنی چھم کر کے
بچڑے ماواں نے گھنی وینڈی آ بند کر کے

رنگروٹ بھرتی کے بارے میں اوڈوائر نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ بھرتی کا موجودہ طریقہ کسی قسم کی جبری بھرتی کے مقابلے میں زیادہ بے چینی اور مخالفت کو جنم دیتا ہے۔ اس نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ چار اضلاع میں بھرتی کے ناجائز طریقے استعمال کرنے کے باعث گڑبڑ پیدا ہوئی۔ 1917ء میں 26,702 فوجی مفرور ہو گئے اور یوں بے شمار خاندانوں کے لئے کمانے والا کوئی نہ رہا اور لوگوں میں دہشت پھیل گئی۔ پولیس نے گولیاں چلائیں۔ ایک خفیہ رپورٹ میں ہوم ممبر ویلیئم ونسٹ نے لکھا:

''یہ ممکن ہے کہ فوجی بھرتی اور جنگی قرضے کی وصولیوں کے لئے استعمال کیے گئے طریقوں سے لوگوں میں بے چینی بڑھی ہو''۔ بمبئی کرانیکل کی 17 ستمبر 1919ء میں پنجاب میں فوجی بھرتی اپنے عروج پر تھی۔ دسمبر 1917ء میں ملتان ڈویژن میں بھرتی پانچ سو اسی نسبت ایک (580:1) کی شرح سے ہوئی جو نومبر 1918ء میں ترانوے

نسبت ایک (1:93) کی شرح تک بڑھ گئی۔ اس طرح مظفر گڑھ ضلع میں، دسمبر 1917ء میں بھرتی کی شرح آٹھ سو نسبت ایک (1:800) تھی جو دسمبر 1918ء میں ایک سو ترپن نسبت ایک (1:153 تک بڑھ گئی۔

بھرتی سے انکار کرنے والوں کو جرمانہ کی سزا دی جاتی۔ نوکری سے ہٹا دیا جاتا اور ٹیکس لگا دیا جاتا۔ کئی بار پورے گاؤں کی بے عزتی کی جاتی۔ روزنامہ ''نیشن'' لاہور کی 18 نومبر 1923ء کی اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ کئی بار دیہاتیوں کو نہری پانی سے روک دینے کی دھمکیاں دی جاتیں اور اکثر ایسا بھی کیا جاتا، جن لوگوں کی ضابطہ فوجداری کی دفعہ 107 اور دفعہ 160 کے تحت گرفتار کیا گیا۔ انہیں فوج میں بھرتی ہو جانے پر چھوڑ دیا جاتا۔

زبردست پیمانے پر نوجوانوں کو جنگ میں جھونک دیئے جانے اور تمام فصلیں توپوں ٹینکوں کی نذر کر دیئے جانے پر پنجاب کے عوام کو شدید مہنگائی بھوک اور بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان میں پڑنے والا قحط پنجاب پر بھی اثرانداز ہوا۔

جنگ کے خلاف مزاحمت کے گیت:

جنگ کے خاتمے پر پنجاب بھر میں جو لوک گیت گائے جا رہے تھے ان میں فتح کے شادیانوں کی بجائے آہیں اور کراہیں تھیں۔ ان چارپائیوں کی خاموش فریاد تھی جن پر لڑکیوں کو اب بھی تنہا سونا تھا کیونکہ ان کے محبوب ایک سامراجی جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ مائیں بہنیں اور بیٹیاں اپنے گمشدہ رشتوں کی تلاش میں تھیں۔ پھر یہ خاموش آہیں اور کراہیں جلیانوالہ باغ کی چیخوں میں بدل گئیں۔ برطانوی سامراج کے پاس جو بارود بچ گیا تھا وہ انہوں نے باغی عوام کی چھاتیوں میں اتار دیا۔

پنجاب میں جنگ و امن کے موضوع پر جتنے لوک گیت ملتے ہیں اتنے محبت کے علاوہ کسی اور موضوع پر نہیں ملتے اور اگر دیکھا جائے تو جنگ اور امن کے گیت بھی دراصل محبت ہی کے گیت ہیں:

بوٹا پکیا امبیاں دا

ٹر گیا لام تے چناں، ڈاہڈا راج فرنگیاں دا

ترجمہ: آم کا بوٹا پک گیا ہے، میرا محبوب جنگ پر چلا گیا ہے فرنگیوں کے راج میں کتنا ظلم ہے

لام توں سپاہیا وے

کدی بن کے پراہونا آوے

ترجمہ: میرے محبوب سپاہی، میدان جنگ سے کبھی مہمان بن کر ہی آ جا۔

رناں والے جنگ جتدے

کتھے لکھیا فرنگیا دس وے

ترجمہ: فرنگی، یہ تو بتا، کہاں لکھا ہے کہ بیویوں والے جنگ جیتتے ہیں

نیر اکھیاں دی مک گئی اے

گڈی تیری چن ڈھولا جا بصرے رُک گئی اے

ترجمہ: آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے ہیں میرے چن ڈھولنا، تیری گاڑی بصرے جا کر رک گئی ہے۔

گڈی لنگ گئی آشوں کر کے

ہُن کاہنوں روندی ایں جندے بصرے نوں منہ کر کے

ترجمہ: گاڑی شوں کر کے گزر گئی ہے اب بصرے کی طرف منہ کر کے کیوں روتی ہو

ووہٹی سپاہی دی

لام دے ناں توں ڈردی

ترجمہ: سپاہی کی دلہن جنگ کے نام سے ڈرتی ہے

تیرے پانی دے گلاس چ گھُل جاں

سپاہیا! کھنڈ بن کے

ترجمہ: سپاہی! تیرے پانی کے گلاس میں شکر بن کر گھُل جاؤں

بصرے دی لام ٹُٹ جائے

میں رنڈیوں سہاگن ہوواں

ترجمہ: اگر بصرے کی جنگ ختم ہو جائے تو میں بیوہ سے سہاگن بن جاؤں

پُت ماواں دے لڑدے

پار سمندراں دے

ترجمہ: ماؤں کے بچے سمندر پار جنگیں لڑ رہے ہیں

گل کُرتہ ٹَسرے دا

ہولی ہولی چل گڈیے، وچ مسافر بصرے دا

ترجمہ: میرے محبوب نے ٹسر کا کرتا پہنا ہوا ہے ریل گاڑی، دھیرے دھیرے چل، اس میں بصرے کا مسافر سوار ہے۔

دیور، جیٹھ، گھر والا

لام گئے تن گبھرو

ترجمہ: دیور، جیٹھ اور گھر والا تین جوان جنگ پر گئے ہیں

ویکھ پَت رُکھاں دے لُو سے

خبراں لام دیاں

ترجمہ: درختوں کے پتے جھلس گئے ہیں ہر طرف جنگ کی خبریں ہیں

چھاچھی لوک بیانیہ:

چھاچھی وادیء چھچھ کے لوگوں کا ذریعہ اظہار ہے۔منفرد لب و لہجے کی یہ زبان ضلع اٹک یا سابق ضلع کیمبل پور میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔اس علاقے کی تاریخ ،جغرافیے اور لوک دانش کا احوال تو ہم آگے چل کر پروین ملک کے تخلیقی الفاظ میں بیان کریں گے۔یہاں ان روایات کا ذکر مقصود ہے جو سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے راجہ رسالو کی مہموں اور اس سے بھی پہلے سکندر مقدونی کے حملوں سے جڑی ہوئی ہیں۔اس سے بھی قبل یہ علاقہ گندھارا تہذیب کا حصہ رہا تھا۔راجہ رسالو سے وابستہ پہاڑی کھیڑی مورت کا علاقہ اٹک کے قریب واقع تھا۔اس علاقے میں جین مت اور بدھ مت کی نشانیاں بھی پائی گئی ہیں۔راجہ رسالو کی روایات اور داستانوں کے کئی حصے گزشتہ ابواب میں بیان کئے جا چکے ہیں۔اسی کھیڑی مورت پہاڑ کے گردونواح میں راجہ رسالو کی راجہ ہوڈی سے لڑائی کی تفصیل بھی بیان کی جا چکی ہے۔پروین ملک اس علاقے کے حوالے سے اپنے تفصیلی بیان میں کہتی ہیں۔

''صوبہ پنجاب کے ضلع اٹک میں انتہائی شمال مغرب کی طرف دریائے سندھ کے کنارے چھچھ کا زرخیز خطہ آباد ہے جس کی قدامت کے گواہ یہاں سے دریافت ہونے والے آثار قدیمہ اور نوادرات ہیں جن میں کشان عہد کے خروشتی رسم الخط میں لکھے گئے دو کتبے جو گڑھی متی (چھچھ کا ایک گاؤں) اور کامرہ (چھچھ کی ریتلی پٹی پر کیمبل پور کے نزدیک گاؤں) سے دستیاب ہوئے، انتہائی اہم ہیں۔کامرہ سے ملنے والا کتبہ کنشک دوم کی پیدائش سے متعلق ہے۔

یہ خطہ شمال مغرب کی جانب سے آنے والے اکثر حملہ آوروں کی گزرگاہ رہا ہے،اس لئے یہاں کی زبان، بودوباش اور صنعت وحرفت پر کئی تہذیبوں کی چھاپ آج بھی نظر آتی ہے۔

مقامی لوگوں اور حملہ آوروں کے درمیان چھوٹی چھوٹی جنگیں اور معرکے تو ہوتے رہتے تھے مگر کچھ بڑی جنگیں بھی اس خطہ پر لڑی گئیں۔1008ء میں مقامی راجا جے پال کے بیٹے انند پال اور محمود غزنوی کے درمیان چھچھ کے علاقہ میں ایک بڑا معرکہ ہوا۔جس میں انند پال کو شکست ہوئی۔

1177ء میں چھچھ کے ایک گاؤں ہارون کے مقام پر کامل خان صوبہ دار قلعہ اٹک اور شاہ شجاع کے درمیان ایک خوں ریز لڑائی ہوئی جس میں میدان کامل خان کے ہاتھ رہا۔(ہارون گاؤں ایک طویل عرصہ تک دریا عبور کرنے کا پتن تھا)

1813 میں حضرو کے مقام پر سکھوں اور افغانوں کے درمیان ایک بڑی جنگ لڑی گئی۔جسے ''جنگ اٹک'' کا نام دیا جاتا ہے۔اس جنگ کے نتیجے میں وادی چھچھ پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا۔جس کے بعد کچھ عرصہ تک افغانوں کی یلغار رک گئی۔

چھچھ کا خطہ اپنی جغرافیائی حیثیت میں رنگا رنگ نظاروں کا حامل ہے۔ڈپٹی کمشنر اٹک مسٹر سی سی گاربیٹ نے 1907ء کے ''اخبارِ اٹک'' کی بنیادی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے 1930ء میں جو تفصیلی تحریر لکھی اس میں ان کا اس علاقہ سے لگاؤ صاف جھلکتا ہے۔

''تمام ہموار اضلاع میں یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے، جس میں ہر طرح کے نظارے موجود ہیں۔'' (اٹک گزیٹیر 1930)۔

''باغ نیلاب کے قریب جہاں دریائے ہرو، سندھ میں شامل ہوتا ہے پانی کے پھیلاؤ اور کالا چٹا کی سرسبز پہاڑیاں جن کی بلندی 3800 فٹ تک کا نظارہ کریں تو ایسا لگتا ہے کہ آپ سکاٹ لینڈ میں پھر رہے ہیں۔ چھچھ کا علاقہ جب اس کے سرسبز میدانوں پر گہرے بادل چھائے ہوں تو خوبصورتی میں اپنی مثال آپ بن جاتا ہے۔'' (اٹک گزیٹیر 1930ء)۔

شمال اور مغرب کی طرف چھچھ کی حدود دریائے سندھ سے ملتی ہیں جبکہ مشرق کی جانب گندھ گڑھ کی پہاڑیاں ہیں۔جنوب کی طرف تقریباً چھ میل لمبی نیم ہموار، ڈھلوان ہے جو کیمبل پور (اٹک) تک دریائے ہرو کے کنارے پہنچتی ہے۔اس ریتلی پٹی کو ماہرین ارضیات نے ''سروالہ'' کا نام دیا ہے۔سروالہ میں سیکڑوں چھوٹے نالے بہتے ہیں جو کسی نہ کسی مقام پر دریائے ہرو سے جا ملتے ہیں۔ان میں جھبلاٹ، نندنا، شکردرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ (سروالہ نام کے برساتی نالے کی گزرگاہ کچھ عرصہ پہلے تک موجود تھی۔اب سڑک بن چکی ہے) دریائے ہرو اونچے کناروں کی وجہ سے اپنے دائیں بائیں آباد بستیوں کے لئے کبھی خطرے کا باعث نہیں بنا۔سوائے 1841ء کے جب دریا میں پانی کی سطح اتنی اونچی ہوگئی ہے کہ اس نے اپنی الحاقی ندیوں کا پانی پلٹا دیا جو اپنے علاقوں میں شدید سیلاب کا باعث بن گیا۔گاؤں کے گاؤں اس سیلاب میں بہہ گئے۔اس موقع پر شاعروں نے چار بیتے لکھے۔بابا گلا با شاعر نے ہرو کو مخاطب کر کے کہا:

سیداں دے توں مال رُڑھاویں کیتی آ بہت زیادتی
سید ذات علی دی تے توں نہ ادب کیتا کم ذاتی

(تم سیدوں کے مال بہا کر لے گئیں، سید حضرت علی کی اولاد ہیں مگر تم نے ان کا ادب ملحوظ نہ رکھ کر کم ذاتی کا مظاہرہ کیا ہے) اس واقعہ کو اور بھی کئی شاعروں نے بیان کیا۔

1907ء اور 1930ء کے اٹک گزیٹیر ہمیں ایک بڑی دلدل کے بارے میں بتاتے ہیں جس نے کبھی ''شمس آباد''، ''بہادر خان'' حتیٰ کہ ''جتیال'' تک کو گھیرا ہوا تھا۔اس کا باعث ''چیل ندی'' تھی جو اس علاقے کی جنوبی حدود کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔اس میں سروالہ اور چھچھ کے درمیانی علاقے کے چھوٹے چھوٹے بے شمار نالے شامل ہو کر آس پاس کی زمین کو دلدل بنا دیتے جس میں بننے والے چھوٹے تالاب مل کر دریا کی صورت اختیار کر لیتے،

گندھ گڑھ کی پہاڑوں کا زیر زمین پانی بھی اس میں شامل ہو کر چیل کو تیز رفتار ندی بنا دیتا جو اکثر سیلابی روپ میں ڈھل جاتی۔ 1924ء میں اہل علاقہ کو چیل ندی کو گہرا کرنے اور اس کا پانی کاٹ کر دریائے سندھ میں ڈالنے کا منصوبہ دیا گیا جس پر عمل کر کے نہایت زرخیز زمین حاصل ہوئی۔

چھچھ کا مرکزی قصبہ ''حضرو'' طویل عرصہ سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ کئی مشہور ہستیوں نے یہاں جنم لیا۔ جن میں بھائی بالک سنگھ (نامدھاری سکھوں کے گرو) حکیم محمد یوسف حضروی (نامور طبیب) اور اعجاز حضروی (منفرد غزل گائیک) شامل ہیں۔ (چھاچھی بولی از: ارشد محمود ناشاد، صفحہ نمبر 13)

ایک اور بڑے قصبے گوندل کی شہرت کا باعث یہاں لگنے والی منڈی مویشیاں اور اس دوران منعقد ہونے والے گھڑ سواری، نیزہ بازی، کبڈی، اور دیگر کھیلوں کے مقابلے بھی ہیں۔ حضرو اور گوندل دونوں قصبوں میں منڈی مویشیاں کے موقع پر یہ مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔

1947ء سے پہلے تک چھچھ کی دستکاریوں میں ''پھلکاری'' کی بہت دھوم تھی۔ دوسری ''چھیل'' ہے جو اب بھی بنائی جاتی ہے۔ اور سندھی اجرک کی طرح فقط چھچھ کے ساتھ ہی منسوب ہے۔ خواتین گھر سے باہر جاتے وقت پردے کی غرض سے چھیل اوڑھتی ہیں۔ پہلے تو یہ صرف کھدر پر بنائی جاتی تھی مگر اب ہلکے سوتی کپڑے سے بھی بنائی جاتی ہے۔ بھورے سبز رنگ کی زمین پر اٹھنی کے برابر گول ٹھپہ پوری چادر پر گہرے لال رنگ میں لگایا جاتا ہے۔ دونوں رنگ پکے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ چھیل کا منفرد ڈیزائن دیکھنے میں بہت اچھا لگتا ہے۔

چھچھ سطح مرتفع اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ایسا ہموار خطہ ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی ہریالی کی بنا پر متوجہ کر لیتا ہے۔

مشہور سیاح بیرن ہوگل نے 1885ء میں حسن ابدال سے اٹک آتے ہوئے اپنا مشاہدہ یوں بیان کیا ہے۔ ''تہہ در تہہ پہاڑی سلسلے کے دامن میں یہ ایک حیرت کدہ ہے۔'' (اٹک گزیٹیر 1930ء)۔

چھچھ کے نام کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ اس علاقے کی دلدلی زمین کی وجہ سے سکندر یونانی نے یہ نام دیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک چھچھ ترکی زبان کے لفظ چچھہ سے مشابہت رکھتا ہے جو اس زمین کے لئے بولا جاتا ہے۔ جو پانی کی گزرگاہ ہو۔

جو زمین سیلاب یا طغیانی سے سیراب ہوتی ہے اسے چھگ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ چھگ ہی چھچھ کی صورت اختیار کر گیا ہو۔

اٹک گزیٹیر 1930ء میں ماہرین آثار قدیمہ کے حوالے سے سی۔ سی گاربیٹ لکھتے ہیں کہ ''صدیوں پہلے یہ علاقہ چھکشا کے نام سے ٹیکسلا کی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔''

اللہ بخش مؤلف۔ تاریخ یوسف زئی افغان نے بھی تقریباً یہی بات اس پیرائے میں لکھی ہے۔

''جونہی جھیل آہستہ آہستہ خشک ہوتی گئی، دلدلی زمین نظر آتی گئی۔ ایک طرف چھچھ اور دوسری طرف

جہانگیرہ، طورڈھیر، زیدہ، ٹوپی اور ہنڈ کے مسکن دکھائی دینے لگے۔''

چھچھ میں زیادہ تر گاؤں پٹھانوں کے آباد ہیں سکندر خان مؤلف تاریخ وادیٔ چھچھ کا خیال ہے کہ''اکثر پٹھانوں کے آباؤ اجداد حملہ آوروں کی شکل میں آئے اور قابض ہوئے۔'' یہ بات بہت حد تک درست لگتی ہے۔ کیوں کہ وادیٔ چھچھ کی طرف سے ہارون اور اس پار اوہنڈ ایسے پتن تھے جہاں سے دریا عبور کیا جا سکتا ہے۔ پٹھانوں کے علاوہ کچھ گاؤں شیخ برادری کے ہیں۔ دیگر آبادیوں میں اعوان سید، مغل، گوجر، کھٹر، پراچہ اور ملیار بھی بستے ہیں۔

چھچھ کے باشندوں کی طبیعت شروع سے مہم جو رہی ہے چاہے وہ کسی بادشاہ کے لشکر میں شمولیت کی شکل میں ہو یا تجارت کی شکل میں تبلیغ دین کی صورت میں ہو یا پھر ملازمت کے سلسلہ میں۔ غرض یہ ہر دور میں سرگرم رہتے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بھی وادی چھچھ کے لوگ پاکستان کے دیگر علاقوں کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں انگلستان، امریکہ، کینیڈا، جرمنی، ابوظہبی، سعودی عرب، دوبئی، قطر، کویت، ایران، عراق، لیبیا، ہانگ کانگ، ملایا، سنگاپور، تھائی لینڈ، ویتنام، جاپان اور آسٹریلیا میں آباد ہیں اور وطن عزیز کے لئے زرمبادلہ کا کثیر حصہ کما رہے ہیں۔ اندرون ملک بھی چھاچھی بڑے بڑے شہروں میں اپنے کاروبار میں سرگرم عمل ہیں۔ راولپنڈی شہر میں تو ایک محلہ چھاچھی محلّہ کے نام سے منسوب ہے یہاں اکثریت چھاچھیوں کی آباد ہے۔

ایک محاورہ ہے:

جتھے بیڑی ڈُبے، حاجی شاہیا وچ

(جہاں بھی کوئی کشتی ڈوبتی ہے ایک نہ ایک حاجی شاہ گاؤں کا باسی ڈوبنے والوں میں شامل ہوتا ہے)

حاجی شاہ اگر چہ چھچھ کے مرکزی علاقے سے ذرا ہٹ کر جی ٹی روڈ پر واقع ہے مگر اسی علاقے سے متعلقہ تصور کیا جاتا ہے۔

مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے امتزاج کی بنا پر اس علاقے کی زبان میں ایک رنگا رنگی اور وسعت نظر آتی ہے۔ جو دیگر علاقوں میں کم کم ہی ملتی ہے۔''

چھاچھی لوک دانش:

پروین ملک کے لفظوں میں'' کہاوتیں دنیا کی ہر زبان اور تہذیب کا حصہ ہوتی ہیں۔ جن کی مدد سے اس علاقے یا قوم پر بیتنے والے واقعات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

''اصطلاحی معنوں میں تو کہاوت اس پند و نصیحت کو سمجھا جا سکتا ہے جو کسی علاقے کے سیانوں نے اپنی بستی، قبیلے یا قوم کی رہنمائی کے لئے مختصر مگر جامع انداز میں ترتیب دیئے ہوتے ہیں۔ مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ اس علاقے کی لسانی، مذہبی اور سماجی تاریخ مرتب کرتے نظر آتے ہیں۔

''چھاچھی زبان میں بے شمار کہاوتوں کا ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو زندگی کے ہر پہلو کی آفاقی قدروں کو بیان کرتا نظر آتا ہے۔ ہر کہاوت کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ جس سے علاقے میں بسنے والے بخوبی آشنا ہوتے ہیں۔ مگر دوسرے علاقے کے لوگوں کے سامنے پوری کہانی بیان کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر:

''راہ وینی ایں بلائی، دو پراء ہٹنی ونجیں

(اپنی راہ چلتی بلا آؤ ذرا آرام کرلو)

اس کہاوت کے پیچھے یہ کہانی ہے کہ ایک نوعمر چرواہا اپنی بھیڑ بکریاں چراتا ہوا کسی سنسان علاقے میں جا نکلا۔ دور دور تک انسان تو کیا کسی پرندے کا بھی وجود نہ تھا۔ بھیڑ بکریاں تو ادھر اُدھر بکھر کر جھاڑیوں پر منہ مارنے لگیں اب یہ اکیلا کیا کرے۔ خود کلامی جیسی گفتگو کچھ دیر بھیڑ بکریوں کے ساتھ کرتا رہا پھر اس سے بھی اُوبھ گیا۔ تنہائی کی وحشت سے بے حال ایک جھاڑی کے سائے میں پڑا تھا کہ دور دھول اٹھتی دکھائی دی اس نے غور سے دیکھا تو کوئی بلا ،کہیں دھاوا کرنے جارہی تھی۔ پکارا اٹھا۔ ''بلا! ادھر آؤ تھوڑا آرام کرلو، بلا تو انسانی شکار کی تلاش میں ہی جارہی تھی۔ غیر متوقع طور پر ایک انسان پکارتا ہوا ملا تو مسکراتی ہوئی واپس آئی اور بغیر کچھ کہے سنے لڑکے کو چٹ کر کے یہ جاوہ جا۔''

چرواہے نے ایک بے فائدہ کام باتیں کرنے کی خاطر زندگی جیسی نعمت گنوادی۔

''انھیاں حوراں تے لو ہلے فرشتے''

(اندھی حوریں اور ہاتھوں سے معذور فرشتے)

یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی برادری، محلے یا دفتر کے لوگ یکساں نکمے ہوں۔

''اجڑے آں پکھیاڑ پیا تے کُتے آں ہگن آ گیا''

(ریوڑ پر بھیڑیے نے حملہ کیا تو کتا رفع حاجت کرنے چلا گیا)

کتے ریوڑ کی حفاظت کے لئے پالے جاتے ہیں توقع ان سے یہی کی جاتی ہے کہ جب کوئی درندہ ریوڑ پر حملہ کرے تو وہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھیڑ بکریوں کی حفاظت کریں۔

یہ کہاوت ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جب کوئی کسی بڑے اور ضروری کام کو نظر انداز کر کے کسی بہت ہی معمولی کام میں مصروف ہوجائے۔

''اَن ڈِٹھ کراڑی منکالدھا، گِٹے نالوں کھوہل کے لکے نال بدھا''

(کراڑی (ہندوؤں کی ایک ذات) کے پاس دیکھنے کو بھی زیور نہ تھا اسے کہیں سے موتی مل گیا۔ اب وہ اسے کبھی ٹخنے کے ساتھ باندھتی ہے کبھی کمر کے ساتھ۔ نودولتیوں کی مثال دینی ہو تو یہ کہاوت بولی جاتی ہے۔

دنیا کی تقریباً ہر زبان محاوروں کا اثاثہ رکھتی ہے کہیں کم کہیں زیادہ اور اسی سے کوئی محقق یہ اندازہ لگا پاتا ہے کہ اس زبان کی علمی استطاعت کس قدر ہے۔

جب زبانیں تشکیل پارہی ہوتی ہیں تو ان کے پاس اتنا ذخیرہ الفاظ نہیں ہوتا جو استعاراتی روپ اختیار کر سکے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی لیکن جب ایک زبان کا بنیادی ڈھانچہ تکمیل کے مراحل طے کر چکا ہوتا ہے تو بیان میں وسعت اور معنویت پیدا کرنے کے لئے محاورے بنائے جاتے ہیں۔ ارشد محمود ناشاد ضلع اٹک کے لوک ادب کے بارے میں لکھی گئی اپنی کتاب '' آپنا گراں ہووے'' کے صفحہ 202 پر محاورہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

'' محاورہ دے لغوی معنے گل بات دے نیں، پر بیان دے علم وچ محاورہ اس لفظ یا لفظاں دے مجموعے نوں آکھیا جاندا ہے جو اپنے حقیقی تے اصلی معنیاں دی تھاں مجازی تے متھے ہوئے معنیاں لئی ورتیا جاندا اے ۔ گل نوں ہور کھولن لئی اینج وی آکھیا جاسکدا اے پئی محاورے وچ ورتے لفظ آپنے حقیقی معنے وی رپراو ہناں نوں اکھوں پروکھے کردتا جاندا اے تے او ہناں لفظاں نوں نویں معنے دے دتے جاندے نیں۔

محاورہ کی یہ ایک جامع تعریف ہے جس پر پرکھا جائے تو چھا چھی زبان کے پاس گفتنی، ناگفتنی محاوروں کا بے حد وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ ہر زبان میں ایسے محاورے بھی ہوتے ہیں جنہیں کسی رسمی محفل میں اپنی بات چیت کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا اس لئے وہ انتہائی نجی محفلوں میں ہی بیان کئے جاسکتے ہیں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ خواتین با محاورہ زبان کا استعمال زیادہ کرتی ہیں۔ اس سے جہاں بیان کی دلکشی دو بالا ہوتی ہے وہیں محاورہ ایک مستند دلیل کی صورت کہی گئی بات میں وزن پیدا کرنے کا باعث بھی ثابت ہوتا ہے۔

'' آندراں ناں ساک''

ماں اور بچے کے تعلق کے لئے یہ محاورہ بولا جاتا ہے اور یوں بچے کی ہر بھول معاف کرنے کو ماں کی مجبوری سمجھ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔

ہزاروں میں سے چند محاورے مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

'' اَن کڈھنی جائیوں کڈھنا''

(کسی ایسے شخص سے کچھ وصولنے کی کوشش کرنا جس سے لینے کا حق یا موقع نہ ہو)

'' اہم الاونا''

(بڑا بول بولنا)

'بوڑے گھڑے کپاہ''

(جس گھڑے کا منہ ٹوٹا ہوا ہو اس میں روئی نہیں ٹھہرتی باہر کو اُبل آتی ہے۔ کم ظرف انسان کے لئے بولا جاتا ہے جو علم کو اپنے اندر نہ سہار سکتا ہو یا جس کی نیت کبھی نہ بھرتی ہو۔)

' پکی وئی انگلی تے نہ موترنا''

(خیال کیا جاتا ہے کہ اگر ہاتھ پاؤں کی انگلی کے ناخن میں پیپ پڑ جائے تو کسی دوسرے کا پیشاب لگانا اس کے لئے

دوا کا کام کرتا ہے۔ جب کوئی کسی کے لئے ایسا بے وقعت کام کرنے پر بھی راضی نہ ہو تب یہ محاورہ ساری صورتحال کی وضاحت کر دیتا ہے۔

''تھکاں نال وَڑے پکانا''

(خیالی پلاؤ پکانا۔ ایسی تجویز پیش کرنا جو ممکن ہی نہ ہو)

''جفر جالنا''

(شدید ذہنی اور جسمانی محنت کرنا۔ ہر ممکن کوشش کرنا)

''چودھیں بکیں چھا ہونا''

(چھا، اناج ناپنے کا برتن، جس میں تقریباً سوا سیر اناج آ جاتا ہے۔ وہ تو آخر کار اناج سے بھر جاتا ہے مگر احمق انسان کے دماغ میں کوئی عقلی دلیل ٹھہرتی ہی نہیں)

''چھجے پا کے اُڈانا''

(اناج اور بھوسے کو الگ الگ کرنے کے لئے چھاج میں ڈال کر ہوا کے رُخ اڑایا جاتا ہے تو ہوا پر منحصر ہے کہ وہ اسے کتنی دور تک اڑائے۔ کسی کا راز ہر ایک سے بیان کرنا)

''دندی تے بروٹا ہونا''

(ٹیلے کے کنارے اگا ہوا بیری کا درخت جو تیز ہوا یا بارش سے بھی گر سکتا ہے۔ شدید بیمار یا بہت بوڑھے انسان کے متعلق اس محاورے کا استعارہ برتا جاتا ہے)

''سوتر پانا''

(مکان کی دیوار کے سیدھے ہونے کا جائزہ لینا ہو تو مستری ایک رسی کے ساتھ بندھا ہوا پیتل کا لٹو لٹکاتے ہیں اس طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ دیوار میں کہیں کجی تو نہیں۔ کسی کے کس بل نکالنے کے موقع پر یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔)

''گور کتا مارنا''

(واجبی سا کام چلاؤ انتظام کرنا)

''لڑم پانا''

(کسی کام میں دخل اندازی کرنا۔ سیدھے سبھاؤ ہوتے کام کو الجھا دینا)

''وچیا بدلانا''

(ظاہری حلیہ بدلنا۔ برتاؤ تبدیل کرنا)

''بھوں کرنا''

(عاجز کرنا، تھکا دینا۔ لاچار کر دینا)

وادیٔ چھچھ

مزاحمت کے لوک بیانیے:

اس سرزمین پر بیرونی حملہ آوروں کے خلاف قدم قدم پر مزاحمت کی گئی۔ شفقت تنویر مرزا کے لفظوں میں ''اسی چھچھ کے علاقے میں محمود غزنوی اور انند پال کی فیصلہ کن جنگ بھی لڑی گئی (14) جس میں حملہ آور کو فتح نصیب ہوئی۔ مزاحمت کا سلسلہ اگلی صدیوں تک بھی جاری رہا۔ یہ دھرتی ''اٹک کی زیارت اور دیگر مزارات جیسے چورہ شریف، شمس آباد اور مکھڈ وغیرہ میں کئی پیر فقیر محو خواب ہیں۔ مکھڈ شہر تو 1930ء تک تجارتی سامان اور مسافروں کو کشتیوں کے ذریعے سمندر سے لانے اور لے جانے کے لئے مشہور تھا۔ مکھڈ نہ صرف تجارتی مرکز تھا بلکہ ایک روایت کے مطابق مگدھ دراصل مکھڈ اور ماڑی انڈس کے بیچ قائم علاقے کا نام تھا جو برباد ہو گیا، جس کی اب تک کھدائی نہ کی جا سکی۔ اس کے آثار کہیں کہیں آج بھی مل جاتے ہیں مگر ہم اپنے بزرگوں والی لاپروائی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اسی پس منظر میں اٹک کا ایک شاعر ارشد محمود ناشاد کہتا ہے۔

صدیاں تے زمانیاں توں
اسیں اپنے وڈوڈیریاں نے
کھریاں نال کھرا میچ کے
ڈنگ بھڑنگیاں رہواں اُتے ٹرنے رہنے آں

(صدیوں پر محیط زمانوں سے ہم اپنے آباؤ اجداد کے قدم سے قدم ملا کر ٹیڑھی میڑھی راہوں پر چلتے جا رہے ہیں)

اولیا اللہ میں سے ایک ولی قندھاری بھی گزرے ہیں، جو حسن ابدال کی پہاڑی پر ڈیرہ لگائے بیٹھے تھے، نیچے کسی حسن گجر کا ڈیرہ تھا۔ آج مہا تما بدھ اور اس سے پہلے والی تہذیب رکھنے والے شہر کو نئے حوالے مل چکے ہیں۔ یعنی ایک جانب حسن ابدال اور دوسری جانب پنجہ صاحب۔ ہیون سانگ تو کچھ اور ہی بیان کرتا ہے۔ جو کہانی بعد میں منظر عام پر آئی۔ اس کے مطابق بابا نانک یہاں تشریف لائے تھے۔ گوتم کی نگری میں اپنے مرید مردانہ سے فرمایا جاؤ اوپر بیٹھے ولی سے پانی مانگ لاؤ۔ ولی قندھاری ناراض ہوئے پانی نہ دیا۔ بابا نانک نے لاٹھی ماری تو چشمہ پھوٹ پڑا۔ ولی قندھاری ناراض ہوئے اور ایک چٹان اوپر سے لڑھکا دی، جو سکھ روایات کے مطابق بابا جی گورو نانک نے اپنے ہاتھ سے روک لی۔ چٹان پر ہاتھ کا نشان آج بھی نظر آتا ہے۔ یوں یہ جگہ پنجہ صاحب کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہاں بڑا گوردوارہ، تالاب اور مسافر خانہ بن گیا۔ یہ لوک روایت اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے مگر صوفیاء اور اللہ والوں سے ایسی باتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ البتہ جب سکھ باغیوں کو انگریز امرتسر سے پکڑ کر اٹک قلعہ لے جا رہے تھے تو مقامی سکھوں نے نان سٹاپ گاڑی کو روکنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس گاڑی کو ہر قیمت پر روکنا چاہتے تھے۔ خواہ اس کے

لئے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ایک لوک وار اس واقعے کو یوں بیان کرتی ہے:

"گڈی چل گئی ہوا دے نال رل کے
ٹیشناں نوں جاوے چھڈ دی
پنجہ صاحب دی سنگت نے سنیا
سیوادا پریم جا گیا
ہکاں ڈاہ کے کھلو گئے سنگھ سارے
گڈی آ گئی شاں کر کے

(گاڑی ہوا کے دوش پر چل رہی تھی کسی سٹیشن پر نہ رکی، پنجہ صاحب والی سنگت نے گاڑی کی آمد کا سن رکھا تھا ان کے دل میں وطن کی محبت جاگ اٹھی، تمام سکھ چھاتیاں تان کر گاڑی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔گاڑی فراٹے بھرتی یہاں آن پہنچی۔

گڈی چل گئی چیر گئی چھاتیاں
ہڈی ہڈی چورا کر گئی
پہیے بھج گئے انجن دے سارے
سورمیاں دی رت سنگھنی

'فراٹے بھرتی گاڑی نے کئی سرداروں کی چھاتیاں چیر ڈالیں۔ہڈیوں کو چُور چُور کرتی گزر گئی۔انسانی ہڈیوں کے ٹکرانے سے انجن کے پہیے ٹوٹ گئے۔سچ ہے بہادروں کا خون بہت گاڑھا ہوتا ہے۔"

"یہاں کے سورماؤں کے کئی قصے مشہور ہیں مگر ہم انہیں بھول چکے ہیں۔ہمیں تو یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اکبر بادشاہ نے یہ قلعہ بنوایا تھا، رانا بھگوان داس یہاں کا گورنر رہا ہے، جہانگیر یہاں کا کمانڈر رہا ہے۔اورنگ زیب کی فوج پٹھانوں کے ساتھ یہیں لڑی۔مشہور پشتو شاعر خوشحال خان خٹک اورنگ زیب کے خلاف لڑا جبکہ اس کے بیٹے اورنگزیب کی جانب سے لڑائی میں شامل ہوئے۔نادر شاہ یہیں سے دریا عبور کر کے گیا اور پشاور کا گورنر ناصر اس کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوا۔قلعوں کے حاکم اور غلام تبدیل ہوتے ہوتے رنجیت سنگھ کا زمانہ آ گیا۔سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں نے یہاں لڑنے کا فیصلہ کیا مگر ان کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پایا۔رنجیت سنگھ نے احمد شاہ ابدالی کے پوتے تیمور شاہ سے یہ قلعہ خریدا۔اسنے انگریزوں سے 1848ء میں جنگ کی مگر شکست کھائی۔سکھوں نے دوسری بار 1848 میں جنگ کی۔جس میں انگریز کمانڈر لیفٹیننٹ ہربرٹ مارا گیا۔سکھوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔مگر یہ فتح عارضی ثابت ہوئی اور سو سالوں تک یہاں مسلمان، سکھ اور ہندو قیدیوں کی صورت میں لائے جاتے رہے ہیں۔"(15)

1857ء میں انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی لڑی گئی۔چھاچی بھی باقی ہندوستانیوں کے مقابلے میں اس جنگ میں کسی طرح پیچھے نہ رہے۔پنجاب، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے جنگ آزادی میں

انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس کی حقیقت ہم گزشتہ صفحات میں واضح کر چکے ہیں۔ چھچھ کے رہنے والوں نے بھی مجاہدین آزادی کا بھرپور ساتھ دیا۔ بقول شفقت تنویر مرزا:

''1857 کی جنگ آزادی میں آس پڑوس کے بڑے بڑے شملوں والے انگریز کے وفادار بن گئے۔ ایک انگریز سورما نکلسن، جس نے پنجابی باغیوں پر ان گنت مظالم ڈھائے، وہ دہلی کے قریب آخری مورچہ فتح کرر ہا تھا۔ مغلوں کی حکومت آخری سانس لے رہی تھی تب یہاں کے ایک غریب سپاہی کالے خان نے جرنیل نکلسن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ نکلسن کی یادگار مارگلہ میں بن گئی۔ آج کالے خان کو کوئی یاد نہیں کرتا مگر ضلع اٹک کے شاعر کالے خان کو نہیں بھول پایا۔ ہم کالے خان کے ساتھ ساتھ شاعر کا نام بھی بھول گئے مگر محمد عظیم بھٹی مرحوم ہمیں اس گمنام شاعر کے یہ شعر سناتا ہے۔:

کالے خانا اوئے توں ساڈا سردار

خان گوریاں نوں سیس نوان

اوہناں دیاں جتیاں چان

توں کمیاں دا پتر ہو کے

دِتا نکلسن مار

کالے خانا اوئے

توں ساڈا سردار

(اے کالے خان تو ہمارا سردار ہے۔ خان بہادر تو گوروں کے سامنے گردن جھکائے کھڑے تھے بلکہ ان کی جوتیاں اٹھا رہے تھے۔ اے کالے خان تو نے کمیوں کا بیٹا ہو کر بھی نکلسن کو قتل کر دیا۔ اے کالے خان تو ہمارا سردار ہے۔)

ایک اور شاعر عمر اٹکاں والا، اٹکاں والا اس لئے کہ یہ کریری قلعہ کے زیریں محلے ملاحی ٹولہ کا رہائشی تھا۔ اس محلے کے لوگوں نے اکبر سے لے کر انگریزوں تک سب ہی کے زور، جور و جبر کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عمر اٹکاں والا کہتا ہے:

گوریاں کھوہ کے دیس ساڈا رج کے لوکاں دا قتلام کیتا

جھاں راج کیتا سی ملک اُتے پھڑ کے اوہناں نوں چا غلام کیتا

گل کرن نہ دیندے آزادیاں دی ایہناں جیوناں ساڈا احرام کیتا

دیس پیارا ہے عمرا جھاں ہڈیں اوہناں عاشقاں کدوں آرام کیتا

(گوروں نے ہمارا وطن ہم سے چھین کر عوام کا قتل عام کیا۔ یہاں کے حکمران طبقے کو غلام بنالیا۔ بات کرنے پر پابندی کے باعث ہمارا جینا حرام بنا ڈالا ہے۔ یہ دیس ہمیں بہت پیارا ہے جن کے دل میں وطن کی محبت کا عشق جاگ اٹھا ہے۔ انہیں کہیں چین نظر نہیں آتا۔(16)

پوٹھوہار کا لوک بیانیہ

اپنے جداگانہ خدوخال کے سبب پوٹھوہار مرکزی پنجاب سے الگ شناخت رکھتا ہے۔ پنجاب کی رنگا رنگی میں اس کا رنگ انوکھا اور بے حد خوبصورت ہے۔ پوٹھوہار کا ایک رنگ جو سارے پنجاب کا رنگ بھی ہے لوک مزاحمت ہے۔ یہ خطہ نوآبادیاتی عہد سے فوجی بھرتی کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں کے باشندے ایک طرف وطن کے دفاع میں پیش پیش رہے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے جنگوں کے خلاف آواز بھی بلند کی ہے۔ پھر اس مزاحمت کے بھی کئی رنگ ہیں۔ خصوصاً نوآبادیاتی جور و جبر کے خلاف پوٹھوہاری عوام ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں۔ اس دور میں پنجاب کی سرحدیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

بقول شفقت تنویر مرزا:

''انگریز کے دور میں دہلی بھی پنجاب کا حصہ تھی اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) بھی۔۔ 1901ء میں صوبہ سرحد بنایا گیا۔ دہلی ہی صدر مقام ٹھہرا۔ انگریزوں کا دیگر صوبوں کی نسبت پنجاب سے سوتیلوں جیسا سلوک رہا۔ مثال کے طور پر آسام کی آبادی ستر لاکھ کے قریب تھی مگر مرکزی اسمبلی میں اس کے تیس (30) ممبر تھے جبکہ پنجاب کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی جب کہ اس کے ممبران کی تعداد بھی تیس (30) تھی۔ انگریزوں نے پنجاب پر تب قبضہ کیا جب وہ سارے ہندوستان پر قبضہ کر چکے تھے۔ یعنی پنجاب سب سے آخر میں غلام بنا۔ راولپنڈی میں زمین پر مالیہ لگانے کی صورت میں پہلا قضیہ اٹھا۔ پنڈی کے شاعر رجب علی جوہر، جو پیر مہر علی شاہ کے رشتہ دار تھے، لکھتے ہیں:

ساڈے پلے مال نہ مایا کیہ سوچ کے ٹیکس لگایا اے
اک بالی آخلق نمانی تے ہر بستی بے ترانی تے

(ہمارے پاس مال و دولت نہیں، تم نے کیا سوچ کر ٹیکس لگایا ہے۔ (یہ ٹیکسوں والی) آگ مجبور و لاچار عوام پر کیوں جلا دی ہے۔ کہ ہر بستی اور علاقہ پہلے ہی ویران اور اجڑا ہوا ہے۔)

انہی دنوں راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر کے حکم پر بیگار سے انکار کرنے پر ایک مسلمان کو گولی مار دی گئی۔ تمام ہندوستان میں شور مچ گیا۔ وکیلوں نے جلسے کیے اور سرکار کو نوٹس جاری کیے گئے۔ اگلے دن 3 مئی 1907ء کو تمام شہروں میں ہڑتال کی گئی۔ فوجی ورکشاپوں اور ریلوے ورکشاپوں میں بھی ہڑتال ہوگئی۔ بھگت سنگھ کے چچا اجیت سنگھ، لالہ لاجپت رائے اور آغا حیدر اس بغاوت کے بانیوں میں سے تھے۔(18)

اسی زمانے میں گاؤں گھکھر وٹ راولپنڈی کا شاعر ہیرا سنگھ درد میانوالی جیل میں قید، شریہنہ کے درخت کے نیچے بیٹھ کر یہ اشعار لکھتا ہے:

جھاں شریہناں بیٹھاں گذرے گن گن دن سزاواں دے
جھرمٹ ہن جھاں تے آن آزاد طوطیاں کانواں دے
بندی وان ایہناں نوں پچھدے قصے بھین بھراواں دے
بہہ بہہ جاون جھاں دے بیٹھاں اپت پنجابی مانواں دے

(جن شریہنہ کے درختوں کے نیچے سزا کے دن گن گن کر پورے کئے، انہی درختوں پر آزاد پھرتے طوطوں اور کوؤں کے جھرمٹ آتے اور جاتے رہے۔ جن درختوں کے نیچے یہ پنجابی بیٹے بیٹھا کرتے تھے، قیدی اپنے بہن بھائیوں کے متعلق اس سے خیریت دریافت کرتے)

راولپنڈی جیل:

میانوالی جیل کے علاوہ راولپنڈی جیل بھی مسمار ہو چکی ہے، انگریز کی قید بردا پشاوری نے بھی کاٹی تھی:

ج۔جیل خانہ راولپنڈی والا، جیہدیاں کوٹھیاں گنو تے ہین چالھی
پنج ست قیدی روز آوندے نیں، کوئی دن نہیں جاندا ائے مول خالی
باراں سیر دیندے نیں پیہنے نوں، مونہہ تے چھائی زردی، اکھیں آئی لالی
بُردا آکھدا یار وا انگریز ڈاڈھے، جینہاں سئیاں جواناں دی عمر گالی

(راولپنڈی والے جیل خانہ کے اگر کمرے شمار کرو تو تقریباً چالیس ہیں۔ پانچ سات قیدی روزانہ آہی جاتے ہیں اور کوئی دن خالی نہیں جاتا (قیدی پر مشقت کی یہ صورت ہے کہ) روزانہ بارہ سیر چنے ہر قیدی سے پسوائے جاتے ہیں۔ جس کے باعث ان کے چہرے زرد ہو چکے ہیں اور آنکھیں سرخ ہو چکی ہیں۔ بُردا بیچارہ روزانہ یہ بات کہتا ہے کہ انگریز ظالم ہیں جنہوں نے سیکڑوں جوانوں کی زندگیاں تباہ کی ہیں)

جنگ مخالف لوک بیانیہ:

راولپنڈی کی فوجی ہیئت کی بدولت انگریز پہلی جنگ عظیم میں خوف کا شکار رہا۔ جنگ کے دوران ہی یہاں کے فوجیوں نے آزاد ہند فوج کی بنیاد رکھ دی تھی۔

دھنی اور پوٹھوہار کی زمین سخت اور نامہربان ہے۔ یہاں کے بانکے چھبیلے اور لمبے تڑنگے گھبرو، زمین کی اس طبعی کمزوری کے کارن ہل کی ہتھی سے اپنی سانجھ استوار نہ کر سکے۔ برطانوی سامراج کو جب جنگ کا انیدھن بنانے کے لئے زبردست افرادی قوت کی ضرورت پڑی تو مقامی دستکاریاں اجڑ گئیں۔ کارخانے ویران ہو گئے۔ زمین پہلے ہی پتھریلی تھی چنانچہ نوجوانوں کو میدان جنگ کی طرف ہنکایا گیا۔ انگریز مستشرقین نے ان کی بہادری کے

ترانے گائے اور یوں صنعت میں اپنے مستقبل کو تلاش کرنے والی دھرتی فوجی، رنگروٹوں کی مشین بن کر رہ گئی۔ پنڈ دادنخان جس کی آبادی کبھی ایک لاکھ کے قریب تھی جو اپنے کارخانوں کے لئے مشہور تھا اور ضلع کا صدر مقام تھا، بتدریج پس منظر میں چلا گیا۔ کارخانوں کا نشان تک باقی نہ رہا اور آبادی سکڑ کر دس ہزار تک آ گئی۔ پنڈ دادن خان کی یہ قسمت، دھنی اور پوٹھوہار کے کتنے ہی ایسے ابھرے ہوئے شہروں کی قسمت بنی رہی جو ابھرنے سے پہلے ہی ڈوبتے چلے گئے۔ دو عظیم جنگوں نے اس علاقے میں ''مارشل ریس'' کے نظریے کو جنم دیا۔ اس نظریے کی بنیاد، دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے جذبے کے تحت رکھی گئی۔ برطانوی سامراج کا یہ کھیل، اس علاقے کے تخلیقی لوگوں کے ذہن چھین کر لے گیا اور اس کے بدلے وہ ایک اندھی طاقت بن گئے، جس سے وہ خود اپنا بھلا تو نہیں کر سکتے تھے لیکن برطانوی سامراج کو جنگیں جیت کر ضرور دے سکتے تھے۔ یہاں کی عورتوں نے دو بڑی جنگوں کے دوران جو لوک گیت تخلیق کئے وہ نہ صرف اس سرزمین کے بیٹوں کی سلامتی کی آرزو ہیں بلکہ دعا بھی کہ جنگ ختم ہو اور جہاز کنارے آلگیں:

ماواں دے سب بچھڑے شالا پردیس
مینڈے بچھڑ یووے
مولا لام تروڑے نیں
پنج تن را کھانیں پترو
وے اللہ خیریں موڑے نیں
شالا باجرے دے دانے
ساڈا ویر جوانیاں مانے
مینڈے مرشد توں لاماں دی صلح کرا
فوجا ہسٹریاں
وے جہاج کنارے لا
آجا وے اللہ اینے
ماء بسم اللہ کرینے
مینڈے مرشد توں فوجاں دی صلح کرا
فوجاں گھر آون
وے جہاج کنارے لا
صاحباں نی صاحباں بی بی

پا چکنے ناں چولا

بچے ترت ملاسی

خیریں رب مولا

رب بھلا کرے انکھیلا

شالا منشی تینڈا

آوڑیوں دے آوڑیود

مینڈا اپتر بوہنگرو

ماء بسم اللہ کریندی اے

رب نیاں خیریں اندروں اندروں

مولا ساڈا اہن پار سمندروں

ڈاہڈا افضل کریسی

ماواں دے سبھ بچڑے

ربا پردیسی

کئی وچ خیریں دے شالا

پئی رجھدی کھیر

خیریں آونا بھیناں دے

ڈاہڈے سوہنے ویر

مینڈھے مرشد وے

لاماں دی صلح کرا

فوجاں ہسٹریاں

جہاج کنارے لا

تسیں آودوے پترو

کہڑے کہڑے راہیں

دیواں بال دھریں راتیں

مینڈے بچیو خنگاہیں

مولا ساڈا اہن

ڈاہڈا فضل کریسی

ماوں دے سب بچڑے

ربا پردیسی

گھر گھر بلدے ربا

خیریں سوہنے دیوے

شالا سائیں صاحباں دا

خیریں سکھ لدھیں جیوے

مینڈھے مرشد وے

لا ماں دی صلح کرا

صاحباں نی صاحباں بی بی

پا چکنے ناں چولا

بچے تُرت ملاسی

خیریں رب مولا

رب بھلا کرے انکھیلا

شالا منشی تینڈا

رب ترت ملاوے جیلا

وے شالا بچڑا مینڈا

آوڑیوں وے آوڑیوں

مینڈا پتر بوہنگروں

ماہ بسم اللہ کریندی وے

رب نیاں خیریں اندروں اندروں

مولا ساڈا ہُن پار سمندروں

ڈاہڈا فضل کریسی

ماواں دے سب بچڑے

ربا پردیسی

کُنی وچ خیریں وے شالا

پئی رجھدی کھیر

خیریں آونا بھیناں وے

ڈاہڈے سوہنے ویر

مینڈے مرشد وے

لا ماں دی صلح کرا

فوجاں ہُسڑیاں

جہاج کنارے لا

تسیں آ وو وے پُتر

کیہڑے کیہڑے راہیں

دیوا بال دھراں راتیں

مینڈے بچیو خنگاہیں

مولا ساڈا اہُن

ڈاہڈا افضل کریسی

ماواں دے، سب بچڑے

رباپردیسی

گھر گھر بلدے رہے

خیریں سوہنے دیوے

شالا سائیں صاحباں دا

خیریں سُکھ لدھیں جیوے

مینڈے مُرشد وے

لا ماں دی صلح کرا

جب کسی ماں کے لئے اپنے بیٹے کا دُکھ لاکھوں بیٹوں کا دکھ بن جائے تو ماں کی پکار چشمے کی طرح ''ترِل ترِل'' ترِل ترِل بہتی ہے:

شالا رب سائیں نیاں رکھاں، بھرتی جا ہوے لکھاں

گڈی سرکاری، پُتاں توں ٹھگنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی دینی آ بند کر کے

شالا اُتے اُتے وطنیں ٹیساں، بھلے لوک کریے ریساں
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا ہٹیوں لینی آں شے، مینڈے بچڑے جیون ترے
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا ٹھگری تے مقام، آنیاں وینیاں کراں سلام
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا اکٹھا آیا تانڈا، خیریں آوے جوڑا چانجا
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا مینڈا موہ تروڑ گیا، جگ ماؤناں چھوڑ گیا
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا جکواں نے کھب کالے، نوکر بچڑے پیار حوالے
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا سراں نے اُپر خطرے، خیریں منّے اساں بکرے
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا ولیاں تے ترے پیٹھے، خیریں آون مینڈے بیٹے
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے
بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے
شالا آور مینڈے ویہرے، ونڈاں پئی لڈو پیڑے
گڈی سرکاری، ٹلاں توں لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی دینی آ بند کر کے

شالا بچیا خیریں آ، بھیناں کو ملن بھرا

گڈی سرکاری، ٹلاں توں لُگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی دینی آ بند کر کے

شالا گڈی خالی چک جہمرہ، بچڑے مانن وڈیاں عمراں

گڈی سرکاری، ٹلاں توں لُگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی دینی آ بند کر کے

کیا سر مائیل اوڈ وائر اس گیت کے جذبے کو سمجھ سکتا ہے؟

افضل پرویز اپنی کتاب ''بن پھلواری'' کے ایک باب ''ماہیا وے سپاہیا'' میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''پوٹھوہاریوں کی عسکریت تو مثالی ہے۔ اس علاقے کے تاریخی حالات بھی صدیوں سے ایسے رہے ہیں کہ بیرونی حملہ آوروں سے مقابلہ کرنا تو آئے دن کی بات تھی۔ ان حالات نے ان کو تنومند مستقل مزاج، پامرد، ایثار پیشہ اور جری بنادیا ہے۔ حملوں اور جنگوں کے تاریخی بہاؤ نے انہیں بے خوف سپاہی بنایا ہی تھا لیکن غیر ملکی سامراج نے ان کی اس فطرت سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے لئے اس علاقے کو جان بوجھ کر پس ماندہ رکھا تا کہ وہ مجبوراً بھی اس کے لئے اپنی جانیں قربان کرتے رہیں۔

پچھلی دو عظیم جنگوں میں پوٹھوہاریوں نے جس جوانمردی سے اپنی عسکریت کے جوہر دکھائے ہیں اسکی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان میں نہ صرف نڈر اور جیالے سپاہی ہی پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مدبر جرنیل بھی اسی نسبت سے اس سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد پوٹھوہاریوں کی عسکری فطرت کو اور جلا بخشی گئی کیونکہ اب وہ آزاد تھے اور اس بازوئے شمشیر زن کے جوہر کسی غیر ملکی طاقت کے آلہ کار نہ تھے بلکہ اپنے پاک وطن کے لئے وقف ہو گئے تھے۔

مگر اس سے پہلے گو وہ غربت کے ہاتھوں مجبور اور اپنی ناکافی زرعی زمینوں سے غیر مطمئن ہو کر فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ اور اپنے انگریز آقاؤں کے حکم پر ہر محاذ پر اپنے آپ کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ تاہم جی داری اور دلیری ان کی فطرت تھی۔ انہی دنوں ایسے گیت بھی جنم لیتے رہے ہیں جن میں لام پر گئے ہوئے ماہی سپاہی گھروؤں کی تکالیف فاشزم کے خلاف نفرت اور جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر ملتا ہے۔

سپاہی ماہی میدان جنگ میں اپنی جیداری کے جوہر دکھلا رہے ہوتے تھے اور ان کی محبوبائیں دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھی ان کے انتظار میں گیت بُن رہی ہوتی تھیں۔

سُتا اٹھیا مکئی کولوں

رب کرے لام ٹر نئے مُڑ آوے بمبئی کولوں

ماہیا کی اس کلی میں بھی ایجاز واختصار کے کرشمے نے ایک داستان سمیٹ لی ہے کہ یہ کلی سنتے ہی پوری داستان فوراً اپنی پوری جزئیات اور تفصیل سمیت ذہن میں کھل جاتی ہے۔'' (وہ مکئی کی رکھوالی کے دنوں میں) مکئی کے کھیت کے پاس آرام سے سورہا تھا جاگا (تو اسے بھرتی ہوکر دور دیسوں کو سدھارنا پڑا کیونکہ جنگ چھڑی ہوئی تھی) خدا کرے یہ لام جلد ٹوٹے اور وہ بمبئی سے ہی لوٹ آئے (محاذ جنگ تک پہنچنے ہی نہ پائے) یوں سوتے سے جاگ کر اچانک ان سپاہیوں کو جنگ میں شریک ہونا پڑا تھا۔

بمبئی سے لوٹ کر تو ماہی نہ آسکا وہ محاذ جنگ پر پہنچ ہی گیا۔ بحری جہاز میں بیٹھ کر وہ اجنبی دیسوں کو روانہ ہو گیا۔ تو لمبے گیتوں میں فریادیں بھر گئیں:

وچہ سمندراں ٹھوکر لگی جہازے آں
ماواں یاد کرن بچیاں نے وازے آں
آڈھولا انہاں راہواں دیوا بال رکھاں خانگا ہواں
وچہ سمندراں ٹھوکر لگی جہازے آں
ماواں یاد کرن بچیاں نے وازے آں

سمندروں میں جہاز ہچکولے کھا رہا ہوگا۔ مائیں (لام پر گئے ہوئے) اپنے بچوں کی آوازوں کو ترس گئی ہیں۔ اے ماہی انہی راہوں لوٹ آؤ میں خانقاہ پہ دیا جلاؤں گی۔''

جنگ کی خبریں ان تک پہنچتی ہیں تو ان کے دل متوقع خدشات سے سہم سہم جاتے ہیں۔

کنڈا بھج گیا پھولی نا
ہِک پردیس ربا دُوا خطرہ گولی نا

''پھاوڑے کا ٹنڈا ٹوٹ گیا ہے۔ پناہ بخدا ایک تو پردیس کی صعوبتیں دوسرا گولی کا خطرہ!''

پھر جب انہیں کسی نے یہ بتا دیا کہ یہ سب کیا دھرا ''جرمن'' نام کے کسی ایسے ''شخص'' کا ہے جو بڑا ظالم بھیانک اور خونخوار ہے تو انہوں نے اپنے گیتوں کا ''دہانہ'' اُدھر موڑ دیا

تھلا ٹرٹ گیا تھالی دا
سڑے کلیجہ جرمن جمنے والی دا
ہٹیاں تے چرس نہیں
بس کر جرمن تینڈ ھے دِلے وچ ترس نہیں

''تھالی کا پیندا ٹوٹ گیا ہے جرمن جننے والی (ماں) کا کلیجہ جل جائے۔ دوکانوں پر چرس نہیں اے جرمن اب تو بس کر

تیرے دل میں ذرا رحم نہیں۔"

یہ کوسنے "ماہیا" کے علاوہ لمبے گیتوں میں بھی دیئے گئے ہیں جن کے ساتھ وہی مشترکہ ٹپے گائے جاتے رہے ہیں۔ جن میں وطن کے نظاروں کا ذکر اور ماہی کے لوٹ آنے کی خواہش ہے۔ ان گیتوں کے صرف ٹیپ دیئے جاتے ہیں (ان کی دھنیں اس بحر کے دوسرے گیتوں جیسی ہیں)

نہ آپ آئے نہ کوئی چٹھیاں آئیاں نی

جرمن! بچہ مری کیہیاں لاماں لائیاں نی

بچڑے ماواں نے ہُن کا ہلے پے گئے نی

چاچار فلاں ہتھاں تے چھالے پے گئے نی

جرمن! بچہ مری تے دیوں لگی ارمان

ماواں نے چن بچڑے کیہئے سوہنے خوب جوان

"نہ وہ خود لوٹے نہ کوئی ان کی طرف سے چٹھی آئی۔ اے جرمن! تیرا بچہ مرجائے تو نے کیسی جنگ چھیڑ رکھی ہے"۔

"ماؤں کے بچے اب تنگ آ چکے ہیں۔ رائفلیں اٹھا اٹھا کر ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں"

"اے جرمن تیرا بچہ مرجائے اور تجھے (میری طرح) دل پر ٹھیس لگے۔ ماؤں کے چاند ایسے کیسے کیسے خوبصورت تگڑے جوان (تیری بھینٹ چڑھ گئے ہیں)"

بچہ مرنے کی بدُعا بدترین بدُعا ہے جو ایک ماں کسی دوسری ماں کو دے سکتی ہے۔ ان دکھیا ماؤں کی یہ بدُعا قبول ہوئی اور مادرِ جنگ کا خونخوار بچہ مرگیا لیکن اس کے ساتھ کئی سہاگنوں کے سہاگ لٹ گئے۔ ماؤں سے بچے چھن گئے بچوں سے باپ بچھڑ گئے۔ بہنوں سے بھائی جدا ہو گئے اور بین کرنے کے لئے انہیں گیتوں کے "بہلاوے" دے گئے۔

ہُن جہاز تاں دندرے لا

فوجاں ہُسرو گیاں جہازاں کی جندرے لا

کوئی آڑو پکے ہوئے نی

ہولے ہولے ٹرگڈیئے ہن فوجی تھکے ہوئے نی

"اب جہازوں کو ساحل پر لے آؤ۔ فوجوں کا دم گھٹنے لگا ہے ان جہازوں کو اب تالے لگا دو۔ دیس میں آڑو پک گئے ہیں۔ اے ریل گاڑی دھیرے دھیرے چل۔ اس میں بیٹھے ہوئے فوجی تھکے ہوئے ہیں (انہیں دھچکا نہ لگے)۔"

جہاز ساحل پر آ لگے۔ ان پر تالے بھی پڑ گئے۔ ریل گاڑی دھیرے دھیرے چلتی فوجی جوانوں کو وطن

واپس لے بھی آئی لیکن کیا جتنے جوان گئے تھے سب لوٹ آئے؟ دھڑکتے دلوں میں جب یہ سوال پیدا ہوتا تو دھڑکنیں ٹھٹک جاتیں۔ ان دلوں سے دعائیں بلند ہوتیں۔ منتیں مانی جاتیں اور گیتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔

سڑکاں تے آئی لاری۔ لاری وچہ گڈ آیا

دیساں بکرا جدوں ملائیوں مُڑ آیا

آ ڈھولا انہاں راہواں

''لاری سڑک پر پہنچ گی ہے اس پر گرولدا ہوا ہے۔ میں بکرا ذبح کر کے خیرات کروں گی اگر وہ ملا یا سے بخیریت لوٹ آیا۔''

مگر ہزاروں آنکھیں سڑکوں پر ٹکٹکی باندھے منتظر رہیں۔ جنگ پر گیا ہوا ہر سپاہی تو لوٹ کر نہیں آتا۔ ہزاروں دلوں کی دھڑکنیں رُک رُک جاتیں۔

پچھی بھری املوکاں نی

ماہیا نہیں دِسناں بس بھری ہوئی لوکاں نی

پچھی بھری املوکاں نی

ماما نہیں دِسناں بس بھری ہوئی لوکاں نی

لالا نہیں دِسناں بس بھری ہوئی لوکاں نی

چاچا نہیں دِسناں بس بھری ہوئی لوکاں نی

ویر نہیں دِسناں بس بھری ہوئی لوکاں نی

بس بھری ہوئی لوکاں نی؟

ریل گاڑی دھیرے دھیرے چلتی رک گئی۔ تو فوجی جوان لاریوں میں بیٹھ بیٹھ اپنے اپنے گاؤں کو سدھارے۔ لاریاں گاؤں گاؤں پہنچیں مگر بہت سے گھروں میں شور مچ گیا۔ فریادیں بلند ہوئیں۔ نالے سر ہوئے، کہیں سے آواز آئی۔ ''بس تو لوگوں سے بھری ہے لیکن ماہی نظر نہیں آتا، کہیں کوئی بچی بسور کے پکاری، بس تو لوگوں سے بھری ہے لیکن ماموں کہاں ہیں۔

کہیں کوئی لڑکا چیخا: ''بس تو کھچا کھچ بھری ہے لیکن ابا نظر نہیں آتے۔'' کوئی بس کو ٹٹولتے ہوئے بولا ''بس میں کتنے لوگ ہیں لیکن چچا ان میں نہیں۔''

کوئی معصوم بہن رونے لگی ''بس تو لوگوں سے بھری ہے مگر میرا ویر؟۔۔۔۔

اب بھی چاندنی راتوں میں انہیں پکارا جاتا ہے جو لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

تارے لشکن وے راتیں چٹیاں چاننیاں

رُل رُل ڈھونڈھاں ماہیا تینڈھیاں چھاؤنیاں

''تارے دمک رہے ہیں اور آج کل راتوں میں دوھیائی چاندنی ہوتی ہے لیکن میں خراب وخوار ہوتی ماہی تمہاری چھاؤں کی تلاش میں ہوں''۔

پنجاب کی باریں اوران کا لوک بیانیہ:

لوک ورثہ، اسلام آباد کی ایک غیر مطبوعہ تحقیق کے مطابق:

''بار کا لفظ جنگل اور غیر آباد علاقے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بالعموم دو دریاؤں کا درمیانی اونچا علاقہ، جہاں پانی قدرتی طور پر نہیں چڑھتا، بار کہلاتا ہے۔ پنجاب کی باریں آپس میں ملحق ہیں، اس لئے تقریباً سب باروں کا جغرافیہ ملتا جلتا ہے۔ تاہم دریاؤں اور نالوں کے ناموں اور گزرگاہوں کا تھوڑا سا فرق ہے۔ بعض باروں میں چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلے بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے مقامی رہن سہن، فصلوں اور نباتات میں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ باقی موسم اور جنگلی حیات و نباتات تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ہم یہاں مغرب سے مشرق کی طرف باروں کا ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

گوندل بار:

یہ دریائے جہلم اور چناب کے درمیان شمالی علاقوں پر مشتمل ہے۔ دریائے جہلم اس بار میں میانی کے مقام پر داخل ہوتا ہے اور شاہ پور سے کچھ نیچے تک اس بار کی حد بناتا ہے۔ اور دریائے چناب تخت ہزارہ سے تھوڑا سا اوپر قادر آباد سے گوندل بار میں داخل ہوتا ہے اور طالب والا اور چوکی بھاگٹا نوالہ کے قریب قریب علاقوں کو لوگ گوندل بار کہتے ہیں۔ شمال میں ان دونوں دریاؤں کے درمیان پھالیہ اور منڈی بہاؤالدین کے علاقے اور جنوب میں بٹھالک سے شاہ پور تک مفروضہ لائن گوندل بار کو کڑانہ بار سے جدا کرتی ہے، مگر یہ حدیں سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی ہیں۔ اس لئے درمیان کے دس بارہ میل کے علاقے ملے جلے ہیں۔ مثلاً دریائے جہلم کے قریبی علاقوں کو دیہت بار (دیہت دریائے جہلم کا پرانا نام ہے) اور دریائے چناب مثلاً تخت ہزارہ، مِڈھ رانجھا ایسے قریبی علاقوں کو چہاں بار بھی کہتے ہیں۔

اس بار میں بھیرہ کے گرد و نواح کا علاقہ کلراٹھی (شور) زمینوں پر مشتمل ہے۔ جہاں باجرہ اور جوار کی فصلوں کے علاوہ مہندی کی جھاڑیاں ہوتی ہیں جنہیں ہر سال فصل کی طرح کاٹ کر پتے سکھا کر جھاڑ لیتے ہیں اور لکڑیاں جلا لیتے ہیں۔ دوسرے سال نئی شاخیں اور فصل تیار ہو جاتی ہے۔ درمیانی علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ یہاں گندم، کپاس، چاول، مکئی، اور خاص طور پر کھٹے پھلوں مثلاً کنوں، مسمی کے لاتعداد باغات ہیں۔ اس کے علاوہ سن اور سنکڑا بہت پیدا ہوتا ہے۔ تخت ہزارہ کے بلند علاقوں میں گندم، کپاس اور ہر قسم کی فصل اور نچان یعنی ہتھار میں دالیں، گندم، گنا اور اس قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں سے جنوب کی طرف کڑانہ بار سے ملتی ہے اور دریائے چناب

کے اس پار ساندل بار کے علاقے ہیں۔اس علاقے میں قادر آباد، جہاں دریائے چناب پر ڈیم بنایا گیا ہے اور خانکی ہیڈ کے ارد گرد کافی لمبی چوڑی جھیلیں بن گئی ہیں۔کنول، کول ڈوڈے اور دبھ اگتی ہے۔جس سے صفیں بنائی جاتی ہیں۔سردیوں میں مچھلی، مرغابی اور کونج کا شکار ہوتا ہے۔

کڑانہ بار:

اس بار کا نام کڑانہ پہاڑی کی وجہ سے کڑانہ بار پڑا ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ خزانہ بار بھی یہی ہے جس کا وارث شاہ نے ہیر کی زلف کو تشبیہ دیتے ہوئے ذکر کیا ہے۔یعنی ''زلف ناگ خزانے دی بار وچوں'' میاں صدیق لالی اپنی اس بار کا نام کڑانہ دیس بھی بتاتا ہے اور اس نے کڑانہ پہاڑی کے گرد کی چوٹیوں کے نام اپنی شاعری میں بڑے خوبصورت انداز میں گنوائے ہیں۔اس بار کی شمالی حد گوندل بار سے اور جنوبی ساندل بار سے ملتی ہے۔مشرق میں دریائے چناب اور مغرب میں دریائے جہلم ہے۔جھنگ گزیٹیئر کے مطابق اس کا ضلع جھنگ میں رقبہ 315 مربع میل اور باقی علاقہ ضلع شاہ پور (سرگودھا) میں ہے۔کڑانہ پہاڑی پر ناتھوں کا بہت بڑا مندر اور تالاب ہے۔کڑانہ پہاڑی سکھاں والی کی پہاڑیاں اور احمد پور کی پہاڑیاں ہیں باقی علاقہ میدانی ہے۔ان پہاڑیوں کے نام صدیق لالی مرحوم نے یہ گنوائے ہیں۔(1) نہڈے والی، جس کے قریب نہڈ یوالی کا ریلوے سٹیشن ہے جس کا نام تبدیل کر کے نشتر آباد رکھ دیا گیا ہے۔کہتے ہیں یہاں ایک فقیر رہتا تھا جو صبح صبح بہت بڑی روٹی پکاتا تھا پھر سارا دن اسے مسافروں میں بانٹتا رہتا تھا۔(2) داؤن گلی، اس پہاڑی پر سکھوں اور لالی قوم کی ایک شاخ ''بودھراں'' کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور بودھراں نے یہ پہاڑی سکھوں سے چھین لی تھی۔(3) سیخو (4) بیرے۔(5) بدمنس (آجکل اس پہاڑی کو ''منسو'' کہا جاتا ہے (6) بگے والی (7) تگوالی (8) چھنڈل (9) بہرہ (10) کوہڑی (11) ٹھبڑی (12) بچی (13) کلے (14) ترشول (اس کی شکل کی وجہ سے شاید ہندوؤں کے تین کونے والے ترشول کا نام دیا گیا ہے) (15) مڑھانہ (16) گڑھالہ (17) لڑیانہ (18) روڑیاں (19) کدھڑ لے (20) کھڑکیاں (21) ٹھل وغیرہ، پنجاب کی باروں میں یہ سب سے چھوٹی بار ہے جبکہ ساندل بار سب سے بڑی بار ہے۔اس بار میں غیر مسلم آبادی کافی تھی۔

لوگ شاہ پوری اور لہندی پنجابی کی ملغوبہ زبان بولتے ہیں۔گندم اور چاول بڑی فصلیں ہیں۔کڑانہ پہاڑیوں کے پتھر سے چنیوٹ کی مسجد بنی ہے۔دریائے چناب کے پل کے قریب پہاڑی پر دیوی کا مندر تھا۔جس کی سیڑھیاں دریا میں اترتی تھیں۔یہاں پر تیتر، (بھورا تیتر) عام ملتے ہیں۔اس علاقے میں سانپے اور سانپ عام ہیں۔کالا ناگ، پھنیئر، سنگ چور، کرلی، گرگٹ اور گوہ، عام ملتے ہیں۔ایک خاص قسم کا رینگنے والا جانور ''بنڈوا'' (Bindwa) بہت زہریلا بتایا جاتا تھا۔مثل مشہور تھی۔''لڑے بنڈوا تے کھٹے ٹویا'' (قبر)

ککر، ملہا، جالی، چنڈ، شرینہہ، کاہو، کھجی، توت، اک اور کانہہ قسم کے پودے عام ملتے ہیں۔

ساندل بار:

یہ پنجاب کی سب سے بڑی بار ہے۔ اس کی حد شرقاً غرباً دریائے راوی سے چناب تک ہے لیکن جنوبی حصے میں دریائے چناب سے پار ضلع جھنگ کا علاقہ بھی اس میں شامل ہے اور شمال میں ضلع شیخوپورہ۔ یہاں تک کہ ضلع گوجرانوالہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ جو کہ نسبتاً پہلے آباد ہونے کی وجہ سے انتظامی طور پر انگریزی حکومت نے ساندل بار میں شمار کرنا بند کر دیے۔ جن میں جنڈیالہ شیر خان، سچا سودا، شاہ کوٹ اور ننکانہ صاحب کا نام شامل ہیں۔ یہ بار مشاہیر کا گڑھ، داستانوں کا مرکز، پیداوار کا ذخیرہ، اچھی نسل کے پالتو جانور، مشہور شہر، مقامات اور گنجان آبادی کا مسکن ہے۔ پنجاب کی زیادہ مشہور قومیں بھی اس بار میں رہتی ہیں۔

دریاؤں میں دریائے راوی اور چناب کے علاوہ سک نین تھا جو کہ موجودہ جھنگ سے جنوب کی طرف گزرتا ہوا تریموں سے ملتا تھا۔ اس لئے اس جگہ کو تریموں کہتے ہیں یعنی تین دریاؤں کی جائے اتصال۔

علاقے کے موسم تو وہی پنجاب کے چار موسم سردی، گرمی، خزاں اور بہار ہی ہیں۔ جھیلیں یا تو تریموں بند کے اردگرد بڑی دریائی جھیلیں بن گئی ہیں۔ یا پھر دریاؤں کا سیلابی پانی اونچی جگہوں سے گزر کر نیچی جگہوں پر جمع ہو جاتا ہے۔ جو کئی کئی ماہ کھڑا رہتا ہے یا بارش کے پانی سے چھنب بن جاتے ہیں جن میں دبھ اور دیگر بوٹے اُگ آتے ہیں۔

جھنگ کا علاقہ دیسی گھی اور کپڑے کی صنعت کے لئے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ اس علاقے میں سب سے زیادہ ٹاہلی کی لکڑی ہوتی ہے، جس سے چنیوٹ میں اعلیٰ فرنیچر بنتا ہے۔ فیصل آباد کپڑے کی صنعت کا مرکز ہے۔ یہاں کی زمینیں گندم، چاول، کپاس، تیل کے بیج اور دیگر زرعی فصلوں کی شکل میں سونا اگلتی ہیں۔ احمد خان کا جھانبرہ زرخیزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ وارث شاہ کا علاقہ سونے کی چڑیا ہے۔ مرزے کا دانا آباد بہترین بھینسوں کا علاقہ ہے، صاحباں کا کھیوہ، بار کے گیتوں کا مرکز اور بابا نانک کے ننکانے کا علاقہ بہترین چاول کا علاقہ ہے۔

گنجی بار:

پنجاب گزیٹیئر کے مطابق یہ وہ علاقہ ہے جو جغرافیائی طور پر دریائے راوی اور دریائے سک بیاس کے درمیان شمال میں ماجھا سے لے کر جنوب میں خانیوال کے ضلع تک پھیلا ہوا ہے۔ اس بار میں اکیلا دریائے راوی ہی بہتا ہے۔ مشرق کا دریا بیاس مدت ہوئی خشک ہو چکا ہے۔ گنجی بار کا مرکز دریائے راوی اور بیاس کے درمیان اونچی پٹی ہے جسے ''ڈھایا'' (Dhaya) کہتے ہیں۔

ڈھایا کے مشرق میں سک بیاس کے قریبی علاقے کو بیاس بار اور مغرب میں راوی کے قریبی علاقے کو راوی بار کہتے ہیں۔ بعض محققین کہتے ہیں دریائے بیاس 1750ء میں بند ہوا لیکن وہ سکھ بیاس کا نالہ تھا ورنہ بیاس تو آئین اکبری کے مصنف کے مطابق بھی فیروزپور سے 20 میل کے فاصلے پر ستلج میں ملتا تھا۔

گنجی بار کو بھی دریائے بیاس کے دائیں طرف کے نالے سیراب کرتے تھے جو کچھ قدرتی اور کچھ مصنوعی تھے مگر بیاس کے ساتھ یہ بھی خشک ہو گئے ہیں۔ اس علاقے میں مدت سے کچھ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ جنگلی گھاس بھی صرف برسات کے موسم میں اگتی تھی۔ اس لئے اسے گنجی بار کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس علاقے میں پرانے شہر تلمبہ اور ہڑپا ہیں۔ ہڑپہ کی تہذیب تمام برصغیر کے سر پر تاج کا درجہ رکھتی ہے نہری نظام کی وجہ سے اب یہ علاقہ کپاس کی سب سے بڑی فصل نیز گندم، گنا، دالیں اور تیل کے بیج پیدا کرتا ہے۔ اس علاقے میں احمد نگر کا گائیوں کا پاکستان کا سب سے بڑا فارم ہے۔ جہاں زیادہ دودھ دینے والی غیر ملکی گائیوں کو مقامی نسل سے ملا کر یہاں کے موسم کو برداشت کرنے والی نسلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ ملک میں ساہیوال نسل کی سرخ گائے مشہور ہے۔ یہاں ہر موسم کے درخت عام ملتے ہیں۔ مسٹر پرسر (Mr Purser) کے مطابق اکانہہ، پھروانہہ، پچھی، ککر، ببول، کابلی ککر، بہر، ملہے، ون کریر، پھچھر اور سوہانجنا کے درخت ملتے ہیں۔ کریر کی لکڑی کو کیڑا نہیں لگتا۔ علاوہ ازیں سر، لانا، اک، جھنجھن قسم کی جھاڑیاں، بہوپھلی، جوانہہ، ہرل، گلو، دھمانہہ، پولی، الیٹی گلیٹی، گھر رمدھانا، فرید مولی، پٹھ کنڈا، اٹ سٹ، چلائی، بھکھڑا، ہاتھی سنڈی اور بوئیں قسم کی بوٹیاں ملتی ہیں۔ دھابوں میں کوندر، کنول سنگھاڑے، کتابوتی، چوپتی اور لہن گھاس عام ہے۔

نیلی بار:

کسی بھی علاقے کی ثقافتی تقسیم واضح خطوط کے ذریعے نہیں کی جاسکتی کیونکہ ہر بارہ کوس پر ثقافتی تبدیلی نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ کسی بھی ثقافتی وحدت کا مرکز اس کی سرحدوں سے تھوڑا بہت مختلف نظر آئے گا۔ سرحدی ثقافت اپنے اتصالی علاقوں سے ملتی جلتی ہوگی پھر جہاں تک نیلی بار کا تعلق ہے، جغرافیہ پنجاب مرتبہ منشی اگرسین مطبوعہ 1867ء کے مطابق پاکپتن، دیپالپور اور حجرہ شاہ مقیم کے علاقے کبھی ضلع گوگیرہ میں شامل تھے اور منٹگمری ضلع کی ساندل بار کا علاقہ 1899ء میں جھنگ میں شامل تھا۔ پھر رسم ورواج، تاریخ، جغرافیہ اور ثقافتی لحاظ سے گنجی بار کو نیلی بار سے جدا کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ نیلی مقامی زبان میں دریائے ستلج کو کہتے ہیں۔ اس لئے نیلی بار دریائے ستلج کے اس بار کے نزدیکی علاقے کو بھی کہا جاسکتا ہے۔ تاہم نیلی بار سکھ بیاس کے بائیں کنارے سے لے کر دریائے ستلج تک کے علاقے کو کہا جاتا ہے۔ جس کی شمالی سرحد کنگن پور تک اور قصور ضلع کے مغربی علاقوں سے جالگتی ہے۔ اور مغربی سرحد پر ہم خانیوال کے علاقوں کو شامل کرسکتے ہیں اصل میں نیلی اور گنجی بار کی سرحدوں کو ایک خط میں دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

ساندل بار کے بعد نیلی بار ایک ایسی بار ہے جو اپنے سرسبز علاقے، خوشحالی، بہترین دودھ دینے والی بھینسوں، گھوڑوں اور دیگر پالتو جانورں کے علاوہ دیگر ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ پاکپتن میں بابا فرید کا مسکن اور مزار، حجرہ شاہ مقیم، کوٹ قبولے کا قدیم شہر، دیپال پور کی تاریخی حیثیت اس بار کی شان کو دوبالا کرتے ہیں۔

تمام علاقہ ہرا بھرا ہے ملکہ ہانس ہے جہاں وارث شاہ نے دل پر چوٹ کھائی اور ہیر رانجھے کا قصہ وجود میں آیا۔ اسی طرح دیوان چاولی مشائخ نے تصوف میں نام پیدا کیا۔

اس علاقے میں صرف ایک دریا دریائے ستلج ہے وہ بھی تقریباً مشرقی سرحد پر' تاہم علاقے میں دریائی اور برساتی نالے جال کی طرح پھیلے ہوئے تھے جو کچھ تو قدرتی تھے کچھ ضرورت کے تحت مصنوعی۔ ان میں جھلاروں کے ذریعہ آبپاشی اور کشتیوں کے ذریعہ آمد و رفت اور بار برداری نے علاقے کو خوشحال بنا دیا ہے۔ ان میں بڑے بڑے نالے یہ تھے جن کو بڈھ یعنی بوڑھے یا پرانے بھی کہا جاتا ہے سب سے بڑا سکھ بیاس، نالہ سکھراوا، پرانا سہاگ اور اس کے امدادی نالے پارا اور ڈھاڈر، کھڈ، ڈنگ اور اس کی شاخیں بھاک، ڈنگی، کیرار، نالہ دیوان واہ، نالہ گھگھہ، نالہ تجبل واہ، اور نالہ بشارت۔

ہر قسم کے درختوں کے علاوہ علاقے کی مختلف گھاس مثلاً گھبل، دبھ، لونگ، دھمن، بپلو اہن، کھیئو، گھرم، گھرب، ڈھڈن، سوانک، کوری، کورا، پنی، ٹیلا، مرک، مرکن، لیمب، چھمکی، لومبڑ، کانہہ اور میتہ وغیرہ۔ پرانے زمانے میں جب دریاؤں میں پانی آتا تھا مچھلی کا شکار بھی بہت ہوتا تھا کیونکہ دریائی نالے بھی سیلاب کے وقت ڈھلانوں میں پانی کھڑا کر جاتے تھے جن میں سارا سال مچھلی ختم نہیں ہوتی تھی۔(20)

تاریخی تناظر میں ہڑپہ تہذیب، ایرانی اور یونانی حملوں، راجہ رسالو کی داستانوں، بابر کے حملے کا تعلق انہی باروں سے ہے۔ ہماری مذکورہ تحقیق کے مطابق:

سولہویں صدی میں بابر نے باروں کے علاقے پر حملہ کیا تو اس وقت بھیرہ یعنی گوندل بار کا حاکم سید علی خان تھا جو لودھی کا خطبہ پڑھتا تھا۔ وہ بھاگ کر شورکوٹ کے قلعے میں پناہ گزیں ہوا۔ بابر بڑھتا بڑھتا دیپال پور کے علاقے یعنی گنجی اور نیلی بار پر بھی قابض ہو گیا۔ پھر 1658 سے 1707ء تک نیلی بار میں ایک کاشتکار قوم کے قطب ہانس کو جو کہ دہلی کے حکمران طبقے کے بچے پڑھاتا تھا۔ اورنگ زیب نے قطب آباد کے قریب زمین دے دی اس طرح ہانس قوم نے نیلی کے علاقے میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ہانس قوم اور گوگیرہ کے قریب بسنے والے سکھوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی ملکہ ہانس (جہاں وارث شاہ نے ہیر لکھی) کے ہانس کامیاب ہو جاتے اور کبھی نکئی سکھ، ملکہ ہانس کے ہانسوں نے کھرلوں سے کمالیہ چھین لیا۔ کھرلوں نے نکئی سکھوں کو اپنی مدد کے لئے پکارا تو نکئی کمالیے پر خود قابض ہو گئے۔ 1739ء میں نادر شاہ اور 1747 میں احمد شاہ نے اس علاقے کو لوٹا تو مثل مشہور ہوئی'' کھادا پیتا لاہے دا، باقی احمد شاہے دا'' جب گنڈہ سنگھ اور جھنڈا سنگھ نے 1766 میں ملتان پر حملہ کیا تو نیلی کے علاقے میں پاکپتن کے دیوان ملکہ ہانس کے ہانس اور نکئی سکھوں کے درمیان لڑائیاں جاری تھیں۔ دیپال پور میں افغان، بصیر پور اور حجرہ شاہ مقیم میں سید اور شیر گڑھ میں سکھوں کا اقتدار تھا۔ 1814ء سے 1830ء تک ملتان کا ساون دل اس علاقے پر حکمران رہا۔ مقامی طور پر سیالوں اور کھرلوں کے جھگڑے چلتے رہے۔ آخر 1849ء میں

انگریزوں نے باروں پر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں نے 1855ء میں تقریباً بیس دیہات لاہور سے کاٹ کر گوگیرہ ضلع میں شامل کر دیئے۔ 1857ء کی بغاوت پر قابو پانے کے بعد 1864ء میں انگریزوں نے گوگیرہ کا ضلعی ہیڈ کواٹر ساہیوال منتقل کر دیا اور لاہور اور ملتان کے درمیان ریلوے اسٹیشن کا نام سر آر منٹگمری کے نام پر رکھا اور ساہیوال کا نام منٹگمری رکھا۔ ادھر 1890ء میں چناب کالونی کے نام سے ایک آبادی کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں 1892ء میں یونین جیک کے نقشے پر ایک شہر بسانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ 1896ء میں سر جمیز لائیل اور لفٹیننٹ گورنر کے نام سے اس کا نام لائل پور رکھا گیا اور اس طرح دُلا بھٹی کے دادا بجلی خان عرفساندل کے نام سے پکاری جانے والی ساندل بار کا مرکز آہستہ آہستہ لائلپور بن گیا جسے صدر ضیاء الحق کے دور میں سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فیصل کے نام سے فیصل آباد بنا دیا گیا۔ گوندل بار ''گوندل قوم کے نام سے اور کڑانہ پہاڑی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس طرح نیلی بار دریائے ستلج کے دوسرے نام نیلی کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ رہی گنجی بار تو یہ علاقہ اتنا ویران تھا کہ سیکڑوں میل تک کوئی درخت نہیں نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ گرمی سے گھاس بھی جھلس کر معدوم ہو جاتی تھی اور زمین بالکل گنجی ہو جاتی تھی اس لئے لوگ اسے گنجی بار کہنے لگے۔'' (21)

ان باروں سے متعدد لوک داستانیں روایات اور قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔ جن کا مجموعی تاثر باروں کے لوک بیانیے کو جنم دیتا ہے۔ لوک ورثہ کی اسی تحقیق میں ایسی کئی داستانیں اور روایات محفوظ کر دی گئی ہیں جو ان علاقوں کی منفرد خصوصیات کا حصہ ہیں۔

گامن سچیار:

جھنگ کی لوک روایتوں کے مطابق بوہر کورائیاں موضع کل کورائیں جھنگ سے بجانب شمال تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ تقریباً چار مربع میل میں پھیلی ہوئی کنوؤں اور ڈیروں کی آبادی تھی۔ کورائیں بلوچوں کی ایک شاخ ہے۔ اس موضع میں بوہڑ کورائیں کی بستی میں ایک شخص بہبل خان کورائیں تھا۔ اس کی بیوی کا نام کالی تھا۔ بہبل خاں اچ گل امام کے سید دیوان علی شاہ کا مرید تھا۔ بخاری سادات کی سات ''اچ'' یعنی اونچی اور مقدس بستیاں مشہور ہیں۔ موضع بہر کورائیں میں بہت تنگ تھا، چنانچہ اس کے پیر نے کہا کہ میرے پاس آؤ اور میرا کارندہ بن کر رہو۔ اللہ روٹی دے گا۔ اس پر بہبل خان اپنی بیوی اور بیٹے گامن کو لے کر اچ گل امام چلا گیا جو کہ لیہ کی طرف جھنگ کی سرحد کے قریب تھل میں واقع ہے۔ گامن نے ان نیک سادات کی زیرِ نگرانی تعلیم پائی۔ سید دیوان علی شاہ جب فوت ہو گیا تو اس کے چاروں بیٹے در جمال، در جلال، در لعل اور در کمال گدی کے امیدوار تھے۔ ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ گامن سچیار نے سوچا کہ کس پیرزادے کی حمایت کرے اور کس کی مخالفت۔ اس نے سوچا بہتر ہے یہاں سے کنارہ کیا جائے چنانچہ وہ گاؤں چھوڑ کر ڈیرہ غازی خان کی طرف چلا گیا۔ غازی خان، اسمٰعیل خان، لیہ خاں اور دادن خان چار بھائی تھے۔ غازی خان اور اسماعیل خان کے درمیان چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے پر لڑائی

تھی۔ ایک دفعہ غازی اور اسماعیل نے کہا کہ آؤ ہم دونوں بھائی آپس میں بات چیت سے فیصلہ کر لیں لہٰذا دونوں میں سے کوئی بھی نہ اپنا فوجی ساتھ لائے اور نہ کوئی ذاتی ہتھیار۔ وہ دونوں بیڑی میں سوار ہو گئے کہ پار جا کر بات چیت کریں گے لیکن دونوں کے پاس خفیہ ہتھیار تھے۔ درمیان میں بیڑی چکر کھانے لگی۔ ملاح نے کہا اپنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو ورنہ بیڑی ڈوب جائے گی۔ دونوں بھائیوں نے بلند آواز میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور اپنے چھپے ہتھیار دریا میں پھینک دیئے۔ بیڑی پر ایک عورت سوار تھی جو اپنے خاوند کے لئے کھانا لے جا رہی تھی اور ایک ہندو ساہوکار اپنی بہیاں لئے قرضے واپس لینے جا رہا تھا۔ جب دونوں نوابوں کے اعتراف گناہ کے باوجود بھی بیڑی نہ چلی تو ملاح عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ عورت نے اعتراف کر لیا کہ وہ اپنے یار سے مل کر اپنے خاوند کو ہلاک کرنے کے لئے زہر ملا کھانا لے جا رہی ہے۔ اس نے کھانا دریا میں پھینک دیا اور توبہ کی۔ کشتی پھر بھی چکر کھاتی رہی تو ملاح ساہوکار کی طرف متوجہ ہوا۔ اس ہندو نے اعتراف کیا کہ یہ سارے کھاتے میں نے جعلی بنائے ہیں اور اس نے بھی توبہ کی اور کھاتے دریا میں پھینک دیئے۔ کنارے پر پہنچ کر کشتی پھر ڈوبنے لگی تو ملاح نے بھی اعتراف کیا کہ میرے سر پر جو کپڑا ہے وہ چوری کا ہے۔ اس نے کپڑا اتار پھینکا اور کشتی کنارے جا لگی۔ گامن سچیار وہاں کھڑا تھا۔ وہ یہ کہہ کر رہا کہ میں نے آج تک بیڑی کا ایسا پور نہیں دیکھا جو سارے کا سارا بے ایمانوں کا ہو۔ اس پر دونوں نواب خاص طور پر بہت شرمندہ ہوئے لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

وہ اترے اور گامن بیڑی پر بیٹھ گیا اور اگلے کنارے جا کر ایک دائی کے گھر بسرام کیا کیونکہ اس زمانے میں گاؤں کی تنور والی دائیاں ہی مسافروں کو قیمت پر روٹی کھلایا اور گھر میں رہنے کو جگہ دیتی تھیں۔ یہ روٹی کھا کر چارپائی پر لیٹا ہی تھا کہ اس نے دیکھا غازی خان کے چار نوکر ایک مرغ پکڑ کر لا رہے تھے۔ وہ ان سے چھوٹ کر اس کی چارپائی کے نیچے پناہ گزیں ہوا۔ انہوں نے نکالا، وہ پھر چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ جب تین دفعہ اسی طرح ہوا تو گامن نے ان سے کہا کہ یہ میری پناہ مانگ رہا ہے۔ جتنے پیسے تمہارے خرچ ہوئے ہیں لے لو اور اس مرغ کو چھوڑ دو۔ وہ گرم ہو کر بولے تمہیں پتہ نہیں ہم نواب غازی خان کے آدمی ہیں اور اس کے لئے مرغ لے جا رہے ہیں۔ ہم پیسے کیوں لیں؟ ہم تو جس کا مرغ چاہیں پکڑ لیں۔ اس پر گامن نے کہا غازی خاں اتنا بڑا نواب ہو کر حرام کھاتا ہے؟ چنانچہ وہ نوکر گامن سے الجھ پڑے۔ گامن نے تلوار نکال لی اور تین کو بری طرح زخمی کر کے پھینک دیا اور چوتھا بھاگ کر دربار میں پہنچا۔ نواب نے بارہ ہتھیار بند سپاہی بھیجے کہ اگر گامن خود دربار میں نہ آئے تو اس کا سر اتار کر دربار میں پیش کیا جائے۔

گامن دربار میں چلا آیا تو نواب نے پوچھا کہ تم نے نوکروں کو کیوں مارا ہے اور مجھے کیوں برا بھلا کہا ہے؟ گامن نے جواب دیا: نواب صاحب میں تو آپ کی تعریفیں سن کر جھنگ سے آپ کی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے نکلا تھا مگر مجھے یہاں آ کر پتہ چلا کہ آپ کی تو صرف خوشامدیوں نے کہانی بنائی ہوئی ہے ورنہ آپ تو بہت بڑے ظالم

ہیں۔نواب نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا ''کورائیں بلوچ'' اور نام ''گامن''۔نواب نے فوراً کہا ''گامن سچیار''؟ گامن نے کہا سچیار تو اللہ کی ذات ہے۔غازی نے اس کو اپنا اتالیق اور سب سے بڑا مشیر بنالیا اور کہا کہ مجھے مشورہ دو۔گامن نے کہا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ رشوت کی جڑ کاٹ دو۔دوسرا یہ کہ نذرانے مت وصول کیا کرو اور تیسرا یہ کہ کسی سے بیگار نہ لو۔غازی خان نے اس پر عمل کیا۔تمام جاگیردار اور درباری اس کے خلاف ہو گئے۔گامن نے کہا میں بالکل فارغ بیٹھ کر مشورے نہیں دینا چاہتا۔میرے سپرد ایک مرغی خانہ کر دیں۔سال کے بعد نواب نے کہا آپ نے مرغیوں کو کتنا دانہ کھلایا ہے۔اس نے کہا میں نے تو ایک دانہ بھی نہیں کھلایا۔نواب نے کہا پھر مرغیاں کیسے پالیں۔اس نے کہا شاہی باورچی خانے میں پکنے والی دیگوں کو جو دم کرتے وقت آٹا لگاتے ہیں وہی پک کر اترا ہوا آٹا میں مرغیوں کو کھلاتا ہوں۔

گامن کو پتہ چلا کہ وزیرستان کے پٹھان اکثر نواب کے علاقے پر حملہ کرتے ہیں اور لوٹ کر لے جاتے ہیں۔گامن حیران ہوا کہ 18000 فوج سے مقابلہ کر کے یہ قبائلی کس طرح مال لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ایک دفعہ قبائلیوں نے حملہ کیا اور مال لوٹ کر لے گئے۔گامن خود لمبا نیزہ لے کر قبائلیوں کے مقابلے کے لئے بھاگا۔دیکھا کہ نواب کا لشکر شکست کھا کر واپس بھاگتا آ رہا ہے۔گامن نے نعرہ مارا اور قبائلیوں پر ٹوٹ پڑا۔یہ دیکھ کر لشکر بھی واپس پلٹا اور قبائلیوں کو بھگا کر مال ان سے واپس لے لیا۔گامن کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔اس نے سو قبائلی ہلاک کر دیئے۔اب قبائلیوں نے سوچ لیا کہ لوٹ کا وقت ختم ہوا لیکن انہوں نے باعزت صلح کرنے کے لئے نواب صاحب کی ایک خوبصورت کنیز دریا پر نہاتی ہوئی اغوا کر لی تاکہ ان سے بات چیت کی جائے۔اس پر درباریوں نے نواب کے گامن کے خلاف خوب کان بھرے کہ اس کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا چنانچہ نواب بہت رنجیدہ خاطر ہوا۔گامن دربار پہنچا اور اس نے یہ بات سنی تو اکیلا ہی گھوڑے پر سوار ہو کر قبائلیوں کا پیچھا کرنے لگا۔اسے پتہ چلا کہ پانچ قبائلی کنیز کو لے جا رہے تھے۔ایک نے کنیز اپنے پیچھے بٹھائی ہوئی تھی اور چار محافظ ہتھیار بند ہو کر گھوڑوں پر سوار تھے۔گامن گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچ گیا اور انہیں للکارا۔لڑائی ہوئی گامن نے پانچوں سوار ہلاک کر دیئے اور پانچویں کا سر تن سے اتار کر اپنے گھوڑے کی زین کی پچھلی طرف لٹکا لیا۔یہ سر اس کا تھا جس کے پیچھے گھوڑے پر کنیز بیٹھی تھی۔کنیز اور اغوا کرنے والے کے سر کے ساتھ جب گامن واپس آیا تو دربار میں دھوم مچ گئی نواب نے کنیز گامن کو دینی چاہی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں عورتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔گامن نواب صاحب کے زنان خانے میں بھی آتا جاتا تھا۔کسی نے سوال کیا کہ نواب صاحب کے حرم میں کتنی عورتیں ہیں؟ تو گامن نے کہا کہ میں نے تو کبھی نظر اوپر نہیں اٹھائی اور نہ کبھی کسی عورت کو وہاں دیکھا ہے۔گامن نے کہا کہ مجھے سچ بولنے کی عادت ہے اور سچ بڑے لوگوں کو پسند نہیں اس لئے خدا جانے کب سچ کی سزا میں ہلاک ہو جاؤں۔بیوی بچے نہ ہوں گے نہ رلیں گے۔گامن کی وجہ سے نواب غازی خان کی سرحدیں محفوظ ہو گئیں اور وہ مغرور ہو گیا۔وہ اپنے وقت کے بادشاہ اورنگ زیب کو

نفرت سے ''ماما'' کہتا تھا۔ گامن نے کہا کہ اورنگ زیب بڑی طاقت ہے اس کی شان میں نازیبا کلمات مت کہہ۔
بہر حال اورنگ زیب کے مخبروں نے نواب اور گامن سچیار دونوں کی بات دربار مغلیہ میں پہنچا دی۔ غازی خان نے اورنگ زیب کی حمایت پر گامن سچیار کی زبان کاٹنے کی دھمکی دی۔ گامن پر اس کا کیا اثر ہونا تھا۔ بہر حال اورنگ زیب نے نواب غازی پر حملہ کرایا وہ تمام درباریوں سمیت گرفتار کر کے دربار حاضر کیا گیا۔ اورنگ زیب نے پوچھا تم میں گامن کون ہے؟ گامن نے کہا میں ہوں۔ بادشاہ نے کہا تم اتنے مشہور کیوں ہو؟ گامن نے کہا مجھ میں تین صفات ہیں۔ (1) اچھا بولنا (2) اچھا کھانا (3) اچھا اٹھنا بیٹھنا۔

بادشاہ نے کہا یہ صفات تو ہر کسی میں ہیں۔ گامن نے کہا (1) میں سچ بولتا ہوں لوگ جھوٹ بولتے ہیں (2 میں حلال کھاتا ہوں لوگ اکثر حرام کھاتے ہیں (3) میں تمیز سے بولتا ہوں لوگ بدتمیزی کرتے ہیں۔

اورنگ زیب نے غازی کو معزول کر کے جیل میں ڈل دیا اور گامن سچیار کو دربار میں رکھ لیا۔ (22)

عالم شیر اعوان:

عالم شیر دور انگریزی کی داستان ہے۔ اس داستان کے سلسلے میں بہت سے مقامی شاعروں نے مختلف اصناف میں نظمیں لکھی ہیں۔ لوک شاعری کی صنف ڈھولا میں بھی بہت سے شاعروں (سائر) نے یہ قصہ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے دو ڈھولے ماخذ (محمد) مرحوم ولد میر مرحوم چک نمبر 216 سچے دی جھوک کے لکھے ہوئے ملے ہیں۔ دو ڈھولے غلام ولد مراد مرحوم سکنہ چاہ رومی والا موضع کل گورائیں نزد جھنگ کے لکھے ہوئے ملے ہیں، جن سے مجاہد اور شہید عالم شیر اعوان کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ عالم شیر اعوان سرکاری شتر سوار تھا۔، جس کا کام یہ تھا کہ ان علاقوں میں جہاں بغیر اونٹ کے سفر محال ہو، افسران کو لے جائے اور سرکاری کاموں کے لئے اونٹ پر سفر کرے۔

ایک دفعہ علاقہ فیصل آباد کا ایک انگریز افسر کیپٹن گبرائیل صاحب (جسے پنجاب میں لوگ گبریل صاحب کہتے تھے) نے گڑھ کلیانوالہ کا دورہ رکھا۔ یہ گڑھ کلیانوالہ شورکوٹ، شیخوپورہ ریلوے سٹیشن کنجوانی سے جانب مشرق سات میل کے فاصلے پر ہے۔

کیپٹن گبرائیل صاحب نے اپنے شتر سوار کو ایک اچھا اونٹ سواری کے لئے خریدنے کو بھیجا۔ وہ اونٹ خرید کر لایا تو بعض روایتوں کی رو سے کہ وہ مڑ بچا اونٹ (بہاولپوری اونٹ) جو کہ سواری کے لئے ہوتا ہے اور تیز بھاگتا ہے، لانے کی بجائے لادو اونٹ (سست رفتار اور بوجھ اٹھانے والا) خرید لایا۔ جس پر اسے صاحب نے جھڑکا اور سور کا بچہ کہا لیکن دوسری روایت جو کہ زیادہ معتبر معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اونٹ تو وہ سواری والا ہی خرید کر لایا تھا مگر جب اسے پوچھا گیا کہ کتنے کا خرید کر لایا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ سو روپے میں خرید کر لایا تھا مگر اسی دربار میں بیٹھے ہوئے احمد بلوچ نے ازراہِ مذاق مگر بڑے سنجیدہ انداز میں کہا کہ یہ اونٹ تو تو نے میرے سامنے 99 روپے کا خریدا ہے۔ اس پر صوبہ سنگھ تھانیدار نے بھی مذاقاً گواہی دے دی کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے اونٹ 99 روپے کا خریدا ہے۔

اس پر گبرائیل صاحب نے کہا وہ سور کا بچہ ایک روپے پر جھوٹ بولتا ہے۔ یہ کلمہ عالم شیر کو کھا گیا۔ اس نے کہا میرے باپ نے تین حج کئے ہیں اور وہ نیک آدمی اور نمازی ہے۔ آپ نے اُسے سور کہا۔ بہر حال یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ رات کو سب لوگ اپنے اپنے خیموں میں سو گئے۔ صبح ہونے پر صاحب کے خیمے میں صبح کی چائے پہنچا دی گئی۔ وہ اٹھ کر ناشتہ کرنے ہی والا تھا کہ عالم شیر اعوان نے کسی اٹھائی اور صاحب کے خیمے میں گھس گیا اور اتنے زور کا وار کیا کہ صاحب کی گردن الگ ہو گئی اور وہ کوئی آواز ہی نہ نکال سکا۔ پھر وہی کسی لے کر صوبہ سنگھ تھانیدار کا کام تمام کیا پھر احمد بلوچ کو بھی اسی کسی سے اگلے جہاں پہنچایا۔ باقی لوگ ابھی سوئے ہوئے تھے کسی کو پتہ نہ لگا اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ صبح کو ابھی تفتیش جاری ہی تھی کہ اس نے خود بخود پنڈی، لالہ موسیٰ، جو کہ تاندلیانوالہ سے 5 میل جانب مشرق ہے، جا کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ جب اسے پھانسی دی گئی تو اس کی ماں نے بیٹے کی بہادری پر خوشیاں منائیں۔(23)

محرم ماں لک:

''محرم ما لک پنجاب کی مشہور جاٹ قوم لک کا ایک سپوت تھا۔ وہ موضع نیکوکارہ کی بستی اسلام کے چاہ بھمنی والا کا مقیم تھا۔ وہ 1914ء کی جنگ عظیم کے زمانے میں اپنے کسی کام کے سلسلے میں ملتان گیا۔ اسے کسی سرکاری دفتر میں کام تھا۔ جو اس کے پہنچنے تک بند ہو چکا تھا۔ رات گزارنے کے لئے وہ ملتان کی ایک مسجد سراجانوالی میں چلا گیا۔ وہاں کے مولوی صاحب خاصا سیاسی شعور رکھتے تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف تھے۔ یہ مولوی صاحب کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ انگریز کے خلاف نفرت اس کے دل میں پودا بن کر اُگ آئی۔ اس نے مسجد ہی میں اپنے دل سے عہد کیا کہ وہ انگریز کے کسی حکم کو نہیں مانے گا اور نہ اس کی حکومت کو تسلیم کرے گا۔ چنانچہ دوسرے دن وہ اپنے ذاتی کام، جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا، دفتر نہ گیا بلکہ واپس چلا آیا۔ وہ ہر وقت انگریزی حکومت کی برائیاں کرنے لگا۔ آخر اس کے خلاف تحصیلدار تک شکایتیں پہنچیں۔ تحصیلدار نے تھانیدار کو حکم دیا کہ محرم خان کے خلاف کوئی مقدمہ قائم کرے، تھانیدار نے اس کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنایا جس کا مدعی بھی ہندو، گواہ بھی ہندو تھے۔ خود تھانیدار بھی اتفاق سے ہندو تھا۔ محرم خان چار ماہ تک جیل میں رہا۔ کوئی ڈر کے مارے اس کی ضمانت نہ کراتا تھا۔ آخر مخدوم نذر حسین قریشی رئیس حسو بلبل کی سفارش پر اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا لیکن محرم کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک چکی تھی اور انگریز کے ساتھ ساتھ اس کی نفرت کا نشانہ ہندو ساہوکار بھی بن چکے تھے۔ جو غریب مسلمانوں کا خون چوستے تھے۔ محرم خاں نے چند ساتھیوں کو ملا کر ڈاکوؤں کا ایک گروہ ترتیب دیا۔ ان لوگوں نے حضرت سلطان باہو کے دربار میں قسمیں کھائیں کہ وہ غریب مسلمان کسانوں کا استحصال کرنے والے اور ان کی عورتوں کی بے عزتی کرنے والے ہندوؤں کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔ جس نے غریب لوگوں کے دیئے ہوئے سود سے دولت جمع کی ہوگی اور کسی غریب عورت مرد کی بے عزتی کی ہوگی اس کے گھر ڈاکہ ڈالیں گے۔

چنانچہ محرم ماں لک اور اس کے ساتھیوں نے پہلا ڈاکا احمد پور سیال کے ایک ہندو زرگر رتن داس کے گھر پر ڈالا۔ یہ وہی شخص تھا جو محرم ماں لک کے خلاف پہلے جھوٹے مقدمے کا مدعی بنا تھا۔ اس ہندو کے گھر سے 36 ہزار روپے کا سونا اور کرنسی نوٹ لوٹ لئے گئے اور محرم ماں لک نہ پکڑا جا سکا اور نہ پہچانا جا سکا، تاہم پولیس نے شبہ میں اس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ وہ تو پہلے ہی جنگلوں میں ڈیرا کر چکا تھا۔ دوسری واردات بھی ان لوگوں نے اس قصبے میں کی۔ اس وقت اگرچہ ہندو چوکنے ہو چکے تھے اور انہوں نے اپنے دفاع میں آتشی اسلحہ بھی استعمال کیا لیکن ڈاکو تو پہلے ہی اپنا کام مکمل کر کے گھر سے نکل چکے تھے۔ گھوڑیوں پر ان کا پیچھا کیا گیا۔ لیکن یہ لوگ گاؤں کے تو کیا پولیس کے بھی ہاتھ نہ لگے۔ ان وارداتوں کے بعد ہندوؤں نے شہر میں اپنا مذہبی اکٹھ کیا اور ہندو مہا سبھا کے ایک مقامی لیڈر رام لال دتہ مل نے بڑی جوشیلی تقریر کی جس میں انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا گیا کہ یہ لوگ انگریز کے خلاف ہیں۔ ہندوؤں کے اس جلسے میں علاقے کا وہ تحصیلدار بھی شامل تھا جس نے محرم خاں کے خلاف پہلا جھوٹا مقدمہ بنوایا تھا۔ حکومت کو کافی بھڑکا دیا گیا اور مقامی انتظامیہ مسلمانوں کے خلاف ہوگئی اور ضلعی افسروں نے اس علاقے میں ایک ہنگامی چوکی قائم کر دی جس کا خرچہ بھی مسلمانوں پر ڈالا اور یہ بھی طے پایا کہ اگر ڈاکہ پڑا تو لوٹی ہوئی رقم علاقے کے مسلمان زمینداروں سے وصول کی جائے گی۔

اس فیصلے کے خلاف علاقے کے مسلمان زمینداروں نے بہت احتجاج کیا اور ڈاکوؤں کی وارداتوں سے اپنے آپ کو لاتعلق بتایا۔ مخدوم نذر حسین قریشی رئیس حسو بلیل کی سرکردگی میں مسلمان رؤسا نے حکام کو بتایا کہ یہ مسلمانوں کے خلاف تعصب اور ظلم ہے۔ اگر اسی طرح حکام ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کو ظلم کا نشانہ بناتے رہے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ مسلمان زمیندار اپنے محاصل ادا کرنا بند کر دیں گے اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں گے۔ جنگ کے زمانے میں حکومت پہلے ہی پریشان تھی، نیز زمینداروں کے اثر و رسوخ سے علاقے میں بھرتی کی مہم بھی بہت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ اس لئے چھ ماہ کے بعد یہ تعزیری چوکی ختم کر دی گئی اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ امن کمیٹیاں بنا دی گئیں لیکن مسلمان اندر سے انگریزوں سے سخت نفرت کرنے لگے تھے۔ اس لئے محرم ماں لک کے ساتھیوں نے اپنے آپ کو نئے سرے سے منظم کر کے اگلے اقدام کا جائزہ لینا شروع کیا۔ احمد پور سیال سے لیکر ماڑی شاہ سخیرہ تک دریائے جہلم اور چناب کے دائیں کنارے اِن کا طوطی بول رہا تھا۔

آخر حکومت نے یہ علاقہ فوج کے حوالے کر دیا۔ ایک ہندو نے محرم ماں لک کو ایک دفعہ پناہ دی تھی۔ جب اس کے ساتھی اس کا گھر لوٹنے گئے تو اسے خبر مل گئی چنانچہ یہ ان سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور گھر کو لوٹ مار سے بچا لیا۔ آخر ان کے گروہ کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ ایک خصوصی فوجی ٹربیونل قائم کیا گیا جس کا سربراہ سیشن جج عبدالغفور کو بنایا گیا اور جھنگ صدر کے اسلامیہ ہائی سکول کے ہال میں عدالت قائم کی گئی اور سزائیں دی جانے لگیں۔ 428 افراد کو لوٹ مار میں ملوث قرار دیا گیا۔ جن میں محرم ماں لک اور اس کی محبوبہ جنداں بھی شامل تھی۔ جو مردانہ لباس پہن کر

ڈاکوؤں کے ساتھ ہوتی تھی۔ٹربیونل نے محرماں لک اور اس کے 80 ساتھیوں کو مفرور اور اشتہاری قرار دے دیا۔محرم کو گرفتار کرانے والے کے لئے پانچ ہزار روپیہ نقد اور دو مربے زمین کا اعلان کیا گیا۔اس دوران محرماں لک اور جنداں مخدوم نذر حسین قریشی کے ہاں روپوش رہے۔محرماں لک کا ایک ساتھی سجاول علیانہ جنداں پر نظر رکھتا تھا۔ جب جنداں نے اسے گھاس نہ ڈالی تو اس نے وعدہ معاف گواہ بن کر ان کی مخبری کر دی۔ پولیس جب مخدوم نذر حسین قریشی کے ہاں پہنچی تو محرماں لک پہلے ہی اپنی محبوبہ کو لے کر ذوالفقار خاں رئیس گڑھ مہاراجہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔پولیس ناکام واپس آئی مگر وعدہ معاف گواہ نے وہاں کی بھی مخبری کر دی۔جب پولیس وہاں پہنچی تو محرماں جنداں کو لے کر لودھراں کے رئیس کلو خان کے ڈیرے پر جا چکا تھا۔پولیس اور فوج سخت پریشان تھی۔اس دوران علاقہ شور کوٹ کے ایک قریشی نے مربعوں کے لالچ میں ایک انگریز کے دربار میں سرخروئی کے لئے مخبری کر دی اور پولیس لودھراں پہنچ گئی۔عین موقع پر محرماں لک اور کلو خاں کو پولیس کی کاروائی کا پتہ چلا۔اب کیا ہو سکتا تھا بہر حال جنداں نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی۔تین پولیس والے ہلاک ہو گئے اور جنداں اور کلو خاں کی ایک ملازمہ بھی ہلاک ہو گئی۔ جنداں کے پاس گولیاں ختم ہو گئی تھیں اس نے خالی بندوق محرماں کی طرف پھینک کر ہاتھ کھڑے کر دئے۔محرماں لک کو ہندو مسلم فساد کے ڈر سے موت کی سزا تو نہ دی گئی البتہ اسے عمر قید دے دی گئی اور اس کو پناہ دینے کے جرم میں مخدوم نذر حسین قریشی کو ایک سال کے لئے ضلع کانگڑہ اور ذوالفقار خاں رئیس کو گڑھ مہاراجہ کو ضلع حصار میں جلا وطن کر دیا گیا۔

محرماں لک کچھ دیر تو ملتان جیل میں رہا۔1921ء میں لاہور جیل منتقل کر دیا گیا۔لاہور میں 1919 کے جلیانوالہ باغ کے سیاسی قیدیوں نے جیل میں بغاوت کر دی۔محرماں لک نے ان کا ساتھ دیا۔ان پر فائرنگ ہوئی۔ محرماں لک بھی زخمی ہوا اور جانبر نہ ہو سکا۔یہ بہادر بہت دیر تک لوک گیتوں اور ڈھولوں کا عنوان بنا رہا اور ہندو عورتیں اس کے نام سے اپنے روتے بچوں کو چپ کراتی تھیں۔ (24)

شفع اور بگڑو:

جھنگ کے علاقے میں ایک مشہور لوک داستان ہے جسے دریائے چناب اور دریائے جہلم کے درمیانی علاقے یعنی ''وچھ'' سے منسوب کیا گیا ہے۔کہتے ہیں بالو یا اقبال بی بی نام کی ایک لڑکی تھی اور شفع نام کا لڑکا۔ان کا آپس میں پیار ہو گیا اور یہ پیار بڑھتے بڑھتے عشق کی سرحدوں کو چھونے لگا۔شفع نے بگڑو کے نام سے ماہیے بنائے جسے وہ علانیہ گاتا پھرتا تھا۔اس طرح شفع نے بالو کے نام سے بھی ماہیے لکھے۔مقامی لوگ بالو کو بگڑو بھی کہتے ہیں۔ بگڑو سے مراد بگا یعنی سفید رنگ بھی ہے۔چونکہ اس خاتون کا رنگ سفید تھا اس لئے اسے بگڑو بھی کہتے تھے۔

بالکل اس سے ملتی جلتی داستان ماہیا اور بالو، گوندل کے علاقے گجرات میں بھی مشہور ہے۔یہاں بھی زنانہ کردار تو بالو ہی ہے لیکن مردانہ کردار بجائے شفع کے ماہیا ہے اور اس مناسبت سے داستان کا نام ''بالو اور ماہیا''

ہے۔ بعض راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ماہیا محمد علی ماہیا تھا جو کہ مشہور فلم سٹار صبیحہ کا باپ تھا اور بالو اس فلم سٹار صبیحہ کی ماں تھی۔ بہرحال یہ داستان ان دو علاقوں میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ زبان زد عام ہے اس لئے ہم نے اس کا مجملاً ذکر کر دیا ہے۔(25)

لوک بیانیہ کی آڑ میں ریاستی بیانیہ:

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ریاستی بیانیہ لوک بیانیہ کی آڑ لے کر سامنے آتا ہے۔ بار کی آبادکاری میں کئی بار ایسا ہی ہوا۔ چناب کالونی اس کی خاص مثال ہے۔ ایک عوامی شاعر کاہنا نے لائلپور کی آبادکاری کو انگریزی کارنامہ قرار دیا ہے۔ سرکاری بیانیہ پر مبنی عوامی شاعر کاہنا کے اس گیت کو انگریزی ترجمے کے ساتھ چناب کالونی کے ضلعی گزیٹیر میں شامل کر لیا گیا۔ ہم یہاں متن کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ دے رہے ہیں:(26)

سب سے پہلے سچے مالک کے نام کا ورد کر کے
اک نیا قصہ بناتا ہوں
بار کو چوروں نے بری طرح لوٹ کھایا تھا
یہاں صرف ہرن، گیدڑ اور چوہوں کے بل رہ گئے تھے
لیکن اب وہ سب اجڑے جنگل پھر آباد کر دیئے گئے ہیں
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
سچے مالک کا حکم آیا
اور خدا نے انگریزوں کو یہ صلاحیت دی کہ
انہوں نے پہلے بار کا نقشہ (سروے) بنایا
پھر ٹھیکیداروں کو کام کرنے کے لئے بلایا
اور چاروں طرف یہ اعلان کر دیا گیا
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
انگریزوں کا اعلیٰ وصف دیکھیں
وعدہ سچا کرتے ہیں اور پورا کرتے ہیں
وزیرآباد یہاں سے کتنی دور ہے
وہاں سے دریا (چناب) میں کیسے منجدھار پڑتے ہیں
وہاں پل (ہیڈورکس) بنا کر دریا کا پانی روک لیا ہے
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے

دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ ریل چلتی ہے
جن کے پاس پیسے ہیں وہ یہاں سیر کرتے ہیں
تار (ٹیلی گراف) کے ذریعے خبریں آگے بھیجتے ہیں
اور سٹیشنوں پر بابو لوگوں کی نوکری لگ گئی
اے خداوا واہ واہ تیری قدرت
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
انگریزوں نے ساری زمین کی پیائش کر لی ہے
اس مقصد کے لئے پٹواری، ضلعدار اور منشی کام پر
لگا دیئے ان چاروں (انگریزوں سمیت) نے مل کر
کام کیا ہے اور انہوں نے چاروں طرف پانی پہنچا دیا ہے
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
میرے مالک کے بھیجے تحفے دیکھ
ان سکھ جاٹوں کو زمین مل گئی
جو بے چارے افلاس میں دھنسے ہوئے تھے
ہم نے اپنی آنکھوں سے انہیں سیر ہو کر کھاتے دیکھا ہے
اب شراب پیتے اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
انگریز بڑے بہادر اور سورما ہیں
انہوں نے دریا کو چیر کر رکھ دیا ہے
کیا نہر نکالی ہے کہ تیر کی طرح سیدھی ہے
نہروں کے کناروں پر درختوں کے ذخیرے لگا دیئے ہیں
جھاڑیاں اور سرکنڈے سب ختم کر دیئے ہیں
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
انگریزوں کی سرداری کا رنگ دیکھو
ان میں کچھ بادشاہ (حاکم) ہیں اور کچھ تاجر
انہوں نے آرام و آسائش کو پیار نہیں کیا

کھل کر سرمایہ کاری کرتے ہیں

پھر اس سے بھرپور منافع حاصل کرتے ہیں

کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے

یہ انگریز تو پہنچے ہوئے لوگ ہیں، ولی ہیں

یہ سچ ہے اس میں رتی بھر بھی جھوٹ نہیں

انہوں نے فی الفور جنگل صاف کر دیئے

ٹھیکیداروں اور مزدوروں نے خوب کمائی کی

ہزاروں ہی تنخواہ دار ملازم ہیں

کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے

یہ اعلیٰ درجہ کے حاکم اور راہبر ہیں

جس کسی سے پیار کرتے ہیں

اسے ایک پل میں خوشحال کر دیتے ہیں

انہوں نے سکھوں کو نمبر دار بنایا

گوروں نے ان کا اعتبار اور عزت بڑھادی ہے

کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے

ینگ صاحب، بہت اچھا حاکم ہے

اس نے لائلپور کا نقشہ تیار کیا

اور پہلے آباد کاروں کے لئے خود سرمایہ کاری کرتا ہے

اس کے بعد منافع سے اپنے خزانے بھر لیتا ہے

اور سرکاری اراضی کا نیلام کرتا ہے

کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے

لائل پور کا شہر بھی دیکھا

وہاں کاروبار میں زبردست اضافہ ہوا ہے

گندم کی منڈی میں کاروبار کرنے والے ثروت مند ہو گئے

شہر میں ایک چوک ہے جس سے آٹھ بازار نکلتے ہیں

اور نانواں بازار وہاں ہے

کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
لائل پور کا حال سناتا ہوں سنیں
اب کھانے پینے کے لئے وافر ہے
اور نہر ہے کہ ہمارے دروازے کے ساتھ بہہ رہی ہے
اس نہر کے کنارے قطار در قطار درخت لگا دیئے گئے
اب چاروں طرف ہریاول ہی ہریاول ہے
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے
ینگ، راجہ، پنڈی داس تینوں افسروں کا آپس
میں بہت پیار ہے تینوں بڑے لائق حاکم ہیں
انہوں نے جنگل بار کو گل و گلزار میں بدل دیا ہے
کاہنا مالک سے ہر وقت یہی دعا کرتا ہے
کہ ان تینوں کو لمبی خوشیوں بھری حیات دے
کہ ینگ صاحب نے یہ ملک ایسے آباد کر دیا ہے

حوالہ جات:

1۔ سعید بھٹہ، کمال کہانی، سانجھ پبلیکیشنز، لاہور 2006ء

2۔ سعید بھٹہ، نابر کہانی (پنجابی سے ترجمہ) سلیم سہیل، سانجھ پبلیکیشنز، لاہور، 2014، ص 34

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً، ص 34 - 50

5۔ آر۔ سی۔ ٹمپل، حکایات، پنجاب (مترجم میاں عبدالرشید) مجلس ترقی ادب، ص 42-49

6۔ موہن سنگھ دیوانہ، پنجابی ادب دی تاریخ، لاہور، ت۔ن ص، 3-14

7۔ اسد سلیم شیخ، ڈلے دی بار، اظہار سنز، لاہور، 1997، ص 147-149

8۔ سجاد حیدر، واریں، لوک ورثے کا قومی ادارہ، اسلام آباد 1980، ص 65-75، احمد سلیم، لوک واراں، فوک لور ریسرچ سنٹر، نیشنل کونسل آف دی آرٹس، اسلام آباد، 1971 (دراصل 1973)

9۔ احمد غزالی، ساندل بار، وسطی پنجاب کی کہانی، لوک روایات کی زبانی، فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور، ص 21-22

10۔ اسد سلیم شیخ، ڈلے دی بار، ص 22

11۔ سجاد حیدر، واریں، ص، 77-92، احمد سلیم، لوک واراں 1973،

12۔ شفقت تنویر مرزا، پنجاب لوک ریت، تاریخ کے تناظر میں (مترجم: ڈاکٹر احمد علی بھٹی) دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، 2014 صفحہ 148

13۔ ایضاً، ص 51-149

14۔ ایضاً، ص 30

15۔ ایضاً ص 31-32

16 ایضاً ص 33-35

17۔ عبداللہ ملک، داستان، دار و رسن، کوثر پبلیشر، لاہور 1972 ص، 61-62

18۔ شفقت تنویر مرزا، پنجاب لوک ریت، ص، 72-74

19۔ افضل پرویز، بن پھلواری، نیشنل کونسل آف آرٹس، اسلام آباد، ص، 225 -230

20۔ پنجاب کی باریں، غیر مطبوعہ مقالہ، لوک ورثہ، اسلام آباد، ص، 3-5

21۔ ایضاً ص 7-8

22۔ ایضاً ص 59-60

23۔ ایضاً ص 61-62

24۔ ایضاً ص 65-67

25۔ ایضاً ص 75

26۔ شفقت تنویر میرزا، (تالیف و ترجمہ) ڈسٹرکٹ گزیٹیرز، ملتان ڈویژن، مشعل لاہور، ص، 374-378

چھٹا باب

سرائیکی وسیب کا لوک بیانیہ

1۔ تاریخی تناظر
2۔ سندیس راسک
3۔ علی حیدر ملتانی کا سیاست نامہ
4۔ سِکھ، انگریز اور سرائیکی وسیب
5۔ نواب مظفر خان کا لوک بیانیہ
6۔ مولے دی وار

سرائیکی وسیب کا لوک بیانیہ

تاریخی تناظر:

انتظامی اور جغرافیائی اعتبار سے سرائیکی وسیب اگرچہ پنجاب کا حصہ ہے لیکن تہذیبی اور تاریخی پہلو سے اس کی ایک الگ شناخت ہے۔اس لئے اسے ایک الگ باب کے طور پر دیا جا رہا ہے۔اس جداگانہ پہچان کی مزید کئی جہات ہیں۔اس کی پہلی جہت علاقے کی قدامت ہے مسلسل بیرونی حملوں کی زد میں آنے کے باعث یہ ہر بار اجڑا اور آباد ہوا۔اسی وجہ سے یہ کبھی کیشپ پورہ کہلایا، کبھی اسے پرہلاد پورہ کہا گیا۔ڈاکٹر روبینہ ترین کے الفاظ میں ''بھاگوت پران کی رو سے ملتان راجہ کرشن کے بیٹے شامپ کے نام سے شامپ پور بھی کہلایا کیونکہ شامپ نے ملتان کو آباد کیا تھا۔۔۔ملتان کے ناموں میں ایک سنب پورہ بھی آتا ہے۔۔۔ملتان کا ایک نام مترون بھی تھا مترون کے معنی سورج دیوتا کا شہر ہے۔ان ناموں کے علاوہ مختلف ادوار میں ملتان کے یہ نام بھی رہے ہیں۔ہنس پورہ، بھاگ پورہ، مولسان پورہ، میسان، ماستھن پورہ، مولتارن، مولتان اور پھر آخر میں ملتان،(1) ڈاکٹر روبینہ ترین کا اس حوالے سے مزید کہنا ہے کہ ''دراصل ان ناموں کے سلسلے میں مختلف حوالوں سے جو دیومالائی کہانیاں اور مافوق الفطرت واقعات درج ہیں۔ان کو تاریخی واقعیت کی حیثیت تو نہیں دی جاسکتی تاہم ان سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ملتان، وادیء سندھ کا قدیم ترین شہر ہے۔۔۔اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہو جاتی ہے کہ ملتان ایک بڑے وسیع وعریض، آزاد وخود مختار علاقے کا مرکز تھا اور ملتان کے لفظ سے ایک خاص شہر کے علاوہ ایک بہت بڑی اقلیم ولایت، ملک راجدھانی، سلطنت، حکومت بلکہ خاص جغرافیائی وحدت مراد لی جاتی تھی۔''(2)

دیومالائی حوالے سے ہمیں دیگر شواہد بھی ملتے ہیں۔ملتان کی ابتداء کے عنوان سے ''ملتان کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کا یہ مختصر بیان شورکوٹ ضلع جھنگ کے ایک قانون گو خاندان کی بیاض سے لیا گیا ہے۔اس خاندان کے لوگ ابھی تک (1900) قانون گوؤں کے عہدوں پر فائز ہیں۔یہ لوگ پہلے ہندو تھے، پھر انہوں نے شہنشاہ اورنگ زیب (1658ء تا 1702ء) کے عہد میں اسلام قبول کیا۔جس مسودے سے یہ کہانی لی گئی ہے، سابقہ صدی میں لکھا گیا تھا۔

اگرچہ یہ بیان بطور تاریخ بالکل بے سود ہے مگر اس سے دو باتیں بدرجہءاتم ظاہر ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ ''پڑھے لکھے'' لوگوں کا ایسے موضوعوں کے بارے میں کیا طریق فکر ہے اور دوسرے ان موضوعوں کے سلسلے میں ہندو مسلم روایات کو کس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ان ہی وجوہ کی بنا پر اسے یہاں جگہ دی گئی ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ مصنف کے ذہن میں ملتان کے ان پرانے روایتی ناموں کا کچھ تصور موجود ہے، جنہیں البیرونی نے بہت عرصہ پیشتر محفوظ کر دیا تھا(3)

اس دیو مالائی داستان کے مطابق ''اس وقت تک زمین و آسمان کی مدت 6,285,000 برس تھی۔ اس وقت سے ملتان آباد ہے اور چاروں دوروں سے گزر چکا ہے۔ پہلے دور میں اس کا نام راہنس پورا تھا۔ اس دور میں ملتان 92,418,000 برس تک آباد رہا۔ جب اتنی مدت گزر گئی تو ملتان کو ماک پور کہنے لگے۔ ان دنوں یہاں 1,820,005 برس تک فرشتے بستے رہے۔ باکپور (ماکپور؟) کے دور میں یہاں چالیس (بعض کے نزدیک اسی) آدمی رہتے تھے مگر ان کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی۔ چوتھے دور میں اس شہر کو ملتان کہنے لگے، ان دنوں یہاں گھوڑے رہتے تھے، ان کی تعداد 807,000 تھی۔ اس کے بعد 817,000 برس بعد یہاں مہتر آدمؑ پیدا کیئے گئے۔ حضرت آدمؑ کے زمانے سے اب تک 60,945 برس ہوئے ہیں۔(4)''

سندیس راسک۔ سرائیکی وسیب کا ایک اہم لوک بیانیہ:

ڈاکٹر انوار احمد عبدالرحمٰن ملتانی کی طویل نظم ''سندیس راسک'' کے ملتانی الاصل ہونے کے حوالے سے شاکی ہیں کہ ہمارے ہاں بہت سے علماء کا اسلوب اور استدلال ایک خاص طرح کے تعصب سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اہلِ ملتان شاکی ہیں کہ ان کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی شناخت کے ہر حوالے کو نامعتبر بنا دیا جاتا ہے اس کی تازہ مثال مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور (المعروف ڈاکٹر وحید قریشی، اکیڈمی) سے 2006ء میں شائع ہونے والی محمد انصار اللہ کی کتاب ''تاریخ ارتقاء زبان و ادب (پہلا حصہ)۔ ابراہیم لودھی کے عہد تک'' ہے جس میں سندیس راسک کے مصنف کی ملتان سے نسبت کی تردید وکیلِ استغاثہ کے طور پر کی گئی ہے۔(5)

ڈاکٹر انوار احمد نے نہایت عالمانہ انداز میں اس بیان استغاثہ کی تردید کی ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ ہمیں اس کے اصل متن سے دلچسپی ہے، جس کے دو اردو تراجم کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

سنسکرت متن سے اردو ترجمہ سید اصغر علی شاہ کا ہے جبکہ انگریزی متن کا اردو ترجمہ نازیہ بخاری نے کیا ہے۔ ہم یہاں نازیہ بخاری کے ترجمے سے منتخب اشعار پیش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے مباحث کے آخر میں ''سندیس راسک'' کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

سندیس راسک میں نائیکا وجے نگر کی نوجوان خاتون ہے جس کا شوہر اسے چھوڑ کر کام پر چلا گیا ہے اور ابھی تک نہیں لوٹا۔ قاری اس سے اس وقت ملتا ہے جب وہ اپنے شوہر کا راستہ دیکھ رہی ہے اور تنہائی میں آنسو بہا رہی ہے۔ وہ سڑک پر ایک مسافر کو دیکھتی ہے۔ شرم کو بالائے طاق رکھ کر وہ مسافر کے پیچھے دوڑتی ہے اور اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ مسافر اس کی خوب صورتی کی تعریف کرتا ہے۔ جس کے جواب میں وہ شرما جاتی ہے لیکن وہ برابر اس سے پوچھتی ہے وہ کہاں سے آیا ہے اور اب کہاں جا رہا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ وہ ''سمورا'' سے آیا ہے۔ پھر تفصیل

کے ساتھ قصبے اور اس کے گردونواح کی خوب صورتی بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ملتان سے کھمبائیت تک جائے گا۔ وہ بتاتی ہے کہ یہی جگہ ہے جہاں اس کا شوہر ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مسافر سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر انتظار کرے تا کہ وہ اپنے شوہر کے لئے پیغام دے سکے۔ تب وہ اپنے محبوب کو جذباتی سرزنش کرتی ہے اور بہت کوسنے بھی دیتی ہے مگر والہانہ لگاؤ کے ساتھ۔ مسافر شائستگی سے اپنے سفر کو جاری رکھنے کی شدید ضرورت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنا پیغام جلدی جلدی دے دو لیکن وہ جذبات کی رو میں بہتی چلی جاتی ہے۔ جونہی دن ختم ہوتا ہے مسافر کو بار بار اسے خاموش کرانے کے لئے مداخلت کرنا پڑتی ہے اور اسے اپنا کام یاد دلانا پڑتا ہے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آخرکار وہ اس کی خوبصورتی کے آگے ہار جاتا ہے۔ (یا شاید اسے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ وہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکتا تھا) اور اس سے اس کے دُکھ کی وجہ پوچھتا ہے کہ اس کے محبوب نے اسے کب چھوڑا؟ خاتون نے جواب دیا کہ وہ اسے موسم گرما میں چھوڑ کر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی موسم گرما کا بیان اور اس کے بعد آنے والے موسموں کی تفصیلات ہیں۔ تمام وقت وہ مسافر سے باتیں کرتی رہتی ہے اور اسے اپنی جسمانی اور ذہنی ابتری کے بارے میں بتاتی رہتی ہے۔ آخرکار وہ خاموش ہوتی ہے۔ اپنی ضد کے لئے معافی مانگتی ہے اور التجا کرتی ہے کہ وہ اس کے محبوب سے اچھے انداز میں بات کرے تب اسے جانے کی اجازت دے دیتی ہے اور جب خود جانے کے لئے مڑتی ہے تو اسی لمحے اپنے شوہر کو واپس آتے ہوئے دیکھتی ہے۔ (6)

حصہ اوّل

1۔ اے دانش ورو! ابتداء میں جس نے سمندر، زمین، پہاڑ، درخت اور آسمانی شکل، آنگن میں تاروں بلکہ سارے جہان کو پیدا کیا۔ وہ تمہیں نجات دے، نعمتوں سے نوازے۔

2۔ اے مہذب (قاریو) اس کام کرنے والے کو سلام کرو جو انسانوں، دیوتاؤں، علمی گھروں، آسمانی راستے پر چلنے والے چاند اور سورج اور جنتی راہوں میں لائق پرستش ہے۔

3۔ مغربی علاقے میں کافروں کا ایک ملک ملیچھ ہے۔ جو پرانے وقتوں سے ہی طاقتور اور مشہور ہے اس کے ایک قصبے میں آریدھو پیدا ہوا جو کہ میر اسین کا بیٹا ہے۔

4۔ اس کے بیٹے عبدالرحمٰن نے جو پراکت شاعری اور گیتوں کی نگری میں اپنے خاندان کی شان تھا یہ سندیس راسک تخلیق کیا۔

5۔ معانی سمیت الفاظ میں ماہر پرانے عالموں اور شاعروں کو میں سلام کرتا ہوں جن کے ذریعے منطقوں میں یعنی کل جہاں (زمین، جنت، دوزخ) میں جنہوں نے علم عروض دریافت کیا اور سکھایا۔

6۔ اُپ بھرنش 1 سنسکرت، پراکرت اور پیاچی 2 زبانوں میں انہوں نے قواعد اور بحور کے زیوروں سے آراستہ شاعری کی۔

7۔ ان شاعروں کے بعد ہم جیسے روایات کا علم نہ رکھنے والے گھٹیا شاعروں کے کلام کی ستائش کون کرے گا۔

8۔ اور دوسری طرف اس میں کوئی خرابی نہیں کہ رات کو چاند کے نکلنے کے بعد بھی گھر میں اگر اندھیرا ہو تو کیا گھر میں چراغ نہیں جلائے جاتے؟

9۔ اگر کسی درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھ کر پپیہے طرب آمیز اور جذبات انگیز گیت گا رہے ہوں، تو کیا گھروں کی منڈیروں پر بیٹھ کر کوے کائیں کائیں نہ کریں؟

10۔ اگر ستار کو چھیڑنے والی کومل انگلیوں کے ساتھ ستار کے تاروں کی آواز سننا پسندیدہ ہے تو کیا مسرت بھرے تہواروں کے مواقع پر مارڈالا اور کارڈا ڈھول کو نہیں سنا جانا چاہیے؟

11۔ اگر مدکالا (زمین کو سنبھالنے والے چار مددگار ہاتھیوں میں سے ایک) اپنی مستی میں شراب بکھیرتا ہے جو کنول کی پتیوں ایسا مہکتا ہے یعنی ایراوت 3 اگر گردش میں نہیں تو کیا دوسرے ہاتھی اظہار گردش سے باز آ جائیں؟

12۔ اسی طرح مثال کے طور پر اندر 4 کے محل میں پروان چڑھنے والا بہشتی شجر، پارجات 5 ڈال ڈال پر پھول لئے کئی طرح کی بھینی بھینی خوشبوئیں بکھیرتا ہے تو کیا دوسرے درختوں کے پھول نہ مہکیں؟

13۔ اگر اس طرح دریائے گنگا جس کی اہمیت بلاشبہ تینوں جہانوں میں مسلّم ہے۔ سمندر کا رُخ کرتا ہے تو کیا دوسرے دریا سمندر کا رُخ کرنا چھوڑ دیں؟

1۔ ہرات اور قندھار کے درمیانی علاقے سے برعظیم میں داخل ہونے والی ابھیر قوم کو زبان کو دی بھرشٹ ایوی باشا کا نام دیا گیا ہے چھٹی صدی عیسوی تک ابھیروں کی اس بولی نے اُپ بھرنش کے نام سے ترقی کی۔

2۔ برعظیم میں پہلے سے موجود آریاؤں نے نئے آنے والے آریاؤں کو پساچی یعنی خون خوار اور وحشی کے نام سے پکارا۔ نئے آریاؤں کی زبان پساچی کہلائی۔

3۔ اندر کا ہاتھی، جس پر وہ سواری کرتا تھا، یہ ہاتھی سمندر کے بلونے سے پیدا ہوتا تھا۔

4۔ یہ آسمان کا بادشاہ ہے جس کے قبضہء قدرت میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج ہے۔

5۔ ''پاری جات'' درخت سمندر کے بلونے سے پیدا ہوا تھا اور اسے اندر کے آسمانی باغ میں لگادیا گیا تھا۔ یہ خوب صورت درخت دلکش اور خوشبودار پھولوں اور نہایت لذیز پھلوں سے لدا پھندا رہتا ہے۔

6۔ ہندوؤں کے تین بڑے خداؤں میں برہما سب سے پہلا خدا ہے، یہ خداؤں، انسانوں اور جانداروں کے آقاؤں'' لک ویدک پرجاپتی'' کا باپ ہے۔۔

7۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق راہو ایک اسورہ یا جن ہے جو گرہن کے وقت سورج اور چاند کو کھا جاتا ہے کیونکہ سورج اور چاند نے امرت چوری کرنے پر اس کی شکایت وشنو بھگوان سے کی تھی۔ جس نے اسے راہو

اور کیتو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب راہو ان دونوں سے اپنا بدلہ لیتا ہے۔

8۔ پاروتی وشنو کی بیوی تھی، جس نے دوسرا جنم ستی کی شکل میں لیا۔ تخلیق شدہ ہستیوں میں حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا۔

9۔ لفظ ''وید'' کا مادہ ''ود'' جس کا معنی جاننا ہے، لہٰذا وید کے معنی ہوئے علم۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق یہ وید خدا کی طرف سے انسان کو براہ راست تحفتاً عطا ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے انتہائی مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ یہ برہمنوں کی خاص ملکیت تھے۔ کسی نچلی ذات کے آدمی کا سننا جرم تھا۔

10۔ وید تعداد میں چار ہیں: i۔ رگ وید ii۔ یجر وید iii۔ سام وید iv۔ اتھر وا وید۔ ہر وید دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصے کو سنتھا کہتے ہیں جس میں منتر یا بھجن جمع کئے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ براہمنا کہلاتا ہے جس میں مذہبی رسومات اور ان کی وضاحتیں ہیں۔

11۔ رامائن میں نل کا ذکر ہے جو بندروں کا ایک سردار تھا اور رام کے لئے پُل تعمیر کرتا تھا۔ نل دمینتی کی ایک کہانی مہابھارت میں بھی ملتی ہے مگر مہابھارت کے قصے والا نل اور ہے اور رامائن کے قصے والا نل اور۔

12۔ ہندوؤں کے دیو مالائی ادب میں ایک رزمیہ نظم جس کی تصنیف سنِ عیسوی کے پورے ایک سو سال بعد ہوئی۔ ہندو اس کتاب کے بارے میں عقیدت و احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔

13۔ ''رام'' کا پورا نام ''رام چندر اوتار'' تھا جو وشنو کے تمام اوتاروں میں مقبول ترین اوتار ہے۔ اس کے ہاتھوں راون کی لنکا تباہ ہوئی جس میں اس نے رام کی بیوی ''سیتا'' کو چھپا رکھا تھا۔ رام کی کہانی رامائن میں ملتی ہے۔

14۔ رامائن بھی رزمیہ نظم ہے۔ رامائن کو بعض لوگ 500 ق۔م کی تصنیف کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس کی تصنیف 100 ق۔م سے پہلے کی نہیں ہے۔

15۔ ''ملتان''

16۔ قدیم زمانے میں ''خلیج کچھ'' سے ملحق علاقہ گجرات میں ایک بندرگاہ کا نام تھا جہاں سے ساری دنیا میں تجارت ہوتی تھی۔۔ یہاں ''بھروچ'' اور ''سورت'' کی بندرگاہیں بھی تھیں۔

17۔ یَم، فانی مخلوق میں سے پہلا شخص جس نے موت کا ذائقہ چکھا اور دوسری دنیا کا راستہ دریافت کر لیا جو لوگ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں یہ ان کی راہنمائی کرتا ہے۔

18۔ پہاڑ کا نام، امرت نکالنے کیلئے وشنو نے سمندر کو اس پہاڑ سے بلویا تھا۔

19۔ i۔ شوا بھگوان نے وشنو بھگوان کو اس زور سے بھینچا کہ دونوں ایک ہو گئے، دونوں دیوتاؤں کے جسم ایک ہو جانے کے حوالے سے انہیں ''ہر ہری'' کہا جاتا ہے۔

ii۔ ایک راکھشس نے سوانگ کو تلوار سے ٹھوکر لگائی۔ تلوار کے مس ہونے سے ''ہر'' پیدا ہوا اور راکھشسوں کو تباہ کیا۔

20۔ ہندوؤں کے عقیدے میں بہت سے درختوں کو مقدس سمجھا جاتا ہے ان میں ایک کُس گھاس ہے، کیونکہ اس پر امرت گرا تھا۔ اس لئے یہ مقدس ہو گیا۔

14۔ سورج کے طلوع ہونے پر اگر ایک خوبصورت شفاف جھیل میں کنول کھل اٹھتے ہیں تو کیا کسی باڑی میں لگا ہوا کدو کا پھول کھلنا چھوڑ دے؟

15۔ بھرت نامی ناچ کی روح اور بحر کی ماہر دوشیزہ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس رقص کرتی ہے تو کیا تالی بجانے والے ہاتھوں کی آواز پر ایک دیہاتی لڑکی رقص کرنا چھوڑ دے؟

16۔ اگر دودھ ملی کھیر پک کر ابلنے لگتی ہے تو کیا اناج کا چھان ملایا ہوا دلیا بلبلے پیدا نہیں کرے گا؟

17۔ ہر وہ جو شعر کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے بغیر کسی انکسار کے اس کا اظہار کرنا چاہئے۔ اگر برہما 6 بول چکے تو کیا دوسرے خداؤں کو نہیں بولنا چاہئے؟

18۔ دنیا میں وہ کون سا شاعری کا ایسا کارنامہ ہوگا جو اعلیٰ آہنگ اور ذوق کے نتیجے میں تخلیق ہوا ہو اور آپ نے اسے دیکھا نہ ہو یا سنا نہ ہو پھر کون ہے جو مجھ جیسے احمقوں کے اجڈ اور گنواروں جیسے کام کی تاب لائے گا؟ پھر بھی باذوق ذہین لوگ تنگ دستی میں بھی جب ان کے پاس لکھنے کو ایک ورق بھی نہ ہو تو کیا وہ کنول کے پتے پر لکھی چیز میں پناہ پاتے ہیں؟

19۔ لوگوں تک پہنچنے والی سندیس راسک کیا ہے؟ ایک جولاہے کے شاعرانہ فن کی شان۔ کسب فیض کی اس کی صلاحیت، جذبات کی سچائی، اخلاص کا خطابت بھرا اظہار۔ آپ سب جو اس حقیقت سے باخبر ہیں تو پل بھر کے لئے اس شاعری پر توجہ دیں کہ انہیں ایک کسان کے موٹے جھوٹے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

20۔ اس تصنیف پر نظر ڈالنے والا کوئی بھی با صلاحیت شخص جو اس کا مطالعہ بھی کرے تو میں اس کا ہاتھ تھام کر کہتا ہوں۔ نکتہ دان علم و فضل اور سادہ لوحی میں فرق جانو یہ کج مج حرف ہیں علم و فضل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے نہیں یا عالموں کی مجلس میں پیش کرنے کے لئے نہیں۔

21۔ عالم لوگ اس بے ہنر شاعری کی تاب نہ لاسکیں گے اور بے علم اپنی لاعلمی کے سبب اس سے ناواقف رہیں گے۔ سو ان اشعار کو تو ان کے روبرو رکھا جائے جو نہ عالم ہیں نہ جاہل بلکہ اس کے بیچ میں ہیں۔

22۔ سنو! جو جذبے کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ گوشۂ محبت ہے۔ عاشقوں کے لئے گرم جوش طغیانی تحفہ اور جن کے دلوں میں جذبات ہیں۔ ان کے لئے راہنما ستارہ۔ اسے سنو یہ ایک برہمن کے لئے محبت کے معصوم دیوتا کا عطیہ ہے جو جذباتی تجربوں کی کسک بھر سے پیدا کرتا ہے۔

23۔ یہ عظیم نزاکت کے ساتھ محبت اور جذبے میں ڈوب کر کانوں کی نہر کے لئے امرت کی ندی ہے۔ توجہ دیں!
اسے ایک گنی شخص نے لکھا ہے جو محبت کی لذتوں کا تجربہ رکھتا ہے

حصہ دوم

24۔ وجے نگر کی ایک خوبصورت ترین خاتون جس کی کمر بھڑ کی طرح ہے اور چال راج ہنس کی مانند اداس چہرہ لئے اپنے شوہر کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نہ ختم ہونے والی جھیلیں تھیں، جن میں آنسو بھرے تھے۔ اس کے جسم کے سنہری اعضا جدائی کی آگ سے کالے پڑ گئے تھے۔ وہ ایسے چاند سے مشابہہ تھی جسے راہو 7 نے نگل لیا ہو (یعنی گہن لگا ہوا ہو)

25۔ اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ پھر دُکھ سے مجبور ہو کر روئی۔ اس کی زلفیں اس کے چہرے کے گرد آوارہ اُڑ رہی تھیں۔ اس نے جمائی لے کر انگڑائی لی اور اپنے جسم کو پھیلایا۔ جدائی کی آگ سے زخمی۔ اس نے لمبی آہیں بھریں اور اپنی انگلیوں کو مروڑا۔ جب وہ خوبصورت عورت رو رہی تھی تب اس نے ایک مسافر کو دیکھا جو پیدل جا رہا تھا۔ وہ سفر پر روانہ تھا اور سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔

26۔ مسافر کو دیکھ کر جب وہ اپنے محبوب کے لئے آہ وزاری کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ چال ترک کر دی اور تیزی سے متحرک ہوئی۔ جونہی اس نے خوش ہو کر حرکت کی۔ اس کے کولہوں کے بھاری ہونے کی وجہ سے اس کا کمر بند کھسک کر گر پڑا۔ جس سے ٹن ٹن کی مدہم آواز پیدا ہوئی۔

27۔ جب دوڑتے ہوئے اس نے کمر بند کو مضبوطی سے گرہ لگائی تو اس کے گلوبند کی باریک ڈوریاں جن میں موتی پروئے ہوئے تھے ٹوٹ گئیں۔ جتنے موتی وہ جمع کر سکی جمع کیئے اور باقی کو ترک کر دیا۔ کیونکہ وہ جلدی میں تھی۔ تب اچانک اس کا پاؤں اس کی پازیبوں میں اُلجھا اور وہ راستے میں آ گری۔

28۔ گرنے کے بعد وہ دوبارہ اُٹھی، گھبرائی ہوئی شرمندہ اور تھرتھراتی ہوئی۔ تب اس خوبصورت خاتون کی خالص سفید شمیز دکھائی دے رہی تھی۔ اس کو ڈھانپتی ہوئی وہ مسافر کے پیچھے چلی کہ اسے آگے جا کر پکڑے۔ عمدہ کپڑے کی بنی ہوئی انگیا گھٹ گئی اور اس کی چھاتیاں تھوڑی تھوڑی سی دکھائی دینے لگیں۔

29۔ اس نے گھبراتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے انہیں چھپانے کی اپنی سی پوری کوشش کی مگر یہ ایسے تھا جیسے کوئی سونے کی صراحی کو سفید پھولوں سے ڈھک دے۔ وہ مسافر تک پہنچی۔ جونہی وہ بولی تو اس کی آواز میں لرزہ تھا۔ گہری آنکھوں والی اداس حسینہ نے یہ دلکش تقریر کی۔

30۔ ٹھہر و ٹھہرو! ''تھوڑی دیر کو پُر سکون ہو جاؤ مجھے تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں، اس کو سنو۔ کچھ لمحے کے لئے میری مدد کرو'' یہ سن کر مسافر کا تجسس جاگ اٹھا۔ وہ مزید اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔

اس نے آدھے قدم بھی حرکت نہ کی۔

31۔ اسے دیکھ کر مسافر کو لگا جیسے وہ خاتون دنیا کے خالق کا مخلوق کی صورت حسن کا خزانہ تھا۔ مسافر نے آٹھ گاتھائیں پڑھیں۔

31a-b ۔مسافر نے اس کے لئے ایک دوسرا دوہا بھی پڑھا۔ جو شاعرانہ مہارت سے بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر حیرت کا شدید احساس اس کے ذہن میں ٹھہر گیا کہ اسے تخلیق کرنے والا اندھا تھا یا چالاک کہ ایسی خوبصورت عورت بنانے کے بعد اس نے اسے اپنے پاس نہیں رکھا۔

32۔ اس کے گھنگریالے بال پانی کی لہروں کی مانند دھوکا دینے والے تھے۔ اپنی سیاہی میں بالوں کی لٹیں شہد کی مکھیوں کی قطاریں تھیں۔

33۔ چاند اپنے عروج پر تھا۔ جو رات کے اندھیرے کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایسے خلوص کے ساتھ جس میں قطعاً میل کچیل نہ ہو امرت بھری ندی کی طرح اس کا چہرہ تھا، جس میں روشنی کے لہردار سورج کی شبیہہ جھلکتی تھی۔

34۔ اس کی دونوں آنکھیں کنول کے پھول کی پتیوں جیسی تھیں۔ لمبی اور سرخ اس خوبصورت خاتون کے رخسار پر انار کے گلدستے کی خوشبو کا چھڑکاؤ تھا۔

35۔ اس کے دونوں بازو نرم، لچکدار کنول کے تنے جیسے تھے جو دائمی امر جھیل میں اگتا ہے۔ بازوؤں کے اختتام پر اسکے چھوٹے اور خوبصورت ترشے ہوئے ہاتھ یوں لگتے تھے جیسے کنول کا پھول دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔

36۔ اس کے پیٹ کے درمیان ناف کا گہرا گڑھا، پہاڑی ندی میں بھنور کی مانند تھا۔ فانی خوشی کی طرح اس کی کمر چھوٹی اور لچکتی ہوئی تھی۔ جو اس کی چال میں رکاوٹ کا باعث تھی۔

37۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں اتنی چمک دار ہیں جیسے یاقوت سے بنی ہوں اور ان پر ناخنوں کی قطاریں بلوریں تھیں۔ اس کے جسم پر بالوں کی نرم لہر ایسے تھی جیسے خوف زدہ پھول ڈالیوں پر متحرک ہوں۔

38۔ پاروتی 8 کی تخلیق کے بعد خالق نے اس کے تمام جسم کی اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ جو عورت میں ہے نمائش کی تھی۔ شاعروں کو الزام کون دے گا، انہیں خالق نے یہی حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہراتے رہیں۔

39۔ یہاں پر گاتھا سننے کے بعد ہنس کی چال والی خوبصورت عورت گھبرائی اور اپنے پاؤں کے بڑے انگوٹھے سے زمین کو کریدا۔ تب سنہری اعضاء والی خاتون مسافر سے یوں مخاطب ہوئی اے مسافر! کہاں جا رہے ہو؟ اور آئے کہاں سے ہو؟

40۔ مسافر نے جواب دیا اے تالاب میں کنول کے پھول کی پنکھڑی جیسی آنکھوں والی خاتون! میرے قصبے کا نام سامورا ہے۔ جو خوشبوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ اے چاند کے چہرے والی خاتون! اس قصبے کی عمارات سفیدی کردہ ہیں، قلعہ بندیاں آراستہ ہیں۔

41۔ بے شک جب نکتہ دان لوگوں سے مختلف گروہ وہاں جاتے ہیں تو وہ مترنم شاعری کی غنائیت اور میٹھی آواز والی پراکرت سنتے ہیں۔ایک طرف وید 9 بیان ہو رہے ہیں۔ان لوگوں کے ذریعے سے جو چار ویدوں 10 کے ماہر ہیں۔دوسری طرف راسک نظمیں جو مختلف شکلوں میں لکھی گئی ہیں، پڑھی جاتی ہیں۔

42۔ایک جگہ پر سدیوپچھ نامی ہندو کی داستان اور دوسری جگہ پر نل 11 کی کہانی ماہرین گا رہے ہیں تاہم ان دونوں سے مختلف تیسری جگہ پر مہابھارت 12 اپنی مختلف خوبصورتیوں کے ساتھ پڑھی یا تلاوت کی جارہی ہے۔ایک اور جگہ پر تپسیا کرنے والے رحم کے عظیم جذبات کے ساتھ رحمت کی دعا مانگ رہے ہیں۔اس کے علاوہ رام 13 کے سفر کی کتھا رامائن 14 کی عمدہ شاعر تعریف کر رہے ہیں۔

43۔ ناچتے ہوئے ان کی کمر کا لباس چنچل ہو جاتا ہے۔مردان کے فن سے ایسے حیران ہیں کہ پہلے کبھی نہ ہوئے ہوں گے۔وہ ان رنڈیوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس میں محض شامل ہو جانے پر پُر جوش ہیں۔کچھ عورتیں ایک عظیم الجثہ ہاتھی کی چال رکھتی ہیں اور ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ان میں کچھ مدہوشی مائل خواتین کے کان ہیروں کے زیوروں سے جھول رہے ہیں۔

44۔ ایک اور عورت جب دلکشی سے مسکراتی ہے اس کا نچلا ہونٹ ایک پنکھڑی ہے۔جیسے پھول کی پتی ہوتی ہے۔ اس کا خوبصورت ہاتھ پھول ہے اور اس کے سیدھے بازوؤں کا جوڑا کنول کے پودے کا تنا ہے۔ایک اور نوجوان خاتون کی انگلیوں کے ناخن چمک رہے ہیں اور بے داغ ہیں۔مزید برآں اس کے رخسار انار کے پھولوں کی پنکھڑیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

45۔ ایک اور عورت کے ابرو حرکت میں آنے کو تیار دکھائی دیتے ہیں۔جیسے محبت کے دیوتا کی کمان کے تیر اُڑا کر وہاں سے پہنچا دیئے گئے ہوں۔ایک عورت کی پائلوں کی تیز جھنکار مسلسل بجتی رہتی ہے۔ایک دوسری عورت کا کمر بند ہیروں سے بنا ہوا ہے۔اس میں جھنجھناہٹ بہت ہے۔

46۔ جب ایک عورت کھلنڈرے پن سے گھومتی ہے تو اس کے جوتوں سے خوبصورت آواز پیدا ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے آنے والی خزاں کا آبی پرندہ سارس چہچہا رہا ہو۔ایک لڑکی پین کم (محبت کی دُھن) گا رہی ہے۔جو بہت دلکش اور سریلی ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے خداؤں کی آنکھوں کے سامنے طنبورے پر یہ دھن بجائی گئی ہو۔

47۔ جب لوگ ایک ایک کر کے ان خواتین کے حسن کو دیکھتے ہیں تو ان کے پاؤں پان کی پیک پر سے پھسل جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مسافر اپنی منزل سے بھٹک جاتے ہیں۔اگر کوئی سیر کے لئے باہر جاتا ہے اور خوشی کے باغ میں مختلف درخت دیکھتا ہے تو شہر کی عمارتوں کو بھول جاتا ہے۔

48۔ وہاں پر یقیناً بہت سے دوسرے درخت بھی اگے ہوئے ہیں۔اے چاند جیسے چہرے والی خاتون کہ جس کی آنکھیں کنول کی پنکھڑیوں جیسی ہیں۔مگر ان کے نام کون جانتا ہے۔مزید برآں اگر کوئی انہیں مسلسل ایک

ساتھ کھڑا کر دے کہ بیچ میں جگہ نہ ہو تو ان درختوں کی چھاؤں میں وہ شخص دس یوجن (ایک یوجن = تقریباً 13 کلومیٹر فاصلہ) تک جا سکتا ہے۔

49a-b۔ اپنا سفر مکمل کر لینے کے بعد میں تمہیں ایک ایک کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔اے خاتون! پتن چوک ہر جگہ مشہور ہے۔اس کا دوسرا نام ملستھان 15 تمام دنیا میں بہت زیادہ شہرت کا حامل ہے۔ مجھے پیغام رساں کے طور پر کسی شخص نے ادھر بھیجا ہے۔اب میں اپنے مالک کے احکامات لے کر کھمبائیت 16 کے چوک سے جا رہا ہوں۔

50۔ یہ بات سن کر چاند چہرے اور کنول آنکھوں والی عورت نے ایک لمبی گرم آہ بھری۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اس نے اپنی انگلیاں مروڑیں۔اس کی آواز کے تاثر میں ترس تھا۔اور وہ ہلکائی ہوئی تھی۔کافی دیر تک وہ دُکھ سے کانپتی رہی جیسے جالمندھری نامی درخت کو ہوا دیر تک ہلاتی ہے۔

51۔ آدھے لمحے تک رونے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا مسافر کھمبائیت چوک کا نام سن کر میرا جسم بکھر گیا ہے۔یہ وہی جگہ ہے جہاں میرا مالک ٹھہرا ہوا ہے۔وہی اس جدائی کی آگ کو بجھا سکتا ہے۔دُکھ کی بات یہ ہے کہ وہ وہاں کافی وقت گزار چکا ہے مگر ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔

52۔ مسافر آدھے لمحے کے لئے اپنے قدموں کو موڑ لو۔اگر تم مجھ پر ترس کھاؤ تو میں چند لفظوں میں اپنے محبوب کے لئے تمھیں پیغام دوں گی۔مسافر نے کہا سنہرے بدن والی خاتون مجھے بتاؤ رونے کا کوئی فائدہ ہے؟ تم اپنی آنکھوں کو ضائع کر رہی ہو۔وہ آنکھیں جو ایک خوفزدہ ہرن کی طرح ہیں۔

53۔ وہ بولی،اس کی رخصتی کے وقت میں گرد کے ڈھیر میں نہیں بدلی تھی۔اب غیر مطمئن دل کے ساتھ جذبات کی دُکھ بھری آگ میں جل کر ایسے سنگدل شخص کو کیا پیغام دیا جا سکتا ہے؟

54ab۔میرا دل غدار مٹی کی طرح پانی کی چاہت میں پلٹتا ہے۔اگر وہ شخص انسان ہے تب یقیناً وہ میرے محبوب کے جذبات محسوس کر سکتا ہے۔میرا محبوب یہ پیغام ضرور لے گا۔اس میں کوئی شک نہیں۔یقیناً وہ جانتا ہے کہ اگر آج میں اس کے بغیر رہ رہی ہوں تو یہ پیغام کیا فائدہ دینے والا ہے؟

55۔ اس کی روانگی کی وجہ سے میں گز رنہیں گئی اس کے فراق میں میں مر نہیں گئی،مسافر میں شرمندہ ہوں کہ اب میں اپنے محبوب کے لئے پیغام بھیج رہی ہوں۔

56۔ اگر چہ میں شرمندگی محسوس کرتی ہوں لیکن مسافر میرا دل یہ نیا دُکھ برداشت نہیں کر سکتا۔مہربانی کر کے میرے محبوب کا ہاتھ پکڑ کر اسے مناتے ہوئے یہ گاتھا پڑھنا۔

57۔ میرا جسم تم سے جدائی کی ضربوں کی وجہ سے شکستہ ہے لیکن وہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتا کیونکہ وہ زندگی کے اس تصور پر قائم ہے کہ آج یا کل ملاپ کی دوا مل جائے گی اے میرے مالک وہ اسی آس پر زندہ ہے۔

58۔ میں اپنا سانس باہر نہیں کھینچتی اس خوف سے کہ کہیں میرا جسم جل نہ جائے جیسے میرا محبوب مجھے اکیلا چھوڑ گیا تھا کہیں ویسے موت کا دیوتا 17 اسے تنہا نہ کردے۔

59۔ مسافر جب تم یہ گاتھا پڑھ چکو اور میرا پیا ناراض نہ ہو تو مہربانی کر کے گہرے جذبات کی نرمی کے ساتھ یہ پانچ دوہے بھی پڑھ سنانا۔

60۔ یہ اچھا نہیں تھا اگر میں اپنے محبوب کی جدائی میں جل کر دیوتاؤں کی دنیا میں جاتی اور اسے چھوڑ دیتی جو میرے دل میں رہتا ہے۔

61۔ محبوب یہ اچھا نہیں ہے جب کہ تم میرے دل میں رہتے ہو جدائی میرے جسم کو زخمی کرتی ہے اور ایک باعزت آدمی دوسرے شخص کی مصیبت میں مبتلا ہوا ہے یہ دُکھ موت سے بھی بدترین ہے۔

62۔ میں بے عزتی محسوس کرتی ہوں کہ مرد تمہارے جسم کو برداشت نہ کرے تم جو اپنی خوبصورتی کے زعم میں رہ رہے ہو تو میرا جسم جس سے تم نے خوشی حاصل کی تھی جدائی کی وجہ سے جل گیا ہے۔

63۔ محبت کے دیوتا نے جدائی کی خدمت میں بے رحم حملے کو منظم کیا کہ میرے جسم کو توڑ دیا لیکن اس نے میرے دل کو تباہ نہیں کیا کیونکہ اس میں دوسروں سے الگ تمہاری صورت ہے۔

64۔ تنہائی سے سمجھوتہ کرنے کی طاقت میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے میں بیٹھی رو رہی ہوں ایک گوالن صرف رونے کا اختیار رکھتی ہے لیکن مویشی اپنے مالک کے ذریعے سے ہی گھوم پھر کر گلے میں واپس آتے ہیں۔

65۔ میرا پیغام طویل ہے میرے پاس اتنی صلاحیت نہیں کہ پورا بتا سکوں میرے محبوب سے کہنا میرے دونوں بازو میرے ایک کنگن میں سما سکتے ہیں۔

66۔ میرا پیغام تفصیلی ہے میرے پاس اتنی صلاحیت نہیں کہ پورا بتا سکوں میری چھوٹی انگلی کی انگوٹھی میرے بازو میں سماتی ہے۔

67۔ اس وقت مسافر اپنے سفر پر جلد از جلد جانے کے لئے بیتاب ہے اس کے دوہے کے اشعار سن کر اس نے کہا بہت ہی ہوشیار خاتون! مزید جو کچھ بھی کہنا ہے مجھے بتاؤ پیاری خاتون! مجھے بہت ہی طویل سفر طے کرنا ہے جو بہت سخت ہے۔

68۔ یہ الفاظ سُن کر وہ محبت کے دیوتا کے تیروں سے ایسے زخمی ہوئی جیسے شکاری کے تیروں سے ہرنی خوفزدہ ہو اس نے لمبی گرم آہیں بھریں اور گہرے سانس لئے اس نے یہ اشعار (گاتھا) پڑھے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

69۔ کیا میری گستاخ آنکھیں ایک لمحے کا آرام کئے بغیر آنسو بہانے پر شرمندہ نہیں ہیں۔ کھانڈوا کے جنگل کی آگ کی طرح آنسوؤں سے جدائی کی آگ زیادہ وحشیانہ انداز میں جلتی ہے۔

70۔ ہرنی کی آنکھوں والی خاتون یہ گاتھا پڑھتی رہی۔ آہ وزاری سے اداس، مزید دکھی اور ناخوشگوار ہو کر اس نے ایک تکلیف دہ آہ کھینچ کر مسافر سے کہا اگر تم دیکھو کہ وہ میری محبت کی امیدوں کی خوشی میں رکاوٹ ہے اور تمہیں لگے کہ وہ ابھی تک بے رحم ہے تو مہربانی کر کے یہ دو چٹ پٹی نظموں کے اشعار اس کو سنانا۔

71۔ جونہی میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں تو میری سوچ اور جذبے کی عجیب احمقانہ حالت ہو جاتی ہے۔ تھوڑی خاموشی کے بعد نہیں ایک لمحے کے لئے بھی میں اپنا بایاں ہاتھ سر سے نہیں اٹھاتی اس احمقانہ پن کی وجہ سے میں ایک پل کے لئے بھی اپنا بستر نہیں چھوڑتی بلکہ اس سے چمٹی ہوئی ہوں اے کا پالک (بھوت) تم سے جدا ہو کر میں بھی مادہ کا پالک (بھتنی) بن گئی ہوں۔

72۔ میں روتی ہوں میرا جسم دکھ میں مبتلا ہے۔ میرے بال بکھرے ہیں۔ چہرہ بُری طرح تباہ ہے۔ میری چال ناہموار اور لرزاں ہو گئی ہے۔ میرا حسن جو زعفران یا سونے کی طرح تھا سیاہ ہو گیا ہے۔ مجھ جیسی خوبصورت عورت اے بھوت تمہاری جدائی میں بھتنی بن چکی ہے۔

73۔ لیکن مسافر تم مسلسل اپنے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہے ہو۔ میں خط نہیں لکھ سکتی۔ مہربانی کر کے میرے محبوب کو ایک دوہا ایک گاتھا سنانا۔ مسافر میرے ساتھ یہ مہربانی کرو۔

74۔ محبوب جدائی میں مجھے وہ صنمیاتی آگ حاصل ہوئی جو اس آگ سے پیدا کی گئی جو سمندر کے نیچے جلتی ہے کہ جب اس پر آنسوؤں کی بوچھاڑ کرو تو یہ فوراً تازہ اور نئی ہو جاتی ہے۔

75۔ گہری آنکھوں والی خاتون کا حلق لمبی گرم آہوں کی وجہ سے خشک ہو رہا تھا اور وہ پیاس سے مر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے بادلوں سے بھاپ بن کر پانی۔

76۔ مسافر نے کہا چاند چہرے والی خاتون! مجھے اجازت دو مجھے جانا چاہئے بس تمہیں جو بھی پیغام دینا ہے وہ مجھے بتا دو ہرن کی آنکھوں والی خاتون نے جواب دیا مسافر میں کہنا چاہتی ہوں میں کیوں نہ کہوں؟ میں کہوں گی۔۔لیکن ایسے شخص کو پیغام دینے کا کیا فائدہ جس کی وجہ سے میں اس حال میں پہنچی ہوں جو محبت کے لطف سے محروم ہے۔

77۔ اس شخص کے لئے جس کی وجہ سے میں تنہائی کے گہرے اور تاریک غار میں داخل ہو گئی تھی اور ایک طرف پڑی رہی جبکہ وہ دولت کے حصول میں ناکامیاب ہے اور میں غیر مطمئن تنہائی کی وجہ سے پاگل ہو چکی ہوں۔ پیغام لمبا ہے اور تم جلدی میں ہو مسافر میرے محبوب کو ایک گاتھا ایک واستو اوزا ایک ڈومیلا پڑھ سنانا (سنسکرت میں مختلف نظموں کے نام)

78۔ تب ہم ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے اتنے کہ ہمارے درمیان کوئی خلا نہ تھا اس وقت اتنے اکٹھے کہ بیچ میں ایک ہار کی بھی جگہ نہ تھی جبکہ اب ہمارے درمیان کئی سمندر، دریا، پہاڑ، وحشت ناک جنگل اور صحرا حائل ہیں۔

79۔ کچھ عورتیں جو اپنے پیارے جیون ساتھی کے لئے رو رہی ہیں تنہائی سے خوفزدہ ہو کر اپنے محبوب کے کرے میں جاتی ہیں اور تصور میں اس سے ملن کی بارش میں بھیگتی ہیں وہ اپنے خوابوں میں محبوب کے جسم کے خوشگوار لمس ان سے گلے ملنا دیکھنا، چومنا، کاٹنا اور ان کے ساتھ جسمانی ملاپ سے لطف لیتی ہیں اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی ہیں لیکن مسافر اس کو یہ بتا تا کہ اے ظالم آدمی جب سے تم نے اسے تنہا چھوڑا ہے اسے نیند کی خوشی حاصل نہیں چہ جائے کہ تمہیں اس نے چھاتی سے لگایا ہو۔

80۔ میرے محبوب سے جدائی کی تنہائی اور اسے دوبارہ ملنے کی فکر میں میں دن رات گھل رہی ہوں۔ یقیناً میں اپنے جسم میں بکھر رہی ہوں اور میرے آنسو مجھے بہادیں گے تب تم ظالم مجھ سے کچھ کھو گے ایک لمحے کے لئے وہ میرے خواب میں آیا جذبات سے مغلوب میں محبت سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس سے باتیں کر رہی تھی۔ میرے محبوب ایک چور نے میرا گھر لوٹ لیا ہے اور بھاگ گیا ہے۔ مسافر مجھے بتاؤ اب میں کس کی حفاظت میں جاؤں۔

81۔ یہ دومیلا بولنے کے بعد وہ جس کے چہرے سے رات کی تاریکی دور ہوتی ہے اور جس کی آنکھیں کنول کی پنکھڑیوں جیسی ہیں ایک لمحے کے لئے بے حس وحرکت کھڑی رہی۔ وہ کچھ نہ بولی اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کو دیکھا ایک لمحے کے لئے وہ خوبصورت خاتون ایسے لگی جیسے دیوار پر تصویر بنادی گئی ہو۔

82۔ احتجاج اور آہوں کی وجہ سے اس کا سانس رک گیا۔ اس کا چہرہ نوحہ گر تھا اپنے محبوب سے گلے ملنے کی خوشی یاد کرنے کے بعد وہ محبت کے دیوتا کے تیروں کے ذریعے گویا کہ دیوار سے جوڑ دی گئی تھی۔ جب جذبات کی شدت سے لرزتی ہوئی پلکوں والی خاتون نے مسافر کو اچانک تھوڑی سی ترچھی نگاہ سے دیکھا۔ اس نگاہ سے مسافر کو ایسے دیکھا جیسے ہرن کمان کی رسی کی آواز سن کر گھبرا گیا ہو۔

83۔ مسافر نے کہا پرسکون ہو جاؤ بھروسہ کرو ایک لمحے کو سانس لو اور رومال سے اپنا چہرہ صاف کرو جو چودھویں کے چاند جیسا ہے اس کی بات سن کر جدائی کی مصیبت میں مبتلا نے رومال لیا اور اپنا چہرہ صاف کیا تب وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔

84۔ مسافر محبت کے دیوتا کے خلاف میری طاقت چھا نہیں سکی کیونکہ محبت ظاہر کرنے والا میرا عاشق میرے لئے محبت کے احساس سے خالی ہے اگر چہ میں کسی قسم کی غلطی سے مبرا ہوں وہ کسی دوسرے کا درد محسوس کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ ایسے سنگ دل پل پل بدلنے والے بے ایمان شخص کو برائے مہربانی صرف ایک مالنی نظم سنانا۔

85۔ میں سوچا کرتی تھی اگر ہماری محبت میں رکاوٹ آئی اور میری خوشیوں کا اختتام ہو گیا تو ایسی صورت حال میں میرا محبوب رنگ اور تیل یا محبت اور احساس لے گا جو کناروں تک بھرے ہوں گے اور مجھے کپڑے میں لپٹا

ایک مرتبان لینا ہوگا اور محبت سے خالی دل کو اس میں غوطہ دوں گی اور وہ دوبارہ محبت سے بھر جائے گا۔

86۔ اگر کپڑے کا رنگ اُڑ جائے تو اسے دوبارہ رنگا جاتا ہے اور اگر کسی کا بدن خشک ہو جائے تو اس پر تیل ملا جاتا ہے۔ اگر کسی کی اشیاء لے لی جاتی ہیں تو مخالف کو شکست دے کر وہ دوبارہ بحال ہو جاتی ہیں لیکن محبوب کا دل ایک دفعہ جدا ہو جائے تو مسافر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟

87۔ مسافر نے کہا لمبی آنکھوں والی خاتون پرسکون ہو جاؤ۔ سفر پر توجہ دو۔ خود کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو واپس لو۔۔ پیاری خاتون جو لوگ گھر چھوڑتے ہیں وہ اہم کاروبار پر جاتے ہیں۔ جس کے لئے انہوں نے سفر کیا ہو۔ اگر ان کا وہ خاص کاروبار مکمل نہ ہو تو پیاری خاتون وہ واپس نہیں آتے۔

88۔ وہ بھی جب بیرون ملک سفر کرتے ہیں۔ اگر محبت کے دیوتا کے تیروں سے گھائل ہوں۔ گھر چھوڑی ہوئی بیویوں کو یاد کر کے جدائی سے شکست خوردہ اپنے پیاروں کے لئے دن اور رات غم کا قابل برداشت بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پیاری خاتون تمہارے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے۔ مسافر بُری طرح اپنے آپ کو ضائع کرتے ہیں۔

89a,b۔ یہ سن کر لمبی آنکھوں والی عورت نے ایک ایتھلا نظم پڑھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مکمل طور پر کھول لیں جو پہلے محبت کی وجہ سے آدھی بند تھیں۔

90۔ میں سوچتی ہوں اس کے اندر میرے لئے محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ مسافر میرے عاشق کو اس معاملے کی خبر دینا کہ اب بھی آدھی رات میں تنہائی کی آگ میرے ناک کے درمیان سے میرے دل کو جلاتی ہے۔

91۔ محبت کے تیروں سے زخمی ہونے کی وجہ سے زیادہ طوالت سے نہیں بول سکتی۔ مہربانی کر کے میری یہ حالت میرے عاشق کو بتانا۔ جنونی محبت کے درد کی وجہ سے جسمانی طور پر بے زار اور تھکی ہوئی کیفیت مستقل ہے۔ رات کی بے خوابی، جونہی میں چلتی ہوں زندگی کی تھکن سے میرے قدم کمزور پڑ جاتے ہیں۔

92۔ بالوں کا یہ انداز ایک پردہ ہے۔ انہیں پھولوں کی چادر سے نہیں سجایا گیا۔ جو کاجل میں اپنی آنکھوں میں لگاتی ہوں۔ میرے رخساروں پر بہہ نکلتا ہے۔ میرے محبوب سے ملن کی امید میں جو گوشت میرے اعضاء پر پیدا ہوتا ہے جدائی کی آگ سے بہت زیادہ مقدار میں جل جاتا ہے۔

93۔ ادھر امید کے پانی سے بھیگتی ہوں، ادھر جدائی کی آگ سے جل اُٹھتی ہوں۔ نہ میں جیتی ہوں نہ میں مرتی ہوں۔ مسافر میں سلگتی رہتی ہوں۔ اس کے بعد گہری آنکھوں والی عورت نے جلدی سے مسافر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور آنکھوں کو خشک کر کے پیہولاگ نظم پڑھی۔

94۔ جو چیز قیمتی ہے میرا دل اس کو کسوٹی پر پرکھنا چاہتا ہے۔ جیسے سنار پرکھتے ہیں۔ مجھے جدائی کی آگ میں گم کرنے

کے بعد یہ سچ امید کے پانی سے میری پیاس بجھاتا ہے۔

95۔ مسافر نے کہا میں سفر پر جا رہا ہوں مجھے بُرے شگون مت دو۔ بار بار رونا۔ اپنے آنسو پی جاؤ اور مضبوط بنو۔ اس نے جواب دیا۔ مسافر خدا کرے تمہاری خواہش پوری ہو۔ خدا کرے تمہاری روانگی آج مکمل ہو۔ میں نہیں روئی یہ تو جدائی کی آگ کا دھواں تھا جو میری آنکھیں نکال رہی تھیں۔

96۔ مسافر نے کہا لمبی آنکھوں والی خاتون کہو جو کہنا ہے۔ جلدی سے کہو۔ کیا تم نہیں کہو گی؟ سورج غروب ہونے کے قریب ہے۔ رحم کرو اور مجھے جانے کی اجازت دو۔ مسافر تم جاؤ۔ خدا کرے وہاں تمہارے لئے ہر لمحہ اچھی خبر ہو۔ کیا تم میرے محبوب کو صرف ایک مادلا اور مزید یہ ایک کوڈیلا سنا سکتے ہو؟

97۔ ماتم اور گرم آہوں سے میرا جسم خشک ہے۔ لیکن میرے آنسوؤں کے پانی کا سیلاب خشک نہیں ہوتا۔ میرا دل پپیہا ہے جو کسی دوسری سرزمین میں اُڑ گیا ہے یا چراغ پر گرے ہوئے پتنگے کی مانند ہے۔

98۔ سورج کے شمالی را ستے کے دوران دن طویل ہوتے ہیں جنوبی راستے کے دوران راتیں۔ یہ پرانا نظام ہے۔ لیکن میری محبت وہ تیسرا راستہ ہے جو تنہائی ہے۔

99۔ دن جا چکا ہے اور شام ہو گئی ہے۔ مسافر تمہیں روانگی ترک کر دینی چاہئے۔ شام اور رات گزرنے کے بعد تم دن کی روشنی میں اپنا سفر دوبارہ شروع کر سکتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ زیریں گول لب والی خاتون دن کے سورج کی روشنی چمکدار ہے۔ دن کی روشنی کے گھنٹوں میں میرا کام بہت اہم ہونے کی وجہ سے مجھے ضرور جانا چاہئے۔ وہ بولی مسافر اگر تم اس جگہ نہیں ٹھہرو گے اور جانا چاہتے ہو تو میری محبت کو ایک کودلا ایک کھڈ ہڈا اور ایک گاتھا سنانا۔

100۔ تمہاری غیر حاضری کی وجہ سے ہمیں جدائی کی آگ کا تحفہ مل چکا ہے۔ جاؤ اور میری محبت کو بتاؤ کہ اس کے نتیجے کے طور پر میں اپنی خواہش حاصل کر چکی ہوں کہ میں زیادہ عرصہ زندہ رہی۔ ایک دن ایک سال کے برابر ہے۔

101۔ اگر میرے محبوب سے جدائی کی وجہ سے میرا دل پریشان ہے۔ اگر میرے جسم کو محبت کے دیوتا کے تیروں سے چھپا ہوا زخم مل چکا ہے۔ اگر میری آنکھیں میرے رخساروں پر آنسوؤں کے سیلاب بہانے کا ارادہ کر چکی ہیں اگر میرے دل میں دکھ کا جذبہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔

102۔ تب مسافر رات کے وقت میں کیسے آرام کر سکتی ہوں اور سو سکتی ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ جو عورتیں اپنے عاشقوں سے جدا ہیں۔ ان کا اتنے دنوں تک زندہ رہنا ایک معجزہ ہے۔

103۔ مسافر نے کہا سنہرے بدن والی خاتون جو کچھ تم مجھے بتا چکی ہو اور مزید جو کچھ بھی میں نے دیکھا ہے، میں اسے پہنچا دوں گا۔ خاتون جس کی آنکھیں کنول کی پنکھڑیوں جیسی ہیں۔ اپنے گھر واپس جاؤ، کیا جاؤ گی؟ جہاں

تک میرا تعلق ہے۔ میں اپنے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ میرا سفر خراب مت کرو۔ مشرق میں اندھیرا بڑھ چکا ہے۔ سورج ڈوبنے کے قریب ہے۔ رات میں سفر کرنا تکلیف دہ ہے۔ راستہ مشکل اور خطرناک ہے۔

104۔ مسافر کی بات سن کر اپنی محبت سے الگ ہوئی خاتون نے اپنے نازک پیٹ سے ایک لمبی گرم آہ دوبارہ خارج کی اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے سیلاب کا کوئی قطرہ رہ گیا تھا۔ جو یوں لگ رہا تھا جیسے مرجان کے ڈھیروں میں کوئی موتی ٹھہرا ہو۔ اس نے باتیں کیں۔ وہ روئی، نوحہ کناں ہوئی۔ اپنی محبت کی جدائی کی وجہ سے وہ غمگین تھی۔ وہ بولی۔ تب میرے محبوب کو ایک سیکنڈ ھک اور ایک دوپد سنانا۔

105۔ میرا دل ہیروں کا ایک خزانہ ہے۔ پس مستقل طور پر اگر مندرا18 اسے بلوئے تو خوشی کے قیمتی پتھر کے ہر ٹکڑے کو اُکھاڑا اور تمہاری محبت کے ذریعے باہر نکالا جا سکتا ہے۔

106۔ جدائی کی آگ جسے محبت کی آندھی نے ہوا دی (پنکھا کیا) نگاہ کے شعلوں سے جلی۔ یہ میرے دل میں ایک ناقابل برداشت دکھ اور ایک نہ ختم ہونے والی جلن سلگا گئی ہے۔ تھکن کی راکھ سے بھری ہوئی۔ یہ اپنے آپ تازہ ہو جاتی ہے۔ جونہی یہ جلتی ہے ہر وقت دھمکاتی رہتی ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب کیفیت ہے۔ تمہارے لئے خواہش مند ہونے کی آگ میں ہمارا کنول اگنا ہے۔

107۔ سینڈ ھک اور دوپد سن کر مسافر کے جسم میں چبھن ہوئی۔ وہ یقیناً محبت پر غالب نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اپنے دل میں خوش تھا۔ اس نے اسے جواباً کہا۔ ہرنی کی آنکھوں والی خاتون ایک لمحے کے لئے پُرسکون ہو جاؤ۔ اور میری بات سنو۔ چاند جیسے چہرے والی خاتون کیا میں تم سے کچھ کہہ سکتا ہوں؟ مہربانی کر کے میرے لئے ایک واضح شرح کرو۔

108۔ نئے بادل کی لہریں ظاہر ہو رہی ہیں۔ خزاں کی رات میں عیاں ہونے والا دودھیا چاند چمکتا ہے۔ ندیاں امرت سے بھری ہیں۔ چہرہ جو چاند سے بھی زیادہ روشن ہے۔ چہرہ جس نے تمہارے عاشق میں مسرت کو جگا یا۔ کب وہ چہرہ جدائی کی آگ میں دھوئیں میں چھپ گیا۔

109۔ مجھے بتاؤ کہ تمہاری شرارت سے تڑپتی ہوئی نظر، محبت میں مدہوش قاتل آنکھوں میں کس دن سے مسلسل غم ٹھہر گیا ہے۔ تمہارا بدن جالمندھری درخت کی طرح نازک ہے۔ وہ شخص تمہیں ضائع کر رہا ہے۔ جس کے لئے تم چنچل عورت کی چال ترک کر چکی ہو۔ جو کہ ہما پرندے جیسی ہے۔

110۔ کانپتی آنکھوں والی خاتون کیوں اداسی کے سامنے سر جھکاتی ہو؟ تمہارا جسم جدائی کی ناقابل برداشت اذیت سے پارہ پارہ ہے۔ کس دن 19 کے بیٹے نے تیز دھار تیروں کی نوکوں سے تمہارا دل زخمی ہوا تھا؟ مجھے بتاؤ پیاری خاتون کس وقت تمہارے عاشق نے تمہیں الوداع کہا تھا؟

111۔ مسافر کے الفاظ سن کر لمبی آنکھوں والی خاتون نے جس کی آنکھیں محبت سے نیم بند تھیں چار مصرعوں کا ایک

گا تھا پڑھا۔

112۔آؤ! مسافر کیا یہ پوچھنا ضروری ہے۔جس دن میرا محبوب چلا گیا۔اس دن اپنی خوشیاں کھونے کے بعد میں نے غم واندوہ کا ایک انبوہ حاصل کیا۔

113۔اب مجھے بتاؤ جس دن جدائی کے شعلے بھڑک اٹھے اس کو یاد کرنے کا کیا فائدہ ہے۔یہاں اس دن کا ذکر نہیں کرنا ہوگا۔جس دن میرا محبوب چلا گیا۔حتیٰ کہ ایک لمحے کا بھی۔

114۔میری بے چینی اسی دن سے قائم ہے۔جس دن میرا عاشق چلا گیا مسافر یقیناً میرے دل میں وقت موت کی مانند گزرتا ہے۔

115۔اس موسم گرما میں جب میرا پیار مجھے چھوڑ گیا تھا تو اس موسم کی گرمی کی آگ مجھے جلاتی تھی اور شاید یہ کہ میں مرجھا گئی تھی اور کوہ ملایا کی خشک ہوا نے جھریاں ڈال دی تھیں۔

حصہ سوم

موسم گرما کے بیان میں:

116۔نئے موسم سرما کی آمد پر مسافر میرے شوہر نے الوداع کے اشارے کے ساتھ گھر چھوڑا۔میری تمام خوشیاں اسی میں رہتی تھیں۔اس کا پیچھا کرتے ہوئے،واپس لوٹتے ہوئے میرا جسم جدائی کی آگ سے جھلس گیا۔آخر کار میں واپس مڑی اور اپنے گھر کی طرف چل پڑی،پریشان حال،میرا دل بے چین تھا۔

117۔ملایا کی ہوا کو برداشت کرنا میرے لئے مشکل تھا جبکہ میں جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ،خواہش،بے زاری اور محبت پر غالب آنے کے قابل نہ تھی۔جنگل میں گھاس کو لگی آگ زیادہ تیزی سے جلتی،زمین کی سطح پر شدید گرمی کی وجہ سے زیادہ تیزی سے بھڑکتی اور سورج کی شعاعیں مزید گرم ہو جاتیں۔

118۔آسمان ٹمٹمایا،لہرایا،جیسے یُما کی زبانیں ہوں۔زمین دراڑوں سے ٹکڑے ہوگئی،یہ گرمی کی زیادتی برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔وہی بہت زیادہ گرم لو جو آسمان میں آندھی لاتی ہے۔تنہائیوں کے جسموں کو بے رحمی سے جھلسا دیتی ہے۔

119۔مادہ کاتکا پرندوں کی ''پیا''(جو کہ محبوب کی نمائندگی کرتی ہے) کی آوازیں آتی تھیں۔نئے بادلوں کی خواہش کے لئے ایک چھوٹی لیکن شفاف پانی کی ندی دریاؤں میں گرتی،پھلوں کے بوجھ سے نیچے جھکے ہوئے۔آموں کے درختوں کا نظارا شاندار تھا۔وہ ہوا میں ہاتھی کے کانوں کی مانند ہلتے۔

120۔ان کے پتوں میں آم کے درخت کے عاشق طوطوں کا ایک گروہ ایک دوسرے کی قربت میں مگن تھا۔ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا۔دیکھو! شگوفے چٹکے اور دل کو چھونے والی آواز بلند ہوئی۔مسافر! میں آموں کے

جھنڈ کو دیکھ کر برباد ہوگئی تھی۔

121۔سنبل جو کہ خوشگوار ٹھنڈک کے لئے چھاتی پر لگایا جاتا ہے اس نے میری چھاتیوں کو جلایا گویا کہ سنبل کے درخت کو سانپوں نے ڈس لیا تھا۔تب روتے ہوئے میں نے مختلف ہار گلے میں ڈال لئے۔پھولوں کے ہار بھی،لیکن وہ بھی شعلے برسانے لگے،اس سے میں خوف زدہ ہوگئی۔

122۔رات پھولوں کی پتیوں کی چادر نے جو میں نے اپنے جسم کو آرام دینے کے لئے بستر پر بچھائی تھیں مجھے دوگنا پریشان کیا۔تب میں اٹھی،میں نے بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی ہمت ہار دی،مسافر اداس ہو کر میں نے کانپتی ہوئی آواز میں ایک داستو اور ایک دوہکار پڑھا۔

123۔سورج کی شعاعیں پڑتے ہی پورا زور لگا کر جھکنے والے سرخ کنول کے پھول اپنی گرمی سے کسی کو بھی گرم بنا دیتے ہیں۔چاند کی امرت بھری شعاعیں پھر انہیں اکساتیں۔یہ جلتا ہے جیسا کہ اس سے منسوب کیا جاتا ہے۔کہ یہ زہر پیدا کرتا ہے (اسی طرح کا زہر کائنات کے سمندر کو بلو کر نکالا جاتا ہے) سانپ کے زہریلے دانتوں سے ڈسا ہوا سنبل جسم کو ضائع کرتا ہے۔موتیوں کے ہار جن کی اصل نمک ہے۔محبت کے دیوتا کی وجہ سے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں۔کنول،چاند،سنبل،قیمتی پتھر اکثر ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔محبت کی آگ ان میں سے کسی سے بھی نہیں بجھتی بلکہ ان سے کسی ایسے جسم کو مزید نقصان پہنچتا ہے۔

124۔کچھ لوگ کافور اور سنبل کا جسم پر مرہم رکھتے ہیں۔یہ بے حاصل ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ محبوب سے جدائی کی آگ صرف محبوب کے ذریعے ہی بجھائی جاسکتی ہے۔

125۔پس میں نے کسی نہ کسی طرح سے بہت زیادہ شدید موسم گرما گزارنے کا بندوبست کیا۔مسافر پھر موسم برسات دوبارہ شروع ہوا لیکن میرا بے وفا خاوند پھر بھی نہ آیا۔تمام اطراف میں خوفناک،بھاری اور بوجھل تاریکی چھا گئی۔آسمان میں بادل شدت سے گرجنے اور چنگھاڑنے لگے۔

126۔آسمانی بجلی جو آسمان میں ہاتھی کی جسامت کی ہوتی اس سے راستہ جگمگا اٹھتا تھا۔آسمان میں ہولناک شعلے کوندتے اور کھلبلی مچ جاتی۔ڈوہا (پرندے) خوشی سے چہچہاتے پانی میں مستقل طور پر خوش۔نئے بادلوں کے درمیان سفر کرتے سارسوں کی قطاریں آسمان میں بھی پیاری لگتیں۔

127۔موسم گرما کی آگ میں سورج کی شعاعی مرکزیت کی وجہ سے بادل بہت گرم ہوگئے تھے۔بادلوں سے گرتے آبشار جھیلوں سے نہ تھمتے۔مسافر جو سفر پر گیا،آسمانی ہاتھی کے ذریعے پانی میں ڈال دیا گیا۔ان میں سے ایک جو دریا کے احاطے کے ہر مرکز کی نگرانی کرتے ہیں۔آسمان کے ہر خطے میں یا (ہر قدم پر) اس نے ادھر ادھر دیکھا (آسمانی بجلی آسمانی ہاتھ کی طرح دکھائی دے رہی ہے) اپنی سونڈ یا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے۔

128۔تیز بہنے والی ندیوں کے مسلسل شور میں،متلاطم ندیوں میں اور بڑے دریاؤں میں لہریں غراتیں اور

چنگھاڑتیں۔ ہر جگہ جہاں بھی لوگ سفر پر تھے، رُک گئے۔ مسافر! جو لوگ اپنے کام پر جا رہے تھے انہوں نے گھوڑوں کی بجائے کشتیوں کے ذریعے اپنا سفر شروع کیا۔

129۔گارے سے سفید کسی عورت کا جسم جب وہ اپنے محبوب کے گھر رات بسر کر کے بارش میں نہاتی تو بجلی میں نمایاں ہو جاتا تھا لیکن اس کی پیشانی بالوں میں چھپ جاتی تھی۔ ستاروں کے میزبان غیر مرئی ہو گئے اندھیرے کی سلطنت وسیع ہو گئی۔ پہاڑ کی چوٹی آتشیں مکھیوں (جگنوؤں) سے مکمل طور پر چھپ گئی تھی۔

130۔سارس نے پانی کا تالاب چھوڑا اور درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا۔ ایک بڑے پہاڑ کی بلندی پر مور اپنا رقص کرتے اور چلاتے۔ جوہڑوں میں بڑے مینڈک اپنی چیخ سے کھردری اور سخت آواز نکالتے۔ کلا کٹھا پرندہ آم کے درخت کی چوٹی پر چہچہاتا رہتا۔ خوبصورت کوکو کی آواز پیدا کرتا۔

131۔وسیع جھیلوں کی وجہ سے سڑکیں گزرنے کے قابل نہ رہیں۔ گویا کہ انہیں زہریلے سانپوں نے تمام اطراف سے بند کر دیا تھا۔ پادلا کے پتوں کی ویرانی ندیوں کے پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے تھی۔ ہما پرندے کے نوحوں کی آواز پہاڑ کی بلندی سے آتی تھی۔

132۔بھڑوں کے ڈر سے مویشیوں کے گروہ کھلے میدان میں دوڑتے۔ گوالوں کی بیویاں خوشی خوشی اپنی محبت سے اپنے شوہروں کو سیراب کرتیں۔ زمین کے چاند سورج کدمبا پھولوں کے سبزے اور خوشبو میں چھپ گئے تھے۔ محبت کے دیوتا نے میرے جسم کے سب اعضاء میں ایک درد بسا دیا تھا۔

133۔جونہی میں اس عظیم درد میں مبتلا ہوئی میرے تکلیف دہ بستر پر کانٹے اگنے لگے۔ شہد کی مکھیوں کے جھنڈ کی آواز سن کر میں زخمی ہو گئی میری آنکھیں کبھی بند نہ ہوئیں۔ پریشان ہو کر اور تمام رات جاگ کر واستو، گاتھا اور دوہکا نظمیں لکھیں۔ کیونکہ میں نیند کو نہ پا سکی تھی۔

134۔اندھیرے کی وجہ سے آسمان ہر سمت میں اپنا سایہ ڈالتا ہے اور برا موسم اسے مزید تاریک بنا دیتا ہے۔ آسمان خوفناک دکھائی دیتا ہے۔ ایک چھپا ہوا سیاہ بادل خوفناک شور کے ساتھ گرجتا ہے۔ آسمان میں سانپ کی طرح لہراتی ہوئی بجلی کڑکتی ہے اور چمکتی ہے۔ کوئی بھی مینڈکوں کی خوفناک آوازوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ مسافر! پھر میں کیسے نہ ختم ہونے والے گھنے بادلوں سے برستے سیلاب کے شور کو برداشت کر سکتی تھی۔ جسے پہاڑ بھی مشکل سے برداشت کرتے ہیں۔ مادہ کوکلا پرندہ درخت کی چوٹی پر چہچہاتا اور ایک نا قابل برداشت چیخ پیدا ہوتی ہے۔

135۔موسم گرما کی آگ بارش کی بہتات سے بجھ گئی تھی۔ جب موسم برسات آیا تو کرامت یہ تھی کہ میرے دل میں جدائی کی آگ اور زیادہ شدت کے ساتھ جل اٹھتی۔

136۔دوہکا ر پڑھنے کے بعد جدائی کے دکھ سے تھکی ہوئی، اوہ! اس کے بعد بہت ہی برا ہوا کہ میں ایک دھوکے سے

مغلوب ہوگئی تھی۔ کہ خواب میں میں نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ جس کو گھر سے گئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کے پہچانتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

137۔ کیا نیک خاندانوں کے سربراہوں کے لئے یہ مناسب ہے؟ ایسے موسم میں جو بادلوں کی گرج کے شور سے بھرا ہے، جس کی روشنی آنکھوں کو تکلیف دیتی ہے کیا وہ اس طرح اپنے محبوباؤں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟

138۔ آسمان میں نئے بادلوں کی قطاروں کی وجہ سے پھولوں کے ہار ہیں، جہاں سے آسمان خالی ہے۔ قوس قزح کی وجہ سے سرخی چھائی ہے۔ آتشیں مکھیوں (جگنوؤں) کی وجہ سے بادل چھپ گئے ہیں۔ میرے محبوب! موسم برسات کو برداشت کرنا مشکل ہے۔

139۔ جب میں اپنے خواب سے جاگی۔ میرے گلے کا اگلہ حصہ جذبات کی شدت سے گھٹ رہا تھا۔ یہ حقیقت جان کر کہ میں کہاں تھی اور میرا محبوب کہاں تھا۔ میں پتھر کی بن گئی۔ پھر بھی میں اسی وقت نہ مری۔ اگر میری زندگی مجھے نہیں چھوڑتی تھی تو یہ اس لئے تھا کہ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ اور میری موت کا کام سا کن تھا۔ بجلی گرنے سے بھی میرا دل پھٹ کیوں نہ گیا؟

140۔ مدہم صدا سے ٹراتے مینڈک نے نرم آواز میں بولنا شروع کر دیا تو رات کے آخری پہر میں نے ایک دوہکار پڑی۔

141۔ رات جس کو ملامت کی جاتی ہے۔ آپ پر اس طرح لاگو ہوتی ہے اور اس کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ پوری دنیا کو پکڑ سکتی ہے۔ رات جو غم کے لمحات میں چار گنا لمبی ہو جاتی ہے اور خوشی کی گھڑیوں میں جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔

خزاں کے بیان میں:

142۔ تاہم صبح ہوئی میں ابھی تک ماتم کر رہی تھی۔ ایک گیت گا رہی تھی اور مقامی زبان (پراکرت) میں کچھ پڑھ رہی تھی جیسا کہ جانا جاتا ہے، کہ رات محبوب کی محبت کے اثر سے خوبصورت ہوتی ہے۔ اس طرح کا گیت میں نے گایا۔ لیکن مسافر میں نے سوچا کہ یہ رات بہت ناپسندیدہ ہے۔

143۔ اس طرح رات گزر گئی، میرے ساتھ بیدار رہ کر۔ میں جو اپنے محبوب کے لوٹنے کی امید میں زندہ تھی، دن نکلنے پر میں نے اپنا بستر چھوڑا اور اپنے دل میں اسے یاد کرنے لگی جو جدائی کی وجہ سے مجھے برباد کر گیا تھا۔

144۔ عقیدت سے جنوب کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک مجھے ستاروں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ میں نے سوچا موسم برسات گزر چکا ہے، لیکن میرا محبوب ابھی تک بیگانے دیس میں رُکا ہے اور میں اس کی محبت سے لطف اندوز نہیں ہو رہی۔

145۔ بارش برسانے والے بادل بکھر چکے تھے اور آسمان سے غائب ہو گئے تھے۔ خوبصورت ستاروں کے ہجوم

رات میں دکھائی دیتے تھے۔ سانپوں کا بل زمین میں تھا۔ چاند کی روشنی رات میں شفاف چمکتی تھی۔

146۔ جھیلوں میں پانی جن میں کنول کے پودے تھے درخشاں تھا۔ دریا مختلف رنگوں کی لہروں میں تقسیم ہو کر بہتے۔ اگر چہ نئی جھیلوں کی خوبصورتی کو گرم موسم خراب کر چکا تھا اور ان کی تازگی لوٹ چکا تھا، یہ نئے موسم خزاں میں پھر سے جاری ہوئیں۔

147۔ بڑی بطخیں نیلے کنولوں میں رس چوستیں اور ایک خوشی کن دلکش آواز پیدا کرتیں۔ زمین کنولوں سے بھری تھی جیسے وہ اُبل پڑے ہوں۔ پانی کی ندیاں وسعت میں دگنی ہوگئیں، ان کا پانی کناروں سے باہر نکل آیا۔

148۔ کُس 20 (گھاس) سے جھیل کے کنارے خوبصورت ہو گئے تھے۔ اتنے سفید جیسے سفید کانچ کی سیپیاں ہوں۔ دریا کے کنارے پرندوں کی قطاروں سے شاندار ہو گئے تھے، جو ندیوں کے شفاف پانی میں بہتے۔

149۔ شفاف ندیوں میں شبیہہ منعکس ہوتی۔ ان میں کیچڑ کا بوجھ ضائع ہو چکا تھا۔ خزاں کے شروع ہونے پر کرونکا (پرندے) کی پکار میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں مرجاتی۔ جرالا (پرندے) کی آمد پر میں بچ نہ سکتی تھی۔

150۔ مسافر میں سوکھ گئی جیسے ندیاں سوکھ گئیں۔ جنگوؤں کے ساتھ ہی میں بھی برباد ہوگئی۔ آبی پرندے اپنی دلکش آواز پیدا کرتے۔ میں نے آبی پرندے کی مادہ سے کہا کیوں تم مجھے میری محرومیاں یاد کراتی ہو، جواب کچھ کم ہو چکی ہیں۔

151۔ ظالم! تم اپنی دُکھ بھری آواز اپنے دل میں رکھو۔ ایک عورت جو تمہاری آواز سنتی ہے، مرجھا جاتی ہے اس کی خوشی غارت ہوگئی۔ اگر چہ میں نے انتہائی دکھ کے ساتھ ایک ایک سے التجا کی لیکن مسافر! ایک لمحے کو کسی نے بھی میری حوصلہ افزائی نہ کی۔

152۔ وہ خواتین جن کے شوہر گھروں میں تھے اور ان کے پاس تھے۔ وہ اپنے آپ سے گلیوں میں لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ راسا (کرشن کے احترام میں جو رقص کیا جاتا ہے) سے مسرت حاصل کر رہی تھیں۔ وہ کھلتے رنگوں کے لباس اور مختلف زیوروں سے سج رہی تھیں۔ وہ عمدہ کپڑے پہن رہی تھیں۔ جو شوخ اور مختلف رنگوں کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے تھے۔

153۔ اپنی پیشانیوں پر رنگ دار پاؤڈر کے تلک لگنے کے بعد انہوں نے اپنی چولیوں پر زعفران اور سنبل چھڑکا۔ وہ درمدا کو ہاتھوں میں تھام کر اس سمیت انہوں نے خدا کی تعریف میں خوش کن گیت گائے۔

154۔ انہوں نے اگربتی پیش کر کے اپنے آقا کی پوجا کی۔ گائے اور گھوڑوں کے اصطبل کو نقش و نگار سے سجایا۔ یہ دیکھ کر میں محبت کی طلب سے مستقل پریشان ہوگئی تھی۔ وہ عورتیں جن کی خواہش پوری ہوگئی تھی۔ میری سہیلیاں نہ تھیں۔

155۔ تب میں نے آسمان کی سطح کو مکمل طور پر روشن رنگوں میں دیکھا اور یہ ایسے تھا جیسے وہ علاقے آگ سے روشن ہو

چکے ہوں ۔میرے دل میں تنہائی کے شعلوں کی لہر سلگ اٹھی ،اور میں نے ایک ننندنی ایک گا تھا اور ایک بھرا ئمبر والی نظمیں پڑھیں ۔

156 ۔گلوں کو کنول کے نئے شگوفوں کی خشکی سے پاک کر کے دھاتر شڑ اور رتھا نگا (پرندے) پانی پر اپنی آواز پیدا کرتے ۔جب وہ چلاتے تو یہ ایک غیر معمولی معجزہ ہوتا ۔خزاں کی آمد پر پازیبوں کی ایک ملائم آواز ۔

157 ۔اسوج (آسویو جا ایک مہینہ) میں ندیوں پر جو کہ خزاں میں وسیع ہو جاتی ہیں، چوڑی اور ایک برقی رو جو پیروں کے نیچے تھرکتی ہے ۔آبی پرندہ بار بار اپنی پکار پیدا کرتا جس کا مقصد مجھے میرے دکھ سے مغلوب کرنا ہوتا ہے ۔

158 ۔راتوں میں چاندنی سے محل نے اپنی خوبصورتی بڑھالی تھی ۔اس کی دلکشی شاندار چھوٹے قلعوں اور دیواروں کے ساتھ بے داغ تھی ۔موسم خزاں اپنے محبوب کی ٹھکرائی عورت کے بستر پر تکلیف کی پکار تازہ کر دیتا ہے ۔ ایسے دکھی ہوتی ہے جیسے موت کے دیوتا کا عصا ہے ۔

159 ۔ان خواتین کا پیارا انداز جن کے مرد گھر پر تھے اور جو جھیل کے ساحل پر سیر کر رہی تھیں نظارہ کرنے والا تھا ۔

160 ۔بچے اور عمدہ نوعمر لوگ کھیلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور ہر گھر میں ڈھول بجائے جا رہے تھے ۔

161 ۔لڑکے ایک دائرے میں رقص کر رہے تھے ۔ان کے مونڈے ہوئے سروں پر بالوں کی ایک چٹیا تھی ۔وہ خوشی خوشی گلی میں پسندیدہ انداز میں موسیقی کے آلات بجاتے ہوئے گئے ۔نوجوان عورتوں کے ایک گروہ نے پُر کشش بستر بنائے تھے ۔تمام گھروں میں خوش کن دھاریاں ڈال کر روغن کیا گیا ۔ان گھروں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں ۔

162 ۔دیوالی کے روشن کردہ چراغ لوگ اپنے ہاتھوں میں چاند کی کرنوں کی مانند پکڑے تھے ۔گھروں میں دودھیا روشنیاں سجائی گئی تھیں ۔خواتین چراغ کی سیاہی کو کاجل بنانے کے لئے لکڑیوں کو استعمال کرتیں ۔

163 ۔اپنے منہ میں زیادہ مقدار کافور کے ساتھ انہوں نے پان رکھے ہوئے تھے ۔یہ یوں تھا جسے سورج صبح صادق کے وقت جاگ رہا ہو ۔ان کی خوبصورتی ایک جلد میں دیئے ہوئے چھینٹ سے مکمل کی گئی تھی ۔بستر اونچی آواز میں گونجنے والی گھنٹیوں سے عمدہ دکھائی پڑتے تھے ۔

164 ۔اس طرح کچھ خواتین مسرور و مطمئن تھیں ،جب انہوں نے محبت کے کھیل کھیلے لیکن میں نے مخالفانہ طور پر نا آسودہ خواہش کی حالت میں رات بسر کی ۔ہر گھر میں خوبصورت گیت گائے جا رہے تھے ،لیکن مجھے دکھوں کا ڈھیر دیا گیا تھا ۔

165 ۔دوبارہ مسافر میں نے اپنے محبوب کو سوچا جو مجھ سے طویل عرصے سے دور تھا ۔میرے ذہن کے تصور میں وہاں پہلے ہی سورج طلوع تھا ۔پانی کے سیلاب کی طرح بہت سے آنسو بہاتے ہوئے میں نے ایک اجلا اور

ایک دستکو بھی پڑھی۔

166۔رات کو میرے لئے آدھے منٹ کی بھی نیند نہیں ہے۔ یہاں بے خوابی ہے۔جونہی میں اپنے محبوب سے بات کرتی ہوں تو مجھے چوتھائی لمحے کے لئے بھی محبت نہ ملتی۔اب دکھائی پڑتا ہے کہ مجھے محبت کی اذیت اور درد ہی عطا کیا گیا ہے۔

167۔اس ملک میں جہاں میرا محبوب ٹھہرا ہے۔کیا چاند کی بے داغ شعاعیں رات میں نہیں چمکتیں؟ کیا بڑی بطخیں جب وہ سرخ کنولوں کے پھولوں کو کھاتی ہیں تو مدہم سرسراہٹ بھی پیدا نہیں کرتیں؟ اور یہ کہ کیا کوئی بھی شخص مہربان آواز میں پراکرت کی تلاوت نہیں کرتا؟

اور تم نے تو خیر جذبے کو ترک کر دیا ہے۔کیا کوئی اور بھی پنکما (موسیقی کی دھن جس کا تعلق محبت سے ہے) احساس کے ساتھ ادا نہیں کرتا؟ اور مزید یہ کہ کیا صبح صادق کے ہونے پر اوس سے بھیگے ہوئے پھولوں کے گھنے انبار سے خوش کن خوشبو نہیں آتی؟ یا مسافر میں جان چکی کہ میرا محبوب ایک ایسا شخص ہے جو کسی قسم کے جذبات نہیں رکھتا۔ کیونکہ موسم خزاں میں بھی (اگرچہ یہ سب باتیں محبت کی یاد دلاتی ہیں) وہ گھر نہیں آیا۔

ابتدائی موسم کے بیان میں:

168۔اسی طرح پیاری خوشبوؤں سے معطر اور مسرور موسمِ خزاں گزرا۔وہ جو باہر گیا تھا۔بے وفا وحشی، اسے اپنے گھر کی یاد نہ آئی۔ میں اسی حالت میں رہی اور تب میں محبت کے تیروں سے بے رحمی کے ساتھ چھیدی گئی۔ میں نے محلوں کو دھند کی زیادہ مقدار سے سفید دیکھا۔

169۔مسافر میرا تمام جسم جدائی کی آگ سے تڑخ تڑخ کر کے جلا۔محبت کے دیوتا نے غرور میں اپنے کمان سے تیر زپ زپ برسائے۔اس پر بھی وہ جو میرا دل چرا کر لے گیا تھا۔مجھ تک نہ آیا۔جب میں غم والم میں مبتلا بستر پر پڑی تھی۔بے حس، غیر مہذب، دھوکا باز اجنبی دیس میں گھومتا رہا۔

170۔اور میں اپنی آہ وزاری کو ہر طرف سے کھوکھلا پا رہی تھی۔دیکھو! موسم سرما دھند کے بوجھ سمیت دبے پاؤں چلا آیا۔سرد گھروں میں پانی کی خوش آمدید نہ تھی۔مسافر کنولوں کی تمام پتیاں کیاریوں میں ہی ختم ہو گئیں تھیں۔

171۔(خدمت کرنے والی عورتیں) یا مزدور عورتوں نے نہ کافور اور نہ ہی سنتل اگایا تھا۔ہونٹوں اور رخساروں کے لئے ابٹن میں شہد کی مکھیوں کا بنایا ہوا موم ملایا جاتا تھا۔سنتل سے پاک زعفران جسم پر لگایا جاتا تھا۔مشک ملا کمیا تیل اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔

172۔جائفل کے ساتھ مشک نہیں اگایا گیا تھا۔کیتکی کے پھولوں کے عطر کو عموماً پانی میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ خواتین اپنے گھر کے اوپر کی منزل کو مزید استعمال نہیں کر سکتی تھیں۔رات ہونے پر وہ اپنے اندرونی کمروں

میں سوتیں اور بستر پر چادریں بچھاتی تھیں۔

173۔اس وقت اگر کی لکڑی جلائی جاتی تھی اور جسم پر زعفران لگایا جاتا۔ایک مضبوط وصل مزہ دیتا تھا۔ایک اور دن، میرے محبوب کی موجودگی میں یہ لمحہ ایک انگلی بھر لمبا تھا لیکن مسافر میری تنہائی میں یہ لمحہ جو شروع ہوا اور اس کی کوئی حد نہ تھی۔

174۔طویل رات میں مجھے نیند نہیں آتی اور میں روتی رہتی تھی اور تب گھر میں تنہا میں نے ایک وستو پڑھی۔

175۔میرے لئے طویل رات آہوں کے ساتھ گزرتی ہے، تم جنگلی بے رحم شخص ہو۔تمہیں سوچتے ہوئے مجھے نیند نہیں آتی۔تم لٹیرے ہو۔بے وفا شخص میرے اعضاء تمہارے ہاتھ کے لمس سے محروم ہیں۔میرا جسم جو سونے کا تھا۔آتش دان کے پھٹنے سے نہیں بلکہ موسم سرما کے پھٹ پڑنے سے راکھ بن گیا ہے۔میرے محبوب میں تمہیں یاد کر کے روتی ہوں۔کیا موسم سرما کے دوران نہ آؤ گے اور مجھے تسلی نہیں دو گے۔نادان، وحشی، مجرم جب میں مر جاؤں گی اور تمہیں پتہ چلے گا کیا تم تبھی آؤ گے؟

آخر موسم سرما کے بیان میں:

176۔مسافر اسی دکھ میں میں نے ابتدائی موسم سرما گزارا۔ٹھنڈا موسم آیا۔میرا ظالم شوہر دور تھا۔آسمان میں کھردرے، کانٹے والے، جھکڑ بلند ہوئے۔اس آندھی سے مار کھا کر یہ جھکڑ بارانی طوفان لائے، جس سے تمام درخت ٹنڈ منڈ ہو گئے۔

177۔یہ درخت سائے، پھولوں اور پھلوں سے محروم تھے۔اب ان پر پرندوں کی آمد و رفت نہ تھی۔برف اور کہر کی زیادتی سے پیدا ہونے والی تاریکی نے آسمان کو چھپا دیا تھا۔سڑکیں کٹ گئی تھیں۔مسافر دھند کے خوف سے سفر نہیں کرتے تھے۔خوشحال باغوں میں پھولوں کے جھنڈ کٹے ہوئے پیڑ کی طرح خشک تھے۔

178۔نوجوان عورتوں نے اپنے عاشقوں کو اپنی جھونپڑیوں میں چھوڑا (گرم موسم میں یہ جھونپڑے محبت کرنے کے لئے ناقص مواد سے تیار کئے جاتے ہیں) سردی کے خوف سے انہوں نے گرم گھروں میں آگ اور جائے پناہ تیار کی۔اندرونی کمرے میں صرف محبت کے کھیل کا مزہ تھا۔پارک میں درختوں کے نیچے سونا بالکل ترک ہو گیا تھا۔

179۔کچھ عورتوں نے موسموں کے بادشاہ بہار کی سالگرہ پر خیرات کی۔ان کے محبوب ان سے اظہار محبت کے لئے ان کے بستروں پر گئے۔مسافر میں اس وقت سے اپنے بستر پر تنہا محبت سے مغلوب پڑی تھی۔تب میں نے اپنے دل کو پیام بر بنا کر اپنے محبوب کے پاس بھیجا۔

180۔میرا خیال تھا یہ میرے محبوب کو واپس لے آئے گا اور مجھے خوشی دے گا۔میں نے یہ نہ سمجھا کہ میرا بے وفا وحشی

دل بھی مجھے چھوڑ دے گا۔ میرا محبوب واپس نہ آیا۔ اس نے صرف پیام بر کو رکھا اور خود وہیں رہا۔ سچ پوچھو تو میرا دل غم کے بوجھ سے بھر کر کناروں سے چھلک گیا تھا۔

181۔ اپنے محبوب سے رابطے کے ذریعے نفع تلاش کرتے میں اپنا سرمایہ ہار گئی۔ مسافر سنو! ماتم کرتے ہوئے میں نے یہ واستو پڑھی۔

182۔ بہت زیادہ دکھی ہو کر میں نے سوچا کہ میں اپنا دل پیغام بر کے طور پر بھیج چکی ہوں۔ یہ میرے خاوند کو نہیں لایا بلکہ اس جگہ سے وابستہ ہو گیا ہے۔ جونہی میں نے اپنے ذہن میں یہ سوچا کہ محبوب کے ساتھ گھومنے کی خواہش میں میں اپنا پیارا دل بھی کھو چکی ہوں۔ رات دن میں روشن ہوئی۔ میں اس نتیجے سے مایوس ہوئی۔ اپنے تصورات میں میں پچھتائی۔ اپنے آپ سے کہا یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں نے اپنا دل دیا لیکن اپنا محبوب نہ لیا۔ ایک کہاوت تھی۔ جو کسی نے کہی ''گدھی اپنے سینگ لینے گئی اور ملاحظہ کروا پنے کان بھی کھو بیٹھی۔

موسم بہار کے بیان میں:

183۔ موسم سرما جس نے جنگل کی گھاس کو خشک کیا، چلا گیا تھا۔ تب خوشیوں سے بھر اَمدَ ہ مہینہ آیا۔ ملایا کے پہاڑوں کی ہوا باقاعدگی سے چلتی تھی، اور وہ جو اپنے عاشقوں سے جدا تھی محبت کی آگ ان کے دل میں زیادہ شدت سے جلتی تھی۔

184۔ کیتکی درخت نے اپنے کھلنے کا حسین نظارہ پیش کیا۔ جب یہ بہار پر ہوتا ہے تو یہ ہر طرف اپنی ہریالی سے مسرت بخشتا ہے۔ اس پر مختلف رنگوں کے نئے شگوفے اور پتے تھے۔ نئے جھیلوں پر مچھلی کا شکار خاص طور پر اپنی طرف بلاتا تھا۔

185۔ انتہائی دلکش مختلف رنگوں کے ٹکڑوں کے لباس میں ملبوس، سفید گہرے اور سرخ پھولوں کی چادروں میں لپٹی ہوئی دوست خواتین جب ایک دوسرے سے ملیں تو ایک دوسرے کے جسم کو مختلف خوشبوؤں سے معطر کیا۔ وہ مسلسل گیت گا رہی تھیں۔

186۔ جیسے ہی ماتم زدہ سرما سورج کی حدت سے رخصت ہوا۔ ان کی چولیوں سے عطر کی خوشبو آنے لگی تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے اپنی پیاری دوست خواتین کی محبت میں ایک لنکوڈ کا نظم پڑھی۔

187۔ ناقابل برداشت موسم گرما گزرا جبکہ میں نے موسم برسات کی خواہش کی۔ موسم خزاں زیادہ بدنصیبی کے ساتھ گزرا اور میں موسم سرما میں پہنچ گئی۔ روتے ہوئے میں نے کسی نہ کسی طرح اس ناخوشگوار ٹھنڈے لمس سے نجات پائی۔ میں اپنے شوہر کو یاد کرتے ہوئے تکلیف کے ساتھ موسم بہار گزار رہی ہوں۔

188۔ یہ ایسے تھا جیسے نئی شاخوں نے ہاتھ بن کر بہار کی دیوی کو اٹھا لیا تھا شہد کی مکھی بھنبھناہٹ کا شور پیدا کر رہی تھی۔ کیتکی پھولوں میں موجود شہد اور خوشبو کے لالچ میں وہ جنگل میں تیزی کے ساتھ آتی جاتی۔

189۔شہد کی مکھیاں ایک دوسری کو ڈنک مارتی تھیں، جب وہ درختوں سے رس چوستی ہیں تو کانٹوں کی تیز نوکوں کی پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ایک خوشی کے خواہش مند عاشق کا جسم اس کی لذت کے لئے مجنونانہ خواہش میں آوارہ ہے۔وہ اس کی محبت کے ساتھ احمقانہ لگاؤ کی وجہ سے اپنے گناہ کا حساب نہیں رکھتا۔

190۔موسم بہار کو دیکھ کر میرے ذہن میں پریشانی افزوں ہوئی۔سو مسافر میں نے ایک رینہ نظم پڑھی۔

191۔جدائی کی جلتی آگ میں تند شعلوں سے بھرا ہوا محبت کا دیوتا دہاڑ رہا ہے، ایک لہر ہے۔ایک مدہم روشنی کا ڈھیر ہے جب کوئی اسے برداشت کر لیتا ہے۔جسے برداشت کرنا مشکل ہو؟ جس کا عبور کرنا مشکل ہے کہ خوف میں سے شمار کیا جاتا ہے، پھر کیوں میری محبت کے قلعے کو بغیر خوف کے بیچا گیا ہے؟

191۔کالے بادلوں میں کمشکا (درخت) خون کی بارش تھے۔پلاشا (درخت) واقعی اپنے نام کی طرح گوشت خور دیوبنے دکھائی دیتے تھے۔آندھی کی وجہ سے اور تمام چیزوں کو برادشت کرنا مشکل ہو گیا۔سہانجنا (درخت) نے اپنے خوبصورت سرخ رنگ کے باوجود ناشاد کیا۔

192۔جب انہوں نے اپنے کثیر زر گل سے زمین کو پیلا اور سرخ بنایا تو نئے شگوفوں کے کھلنے نے مجھے زیادہ پریشان کیا ایک خوشگوار ٹھنڈی ہوا چلی۔جس نے زمین کو ٹھنڈا کیا لیکن اس نے میرے لئے ٹھنڈ پیدا نہ کی۔سچ یہ ہے اس نے میرا گلا گھونٹ دیا۔

193۔وہ درخت جس کو لوگ غلط نام سے پکارتے ہیں۔اشوکا کہ یہ غم سے آزاد ہے۔اس نے نیم لمحے کو بھی میرے دکھ کو کم نہ کیا۔محبت کے دیوتا کی گستاخی سے میں اپنے جسم کے اندر زخمی ہو گئی تھی۔یہ بات حتمی ہے کہ میرا شوہر ہی میرا یقینی مددگار ہے۔نہ کہ شہکارا (ساتھی = آم) کا درخت۔

194۔یہ موقع ملنے پر جدائی کا خوف میرے دل میں بڑھ گیا۔میں نے مور کی پکار سنی۔جب وہ محو رقص ہوا۔مسافر سنو! ایک مائی روبولان کے درخت کی شاخ پر مور کو بیٹھا دیکھ کر دوگا تھا میں نے گایا۔

195۔سوگوار مورنیوں کو دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے اور میں خوش ہوتی ہوں جب رقص کرتے ہوئے مور کی دم پھیل جاتی ہے۔میں دوبارہ دکھی ہوتی ہوں جب نئے درختوں کے سراب کو آسمان کی طرف اٹھتا دیکھتی ہوں کہ یہ بادلوں سے گلے مل سکتے ہیں۔

196۔یہ گاتھا گاتے ہوئے میں روتے روتے چونکی جب میں نے اپنے دل میں دکھوں کو جمع کیا کہ آخر کار یہ کب ختم ہوں گے۔جدائی کی آگ کے شعلے میرے اعضاء پر بھڑک اٹھے۔میرے جسم کو محبت کے دیوتا نے اپنے تیروں سے نقصان پہنچایا تھا۔

197۔میں نے جانا کہ اس موسم کو برداشت کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا موت کے دیوتا کے پھندے کو۔چنے ہوئے پھولوں کے کھلنے کی خواہش نے ہر طرف خوبصورتی بکھیر دی۔آم کے درخت، گھنے ہوئے اور بغیر خلا کے

آسمان تک بلند ہوئے۔ موسم بہار کے شروع ہوتے ہی نئے شگوفے نکلے۔

198۔ تب سُر تکا درخت کی بلندی میں کالے رنگ کے پرندوں نے جذبات کی تمام اقسام کا مظاہرہ اس طرح کیا جیسے ھرت کا رقاص کرتا ہے۔ سب موسموں سے زیادہ مست کن موسم بہار آ چکا تھا۔ شہد کی مکھیوں نے میٹھی آواز نکالی۔

199۔ پھر طوطے محبت کے ساتھ اپنے گھونسلے بناتے ہیں۔ پنّو کا پرندہ نرم آواز نکالتا ہے آہ! میں مشکل کے ساتھ ایک تکلیف دہ زندگی کو برداشت کر رہی ہوں۔ زندگی جس پر ایسی محبت کی حکمرانی ہے۔

200۔ وہ جس کے جسم کو بادل مغموم کر دیتے ہیں۔ اسے زیادہ عرصہ پانی سے نہیں بھرا جاتا۔ پھر کلا کی نرم آواز کو کیسے برداشت کیا جاتا۔ خوبصورت عورتوں کے گروہ گلیوں میں شہنائیوں کی آواز کے ساتھ سیر کرتے ہیں۔ لوگوں نے تینوں دنیاؤں کو بہرا بنا دیا۔

201۔ بے مثال موسم بہار کے دنوں میں گروگیری (نغمہ وسرود کا جلسہ) کا تہوار منایا جاتا ہے۔ ان گنت ہاروں سے لدی عورتیں جنہوں نے جھن جھن کی آواز پیدا کرنے کے لئے اپنے کمر بند میں گھنٹیاں باندھ رکھی ہیں رقص، گیت اور دُھن تخلیق کر کے پیش کرتی ہیں۔

202۔ لڑکیاں گپ شپ کرتی ہیں اور انہوں نے وہ گا تھا سنا جسے تازہ نوجوان عورتوں نے گایا جو کہ اپنے عاشقوں کی خواہش مند تھیں۔

203۔ ایسے موقع پر جب عوام نے اپنے جذبے سے تہواروں کو ممتاز کیا تو محبت کے دیوتا نے پورا ترکش میرے دل میں اتار دیا۔

204۔ مسافر اگر چہ میں نے بولتے ہوئے شائستگی کو برقرار نہیں رکھا کیونکہ میں بہت زیادہ غم میں مبتلا ہوں۔ جدائی کی آگ میں جلی ایک تنہا خاتون لیکن تم اس سے سخت لہجے میں بات نہ کرنا بلکہ اس سے نرم انداز میں براہِ راست مخاطب ہونا۔ ایسے انداز سے بات کرنا کہ ناراض نہ ہو جائے جو مناسب ہو تو اس سے کہنا۔ دلکش عورت نے مسافر کو دعا دی اور اسے اجازت دی کہ وہ چلا جائے۔

205۔ مسافر کو رخصت کر چکنے کے بعد لمبی آنکھوں والی خاتون تیزی سے مڑی۔ اسی لمحے جب اس نے جنوب کی طرف دیکھا تو اچانک اپنے بہت قریب سفر سے واپس لوٹے شوہر کو دیکھا۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ ایک عظیم نعمت غیر متوقع طور پر اسے حاصل ہو گئی تھی۔ بس جو لوگ بھی اس نظم کو گائیں اور پڑھیں خدا کرے کامیاب ہوں۔ تعریف اس خدا کی جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔

علی حیدر ملتانی کا سیاست نامہ:

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مغل راج تیزی سے زوال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ 1707ء میں اورنگ

زیب کی وفات کے بعد دہلی کا تخت کانپنے لگا۔ مرہٹے، نادر شاہ اور احمد شاہ جیسی قوتوں نے دھما چوکڑی مچا دی۔ شفقت تنویر مرزا کے لفظوں میں:

''ادھر علی حیدر اپنے چونترہ میں بیٹھا زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔۔۔ نادر شاہ نے حملہ کیا تو اس حملے کی مذمت علی حیدر، بلھے شاہ، نجابت ہرل اور بعد میں وارث شاہ وغیرہ نے بھی کی۔ علی حیدر دہلی کی سیاست پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

ب بھی زہر جو کھا مرن کجھ شرم نہ ہندوستانیاں نوں
کہیا حیا ایہناں راجیاں نوں کجھ لج نہیں تورانیاں نوں
بھیڑے بھر بھر دیون خزانے فارسیاں نوں خراسانیاں نوں
وچ چھونیاں دے پانی تک بڈھو، جے لہو نہ وڈیاں پانیاں نوں
ہکے تال کھا کٹاری مرو جے سکھو مار ایرانیاں نوں
ڈارھیاں چا منایاں اکھیوں کشف اے اہناں زنانیاں نوں
تو پچیاں زنبورچیاں نوں برقندازاں بانیاں نوں
اہناں بانکیاں ٹیڑھیاں ڈنگیاں نوں انہاں ترکیاں آکڑ خانیاں نوں
نوک بنداں دکھنی جامے بانکے تے پوش کمانیاں نوں
انہاں پلٹھی بازاں نوں انہاں فیل قداں افغانیاں نوں
انہاں تیتیاں کشتی گیراں نوں انہاں تیر انداز کمانیاں نوں
حیدر آکھ انہاں ہیجڑیاں نوں حیزاں نامردانیاں نوں

(ترجمہ: ان ہندوستانیوں کو کچھ غیرت حیا نہیں انہیں تو زہر کھا کر مر جانا چاہیے۔ یہ اپنے ملک کا خزانہ از خود فارس اور خراسان کے لوگوں کو پیش کر رہے ہیں۔ اس صورت حال میں انہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ اگر تم ایرانیوں کو نہیں مار سکتے تو خود مر جاؤ۔ ڈاڑھیاں منڈھانے کے بعد ان کی صورت بھی عورتوں جیسی ہو گئی ہے۔ ان توپ چلانے والوں اور اسلحہ برداروں کو کیا ہوا۔ یہ ترکی، افغانی اور بانکا گیروں اور ماہر تیر اندازوں کو کیا ہوا، (جو خود کو ہندوستان کا وارث سمجھتے ہیں لیکن حملہ آوروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔) اے حیدر! ان خسروں اور نامردوں کو غیرت دلاؤ)

علی حیدر انتہائی تلخ لہجے میں اس عہد کے سیاسی بحرانوں اور دہلی کے حکمران طبقوں پر برستا ہے۔ ان کا یہ انداز ایک سچے محب وطن کا کردار نظر آتا ہے۔

علی حیدر 1690ء میں اورنگ زیب کے عہد میں پیدا ہوئے۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو آپ کی

عمر سترہ برس تھی۔ اپنی پچانوے سالہ عمر کے دوران علی حیدر نے پندرہ بادشاہوں کو آتے جاتے، قتل ہوتے اور بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہوتے دیکھا۔

علی حیدر تعلیم کے حصول کے لئے دہلی گئے اور خواجہ فخر الدین سے دینی ودنیاوی علوم سیکھے۔ تحصیل علم کے بعد چونترہ واپس آ گئے۔ آپ خاندان، قاضیاں سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے رہنے کے لئے ایک نئی بستی آباد کی، جو بیٹے میاں غالب کے نام پر معنون تھی۔ بیٹا ایک بڑا عالم دین تھا۔

علی حیدر کا قیام ساندل بار کے علاقہ میں تھا۔ جہاں بیٹھ کر انہوں نے حاکموں کے طرز حکمرانی پر تنقید کی۔ (8)

سکھ، انگریز اور سرائیکی وسیب:

انیسویں صدی سرائیکی وسیب پر بھاری گزری۔ حقیقت یہ ہے کہ سکندر مقدونی سے منگولوں تک اور بعد ازاں منگولوں سے سکھوں اور انگریزوں تک ملتانی صدیوں اپنی پہچان کی جنگ لڑتے رہے۔ انیسویں صدی میں انگریز، سکھ، کابل، دہلی اور کئی دوسری قوتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ شفقت تنویر مرزا کے لفظوں میں "ایمن آباد، وزیر آباد اور اکال گڑھ یا علی پور کے دیوانوں کی شہرت چہار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ رنجیت سنگھ کے دربار سے منسلک تھے تو دوسری جانب کشمیر کے ڈوگروں کے ملازم تھے۔ وہاں سے خوب مال کمایا اور ایمن آباد، وزیر آباد، گوجرانوالہ میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور محلات تعمیر کئے۔

علی پور اکال گڑھ میں بھی دیوان آباد تھے۔ ان دیوانوں کا راجہ رنجیت سنگھ سے گہرا تعلق تھا۔۔۔ پہلا دیوان ساون مل اور دوسرا مول راج۔ ملتان والا نواب مظفر خان مغلوں کی سرپرستی سے نکل کر کابل والوں کا باجگزار بن چکا تھا۔ رنجیت سنگھ کابل اور دہلی دونوں کا دشمن تھا۔ اسی طرح دہلی اور کابل والے بھی رنجیت سنگھ کے دشمن تھے۔ ملتان میں کھڑک سنگھ نے نواب مظفر خان کو للکارا۔ قصور والے قطب الدین خان نے مظفر خان کو سمجھایا بجھایا مگر نواب نہ سمجھا۔

پھر علی پور اکال گڑھ کا ساون مل ملتان صوبہ کا صوبیدار بنا۔۔۔ اس نے لاہور دربار کو وہ رقم دینا منظور کر لی جو مظفر خان دینے سے انکاری تھا۔ انگریز لکھتے ہیں دیوان ساون مل نے اتمام حجت کیا اور کہا جو کاشت کرے وہی کھائے۔ فرمان جاری ہوا، جو کسان زمین کاشت نہیں کرے گا یعنی جو غیر حاضر زمیندار رہنا چاہتا ہے خواہ وہ مسلمان، ہندو یا سکھ ہو، اس سے زمین واپس لے لی جائے۔ زمینداروں کو زرعی قرضے بھی جاری کئے گئے۔

ساون مل کی دفات کے بعد مول راج 1844ء میں ملتان کا صوبہ دار بنا۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب سکھ دربار میں رانی جنداں، سرلال سنگھ، راجہ گلاب سنگھ نے ملی بھگت کے ساتھ سکھ عوام کا قتل عام کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز لاہور آن بیٹھا۔۔۔ مول راج نے انگریزوں سے نباہ کرنے کی کوشش کی مگر بات نہ بنی اور استعفیٰ دے دیا۔

شجاع آباد کا سوبھا بلوچ ملتان یا مولراج دی وار یا مولے دی وار میں لکھتا ہے۔۔۔ انگریز مولراج سے

ملتان کا انتظام سنبھالنے کے لئے آیا۔ مولراج نے اسے ملتان کی سیر کروائی۔ دوران سیر انگریز نے پوچھا یہ گنبد کیسے ہیں؟

آکھینس ایہ ہن خانقاہاں پیراں دیاں جھاں ہے ملتان بنایا

گیا ہے خاک چمیند اہر کوئی جو صوبہ اتھے آیا

(کہنے لگا یہ پیروں کی خانقاہیں ہیں جنہوں نے ملتان شہر کو آباد کیا تھا۔ جو بھی یہاں آیا وہ اس مٹی کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر گیا ہے)

انگریز کہنے لگا میں یہ گنبد ہی گرادوں گا۔

آکھیس خاک ای خام کریساں گنبد، جو میں ہل گرز چلایا۔

انگریز کو کسی نے نیزہ مار کر زخمی کر دیا۔ مستعفی صوبہ دار مول راج بھی اڑ گیا۔۔۔ ملتان میں انگریز اور مولراج کی لڑائی ہوئی۔ جو پنجاب میں انگریزوں کی سب سے لمبی لڑائی تھی۔ انگریز فوج لاہور سے دریائے راوی کے راستے کشتیوں پر پہنچی۔ 23 اپریل کو جنگ شروع ہوئی، آٹھ مہینے جاری رہی۔ 1849ء کی پہلی جنوری کو مولراج کا بارود خانہ تباہ ہوا تو اس نے شکست تسلیم کر لی۔ سوبھا شجاع آبادی اپنی وار میں انگریزوں کا ساتھ دیتا ہے مولراج کی زبانی کہتا ہے:

گولے گردمریساں گردوں

جے تھائیں سیٹ بچایا

ہندو سکھ توپاں دے اُتے بدھ کر کر آیا

نواب مظفر خان کا لوک بیانیہ:

دیوان مولراج نے کافی ہمت دکھائی مگر شکست مقدر ٹھہری، اسے قید کر لیا گیا، کلکتہ لے جایا جا رہا تھا کہ بنارس کے قریب موت آ گئی مگر ملتان کی لڑائی جاری رہی لیکن سوبھا شجاع آبادی کی زبانی اس جنگ کا احوال سننے سے پہلے ہم نواب مظفر کی بات کریں گے جس نے سکھوں کو للکارا تھا۔ مظفر خان دی وار دلپت رائے نے لکھی:

خدا سچا ہے وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور وہ پلک جھپکنے میں کرتا ہے۔ رنجیت سنگھ نے جلدی سے ملتان کی طرف فوجیں بڑھائیں اور سکھ سنتوں نے کہا کہ وہ خالصہ کا بادشاہ ہے۔ بگل شہنائیاں ترم جوگیوں والی بین، سُورے اور گھوڑیوں کا شور وغل ہے اور بین سے مینڈک کے ٹرانے کی آواز آتی ہے۔ تمام لوگ حوصلے چھوڑ گئے لیکن نواب مظفر ڈٹا رہا اور اس کی تعریف چاروانگ عالم میں ہوئی۔

"کاتک کے مہینے میں فوج کشی ہوئی، سپاہیوں، شاہی ہاتھیوں اور گھوڑوں کی دھکم پیل سے جو گرد اٹھی اس سے چاند سورج چھپ گئے۔ اس فوج کشی سے اور لشکر کے رعب سے دریائے راوی اور بیاس سہم گئے۔ جہلم اور

چناب خاموش ہو گئے دریائے سندھ خوف سے کانپنے لگا۔ تیرا کا شہر روہتاس اور اٹک کے قلعے سیالکوٹ، بھمبر، گجرات، پونچھ، تمام دہشت زدہ تھے۔ تمام لوگ حوصلے چھوڑ گئے لیکن نواب مظفر ڈٹا رہا اور اس کی تعریف چاردانگ عالم میں ہوئی۔

وادی کلّو کانپی، جمنا دریا تباہ ہو گیا۔ شہر متھرا لرز اٹھا۔ کلکتہ کو کسی طرح مطمئن کر کے خاموش کر دیا گیا ہے۔ پہلے چونیاں اور قصور فتح کیے۔ جس پر قصور کے تمام پٹھان مل کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سلام پر آئے او اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد اندر راد یوی کے بادلوں کی طرح بے شمار فوج نے ملتان شہر و قلعہ کو گھیر لیا اور اس کے تمام راستے مسدود کر دیئے تمام لوگ حوصلہ چھوڑ گئے لیکن نواب مظفر ڈٹا رہا اور اس کی تعریف چاردانگ عالم میں ہوئی۔۔

جب کھڑک سنگھ بادلوں کی طرح بے شمار فوج لے کر بڑھا تو زمین کانپنے لگی اور پہاڑ لرز اٹھے۔ اس وقت نواب قطب الدین خان قصور یہ والئی ممدوٹ مہاراجہ کی طرف سے سفیر بن کر نواب مظفر خان کے پاس آیا اور گھٹنے ٹیک کر ہتھیار ڈالنے کی استدعا کی تو اس وقت نواب مظفر خان نے کہا کہ اور قطب الدین پٹھان مجھے ایسی باتیں نہ کہو اپنے قلعہ کو اور تلوار کو دشمن کو دے دینا اچھے ادمیوں کا کام نہیں ہوتا، تمام لوگ حوصلے چھوڑ گئے۔ لیکن نواب مظفر ڈٹا رہا اور اس کی تعریف چاردانگ عالم میں ہوئی۔

''چوہدری غلام غوث مہاراجہ کا درباری نواب مظفر خان کے پاس اس کی کچہری میں حاضر ہوا اور اسے تخلیہ میں سمجھایا کہ مہاراجہ کی ہندو مسلمان سب عزت کرتے ہیں۔ اس کی طاقت کا اندازہ کرو اور اطاعت قبول کرو۔ نواب مظفر نے جواب دیا کہ میرا نام مظفر ہے یعنی ظفریاب ہونے والا، فتح پانے والا۔ مجھے میرے بھائی یعنی ہم قوم احمد شاہ بادشاہ کابل نے صوبہ دار بنایا ہے اور اختیار دیا ہے۔

میں پٹھان ہوں میں سکھوں کو سلام نہیں کر سکتا۔ میرا دل اپنی تلوار استعمال کرنے کو چاہتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں خزانے کھڑک سنگھ کے حکم پر خرچ ہو رہے ہیں۔ آخر کار ملتان خدا کے حکم سے سرنگوں ہو گیا۔ (یعنی جب سکھ قلعے میں داخل ہوئے) اور مظفر خان نے سنا تو وہ دروازہ کی طرف لپکا۔ تمام لوگ حوصلے چھوڑ گئے۔ لیکن نواب مظفر ڈٹا رہا اور اس کی تعریف چاردانگ عالم میں ہوئی۔

''پٹھان یعنی مظفر خان نے اپنی تلوار پکڑی اور سکھوں کے لشکر پر حملہ آور ہو گیا اور سروں کے انبار اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے ہر طرف لاشیں ہی لاشیں میدان جنگ میں پھیلا دیں اس کی لڑکی نے تلوار پکڑی برقعہ پہن کر منہ چھپائے خوب تلواریں چلائیں خون کے دریا ایسے بہے اور بڑے لوگ کانپنے لگے۔ تمام لوگ حوصلے چھوڑ گئے۔ لیکن نواب مظفر ڈٹا رہا اور اس کی تعریف چاردانگ عالم میں ہوئی۔

پھر دلپت رائے کہتا ہے کہ خدا کی درگاہ جس کی امداد کرتی ہے اس کی فتح ہوتی ہے۔''(10)

دیوان مولراج اور انگریزوں کے معرکے کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ سوبھے دی وار'' یا مولے دی

وار'' مولراج اہل ملتان کی بجائے انگریزوں کی طرفداری کرتی ہے لیکن انگریزوں کی تائید وحمایت کے باوجود یہ وار بہت کچھ سامنے لاتی ہے۔

''انگریزوں نے پورا زور لگا کر
ملتان پر دھاوا بول دیا
مولا بڑی انکساری کے ساتھ حاضر ہوا
وہ انگریزوں کے پاس آیا عاجزی کے ساتھ
انگریز نے اس سے کہا دیوان
ہماری بات سنو
پنجاب میں سارے گورنروں کو
انگریزوں نے ہٹا دیا ہے
اپنی ساری فوج لے کر الگ
ہو جاؤ، اس ملک کو چھوڑ دو
جواب میں کہا ایک لحہ تامل کیے بغیر
آپ کا حکم منظور
انگریزوں نے حکم دیا کہ ہمیں
شہر کا دورہ کرایا جائے
انگریزوں نے خانقاہیں دیکھیں اور
مولے سے پوچھا
یہ گنبد کن کی نشانیاں ہیں
کن لوگوں نے یہ عمارتیں بنائیں
کہنے لگا'' یہ پیروں کے مزار ہیں
انہی کے دم سے ملتان آباد ہے
جو جو گورنر یہاں آیا ہے اس نے
انہی خانقاہوں کی خاک کو چوما ہے۔''
انگریز نے کہا، میں انہیں خاک میں ملا دوں گا
صرف ایک گرز چلانے کی دیر ہے

دیوان ایک اعلیٰ گھوڑے پر سوار تھا
اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو
انگریز نے چابک مارنی چاہی
مُولے نے گھوڑا دوڑایا
اتنے میں ایک سپاہی نے انگریز کو
برچھی ماری اور پھر بھاگتا نظر نہیں آیا
انگریز زخمی ہوگیا اور اسے اٹھا کر ڈیرے پر لے گیا
دیوان، گھر (قلعے) میں آگیا
اس نے اپنے سارے افسر اور صلاح کار بلائے
اس نے بڑے دکھ سے کہا، مجھے
اچھا مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہئے
اب شیروں سے دشمنی ہوگئی ہے
میرے ہاتھوں سے حالات کی ڈور نکل گئی ہے
اب وہ وقت واپس نہیں آئے گا
افسروں نے بیک آواز مشورہ دیا
دیوان کو سمجھایا
تیرے پاس بڑے خزانے ہیں
جو کبھی کم نہ ہوں گے
تیرا گھر ہے، قلعہ ہے، شہر ہے
ان کے ہوتے ہتھیار نہ ڈال
گورکھے سپاہی بھی ہمارے ساتھ آملے ہیں
اور روہیلے (روہی کے رہنے والے) نے بھی
ساتھ دینے کا عہد کیا
توپ خانہ ہندوؤں اور سکھوں کے
پاس ہے انہوں نے بھی کمر باندھ لی ہے
ہم چاروں طرف سے گولے پھینکیں گے

اور اس وقت تک جب تک دم میں دم ہے
مُولا نے بہت پہلے ہی تیاریاں
شروع کر رکھی ہیں
ہمارے پاس اسلحہ بھی ہے لوہا اور پتھر اور خزانہ بھی
ان کا کوئی شمار قطار ہی نہیں
آٹے، گھی، مٹھائی وغیرہ اشیا بھاری
مقدار میں اکٹھی کر لی ہیں
اس نے فوج کو حکم جاری کر دیا ہے
اور فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا ہے
یہ حال سن سن کر سپاہی بھرتی کے لئے آرہے ہیں
گویا عزرائیل انہیں گھیر گھار کر لے آیا ہے
لوگوں میں جوش پیدا ہو گیا ہے
مگر انہیں یاد نہیں رہا کہ انگریز کتنی بڑی طاقت ہے
آخر میں ان کی فوج ہار کر بکھر گئی ہے
انہوں نے تو خود اپنے سردار کو مروا دیا ہے
گرفتار ہونے والے سپاہیوں نے معافی مانگی
یا انگریز کی فوج میں نوکری کر لی
چاروں طرف پیغام بھجوائے
کلکتہ (ہیڈکوارٹر) کو بھی اطلاع کر دی گئی
جنگ کی خبریں سن کر انگریز پریشان تھا
مگر جب پیغام فتح پڑھا تو خوش ہوا
کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ دھوتی پوش
کراڑ (بنئے) بھی لڑیں گے
تم نے بغاوت کر کے بادشاہ کو ناراض کر لیا ہے
اور ملک میں فساد پھیلا دیا ہے
چاروں طرف خط اور خبریں بھیج دی گئیں

سارے ملکوں کو حال حقیقت معلوم ہوگئی ہے
انگریزوں نے جو خط خان (بہاولپور) کو
لکھا اس نے چوما اور حکم بجالایا
حکومت نے تمام نوابوں، سرداروں کو مدد کے لئے
بلایا، اور جاگیریں دینے کا وعدہ کیا
نواب (خان) نے بڑا لشکر اکٹھا کیا
اور جنگ کی تیاری پر بڑا پیسہ خرچ کیا
تمنداروں کو اکٹھا کیا گیا اور انہیں
ساتھ دینے کے لئے کہا گیا
خان (نواب) نے جو جو کہا اور مانگا
وہ پیش کر دیا گیا
اس نے اپنی فوج کا بخشی (کمانڈر)
فتح محمد کو مقرر کر دیا
خان صاحب نے فرمایا کہ 27 تاریخ کو
لشکر دریا عبور کر کے ملتان کی طرف ہولے
دریا کے سارے ملاحوں کو حکم ہوا کہ
وہ کشتیاں تیار رکھیں
انگریز کی حمایت میں
پیر ابراہیم بھی آ گیا۔
خان نے اس طرف سے
سرور شاہ پیر کو بھی بلالیا
وہ بڑا زبردست آدمی تھا
جس سے شیر بھی ڈرا کرتے تھے
شک نہ تھا کہ وہ انگریزوں
سے لڑنے سے گریز نہیں کرے گا
علی پور اور ٹبی میدان میں جنگ ہوئی

جس میں وہ شہید ہو گیا
اس نے موت کو خندہ پیشانی
کے ساتھ قبول کر لیا
پھر وہ چل پڑے اور پھر
گیون میں پہنچ کر انہوں نے پڑاؤ ڈالا
توپوں کے چلنے سے ہر طرف غبار ہی
غبار، جنگ شجاع آباد تک پہنچ گئی
شجاع آباد کے بنیوں (ہندوؤں) کو
پریشانی ہوئی کہ داؤد پوترا بڑھتا آرہا ہے
موہن بھاگ کر ملتان گیا اور
وہاں سے فوج کو بلا لیا
اس نے کہا کہ اگر شجاع آباد بچا
لیا گیا تو میں آپ کو مالا مال کر دوں گا
رام رکھیا اور جوہر سنگھ مختاروں
کو پیغام دے کر بھیجا گیا
اگر انہیں لڑائی کرنی ہے تو کوٹ (شجاع آباد)
سے دور جا کر لڑیں
سکھوں کا لشکر چل پڑا ہے اور
کوٹ حسن تک پہنچ گیا ہے
پھر گیجا نے (خان کی فوج) کو خبر دی
رات انہوں نے
سکھوں پر توپیں چلا دیں
فوج نقارے بجاتی گیون سے
آگے روانہ ہوئی
دین کا نقارہ بج رہا ہے اور
سب ملکوں میں یہ سنا جا رہا ہے

(سکھ) ان علاقوں سے قطعی ناواقف
تھے۔ مالک نے انہیں اس علاقے میں بھیجا
ایک شخص بخاری نے انہیں غلط راستے
پر ڈال دیا اور وہ ویرانے میں پھنس گئے
ایک تو دھوپ میں ان کے ملائم جسم جل رہے ہیں
دوسرے وہاں پانی ہی کوئی نہیں
وہ توپوں کی زد میں آ گئے، چاروں
طرف غبار ہی غبار ہے
ایک تو دن ہی تانبے کی طرح تپ رہا ہے
اس پر توپوں کی گرمی نے انہیں اور پریشان کر دیا ہے
اس پر آپس میں بھی جھگڑے ہونے لگے
اور موت کا فرشتہ بھی پہنچ گیا
وہ کون سے باغوں کے پنچھی تھے؟
کہاں انہوں نے جنم لیا کہاں جوان ہوئے؟
پھر انہیں موت بھی پردیس میں آ گئی
ان کے جسم کے ٹکڑے بری طرح بکھرے
اور جنگ میں بے گور و کفن پڑے رہے
وہ بے بس ہو گئے اور ان پر وہ گزر گئی
جس کا انہیں خواب خیال بھی نہ تھا
یہ انگریز ایڈورڈز کی خوبی کہ
وہ دور دراز سے لڑتا بھڑتا یہاں پہنچ گیا
ایڈورڈز نے ٹوانوں پر فتح پائی اور
انہیں ساتھ ملایا، سیالوں کو بھی مات دے دی
ڈیرہ غازی خان والے اس کا مقابلہ نہ کر سکے
اور اس کی دہشت سنگھر تک پہنچ گئی
جب اس نے توپوں کی آوازیں سنی

تو بڑی تیزی سے دریا عبور کر کے آیا
اس نے فوراً ہی سکھوں پر حملہ کر دیا
اور وہ بہت ہی بروقت حملہ آور ہوا
انہوں نے سکھوں کو چاروں طرف سے گھیر
لیا جیسے مچھلی جال میں پھنس جاتی ہے
وہ صدق دل کے ساتھ
میدان میں کودے اور
یقین کے ساتھ مورچے بنا لئے
توپ خانے پر فتح خان مامور تھا
اس نے کمر باندھ کر تیاری کی
اس نے بڑا نشانہ باندھ کر گولہ چلایا
جو دشمنوں کے توپ خانے کو جا لگا
سکھوں کی توپ ہی اڑا دی
اور گولہ انداز بھی مارا گیا
انصاف کی بات یہ ہے کہ سکھوں نے
بڑی بہادری سے مقابلہ کیا
انہوں نے بھی توپوں اور بندوقوں سے
بڑا کام لیا اور زبردست جنگ کی
پٹھان بھی ایسی جانفشانی سے لڑے
بلکہ ان پر بزدلی کی تہمت بھی نہ رہی
چانڈیئے بلوچوں نے بھی کمال تیاری سے لڑائی لڑی
اور میدان جنگ میں پورا پورا انصاف کیا
انہوں نے توپ خانے میں جا کر تلوار کے ایسے جوہر دکھائے
کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھے
داؤد پتروں نے بھی دشمن کو گویا
بھٹی میں دانوں کی طرح بھون کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اور ایسے جیسے بھیڑیا بھیڑوں کے ریوڑ
پر ٹوٹ پڑتا ہے اور انہیں بھاگنے کو راستہ نہیں ملتا
جب سکھوں کا لشکر شکست کھا کر بھاگنے لگا
تو کراڑوں پر موت کا خوف طاری ہو گیا
سکھوں کے راج میں ہم پر بہت عنایات ہوئیں
مگر اب جو انگریزوں کی خدمت میں حاضر ہوئے
ہیں، شاید قسمت اچھی ہو اور بچ جائیں
انہوں نے اپنے شہر کی چابی
انگریزوں کے حوالے کی
اور خود کو فاتحین کے حوالے کر دیا
اب وہ کوٹ (شجاع آباد) سے چل پڑے
اگلے پڑاؤ بڑے مشکل تھے
وہ ملتان تک پہنچے اور سورج کنڈ
میں قدم جمالئے
مُولا بھی ملتان سے باہر آ کر
خیمہ انداز ہو گیا
اس نے کہا میں آخری دم تک لڑوں گا
اس وقت اس نے ہاتھوں میں ہیرا پہن رکھا تھا
اس نے توپیں بندوقیں چلائیں
اور ہر داؤ آزمایا
بہت ہی بندے مارے گئے اور
سارے لوگوں کو قتل عام کی خبر ہو گئی
اس نے (مُولے نے) اپنے مورچے چھوڑے
اور قلعے کے اندر چلے گئے
اس کے بہت سے سردار کام آئے
اب میں کیا کیا ان کا نام گنواؤں

ان میں سے محمد دوے لےشاہ میر کا سر کاٹ

کر نواب بہاولپور نے مُولے کو بھیج دیا

اس نے کاغذ پر لکھ کر بھیجا کہ

کہ پیر جانی ہمارے ساتھ آن ملا

ہے پیر جانی نے خود

فرنگیوں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی

مدد کے لئے آرہا ہے

اس نے سبھی قبائل کو اکٹھا کیا

اور انہیں لڑائی لڑنے کے لئے بھیج دیا

اس نے ہزاروں اونٹ پورے ملک سے

اکٹھے کئے اور ان پر سامان لاد کر

انہیں سپاہیوں کے ساتھ بھیج دیا

بیل گاڑیوں پر جانوروں کی خوراک بھی رکھ دی

پھر اجناس بھی اتنی اکٹھی کر لیں کہ قحط سا پڑ گیا

آڑھتیوں کے تو دن پھر گئے اللہ کی طرف

سے ان کی اجناس کے نرخ ہی بہت بڑھ گئے

جس قادر نے اپنے کرم سے بارش برسائی ہے

وہی صاحب ہمارا رزق بھی بھیج دے گا

جرنیل نے سکھوں پر چڑھائی کر دی

اور لڑائی میں بڑی تیزی آ گئی

اس نے کہا کہ میں ان سکھوں کو

پلک جھپکارے میں تباہ کر کے رکھ دوں گا

ملتان پر چڑھائی کا سامان تو کر

لیا مگر اس میں زیادہ دن لگ گئے

انگریزوں کے حکم نامے پھر ہر جگہ پہنچا دیئے گئے

اردگرد کے حاکم اور سردار انگریزوں کا

حکم بجالاتے اور ضروری سامان فراہم کرتے
انہوں نے ساری پنجابی فوجیں پیچھے ہٹالیں
پھراس نے دریاؤں میں دخانی کشتیاں
اپنی حکمت کے ساتھ چلادیں
اب وہ شہر کے اور قریب پہنچ گئے اور
اس کو چاروں طرف سے گھیرلیا
اور پھر توپوں سے دن رات
گولہ باری شروع کردی
گولہ باری ایک پل کے لئے نہیں رکی
گولے قلعے پر بارش کی طرح برستے رہے
اور چاروں طرف گردوغبار اڑتا رہا
پھر گولے خانقاہوں پر گرنے لگے ان کا
نقصان ہونے لگا، یہی اللہ کی رضا تھی
ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور
مسلسل جاگنے سے سپاہیوں کی آنکھیں سرخ ہوگئیں تھیں
قرابینیں اور طمنچے چل رہے تھے
اور توپوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی
سپاہی آگے بڑھ بڑھ کر
برچھیاں اور لاٹھیاں چلاتے ہیں
پھر کار تقدیر بارود پھٹنے سے
مسجد بھی گر پڑی اور اس کی اینٹیں اڑاڑ کر دور جاپڑیں
گورے سپاہی بھی بڑی بہادری سے لڑتے تباہی مچاتے جاتے
آگے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے
دشمن پر یوں گرتے جیسے پتنگ کی جھوک
جو گوروں کے سامنے آگیا وہ نہ
چھپ سکا نہ بھاگ سکا، مارا گیا

اس لڑائی میں ملتان والے بھاگتے پھرے
کبھی یہاں کبھی وہاں
مُولے کے گرد گھیرا اور بھی تنگ ہو گیا
وہ صرف قلعے تک محدود ہو کر رہ گیا
اب مولے نے اپنے سارے بھائی بندوں کو
بلایا اور ساری فوج کو بھی
کہنے لگا ''میں نے پوری جان ماری ہے
مگر اب بے بس ہو گیا ہوں''
اب شکست کی گھڑی آن پہنچی ہے
اب بھلا کون کون میرا ساتھ دے گا؟''
اب سپاہیوں نے لڑنے سے صاف انکار کر دیا
اور اس اکیلے کے سر پر مصیبت آ گئی ہے
ان کافروں (ہندوؤں، سکھوں) میں یہ مشورہ
کیا گیا کہ اب انگریز سے ملنے کے علاوہ
اور کوئی چارہ نہیں
وہ انگریز کے سامنے مجرم بن کر
حاضر ہوئے اور اعتراف گناہ کے طور پر گلے
میں کپڑا ڈالا ہوا تھا
مجھ سے بڑی تقصیر بلکہ گناہ ہو گیا
اللہ کے نام پہ مجھے معاف کر دو
یہ ملک تیرا ہے یہ ملک تیرا ہے
تم ہی ان ملکوں کے مالک ہو
تم نے اگر مجھے قید سے بچا لیا تو
ساری عمر تمہاری بندگی کروں گا
جرنیل صاحب اور لیک صاحب نے پوچھا
''مولا! تم نے ہتھیار کیوں ڈالے؟

تمہیں تو لڑائی کرتے رہنا چاہئے تھا
کہنے لگا ''اب انگریز صاحبوں سے لڑائی زیب نہیں دیتی''
میرے امیروں وزیروں نے بلاوجہ
یہ آگ بھڑکا دی تھی
جرنیل نے مُولے کو اسی وقت قید کر دیا
اور پھر فرمایا
''جو کچھ مال خزانہ، دولت، جائیداد ہے
وہ سب کچھ ابھی دے دو''
کہنے لگا ''میں تو محض ایک
بے اختیار صوبیدار تھا ملک تو رنجیت سنگھ کا تھا
میں نے ٹھیکے (اجارے) پر لے رکھا تھا
میں اسے سال بسال ٹھیکہ پہنچا
دیا کرتا تھا۔ باقی جو آمدنی تھی
وہ ہتھیار بنانے پر صرف کی، اسلحہ بنانے
والے بڑے پیسے لیتے ہیں
سپاہیوں کے پاس جو کچھ سامان تھا
وہ تو یہاں ہی لٹا کر چلے گئے
کئی سپاہی مارے گئے کئی
زخمی ہوئے اور باقی لاپتہ ہو گئے
وہ روزی کمانے کے لئے آئے تھے
مگر موت کما کر چلے گئے''
اس نے (جرنیل) نے کہا ''تمہارے گناہ اور جرم
اتنے ہیں کہ تمہیں کسی صورت چھوڑا نہیں جا سکتا
بہرحال تیرے بارے میں لندن والوں کو لکھ کر بھیج دیا
وہاں سے جلد ہی جواب آ جائے گا
جو فیصلہ کمپنی لکھ کر بھیجے گی

مجھے اس کی کوئی خبر کوئی اندازہ نہیں
اس وقت کمپنی کی ساری توجہ ملتان پر ہے
وہ کوئی اچھی خبر کی آس لگائے بیٹھی ہے
کبھی کہتی ہے مُولے کو زندہ پکڑ کر
لاؤ اور ہمارے سامنے پیش کرو''
خدا نے دھوتی پوش کراڑوں کو تباہ کر دیا
خدا اب اہل کتاب کو لے آیا ہے
سخت گیر رب کا کھیل دیکھ،
بستیوں کی بستیاں اجڑ گئی ہیں
اب امن و امان کا ایسا زمانہ آیا ہے
کہ شیر اور گائے ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں
ملک پر جو کچھ بیت گیا ہے، سو بھا
اب وہ سب کچھ بیان کر دے

حوالہ جات:

1۔ ڈاکٹر روبینہ ترین، تاریخ، ادبیات ملتان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2012، 15-16

2۔ ایضاً، ص، 16

3۔ آرسی ٹمپل، حکایات، پنجاب، حصہ سوم، میاں عبدالرشید (ترجمہ) مجلس ترقی ادب، 1962، ص، 360

4۔ ایضاً، ص 360-361

5۔ ڈاکٹر انوار احمد (مرتب)، عبدالرحمٰن ملتانی کی نظم ''سندیس راسک''، مترجم، پروفیسر سید اصغر علی شاہ، نازیہ بخاری، شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، 2007، ص 12

6۔ ایضاً، ص، 28-29

7۔ ایضاً، ص، 143-179

8۔ شفقت تنویر مرزا، (تالیف و ترجمہ) ڈسٹرکٹ گزیٹیرز، ملتان ڈویژن، مشعل، لاہور، ص، 156-157

9۔ ایضاً، ص، 238 - 239

10۔ عمر کمال خان، ملتانی واراں، بزمِ ثقافت، ملتان، س۔ن، ص، 19-27

11۔ شفقت تنویر میرزا، (تالیف و ترجمہ) ڈسٹرکٹ گزیٹیرز، ملتان ڈویژن، مشعل، لاہور، ص 153-166

ساتواں باب

آزاد جموں و کشمیر کا لوک بیانیہ

1۔ لسانی تناظر

2۔ کش میر کا لوک بیانیہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

لل دید، للیشوری، لِلہ عارفہ

حبہ خاتون۔ لالہ رُخ، ہمن برے

گہ نندن۔ ایک لوک بیانیہ

لڈی شاہ۔ ایک سماجی لوک بیانیہ

کشمیری لوک دانش

3۔ گوجری لوک بیانیہ

گوجری لوک واریں

ڈلا بھٹی کا گوجری لوک بیانیہ

4۔ پہاڑی لوک بیانیہ

شمس خان کا رزم نامہ

آزاد جموں و کشمیر کا لوک بیانیہ

لسانی تناظر:

پاکستان کے بیشتر علاقوں کی طرح آزاد جموں و کشمیر بھی ایک کثیر لسانی خطہ ہے۔اس خطے کی زبانوں میں کشمیری، گوجری، پہاڑی، ڈوگری، لداخی، دردی، بلتی اور پنجابی کا ذکر کیا جاتا ہے۔کشمیر کی زبانوں میں ہندکو کا بھی ذکر آتا ہے۔''ریاست میں چھوٹی بڑی باون زبانیں اور بولیاں ہیں۔''(1) ان میں سات بڑی زبانوں میں کشمیری، ڈوگری، لداخی، دردی، پنجابی اور پہاڑی کو مقبوضہ جموں و کشمیر میں آئینی تحفظ حاصل ہے، گوجری بھی ریاست کی اہم اور بڑی زبان ہے لیکن یہ ریاستی آئین میں شامل زبانوں میں درج نہیں ہے۔اس کے بولنے والے اسے آئینی تحفظ دیئے جانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ماہرین لسانیات کی اکثریت کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کی تمام زبانیں اور بولیاں ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ بعض اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔(2)

جہاں تک کشمیری زبان کا تعلق ہے۔اسے ریاست کی سب سے بڑی اور قدیم زبان قرار دیا جاتا ہے ''ریاست اسی زبان کے اعتبار سے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب تک کشمیر کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔'' کشمیری زبان اپنی علاقائی حدود کے اعتبار سے ''وادی کشمیر'' کے علاوہ ملحقہ علاقوں رام بن، کشتواڑ، بھدرواہ، پونچھ، مظفر آباد، گلاب گڑھ اور کچھ متصلہ مقامات میں بولی جاتی ہے۔کشمیر کے نامور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر محمد یوسف بخاری کشمیری کو ہند آریائی خاندان کی زبان نہیں مانتے وہ اپنے اس خیال میں زور زبردستی کرتے ہوئے بعض یورپی ماہرین لسانیات مثلاً ڈاکٹر ٹرمپ شا، اے ای نیو، جارج گریرسن، جارج بیمز اور پروفیسر لائنز کو بھی یہ کہہ کر کہ یہ لوگ ''کشمیری زبان کی اساس تورانی زبان کے خانوادے میں بتاتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحقیق سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان نامور ماہرین لسانیات کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے معلوم ہوتے ہیں۔(3)

خود ڈاکٹر یوسف بخاری کے الفاظ میں ''کشمیری زبان سے متعلق وہ لوگ جو لسانی گتھیوں سے ناواقف ہیں ان کا کہنا ہے کہ کشمیری زبان سنسکرت گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔یعنی اس کا تعلق ہند آریائی زبان سے ہے۔''(4) میر عبدالعزیز کے الفاظ میں کشمیری زبان' اردو زبان کی ایک شاخ ہے کیوں کہ جب کشمیر کی عظیم جھیل سے پانی نکل گیا تو سب سے پہلے دردستان کے ہی لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔اس وقت بھی دردستان کی شینا زبان سے کشمیری زبان کو خاص مناسبت ہے۔(5)

آزاد جموں و کشمیر کی دیگر زبانوں میں گوجری اور پہاڑی اہم اور قابل ذکر زبانیں ہیں۔''گوجری زبان

ریاست جموں وکشمیر میں بسنے والے گوجر اور بکروال قبائل کی زبان ہے۔ پہاڑی کی طرح گوجری بھی زبانوں کے ہند آریائی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے لیکن گوجری کی نسبت پہاڑی زبان ریاست میں اپنی قدامت کی دعویدار ہے۔ گوجر اور پہاڑی ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی زبان سے بخوبی آشنا ہیں۔ ان دونوں زبانوں کا آپس میں کئی اعتبار سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پہاڑی کی طرح گوجری بھی ریاست جموں وکشمیر سے باہر بھی بولی جاتی ہے اور اپنے قدیم ادبی ورثے کے اعتبار سے جو قدیم اردو کے نام سے مشہور ہے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

پہاڑی کی طرح گوجری کا رسم الخط بھی فارسی ہے اور ہماری تحقیق کے مطابق اس کی آوازیں یعنی حروف تہجی کی تعداد پہاڑی کے حروف تہجی کے برابر یعنی 66 ہے لیکن چونکہ پہاڑی کی طرح اس زبان میں بھی لسانیاتی میدان میں کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ اس لئے آج تک اس کی اصوات کی تعداد کا تعین نہیں ہو سکا اور گوجری لکھنے والے پہاڑی لکھنے والوں کی طرح اسی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ یعنی لکھتے کچھ ہیں اور پڑھتے کچھ ہیں۔(6)

میاں کریم اللہ قریشی کرنا ہی کے بیان کے مطابق ''ڈوگری اور پہاڑی، ایک دوسرے سے انتہائی مماثل ہیں۔ ڈوگری صوبہ جموں کے تین اضلاع جموں، اودھم پور اور کٹھوعہ میں بولی جاتی ہے اور ڈوگری بولنے والے اپنی زبان کی نسبت سے ڈوگرے کہلاتے ہیں۔ معانی ومطالب اور لب و لہجے کے اعتبار سے ڈوگری پہاڑی کے بہت قریب ہے بلکہ اگر پہاڑی اور ڈوگری دونوں زبانوں سے نا آشنا کسی تیسرے شخص کے روبرو زبانیں بولی جائیں تو سننے والے کے لئے ان میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈوگری اور پہاڑی میں سب سے بڑا فرق رسم الخط کا ہے۔ ڈوگری گورمکھی رسم الخط میں جب کہ پہاڑی فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اصوات کی تعداد کے تعین میں اردو کی نسبت ڈوگری کے ماہرین میں قدرے کم اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈوگری اور پہاڑی کی اصوات تقریباً برابر ہیں۔ گرامر کے اعتبار سے بھی پہاڑی اور ڈوگری میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ڈوگری کو گریرسن نے پنجابی کی ایک بولی لکھا ہے لیکن یہ پوزیشن اب ماہرین لسانیات کے نزدیک متنازعہ ہے۔ تاہم اس موضوع پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ تحقیق نہیں ہوئی۔(7)

کش + میر کا لوک بیانیہ:

کشمیر کے نام کی وجہ تسمیہ مختلف روایات کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی ہے۔ جی ایم منیر نے اپنی کتاب ''جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں'' میں کم از کم ایسی تین روایات کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

''ایک روایت ہے کہ زمانہء قدیم میں جب وادیء کشمیر 'ستی سر' کے نام سے ایک وسیع جھیل تھی اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر مختصر آبادی تھی۔ ایک آدم خور دیو جلا بو 'ستی سر' سے نکل کر بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ لوگ مدت تک اس کے ظلم سہتے رہے۔ آخر کشپ رشی نامی ایک بزرگ یہاں آیا۔ لوگوں نے آدم خور جلا بو کی فریاد کی۔ کشپ رشی نے عوام کو ظالم دیو سے نجات دلائی اور بارہ مولا کے قریب ایک پہاڑ کاٹ کر جھیل کا پانی نکالا جس سے وادی ظہور میں

آئی اور یہ جگہ 'کشپ میر' کی جگہ کہلائی جو بگڑتے بگڑتے کشمیر ہو گئی۔ میر سطح مرتفع کو کہا جاتا ہے۔ جیسے اجمیر، پامیر، دیامیر، وغیرہ، دوسری روایت یہ ہے کہ کشپ کی محبوبہ کا نام میر تھا۔ ان دونوں کے نام سے وادی کشپ میر کہلائی اور بعد میں کشمیر ہو گئی۔ تیسری روایت یہ ہے کہ 555 قبل مسیح میں بنی اسرائیل کے کچھ قبائل، ہجرت کر کے افغانستان، گلگت اور کشمیر وغیرہ کے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ان میں جو قبیلہ وادی کشمیر میں وارد ہوا، اسے اس کی خوبصورتی نے بہت مسحور کیا۔ انہوں نے اس کا نام کشیر رکھا جو ک اور اشیر کا مرکب ہے یعنی اشیر جیسا شیر عبرانی زبان میں شام کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں بھی اسے Syria کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ گویا بنی اسرائیل کو یہ سرزمین شام جیسی سرسبز و شاداب اور خوبصورت نظر آئی اور انہوں نے اس کا نام کشیر رکھا یعنی شام جیسا۔'' (8)

عبدالصمد خواجہ وانی کے مطابق کشمیر سنسکرت کے دو الفاظ کم یعنی پانی اور شمیر یعنی نکالنا کا مرکب ہے یعنی یہ سرزمین پانی نکال کر خشک کی گئی ہے۔ 'کم شیر' بعد ازاں کثرت استعمال سے کشمیر ہو گیا۔ (9) وادیء کشمیر اور گلگت کے لوگ اسے کشیر کہتے ہیں جبکہ لداخ کے ''کشنی چھپا'' اور اہل تبت ''کشن چھپل' کہتے ہیں۔ قدیم یونانی کتب میں اس ریاست کا نام کشمیریہ درج ہے اور زمانہ قدیم میں اس خطہء اراضی کو 'سروبھومیا'' یعنی تیرتھوں کی سرزمین کہا گیا ہے۔'' (10)

کشمیر کے ممتاز شاعر اور محقق طاؤس بانہالی نے ''کشمیری لوک کہانیاں'' نامی ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ جس میں ایک کہانی ''کش دیو اور میر پری'' کے تعلق کے حوالے سے اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ان کے ایک فرماں بردار دیو نے اپنی خدمات کا صلہ یوں چاہا کہ اسے ایک پری کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس دیو کا نام کش تھا اور اس کی حسین محبوبہ میر پری کہلاتی تھی، ان دونوں نے کوہِ سلیمان کو عبور کر کے وادی میں قدم رکھا اور سلیمان کی چوٹی یا تختِ سلیمان کو اپنا مسکن بنایا۔ جہاں اب سرینگر کا شہر آباد ہے۔ کش اور میر کے اسی جوڑے کے ناموں کی مناسبت سے اژدھے کی جھیل کا نام کشمیر مشہور ہوا لیکن اژدھے نے حضرت سلیمانؑ کے ان دونوں نام لیواؤں کو کبھی چین سے نہیں رہنے دیا۔۔۔
کش دیو اور میر پری اس اژدھے سے بہت نالاں تھے اور انہوں نے خدا سے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ حضرت سلیمانؑ کے صدقے اس اژدھے کو فنا کر دے۔ ایک دن دعا کرتے کرتے دونوں کی آنکھ لگی تو خواب میں ایک غیبی آواز سنائی دی کہ ایک بزرگ اژدھے کی وادی میں آکر اسے رام کرے گا۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک اژدھا غائب ہو گیا۔ کش دیو اور میر پری نے کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ پہاڑی کی اونچی چوٹی پر گھنے جنگل میں ایک بزرگ بیٹھے عبادت کر رہے ہیں اور اژدھا موم ہو کر ان کے قدموں میں سر جھکائے بیٹھا ہے۔

بزرگ نے اژدھے کو حکم دیا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے ان نام لیواؤں کو وادی میں رہنے کی جگہ دے لیکن اژدھا بولا کہ حضور میں تو فقط آپ کا خادم ہوں کہ آپ اشرف المخلوقات ہیں۔ آپ میرے ساتھ چل کر جہاں بھی

چاہیں قیام فرمائیے۔ میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ تب ان بزرگوار نے کش اور میر سے کہا کہ وہ اسی جنگل میں قیام کریں اور کل صبح یا شام کے وقت پہاڑ کی اونچی چوٹی سے وہ منظر دیکھیں جو انہیں تخت سلیمانؑ یعنی موجودہ سرینگر میں یہاں سے صاف دکھائی دے گا۔

یہ کہہ کر وہ بزرگ اژدھے کی پیٹھ پر سوار ہو کر سرینگر کی طرف چل دیئے۔ اژدھے نے کہا کہ حضور اگر آپ ساری عمر یونہی میری پیٹھ پر گزار دیں تو یہ میرے لئے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ روحانی بزرگ نے کہا کہ میرے پاؤں مٹی پر ہونے چاہئیں کیوں کہ میں اسی صورت میں اپنی عبادت کا سلسلہ جاری رکھ سکتا ہوں۔ اژدھے نے اپنی دُم کو پانی پر زور سے مارا اور اس جگہ کی زمین خشک ہوگئی۔ انہوں نے یہاں پر صبح کی نماز ادا کی اور دعا مانگنے میں مصروف ہو گئے۔

پہاڑ کی چوٹی سے کش دیو اور میر پری یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان بزرگ کی روحانی قوت سے جیسے ان کا جسم بھی پھیلتا جارہا ہے اور اژدھا اپنی پوری قوت سے پانی کو دھکیلتے ہوئے پیچھے کی طرف کھسک رہا ہے دیکھتے ہی دیکھتے جھیل خشک ہونے لگی۔

اژدھے نے درخواست کی کہ حضور مجھے بھی اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دے دیجئے جواب ملا کہ ہاں تم یہاں سے کچھ پرے فلاں جھیل میں رہ سکتے ہو لیکن پہاڑوں اور جنگلوں پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔۔اور جب تک ہمارے پانچ سو (500) نام لیوا بھی اس سرزمین پر باقی رہیں گے تم اس وادی کو دوبارہ جھیل میں نہیں بدل سکتے۔۔۔اس کے بعد پانچ سو بزرگوں کا ایک قافلہ آیا اور انہوں نے وادی میں ڈیرے ڈالے۔ پھر قدم قدم پر بستیاں بستی رہیں لیکن اژدھا اپنی جھیل سے باہر نہ نکلا اور نہ کبھی اس کی اولاد نے انسانوں کو تنگ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ چشموں میں پائی جانے والی مچھلیاں بھی اسی اژدھے کی اولاد ہیں۔ اسی لئے چشمے کی مچھلی کا شکار بھی ہم لوگوں پر حرام ہے۔(11)

اس لوک کہانی کا بیانیہ دیومالائی ہے۔ اسی لوک کہانی کو حالیہ برسوں میں دوبارہ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں انسانی شجاعت اور حریّت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ تحسین جعفری کاشمیری اس کہانی کو یوں بیان کرتے ہیں ''بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ نام کاش اور میر دو الفاظ کا مرکب ہے۔ میر سے مراد پہاڑ کا کوئی حصہ یا وادی ہے اور کاش آریاؤں کے ایک دیوتا ''کاشب'' سے منسوب ہے۔''

دوسری قیاس آرائی یہ ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں ایک کشن خاندان بھی تھا جس کے تیسرے حکمران کنشک نے اس خطۂ زمین پر قبضہ کیا تھا، کشمیر کے پہلے دو حرف ''کاف'' اور ''شین'' کشن سے لئے گئے ہیں اور ''میر'' کا اضافہ کر کے ''کشمیر'' بنایا گیا ہے۔

کشمیر کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں ایک لوک کہانی بڑی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ وادی کی ساری زمین ایک

لمبے چوڑے اور گہرے پانی کے لحاف میں منہ ڈھانپے خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ پاس ہی ایک بلند و بالا ٹیلے پر تخت سلیمانؑ کی زیارت کو لوگ آتے اور تخت کو عزت و احترام سے بوسہ دے کر واپس چلے جاتے۔ ایک مرتبہ ایک شہزادی جس کا نام میرو تھا۔ تخت کی زیارت کے لئے آئی اور تخت کو بوسہ دے کر واپس چلی گئی لیکن اس کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا تھا کہ پانی کی آغوش میں سوئی ہوئی اس حسین و جمیل وادی کو کس طرح آزاد کیا جائے؟

شام کو جب سب اہل خانہ جمع ہوئے تو شہزادی میروؔ نے اپنے باپ سے کہا کہ بابا جس وادی میں تخت سلیمانؑ رکھا ہے وہ کس قدر خوبصورت اور من موہنی ہے، لیکن افسوس کہ اس کے حسن و جمال، زیبائی و دلکشی کو پانی کی لہروں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

اس نے کہا، بابا کیا اس وادی میں سے پانی نکل نہیں سکتا؟ اس کا باپ میروؔ کی یہ بات سن کر مسکرا دیا اور کہنے لگا کہ بیٹی اس کے چاروں طرف تو پہاڑ ہیں، بھلا پانی کیسے نکالا جا سکتا ہے؟ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟

میرو یہ بات سن کر چپ تو ہو گئی، لیکن وادی میں سے پانی نکال کر اسے خشک کر دینے کا خیال اس کے لئے سوہان روح بن گیا۔ وہ گھنٹوں چپ چاپ پڑی رہتی اور سوچا کرتی کہ پانی کیسے خشک کیا جا سکتا ہے۔ جس سے وادی کا سارا پانی نکالا جا سکے۔ وہ سوچتی رہتی اور آخر مایوس ہو کر نیم مردہ سی پڑی رہتی۔

اس کی سہیلیوں نے اسے اس ناممکن خیال سے دست کش کرنے کی کافی کوشش کی، لیکن سب بے سود۔ اس سوچ بچار نے اس کی صحت پر بُرا اثر ڈالا اور وہ بیمار رہنے لگی۔

اس کی ایک سہیلی نے ایک دن اس سے کہا۔ میرو! کیوں نہ منادی کرا دی جائے کہ جو آدمی وادی سے سارا پانی نکال دے گا اسے بہت بڑا انعام دیا جائے گا۔ دو ہزار، چار ہزار، دس ہزار اشرفیاں؟

میروؔ یہ سن کر اچھل پڑی۔ اس نے اپنی سہیلی کے منہ کو چوم لیا اور بڑی محبت، جوش اور ولولے سے کہا کہ پیاری بہن، دو چار ہزار یا دس ہزار اشرفیاں کیا چیز ہیں؟ اگر کوئی جیالا یہ معرکہ سر کر سکے تو میں اسے اپنا پتی، اپنا سر تاج، اپنا مالک بنا لوں گی۔

میروؔ کے پتا جی نے جو پریوں کا بادشاہ تھا، ڈھنڈورا پٹوایا کہ جو شخص وادی میں جمع شدہ پانی باہر نکال دے گا اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا لیکن کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ بھلا ایسے ناممکن کام کو ممکن بنانے کے لئے کون کمر بستہ ہو سکتا تھا۔ آخر پڑوسی ملک کا ایک شہزادہ کاشو تیار ہو گیا۔ وہ ایک مرتبہ شہزادی میرو کے جمال جہاں آرا کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا اور اسی جذبے کے تحت فرہاد بننے کے لئے تیار ہو گیا۔ تاکہ اپنے وقت کی شیریں، میروؔ کو حاصل کر سکے۔

کہا جاتا ہے کہ شہزادہ کاشوؔ اپنے چند ساتھیوں کو لے کر وادی کے قریب پہنچ گیا، تخت سلیمان کو بوسہ دیا اور پانی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی وادی کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا۔ وادی کے گرد چاروں طرف پھیلے ہوئے سر بہ فلک پہاڑوں کو دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے ہمت ہار دی لیکن اس کے دل میں میروؔ کا عشق لہریں لے رہا تھا، وہ بھلا

تھیار کیسے ڈال دیتا، وہ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور بغور دیکھتا رہا کہ کوئی جگہ ایسی مل جائے جہاں سے پانی کا نکاس ممکن ہو۔ جویندہ یابندہ، آخر بارہ مولہ کے قریب اسے ایسی ایک جگہ مل گئی۔

کاشو نے ڈلر کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھی کچھ تو اسے چھوڑ کر واپس جا چکے تھے، باقی بیدل ہو گئے تھے لیکن کاشو نے ہمت نہ ہاری۔ وہ کوہ کن کی طرح تیشہ نہ سہی، کدال سے سخت چٹانیں کاٹتا اور کھدائی کرتا رہا۔ آخر یہ کھدائی ''دومیل'' تک پہنچ گئی۔ یہاں سے اترائی شروع ہوتی تھی۔ پانی نے زور سے بہنا شروع کر دیا۔ کاشو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر ایک فاتحانہ اور پُر مسرت نظر ڈالی اور زوردار نعرہ لگا کر اپنی شاندار کامیابی کا اظہار کیا۔

کاشو کی محنت شاقہ اور اس کے عزم راسخ کی وجہ سے جھیل کے پانی کے نکاس کا جو راستہ بن گیا تھا اس نے کاشو اور اس کے ساتھیوں کی شب و روز کی محنت کی وجہ سے کئی مہینوں کے بعد دریا کی شکل اختیار کر لی جسے ''وِ۔تھ'' کہا جانے لگا اور آج دریائے جہلم کے نام سے مشہور ہے۔ اس دریا کے ذریعے جھیل کا سارا پانی بہہ نکلا اور اس کے اندر پوشیدہ وادی ایک نئی نویلی دلہن کی طرح جلوہ آرا ہو گئی۔

شہزادی میرو کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے تخت سلیمانؑ کو آ کر بوسہ دیا اور پھر اپنا وعدہ نبھانے کا اعلان بھی کر دیا۔ شہزادہ کاشو اور شہزادی میرو ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ کئی دن تک جشن منایا جاتا رہا اور پھر دونوں نے اسی وادی میں زندگی گزارنے کا عہد کر لیا۔

اس کے بعد اس علاقے کے لوگوں نے جہاں میرو کا باپ حکمرانی کرتا تھا، یہ طے کیا کہ کاشو کی جانبازانہ جدوجہد کے صلے میں چادر آب کو پھاڑ کر جو حسینہ منظر عام پر آئی ہے، اس کا نام انہی دو چاہنے والوں کے نام پر رکھنا چاہئے۔ تا کہ انہیں بھی اس وادی کی طرح ''بقائے دوام'' کی سند مل سکے۔ چنانچہ انہوں نے پوری وادی کا نام ''کاشو میرو'' رکھ دیا۔ زمانہ گزرتا رہا۔ نسلوں پر نسلیں بدلتی رہیں۔ اور یہ نام بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ لیکن ''کاشو میرو'' کا تعلق بہر حال قائم رہا۔ آخر نام مختصر کر دیا گیا۔ اور ''کاشمیر'' کہا جانے لگا، جسے اب ہم سب متفقہ طور پر ''کشمیر'' کہتے ہیں۔ (12)

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا:

کشمیر کی انہی لوک کہانیوں میں ایک ایسا بیانیہ بھی ہے جس کے مطابق، دنیا کا ہر مذہب سچائی کی تلقین کرتا اور من کی جوت جگاتا ہے۔ روایت کے مطابق اس لوک بیانیہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کشمیر پر تُرک مہاراجوں کا راج تھا اور مہاراجہ کا مذہب عام لوگوں سے مختلف تھا۔۔ مہاراجہ کا ایک وزیر حکمران سے بہت متاثر ہوا، اور اس نے وہی مذہب اختیار کیا، اس بات پر وزیر کا بیٹا اپنے باپ سے بہت ناراض تھا اور وہ بات بات پر اپنے باپ کو ٹوکتا تھا۔ وزیر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور

کیوں کر اپنے بیٹے کو سمجھائے کہ ہر مذہب سچائی کی تلقین کرتا ہے۔ بات صرف اس پر عمل کرنے والوں کے اعمال کی ہے کہ وہ پیار محبت کا رویہ اختیار کرتے ہیں یا نفرت کی آگ بھڑکا دے۔ ایک دن اکلوتے بیٹے نے اپنے باپ کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے ترک حکمران کا مذہب ترک نہ کیا تو وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا۔ وزیر بہت پریشان ہوا، اس نے اپنی اس پریشانی کا اظہار بادشاہ کے سامنے کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ تم اپنے بیٹے کو میرے سپرد کر دو اور یہ کہہ کر دو سواروں کو حکم دیا کہ وزیر کے بیٹے کو گرفتار کیا جائے۔ پیادے اسے گرفتار کر کے لائے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ یہ سن کر وزیرزادہ بادشاہ کے پاؤں پڑا اور اس کا باپ بھی منت ساجت کرنے لگا کہ ''اس کی جان بخشی کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ سیدھی راہ پر آئے گا'' بادشاہ نے کہا کہ میں تمہیں ایک مہینے کی مہلت دیتا ہوں، اگر ایک مہینے میں تمہارا بیٹا سیدھی راہ پر آیا تو اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔

ایک ماہ گزرنے پر دونوں باپ بیٹے بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے، تو بیٹے کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ وہ بادشاہ کے پاؤں پڑا اور کہنے لگا مجھے اپنی جان پیاری نہیں، لیکن خدا کے لئے میرا وہ جرم بتا دیجئے جس کی وجہ سے مجھے موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ اس ناکردہ گناہ پر موت کی سزا ملنے کے معاملے میں سوچتے سوچتے میری نیند حرام ہو گئی ہے۔ حالانکہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ برخوردار میں تمہیں موت کے خوف کا نظارہ کروانا چاہتا تھا، اب تم پر یہ بات ظاہر ہو گئی ہوگی کہ موت کا خوف موت سے زیادہ اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ کیا تم اس خوف سے نجات پانے کے لئے ایسا مذہب اختیار کرنا چاہو گے جو اذیت کے اس زہریلے درخت کو جڑ سے اکھاڑ دے؟ وزیرزادے نے کہا کہ میں یقیناً اس خوف سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن جو مذہب مجھے اس سے نجات دے سکتا ہے۔ اس کی تفصیل سے آگاہ ہونا بھی میرے لئے ضروری ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس تفصیل سے آگاہ ہونے کے لئے تمہیں کچھ دن میرا مہمان بن کر رہنا ہوگا اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ وزیرزادے کو شاہی محل کے مہمان خانے میں رکھا جائے۔

ایک خنک شام کو بادشاہ نے ایک جلتی ہوئی شمع یہ کہہ کر وزیرزادے کے ہاتھ میں تھما دی کہ یہ شمع ہاتھ میں لے کر تمہیں شاہی محل سے اپنے گھر تک سرپٹ بھاگنا ہوگا اور تم الٹے پاؤں دوڑ کر واپس آ جاؤ گے۔ اس دوران میں اگر یہ شمع راستے میں ہوا سے بجھ گئی تو تمہاری زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا جائے گا، حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق وزیرزادے نے کانپتے ہاتھوں سے شمع کو تھاما اور اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ دو پہریدار اس کا اس غرض سے تعاقب کر رہے تھے کہ کہیں وزیرزادہ راہ میں ادھر ادھر نہ دیکھے یا ٹھہر کر کسی سے بات نہ کر پائے۔ جونہی وزیر نے اپنے بیٹے کو گھر کی طرف آتے دیکھا تو وہ بیٹے سے ملنے کو آگے بڑھا لیکن بیٹا چلا کر بولا کہ ابا جان مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔ اگر میں الٹے پاؤں بھاگ کر محل میں جلتی ہوئی شمع لے کر واپس نہ پہنچ سکا تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔ یہ کہہ کر وزیرزادہ واپس محل تک پہنچا اور مجسم بت بن کر حکمران کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وزیرزادے کو یوں بے حس و حرکت دیکھ کر بادشاہ نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔'' کہو سفر کیسا رہا۔ اور کس کس سے ملاقات ہوئی'' وزیرزادہ بولا کہ'' سرکار مجھے شمع کے بجھنے کا اتنا خوف تھا کہ آنے جانے کی کیفیت یا ارد گرد کے ماحول کا کوئی ہوش ہی نہ رہا۔'' ''شاباش'' بادشاہ نے کہا۔'' یہی سبق سکھانے کے لئے میں نے تمہیں چراغ لے کر ہوا کے سامنے روانہ کیا تھا کہ تمہاری نظر صرف شمع پر مرکوز رہے اور تم گرد و پیش کے ماحول سے بے نیاز ہو جاؤ۔ یہی سبق مجھے میرے مذہب نے سکھایا ہے، میرا مذہب مجھے خوف سے بے نیاز ہو کر ایک ازلی اور ابدی سچائی پر اس طرح دھیان دینے کی تلقین کرتا ہے کہ میں دنیا کے باقی دکھوں اور سکھوں سے بے نیاز ہو جاؤں۔'' وزیرزادہ بادشاہ کے اس عملی مظاہرے سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے بادشاہ کے قدموں میں گر کر اسے اپنا ہم مذہب بنانے کی درخواست کی۔ یوں باپ بیٹے کا جھگڑا بھی مٹا اور وزیرزادہ دنیا کے دوسرے جھگڑوں سے بھی آزاد ہو گیا۔

راوی کہتا ہے کہ ایسے ہی موقع پر کشمیر میں لوگ لل دید کا یہ اشلوک گاتے ہیں۔

روتے روتے جیون جائے　　یوں مل پائے نہ چین
مگن ہو من کی جوت جگائے　　چھوڑ بھی دے یہ گیدڑ بین

لل دید، للیشوری، للہ عارفہ:

یہ ایک ہی ہستی کے تین نام ہیں۔ جو اس ہستی کے چاہنے والوں نے اپنی اپنی محبت کے انداز میں، اسے مخاطب کرنے کے لئے رکھ چھوڑے۔ مسلمان اس ہستی کو للہ عارفہ کے نام سے پکارتے ہیں جبکہ ہندوؤں کے لئے یہ مقدس ہستی لل دید یا للیشوری ہے۔

شیخ العالم نے اس کی عقیدت میں کہا تھا:

''پد مان پور کی اس للہ کو آفرین، جس نے امرت کے
گھونٹ پی لئے اور کائنات میں شو کو پانے کی جستجو کی
اے پروردگار! مجھے بھی ایسا ہی ذوق جستجو عطا کر''

ڈاکٹر برج پریمی کے لفظوں میں اس کی کہانی کچھ اس طرح تھی:

''چھ سو سال قبل شیخ العالم جیسی پاک نفس شخصیت نے جنگلوں کے سناٹوں اور بستیوں کے ہنگاموں میں گھومنے والی ایک ننگ دھڑنگ، آوارہ گرد اور اپنے آپ سے بے خبر مجذوبہ کے ذوق طلب کو مندرجہ بالا اشعار میں خراج تحسین پیش کیا تھا جس نے اپنے روحانی تجربوں اور باطن کی چھپی ہوئی روشنی کو پہلی بار کشمیری زبان میں ایک انوکھے اور رسیلے انداز میں نظمایا تھا۔ یہ آواز اپنے نرالے آہنگ اور رسیلے لہجے کی دھیمی آنچ میں لپٹی ہوئی ایک بالکل نئی آواز تھی جس نے صرف اپنے عہد کے بلکہ اس زمانے سے لے کر آج کے لمحوں تک برابر لوگوں کو گرمایا ہے۔ اپنے ظاہری وجود سے بے پروا اور اپنے حقیقی معبود کے فراق میں سلگتی ہوئی یہ خاتون پدماوتی تھی جس نے چودھویں

صدی کے وسط میں جنم لیا تھا اور جسے کشمیر میں للہ ایشوری یا لل دید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

''چودھویں صدی اپنے جلو میں کشمیر کے لئے اضطراب اور انتشار لے آئی تھی۔اس صدی کے آغاز سے ہی کئی سیاسی اور سماجی انقلابات رونما ہوئے جن سے کشمیر کی تاریخ بے حد متاثر ہوئی۔شاہ میر نے راجہ اودین دیو کی بیوہ کو ٹارانی کو تخت سے ہٹا کر اسلامی حکومت کا پہلا پتھر رکھا۔یہ 1339ء کی بات ہے، اسی زمانے میں میر سید علی ہمدانی اور ان کے ساتھی کشمیر آئے۔ان کی آمد سے اسلام کی تبلیغ کا کام شروع ہوا۔صدیوں پرانی ہندو اور بدھ مت تہذیب کے اثرات کم ہونے لگے اور ایک نئے طرز فکر کا آغاز ہوا۔شروع شروع میں بودھ مت اور ہندوؤں کے ترکہ فلسفے سے جو نظام زندگی مرتب ہوا تھا وہ اسلامی فکر کے ساتھ شدت کے ساتھ متصادم ہوا۔افکار کے اس تضاد نے یہاں کے لوگوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔اس صورتِ حال میں عام لوگوں کے لئے صحیح سمت اختیار کرنا مشکل تھا۔ایک طرف صدیوں پرانے جانے پہچانے عقائد اور روایات تھیں اور دوسری طرف اسلام کی نئی روشنی تھی۔اس دوراہے پر بڑے بڑوں کے حوصلے شکست ہو گئے۔وقت کا تقاضا تھا کہ اس نازک موقعہ پر کوئی رہنما سامنے آئے جو غیب کے دروازے کھول کر مضطرب اور بے قرار دلوں کو سکون بخش دے۔لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور کئی اہل دل صوفی، سنت اور مشائخ، قلندر اور پاک نفس اسی زمانے میں سامنے آئے اور وہ اسرار جن سے لوگ حیرت زدہ تھے سمجھ میں آنے لگے۔ان بزرگوں نے اپنے طرزِ عمل سے لوگوں کے دل جیت لئے اور آدرشوں اور خیالات کی اس جنگ کی جو آگ سلگ اٹھی تھی، اسے آہستہ آہستہ بجھا دیا۔اس عہد کی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے بامزئی رقم طراز ہیں:

> ''مذہب کے اس ابال کے عہد میں مذہب کو سمجھانے کے ایک ایسے طریقہ کار کی ضرورت تھی جو تمام ذاتوں کا احاطہ کر سکے اور دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کر سکے۔کشمیر کی دینی اور فلسفیانہ روایات اس مقام پر بار آور ثابت ہوئیں۔کئی صوفی اور سنت سامنے آئے جو اپنی تعلیمات اور نفی ذات کی زندگی سے دھرم اور اخلاق کا زندہ پیکر تھے۔ان لوگوں کی پہلی صف میں عظیم عارفہ للہ ایشوری تھیں جن کو عام طور پر لل دید کہا جاتا ہے۔''

[Kosnur Samachar (LAL DED Number 1970-71) page 13]

لل دید چودھویں صدی کے اس انتہائی بحرانی دور میں، جب کشمیر میں صدیوں سے استوار ایک نظام حکومت ہچکیاں لے کر دم توڑ رہا تھا اور ایک نئے نظام کے لئے آغوش کھولے ہوئے تھا اور ایک قدیم مذہبی فکر مقابلۃً نئے دینی عقائد کے ساتھ برسرِ پیکار تھی، کشمیر کے افق پر نمودار ہوئیں اور اس بات کے باوصف کہ انہوں نے اپنی فکری بالیدگی اور باطنی نور کی روشنی سے صحیح سمت کی نشاندہی کی وہ اکثر تاریخوں اور نیم تاریخی تذکروں میں مؤرخوں کی

تساہل پسندی کا نشانہ بن گئی ہیں۔ چنانچہ بعض اہم مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے پراسرار خاموشی اختیار کر کے لل دید کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش پیدا کر دی ہے اور ان کے اردگرد پراسراریت کا ہالہ بُن لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کے بیشتر گوشے نظروں سے اوجھل ہیں لیکن اس کے باوجود لل دید کا وجود روزِ روشن کی طرح ایک حقیقت ہے۔ تذکروں اور تاریخوں میں لل دید کے بارے میں سہو کی وجہ غالباً بقول پروفیسر جے لال کول یہی ہو سکتی ہے کہ یہ کتابیں جدید تقاضوں کے مطابق تواریخیں نہیں ہیں اور صرف بادشاہوں یا سیاسی واقعات کا بیان ہیں۔ چنانچہ جو نراج شری ور، ملک حیدر، پرجابٹ، مصنف بہارستان شاہی اور کئی دیگر مؤرخین نے للّہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے البتہ بعد کے مؤرخین میں سے خواجہ اعظم دیدہ مری، حسن کھوبہامی، بابا داؤد مشکواتی وغیرہ نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس عظیم عارفہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

للّہ ایشوری کی تاریخ پیدائش خاصی متنازعہ رہی ہے۔ مؤرخ حسنؔ نے اگرچہ اپنی تاریخ میں للّہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور کئی متنازعہ فیہ مسائل کے لئے جگہ پیدا کی ہے مگر وہ بھی اس کی تاریخ پیدائش کا ذکر حتمی طور پر مؤرخانہ صداقت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ساتویں صدی ہجری میں سیمپورگاؤں کے ایک پنڈت
گھرانے میں پیدا ہوئی۔ یوم پیدائش اور تاریخ وفات
کا درست پتہ نہیں۔''

(تاریخ حسن (تذکرہ اولیائے کشمیر) تیسرا حصہ ص447)

آر، کے پارمو اپنی کتاب میں للّہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تاریخ ولادت کے بارے میں بڑا ہی مبہم انداز اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''وہ (للّہ) پاندرتھن میں پیدا ہوئی۔ اس کی ولادت
اور وفات کی صحیح تاریخوں کا تعین کرنا مشکل ہے،
جب وہ سید علی ہمدانیؒ (1384-1380) سے ملیں
تو اس وقت وہ ایک بالغ خاتون ہوں گی۔''

(R.K. Parmu: History of Muslim Rule in Kashmir page 107)

البتہ صوفی نے اپنی تاریخ کشمیر میں للّہ کی تاریخ پیدائش قطعیت کے ساتھ یوں لکھی ہے)

''للّہ عارفہ 735ھ بمطابق 1335ء میں اودیان
دیو کے عہد میں پیدا ہوئیں۔''

(G.M. D. Sufi : Kashmir Vol II page 385)

چنانچہ اپنی دلیل کے جواز میں وہ عبدالوہاب شایق کا ایک فارسی شعر سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شعر یوں ہے۔

فزدن بود بہفت صدی و پنج
زویرانہ ، شد پدیدار گنج

پریم ناتھ بزاز، صوفی کے ہم خیال نظر آتے ہیں ان کے مطابق بھی للہ ایشوری کی تاریخ پیدائش 1335ء ہے ان کا بیان ملاحظہ ہو:

''للہ 1335ء میں پیدا ہوئیں جبکہ ادویان دیو تخت نشین تھا اور ہندو
راج بڑے کرب سے بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا۔''

(P.N. Bazaz :- Daughters of Vitasta page 126)

''خواجہ اعظم دیدہ مری نے اپنی تاریخ اعظمی میں للہ کی پیدائش کا ذکر تو کیا ہے لیکن صحیح تاریخ بتانے سے گریز کیا ہے۔ وہ صرف یہ بتا سکے ہیں کہ للہ کا زمانہ سلطان شہاب الدین کا زمانہ تھا جس کا دورِ حکومت 1354ء سے 1373ء تک پھیلا ہوا ہے۔ للہ ایشوری کے ساتھ سلطان کی شہزادگی کے زمانے کی ایک ملاقات کا ذکر یوں کیا گیا ہے:۔

''سلطان شہاب الدین پسر سلطان علاؤالدین بعد
فوت بزرگوارہ مشہور امرائی نامدار بر تخت نشت
کہ پیش از جلوس در زمانِ پدر عالی مقدار طرح جنگلے
بہ تقریب شکار رفتہ بود و از مجذوبہ کاملہ دو پیالہ شیر
خوردہ و بشارِ سلطنت یافتہ بود گویند، کہ آں
مجذوبہ للہ عارفہ است

(1 ہمارا ادب مشاہیر نمبر (1976-1977) ص 16)

''بامزئی کا بیان اعظم دیدہ مری کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مؤرخین سے اختلاف کرتے ہوئے للہ دید کی پیدائش کا زمانہ سلطان علاؤالدین کے دورِ حکومت کا زمانہ قرار دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

''وہ (للہ) تقریباً مسیح کی چودھویں صدی وسط میں
سلطاب علاؤالدین کے عہد حکومت میں پیدا ہوئیں۔''

(P.N.K. Bamzai :- A History of Kashmir. 359)

یہ بات قابل غور ہے کہ سلطان علاؤالدین کا زمانہ ء حکومت 1343ء سے 1354ء رہا ہے۔ پروفیسر جے لال کول نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے بھی 1335ء کو للہ کی پیدائش کا سال بتایا ہے۔ (J.L. Kaul: Studies in Kashmir p. 177)

دوسری جگہ وہ خود اپنی تردید کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''للّہ دید کی تاریخ پیدائش 1317ء اور 1320ء کے درمیان کسی بھی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے قبل ہی ہو لیکن کسی بھی طرح 1320ء کے بعد نہیں ہے۔'' (للّہ دید، ص۔7)

''اس افراط و تفریط کے عالم میں للّہ دید کی تاریخ پیدائش کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ بات البتہ یقینی ہے کہ للّہ نے چودھویں صدی کے دوسرے یا تیسرے دہے میں جنم لیا اور یہ زمانہ راجہ اوسین دیو یا اس کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ ہندو راج نزع کی حالت میں تھا۔ نئی صدی کے آغاز سے کئی انقلاب رونما ہوئے جن کے دوررس نتائج نکلے اور جن سے کشمیر کی ساری تاریخ بدل گئی۔ راجہ سہد یو (1301-1320) وسط ایشیا کے ایک قبائلی سردار کے حملے سے پسپا ہو کر ملک سے بھاگ کھڑا ہوا۔ رینچن (1320-1323)، اودین (1320-1338) اور کوٹا رانی (1338-1339) کی حکومتیں برائے نام ثابت ہوئیں اور ہندو راج کے اثرات آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ اس موقع پر شاہ میر اپنی پوری طاقت اور حکمت عملی کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے کوٹا رانی کو تخت سے ہٹا کر حکومت کی عنان خود سنبھالی اور باقاعدہ طور پر اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔ للّہ ایشوری کی پیدائش کا کم و بیش یہی زمانہ ہے۔ اس کے بعد وہ کافی طویل عمر تک زندہ رہیں اور کئی مسلمان حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔

''للّہ موجودہ سرینگر سے کوئی چار میل دور پاندریٹھن میں پیدا ہوئی جو مہاراجہ اشوک نے راجدھانی کے طور پر آباد کیا تھا اور ایک عرصہ تک پران دھشتان (پرانا شہر) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے والد کا نام ژندرہ بٹ تھا جو ایک متمول کشمیری پنڈت زمیندار تھے۔ کئی مؤرخوں کا خیال ہے کہ وہ پانپور کے نزدیک سیم پور نام کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ للّہ نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے کُل گرو سدھ سری کنٹھ المعروف سدھ مول ایک نامی گرامی عالم اور فاضل تھے اور انہیں ترکہ فلسفے پر عبور حاصل تھا۔ وہ خود بھی ایک یوگی اور پاک نفس بزرگ تھے۔ للّہ نے روحانی اور دینی تعلیم کے ابتدائی اسباق ان ہی سے حاصل کئے۔ اپنے گرو کی تعلیمات کو للّہ نے گہرے انہماک سے نہ صرف سمجھ لیا بلکہ نہایت ہی سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ جذب بھی کر لیا۔ بعد کے برسوں میں جب للّہ کا شعور پختہ ہوا اور ان کو گیان و عرفان کی بیش بہا دولت حاصل ہوئی تو گرو اپنے چیلے کے کشف و کمال اور بصیرت اور آگہی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔

للّہ کی شادی کم سنی میں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ابھی بارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ ان کا ہاتھ پدمان پور (موجودہ پانپور) کے ایک برہمن زادے کے ہاتھ میں دیا گیا۔ یہاں للّہ کا نام پدماوتی رکھا گیا۔ پدماوتی کے لئے زندگی کا یہ موڑ نہایت اہم ثابت ہوا۔ بچپن کے الہڑ پن کا زمانہ بیت چکا تھا اور ازدواجی بندھنوں کی ذمہ داریاں نہایت ہی کم سنی میں شروع ہوئیں۔ سسرال ایسا ملا جہاں دور دور تک امن و سکون کا گزر بھی نہ ہوا تھا۔

کنوار پن میں جو شاداب اور پرسکون بچپن دیکھا تھا اس کی ساری لطافت اس کا سارا حسن اور اس کی ساری رعنائی سسرال کے تپتے ہوئے ریگ زار میں خاکستر ہوئی۔ اجنبی ماحول، تندمزاج اور ظالم ساس کی سفاکی، لاپرواہ اور کٹھور شوہر کی بے اعتنائی اور سب سے بڑھ کر قدامت پرستی کے حصار۔ قدم قدم پر احتساب، پل پل ٹھوکریں، بات بات پر طعنوں کی کسیلی فضا حتیٰ کہ عصمت شعاری پر مشکوک سرگوشیاں۔ کم سن، تنہائیوں کی عاشق، باطن کے بے نام درد کی ہلکی ہلکی ٹیسوں سے بے چین پدماوتی۔ اس محبوس فضاء میں گھٹن محسوس کرنے لگیں لیکن بچپن سے جو صبر، ضبط اور ایثار کا جہیز وہ ساتھ لے آئی تھیں اس کے سہارے سسرال کی اس تند آندھی کا مقابلہ کرنے لگیں۔ ساس کے سفاک رویے اور شوہر کی بے مروتی نے گداختگی میں اضافہ کیا۔ وہ نہایت خاموشی سے اس غیر انسانی سلوک کو برداشت کرتی رہیں۔ دن بھر گرہستی کے کام کے بعد پیٹ کے لالے پڑنے لگے۔ بھات کی تھالی میں پتھر کے ڈھیلے ملے لیکن زبان نے اُف بھی نہ کی۔ ایسی صورت حال میں جب سہیلیوں نے حال پوچھا تو بے اختیار صرف اتنا کہہ سکی۔

ترجمہ: بھیڑ ذبح ہو یا مینڈھا، للّہ کے مقدر میں پتھر کا ڈھیلا ہی ہے۔

''روایت میں لپٹی ہوئی بے شمار کہانیاں للّہ کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روز صبح سویرے دریا سے پانی لے آتی تھیں۔ اسی بہانے تھوڑی دیر کے لئے مندر میں چلی جاتی تھیں۔ اور پوجا سے فارغ ہو کر پانی کا بھرا ہوا مٹکا دریا سے لے آتی تھیں۔ ایک روز بھرا ہوا شوہر راستے میں ملا اور بہانہ تراش کر مٹکے کو چھڑی کی ضرب سے توڑ دیا۔ مٹکا ٹوٹ گیا لیکن پانی پدماوتی کے کندھے پر جما رہا جو چند ایک قطرے زمین پر گر پڑے ان میں سے ایک چشمہ پھوٹا جو آج تک لل تراگ کے نام سے مشہور ہے اور جس میں سے ابھی حالیہ برسوں تک پانی موجود تھا۔ اس واقعے سے نہ صرف للّہ کا شوہر مبہوت رہ گیا بلکہ ان کی پُراسرار شخصیت کا جادو لوگوں پر نقش ہو گیا۔ پدماوتی کے صبر کے سب بندھ ٹوٹ گئے۔ اندر کی آگ بھڑک اٹھی۔ ذوقِ جنون کو ہوا لگ گئی اور اپنے ان دیکھے پیا کے برہ نے مستی اور فقر کے لئے راستہ صاف کیا۔ پدماوتی نے دامن چاک کیا اور حق و صداقت کے سرچشموں کی تلاش اپنا مسلک بنالیا اور یہیں سے اس کا اصل سفر شروع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 25 برس کے لگ بھگ تھی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم ناتھ بزاز رقم طراز ہیں:

''اس کی ازدواجی زندگی کے زیادہ سال نہیں گزرے
تھے جب للّہ نے اپنے رشتوں ناطوں کو ترک کر کے
انسانی کنبے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا وہ نوجوان تھی۔
غالباً اس کی عمر 25 سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جب اس نے
گھریلو بندھنوں کو توڑ کر حق کی تلاش شروع کی''۔

((P.N. Bazaz :- Daughters of Vitasta page 127)

'' للہ اپنے جس معبود کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر دیوانہ وار گھومنے لگیں اس کی ہرادا ان کو بھا گئی تھی اور اس کے پیار کی کسک کو مدتوں سے اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں دستک دیتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جو چنگاری بھڑک اٹھی تھی وہ اب ایک شعلہ بن چکی تھی۔ من مندر کی اس جوت کا احساس انہوں نے ایک بار اس طرح دلایا:

ترجمہ: میں راہِ راست سے چلی آئی اور اسی طرح چلی بھی جاؤں گی

وہ مجھے ازل سے جانتا ہے مجھ جانی پہچانی کو کوئی کیا کرے

''لیکن پھر ایسے میں کبھی کبھی اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہا۔ اس بات کے باوجود کہ معبودِ حقیقی کا پیار اس کی نس نس میں رچا ہوا ہے اور وہ اس کے پیار کی دیوانی ہے لیکن اپنے میں اس قدر سکت نہیں پاتی کہ من موہنی صورت کا سامنا کرے۔ پیا کے گھر کا سفر طویل ہے۔ جیب خالی ہے، بحر بیکراں سامنے پڑا ہے۔ اس تند اور تیز اتھاہ سمندر کو کیسے پار کرے اور اپنے پیا سے جا ملے۔ اعتماد کی اس کمی کا احساس للہ یوں یاد دلاتی ہے:۔

ترجمہ:

''سیدھے راستے سے چلی آئی لیکن واپسی کا راستہ بھول گئی، ندی کے کنارے تک آتے آتے، شام ڈھل گئی۔۔۔ جیب خالی ہے مانجھی کو کیا دوں گی کہ نیا پار لگا دے۔''

''دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو کر للہ اپنے پیا کی تلاش میں سال ہا سال تک سرگرداں رہی۔ برہ کی آگ نے اسے مجذوب بنا دیا۔ وہ غاروں، بیابانوں، جنگلوں اور بستیوں میں ایک آوارہ گرد کی طرح گھومنے لگی۔ ظاہری وجود سے بے نیاز نہ تن ڈھانپنے کا غم اور نہ پیٹ پالنے کی پریشانی، ننگ دھڑنگ، دیوانی، وفورِ جذبات سے نڈھال گاتی اور ناچتی رہتی، پیٹ کا نچلا حصہ آہستہ آہستہ نیچے سرک گیا اور پوشیدہ اعضاء پر ستر کا کام کرنے لگا۔

اسی مستی کے عالم میں جب لوگ اسے دیوانی کہتے تھے وہ فرزانگی کی اعلیٰ منزل میں آگئی تھی اور اپنے مخصوص آہنگ کے ساتھ اپنی روح کا درد اور اپنی تلاش کی کسک ''واکھیوں'' کی صورت میں ڈھالنے لگیں۔ یہی ''واکھ'' آج کشمیری شاعری کا سرِ آغاز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے پس پشت ایک ایسی شخصیت کا بھرپور احساس سامنے آجاتا ہے جس پر گیان و عرفان کے خزانے وا ہو چکے ہوں جس میں بصیرت اور آگہی کی نہ بجھنے والی جوت جھلملاتی ہے۔ للہ نے اپنے گرو سِدھ شری کنٹھ سے جو گوو اپدیش پایا تھا۔ اس کی روشنی ہی میں للہ نے اپنے لئے ایک نیا راستہ تراش لیا۔ اپنی دیوانگی اور مستی کا راز اپنے ایک واکھ میں یوں بیان کیا ہے:۔

ترجمہ:

میرے گرو نے مجھے اُپدیش دیا۔ کہا باہر کی دنیا سے من کی دنیا میں چلی آؤ، اسی اپدیش نے میری کایا پلٹ دی اور میں عریاں ہو کر ناچنے لگی۔

'' للہ نے اپنے گیان وعرفان کی آگہی سے پہلے سدھ سری کنٹھ کے علاوہ کئی برہمن عالموں سے عارفانہ مناظرے کیئے۔ تلاش حق اور ذوق جستجو کو آگہی کی بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیا۔ اپنے نفس کی پاکیزگی اور تیاگ کی صداقت سے عرفان کی ارفع منزلیں حاصل کر لیں۔ حتیٰ کہ اپنے گرو سے جو شیومت کے فلسفے کا زبردست عالم تھا۔ کئی لحاظ سے آگے بڑھ گئی اور کئی مقامات ایسے بھی آئے جب گرو کو اپنے مرشد کے سامنے لاجواب ہونا پڑا۔ اسی زمانے میں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا للہ کی ملاقات کئی مسلمان عالموں، فاضلوں اور مشائخین کے ساتھ ہوئی جن میں سید جلال الدین بخاریؒ، سید حسین سمنانیؒ، سید امیر علی ہمدانیؒ جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان سے عارفانہ باتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کے سلسلے میں کئی روائتیں بیان کی گئی ہیں جن کا یہاں محل نہیں ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ ان ملاقاتوں کے دوران بہت سی باتوں کا ردوقبول ہوا۔ للہ نے بار بار اپنے واکھوں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے۔ انہیں نہ اندھ وشواس پر یقین تھا۔ نہ بت پرستی اور مورتی پوجا پر۔ وہ تہواروں اور بے معنی رسم ورواج کے خلاف تھیں۔ ان کا سب سے بڑا مسلک شو یعنی خدا کی تلاش تھی اور اس کے بعد اس کی ذات میں مدغم ہونے کی تڑپ۔ وہ اس دنیا سے نکل کر نجات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ وہ معرفت کی اس منزل پر پہنچ چکی تھیں جہاں ہندو اور مسلمان، رنگ ونسل، ذات اور خاندان کا کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ سب سے بڑی دولت اپنے آپ کو شناخت کرنا ہے اور اسی سے شو (ایشور) کو پایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے کہتی ہیں:

ترجمہ:

''شو ہر جگہ موجود ہے۔ ہندو اور مسلمان کے بھید بھاؤ سے پرہیز کر۔
اگر ذہن رسا ہے تو اپنے آپ کو پہچان یہی ایشور کی شناخت ہوگی''۔

'' للہ نے اپنے روحانی تجربوں کے اظہار کے لئے نظم کا میڈیم استعمال کیا۔ یہ میڈیم ان کے واکھ ہیں اور ان سے ہی کشمیری زبان کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم شاعرہ ہیں۔ ان کے سامنے کوئی روایتی تجزیہ یا نمونہ بھی نہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی بات کہنے اور منوانے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ للہ کی زبان اس وقت کی عام کشمیری زبان ہے اس میں صداقت اور حسن بیان کی دلیل ہے۔ جبھی ان کے واکھ زبان زدعام ہیں۔ للہ نئے نئے استعاروں سے خوبصورت پیکر تراش لیتی ہیں اور ان پیکروں سے معنی کی پرتیں کھل جاتی ہیں۔ یہ بلیغ اور بامعنی واکھ زندگی کی کتنی ہی مشکلوں کے لئے سہولت کے دروازے کھول دیتے ہیں اور توہمات اور تعصبات کے گھور اندھیروں میں کھوئے ہوئے انسانوں کو روشن مارگ کی سمت بتاتے ہیں۔ للہ ترکہ فلسفے کی رازدان ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ اور ایشور ایک ہیں۔ اس لئے وہ کٹر برہمنیت اور کٹر ملائیت کے تانے بانے کو کاٹ کر من کی دنیا میں سراغ زندگی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پوجا پاٹھ، دیروحرم اور مندر وخانقاہ تو صرف ظاہری مذہب کی علامتیں ہیں۔ اس سے گیان اور آگہی کی منزلیں شاید ہی مل سکیں۔ اصلی گیان تو باطن کا نور ہے۔ خودی کی شناخت ہے جہاں سے ازلی

نور میں جذب ہونے کی راہ نظر آتی ہے۔ کہتی ہیں

ترجمہ:

(میرے معبود! تم ہی آکاش ہو اور تم ہی پرتھوی ہو۔ تم ہی دن اور تم ہی رات ہو۔ تم ہی چندن اور پھول اور پانی ہو تم ہی سب کچھ ہو میں تمھاری پوجا میں کیا چڑھادوں۔)

" للہ ایشوری نے کسی مت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ ان کا کوئی پیرو کار تھا نہ چیلوں کی کوئی ٹولی۔ لیکن انہوں نے جس فلسفے اور پیغام کو لوگوں تک پہنچادیا۔ اس کی جڑیں دور دور تک پھیل گئیں۔ للہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک پیش رو کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے اپنی روحانی حیثیت سے قطع نظر ان کی ادبی حیثیت بھی ہمیشہ تابندہ رہے گی۔

للہ نے طویل عمر پائی۔ ان کی پیدائش ہی کی طرح ان کا انتقال بھی مؤرخین میں اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ صوفی کا خیال ہے کہ للہ نے آخری عمر میں اسلام قبول کیا تھا۔ (Sufi: kashmir Vol II page 385)

ان کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" للہ کافی بڑھاپے میں بیج بہاڑہ میں وفات پا گئیں۔ جو سرینگر کے جنوب مشرق میں 28 میل کے فاصلے پر ہے۔ جامع مسجد میں جنوبی مشرقی کونے پر آج بھی اس کے مزار کی نشاندہی کی جاتی ہے" (Sufi:kashmir Vol-IIpage 385)

" لیکن للہ کے اسلام قبول کرنے کی سند کسی بھی تاریخی یا نیم تاریخی دستاویز میں نہیں ملتی۔ مؤرخ حسن للہ کی وفات ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

- " مؤرخوں میں سے کوئی اس کی وفات کا قائل نہیں۔ مشہور ہے ایک دن بیج بہاڑہ کی جامع مسجد کی دیوار کے نیچے بیٹھی تھی اچانک آگ کے شعلے کی طرح چمک اٹھی اور یہ شعلہ فضا میں اوپر جا کر نظر سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد للہ عارفہ کو کسی نے نہیں دیکھا۔" (تاریخ حسن (تذکرہ اولیائے کشمیر) تیسرا حصہ، صفحہ 349)

آزاد نے اپنی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" میں محمد الدین فوق کے حوالے سے اس سلسلہ میں یوں لکھا ہے۔

" انگریز مفسر اس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب اس کی روح اس کے قفس عنصری سے نکلی تو وہ ایک شعلہ کی طرح بھڑکی اور ہوا کی طرح جسم سے نکل کر غائب ہو گئی۔ یہ واقعہ بیج بہاڑ میں پیش آیا لیکن اس کا جسم کہاں گیا۔ اس کے متعلق انگریز مفسر بھی خاموش ہے۔" (کشمیری زبان اور شاعری، جلد دوئم، صفحہ 125-126)

صوفی کی کتاب میں جس مقبرے کا ذکر آیا ہے۔ انگریز مفسر کے یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دوسرے مؤرخین بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ اس کی وفات کا ذکر بھی روایات میں لپٹا ہوا ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ للہ دید ایک بڑے مٹی

کے برتن میں سما گئیں اور دوسرا برتن اپنے سر پر رکھا اس کے بعد دو برتنوں کے درمیان اپنے آپ کو چھپا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب برتن ہٹایا گیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس طرح للہ دیدا اپنے معبود کے ساتھ ملیں۔ پروفیسر جے لال کول لکھتے ہیں۔

''للہ دیدا اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر سورگباش ہوگئیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان کی آخری آرام گاہ پر نہ کوئی سمادھی تعمیر ہوئی اور نہ کوئی مقبرہ۔''

پروفیسر موصوف نے سورگباش ہونے کے وقت للہ دید کی عمر لگ بھگ 71 برس کی بتائی ہے اور سن وفات 1388ء اور 1399ء کا کوئی درمیانی عرصہ بیان کرتے ہیں۔ للہ دید کی قد آور شخصیت کے اردگرد پراسراریت کا جو ہالہ کھینچ لیا گیا ہے۔ اس سے اس کی حقیقت افسانویت میں ڈھل گئی ہے، مگر حق بات تو یہ ہے کہ للہ ایک حقیقت ہے۔ زندہ اور تابندہ، اور کشمیر کو ان کی ذات بابرکات پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

حبہ خاتون۔۔ لالہ رُخ، سمن برے:

کشمیر کی نور جہاں، کشمیری زبان میں حُبہ خوتن اردو میں حبہ خاتون کے نام سے جانی جاتی ہے۔ سلیم خان گمی نے اسے ''لالہ رُخے، سمن برے، کہا ہے۔ ان کی بیان کردہ کہانی کے مطابق:

''حبہ خاتون کا اصلی نام زون تھا۔ زون کشمیری زبان میں چاند کو کہتے ہیں۔ حبہ خاتون کا یہ نام اس کے والدین نے رکھا تھا۔ اس لئے کہ جب وہ پیدا ہوئی تو نہایت خوبصورت تھی۔ زون کو حبہ خاتون کا نام کشمیر کے حکمران اور حبہ خاتون کے دوسرے شوہر یوسف شاہ چک نے دیا تھا۔ حبہ خاتون کا پہلا شوہر ایک تغافل کیش اور لاپروا کسان نوجوان تھا۔

حبہ خاتون چندن ہار میں پیدا ہوئی۔ جسے بعض کتابوں میں چندر ہار لکھا گیا ہے۔ چندن ہار نام کا گاؤں دریائے جہلم سری نگر سے دس میل دور پانپور کے زعفران زاروں سے دواڑھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ گاؤں سرسبزی وشادابی کے لئے مشہور ہے۔ حبہ خاتون کے والدین کاشتکار تھے۔

حبہ خاتون نے اپنے گاؤں میں مروجہ تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں اسلامی گھرانے اپنے بچے اور بچیوں کو قرآن کریم اور گلستان بوستان پڑھانا فریضہ اولین خیال کرتے تھے۔ حبہ خاتون نے اس کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی رسالوں کا بھی مطالعہ کیا۔

جونہی حبہ خاتون نے عالم شباب میں قدم رکھا۔ اس کی شادی ایک کسان نوجوان سے کردی گئی۔ جس نے اس کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ حبہ خاتون کی ساس جھگڑالو قسم کی عورت تھی۔ اس نے ہمیشہ حبہ خاتون کو تنگ کیا اور اس کے لئے بلائے جان بنی رہی۔ اس نے اپنے لڑکے کو بہو کے خلاف ہمیشہ بھڑکایا۔ گھر میں افلاس تھا اس لئے ساس کے طعنوں میں جھلاہٹ اور شدت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ حبہ خاتون کا شوہر نکھٹو، کام چور اور کاہل قسم کا آدمی تھا۔

وہ الٹا اس کو برا بھلا کہتا اور اپنی ماں کا ساتھ دیتا۔ روز روز کی چخ چخ آخر کار رنگ لائی اور زون کو طلاق مل گئی۔ اس کے لئے یہ صدمہ بے حد اضطراب انگیز تھا۔

دل کا ملال دور کرنے کے لئے حبہ خاتون گیت کہنے اور گانے لگی۔ وہ زعفران کے لہلہاتے کھیتوں میں گھومتی اور دکھ بھری آواز میں گیت گاتی۔ اس دکھ کے گیت جو وہ جھیل رہی تھی اور اس خوشی کے گیت جس کی امید سے اس کی دنیا آباد تھی۔

ایک دن کشمیر کا حکمران یوسف شاہ چک اپنے مصاحبین کے ہمراہ زون کے گاؤں میں سے گزرا۔ اس نے زعفران کے کھیت میں زعفران کے پھول چنتی اور گیت گاتی لڑکی دیکھی۔ زون کی ملکوتی آواز، حسین مکھڑے، سیاہ زلفوں اور نازک جسم نے بادشاہ پر جادو کر دیا۔ اس نے زون کے والدین سے بات طے کی اور اس کے ساتھ شادی کر کے ایک دیہاتی لڑکی کو حبہ خاتون اور کشمیر کی نور جہاں بنا دیا۔ یوسف شاہ چک اس وقت تک حبہ خاتون کی زلف گرہ گیر کا اسیر رہا جب تک مغل اعظم، اکبر نے کشمیر پر قبضہ کر کے اسے پٹنہ میں قید نہیں کر دیا۔

حبہ خاتون کی زندگی اور زمانے کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ یوسف شاہ چک کے کردار اور عہد کا مطالعہ کیا جائے۔ ایک مطلقہ کسان لڑکی کو اپنی ملکہ بنانے والے حکمران کی شخصیت یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتی۔

1063ھ میں یوسف شاہ چک کا تایا حسین شاہ کشمیر کا بادشاہ بنا۔ وہ ایک عادل اور رعایا پرور بادشاہ تھا۔ وہ مذہبی امور میں ہمیشہ نرم روی اور فراخ دلی کا قائل تھا۔

1064ھ میں حسین شاہ نے یاد الٰہی کی خاطر دنیا اور کاروبار سلطنت سے ترک تعلق کر کے تاج و تخت چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کشمیر کے تخت کا کون وارث ہوگا۔ اس پر حسین شاہ کے امراء وزراء یوسف شاہ چک کے والد حسین شاہ کے چھوٹے بھائی علی خان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ حسین شاہ کا وزیر اعلیٰ سید مبارک خود بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امراء کا ایک گروہ بڑی شدت سے اس کی حمایت کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ علی خان کو کشمیر کا حکمران بنانا چاہتا تھا۔ اس طرح یوسف شاہ اور اس کے باپ علی خان میں تخت کشمیر کے لئے ٹھن گئی۔ آخر یوسف شاہ کے والد نے فوج کی حمایت حاصل کر لی اور 1070ھ میں علی شاہ چک کے لقب سے کشمیر کا بادشاہ بنا۔

علی شاہ چک نے سید مبارک کو معاف کر دیا اور اسے اپنے بڑے بھائی حسین شاہ کی طرح وزیر اعلیٰ رہنے دیا۔ سید مبارک نے بڑی دانش مندی سے یوسف شاہ چک اور اس کے باپ کی شکر رنجی دور کر دی اور یوں وہ بدمزگی دور ہو گئی جو حصول تخت کے لئے باہمی اختلاف کے باعث پیدا ہوئی تھی۔

علی شاہ چک کے عہد حکومت کا اہم ترین واقعہ مغل بادشاہ اکبر کے دو سفیروں قاضی صدر الدین اور مولانا عشقی کی کشمیر میں آمد ہے۔ اکبر نے اس کی وساطت سے علی شاہ چک کو باہمی ازدواجی روابط قائم کرنے کے لئے کہا تھا۔ علی شاہ چک نے اکبر کی بات تسلیم کر لی اور اپنے بڑے بھائی حسین شاہ کی بیٹی کا رشتہ اکبر کو دیا۔ اس کے علاوہ علی

شاہ نے کشمیر میں اکبر کے نام کے سکے بھی جاری کیئے۔

1079ھ میں علی شاہ فوت ہو گیا اور یوسف شاہ چک تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی اپنے تایا اور باپ کے آزمودہ وزیراعلیٰ سید مبارک کو اپنا وزیراعلیٰ بنایا اور سلطنت کا سارا کاروبار سید مبارک کے سپرد کر کے خود عیش ونشاط کی محفلوں میں گم ہو گیا۔

سید مبارک چک خاندان کا قدیم نمک خوار تھا۔ اس نے یوسف شاہ کی عیش کوشی پر معترض ہو کر وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ یوسف شاہ چک نے اس کی جگہ محمد بٹ کو بٹھایا اور خود دوبارہ عیش وعشرت میں کھو گیا۔

بادشاہ کی لاپرواہی، عیش پرستی اور بے حسی سے تنگ آ کر امراء وزراء نے بغاوت کر دی۔ مستعفی وزیراعلیٰ سید مبارک نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ بغاوت کر کے نمک حرامی کا ثبوت نہ دیں لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا۔

آخر سید مبارک نے یوسف شاہ چک کو کہلا بھیجا کہ وہ بغاوت سختی سے کچل دے۔ یہ مشورہ نیک تھا اور حالات ایسے ہی اقدام کا تقاضہ کرتے تھے۔ مگر بجائے اس کے کہ یوسف شاہ چک سید مبارک کے مشورے پر عمل کرتا۔ اس نے نادانی سے سید مبارک پر الزام لگایا کہ وہ باغیوں کو شہہ دے رہا ہے۔ اور اصلی باغی وہی ہے۔ چنانچہ اس نے سید مبارک کو حکم دیا کہ وہ ان باغی امیروں اور وزیروں کو زنجیروں میں جکڑ کر اس کے حضور میں پیش کرے۔ سید مبارک نے اس کا یہ حکم سن کر ہتک محسوس کی اور غصے میں آ کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ دونوں کے حامیوں میں لڑائی ہوئی۔ سید مبارک جیت گیا۔ اور یوسف شاہ نے پہاڑوں کے پیچھے جنگلوں میں چھپ کر جان بچائی۔

''اب سید مبارک کشمیر کا بادشاہ تھا اور یوسف شاہ چک بے یارومددگار دشتِ نورد تھا۔ لیکن سید مبارک نے چند ماہ بعد تخت چھوڑ دیا اور یوسف شاہ چک کو دعوت دی کہ وہ تخت نشین ہو۔ سید مبارک کے امیر عساکر ابدال بٹ نے یوسف شاہ چک کی مخالفت کی اور اس کے چچیرے بھائی گوہر شاہ کو مدد دے کر تخت پر بٹھایا۔ ابدال بٹ نے خود گوہر شاہ کا وزیراعلیٰ بننے ہی کے لیئے اس کی مدد کی تھی۔ گوہر شاہ 1079ھ میں تخت پر بیٹھا۔

جنوری 1080ھ میں یوسف شاہ چک اکبر اعظم کو فتح پور سیکری میں ملا اور التجا کی کہ اسے کشمیر کا تخت دلانے میں مدد دی جائے۔ اکبر نے راجہ مان سنگھ اور مرزا یوسف کی سرکردگی میں اپنی فوج کشمیر روانہ کی لیکن اکبر کی فوجوں کو لڑنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یوسف شاہ چک اور ابدال بٹ کے حامیوں میں لڑائی ہوئی۔ ابدال بٹ لڑائی میں کام آیا۔ گوہر شاہ تخت چھوڑ کر بھاگ گیا اور یوسف شاہ چک دوبارہ 1080ھ میں کشمیر کا بادشاہ بن گیا۔

لیکن اس خرابی بسیار کے باوجود یوسف شاہ نے نصیحت نہ پکڑی اور حبہ خاتون کی معیت میں سیر وتفریح اور عیش وعشرت میں کھو گیا، جس سے امراء، وزراء بدگمان ہو گئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ یوسف شاہ چک کی اصلاح ناممکن ہے۔ سازشیوں نے سر نکالا جن میں خود بادشاہ کا بیٹا یعقوب خان بھی شامل تھا۔

باغیوں نے یوسف شاہ چک کے خلاف اکبر سے مدد چاہی۔ اکبر چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح کشمیر پر قبضہ

کر لے۔ اسے معقول بہانہ ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس نے یوسف شاہ چک کو شکست دینے کے لئے مرزا اعلیٰ اکبر کی سرکردگی میں بہت بڑی فوج کشمیر روانہ کی۔ یوسف شاہ نے اکبر کی فوجوں کے مقابلے کا تہیّہ کیا لیکن دونوں فوجوں میں لڑائی نہ ہو سکی۔ بارشوں اور برف باری کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ جس سے آمد و رفت کے راستے بند ہو گئے۔ اس لئے اکبر کی فوجوں کی پیش قدمی رک گئی۔

اس دوران میں اکبر نے اپنا ایک سفیر، تیمور بیگ، یوسف شاہ کے پاس بھیجا تا کہ باہمی گفت وشنید سے معاملہ طے ہو جائے۔ یوسف شاہ نے اپنے بیٹے یعقوب خان کو (باپ بیٹے کے اختلاف اب ختم ہو گئے تھے) اکبر کے دربار میں بھیجا اسی اثنا میں اکبر کا سوتیلا بھائی مرزا حکیم جو کابل کا والی تھا، فوت ہو گیا۔ اکبر نے کابل جانے کا قصد کیا اور یوسف شاہ کو پیغام بھیجا کہ وہ مغل بادشاہ کو راستہ میں ملے۔ یوسف شاہ نے اکبر کے اس حکم کو بے عزتی اور ہتک پر محمول کیا اور اکبر کو ملنے نہ گیا۔ اکبر سخت ناراض ہوا اور حکم دیا کہ یوسف شاہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کے دربار میں حاضر ہو۔

جب حالات زیادہ بگڑے تو یوسف شاہ کے بہی خواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اکبر کے دربار میں ہرگز نہ جائے۔ کیونکہ اکبر کی نیت کچھ درست معلوم نہیں دیتی۔ لیکن یوسف شاہ اکبر کے مصاحب راجہ بھگوان داس کی تسلی او راعتماد پر اکبر کو ملنے کے لئے چل پڑا۔

یوسف شاہ کی عدم موجودگی میں اس کے مخالف عناصر کو سنہری موقع ہاتھ آیا۔ انہوں نے اس کے بیٹے یعقوب خان کو تخت پر بٹھا دیا اور اکبر کی فوجوں پر حملہ کر دیا جو کشمیر میں پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ یعقوب خان اور اس کے ساتھیوں کو شکست ہوئی۔ اکبر نے یوسف شاہ کو پٹنہ کی جیل میں ڈال دیا اور 1086ھ میں کشمیر کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا لیا۔

یوسف شاہ سیاسی تدبیر میں کورا تھا۔ وہ عیش ونشاط کا دلدادہ تھا اور اہل فن کی قدر کرتا تھا۔ اس کے دربار میں ہر وقت خوبصورت رقاصاؤں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور سازندے ہر وقت تیار رہتے۔ رامش ورنگ کی محفل تھی اور سراپا حسن وشباب اور نزاکت حبّہ خاتون مرکز محفل ہوتی۔

یوسف شاہ حبّہ خاتون سے بے حد محبت کرتا تھا اور وہ اسے دل وجان سے چاہتی تھی۔ وہ چودہ سال کشمیر کی ملکہ رہی اور اپنی زندگی کا یہ عرصہ اس نے گل مرگ، سونا مرگ اور ڈل کے حسین مناظر میں یوسف شاہ کے ساتھ گزارا۔ یوسف شاہ نے اسی کی خواہش کے مطابق دریائے جہلم پر کدل یعنی پل بنایا اور اس کا نام 'حبہ کدل' رکھا۔

یوسف شاہ کچھ عرصہ پٹنہ میں قید رہا۔ پھر اسے اکبر نے معاف کر دیا اور پانچ ہزار کا منصب دے کر بنگال بھیج دیا۔ جہاں وہ 1090ھ میں فوت ہو گیا۔

حبّہ خاتون، یوسف شاہ چک کے ہمراہ اکبر کے دربار میں نہیں گئی تھی، جب تک یوسف شاہ قید رہا۔ وہ سری

نگر میں اپنی زندگی کے دن جوں توں کر کے اس امید پر کاٹتی رہی کہ کبھی تو وہ اس سے مل سکے گی لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور آخر جب 1090ھ میں چک خاندان کا آخری تاجدار مر گیا اور حبہ خاتون کو اس کی موت کی اطلاع ملی، تو اس کی دنیا تاریک ہو گئی۔ وہ سری نگر سے تین میل دور ایک گاؤں کی مسجد میں دنیا سے قطع تعلق کر کے یاد الٰہی میں محو ہو گئی۔

حبہ، انیس برس کی عمر تک محض ایک دیہاتی دوشیزہ تھی اور اس کی زندگی سادہ رہی۔ چودہ برس کشمیر کی ملکہ رہی اور اس نے بڑی پُر کیف زندگی بسر کی۔ بیس سال وہ تارک الدنیا رہی اور پچپن سال کی عمر میں فوت ہو گئی۔

حبہ خاتون ساری عمر کسان لڑکی رہی۔ اس نے ملکہ بن کر بھی ان جذبات اور محسوسات سے منہ نہ موڑا جو ایک سیدھی سادی کسان لڑکی کی ذہنی زندگی کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ اس نے اپنے گیتوں میں کشمیر کی لاکھوں کسان اور مزدور عورتوں کے جذبات کی نمائندگی کی ہے۔ بھلا فلاکت زدہ کشمیر کی بہو بیٹیوں کے جذبات سوائے حزن و ملال کے اور ہو بھی کیا سکتے ہیں؟ چنانچہ حبہ خاتون کی غزلوں اور گیتوں میں رنج و الم کی جو کیفیت ملتی ہے۔ وہ کشمیری عورت کی ذہنی زندگی کی صحیح طور پر عکاسی کرتی ہے۔ تاہم دکھ کی بات بھی پھولوں کی زبانی ادا ہوئی ہے۔

حبہ خاتون کے گیتوں اور غزلوں کی زبان سادہ، سلیس اور واضح ہے۔ وہ مبہم بات نہیں کہتی۔ مخصوص جذبے یا خیال کو سیدھے سادے لفظوں کے پیکر میں ڈھال دیتی ہے اور اس طرح گیت سننے یا پڑھنے والا بڑی شدت سے وہی محسوس کرتا ہے جو حبہ خاتون نے محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنے گیتوں اور غزلوں میں خالص کشمیری زبان برتی ہے اور سنسکرت، فارسی یا عربی کے الفاظ استعمال نہ کرنے کی قصداً کوشش کی ہے۔ حبہ خاتون کے گیتوں کو کشمیری عوام نے لوک گیتوں کا مقام و درجہ عطا کیا ہے اور یہ بات کسی شاعر یا شاعرہ کے لئے باعثِ فخر بھی ہوتی ہے اور اس کی عظمت کی دلیل بھی۔

کشمیری زبان میں المیہ گیت کو ''ودا کھ'' کہا جاتا ہے جس کے لفظی معنی دکھ کے ہیں۔ ودا کھ وہ گیت ہے جس میں ایک چاہنے والا دل اپنے محبوب کو نہ پا کر المیہ اور اضطراب آمیز جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ حبہ خاتون کا وہ ودا کھ ملاحظہ کیجئے، جو اس نے اپنی ساس کے ہاتھوں مصیبت برداشت کرنے کے زمانے میں لکھا تھا۔

> ''میں سسرال میں گرفتار رنج و بلا ہوں۔ میکے والو میرے دکھ کا مداوا کرو۔ ساس اور بہو میں پیار اور سلوک تھا مگر نند کو یہ بات نہ بھائی۔ نند اب مجھے نشانہ ستم بنا رہی ہے۔ میکے والو! میرے دکھ کا مداوا کرو''

ایک اور ودا کھ میں پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب، یوسف شاہ سے ملنے کی آرزو پائی جاتی ہے۔ حبہ خاتون کی یہ آرزو کبھی بھی پوری نہ ہو سکی اور آخر حسرت کا روپ دھار کر اس کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو گئی۔

> ''میرے محبوب تو کہاں چلا گیا ہے؟

میں تیرے لئے چراگاہوں میں پھول بکھیر دوں گی
آ جا میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب آ جا!
میرے محبوب! تو آ جائے تو ہم دونوں مل کر چنبیلی کے پھول چنیں۔
بھلا مرنے کے بعد بھی کوئی واپس آیا ہے؟
میں تیرا انتظار کر رہی ہوں۔آ جا میرے پھولوں سے پیار کرنے والے محبوب آ جا!''

کشمیری میں پیار کے گیت کو ''لول'' کہتے ہیں جس کے معنی ہیں دل کی دھڑکن۔اس کی کامیابی کی شرط یہ ہے کہ دل گرفتار محبت ہو۔حبہ خاتون نے کئی ''لول'' لکھے جو کشمیری دوشیزاؤں میں بے حد مقبول ہیں۔حسن و محبت کا یہ گیت فی الحقیقت نہایت نازک اور کومل احساسات کا دلفریب پیکر ہوتا ہے۔حبہ خاتون سے پہلے کشمیری میں ''لول'' نہیں کہا جاتا تھا۔یہ کشمیری ادب کو حبہ خاتون کی دین ہے۔

''میرے محبوب میں تیرے لئے کنول کے پھول تلاش کر کے لاؤں گی۔تو مجھ سے روٹھ نہ جانا
میرے محبوب حبہ خاتون عاجزی سے عرض کرتی ہے کہ اس کی محبت سے لطف اٹھاؤ''

ایک اور لول کے الفاظ ہیں:۔

''میرے محبوب! جاگ محبت کی شراب کے جام تیرے سامنے بھرے پڑے ہیں
میرے محبوب اٹھ میں تیرے لئے صراحی سے الفت کی شراب انڈیلتی ہوں
تیرا پیار مجھ سے یوں لپٹ گیا ہے جیسے آکاس بیل درخت سے لپٹ جاتی ہے
میرے محبوب جاگ!''

یہ لڑکی جو ملکہ اور جوگن بنی نہ صرف شعر کہتی تھی اور خوش گلو تھی بلکہ کشمیری راگنیوں کے بارے میں بھی اس کا علم پیشہ ور مغنیوں کی نسبت کہیں زیادہ تھا۔مروجہ راگ راگنیوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس نے موسیقی میں اختراعیں بھی کیں۔اس نے کشمیری موسیقی میں ''راست راگ'' کا اضافہ کیا۔''(14)

اکہ ننندن۔ ایک لوک بیانیہ:

کشمیری لوک کہانیوں میں یہ انتہائی مقبول لوک کہانی ہے۔سلیم خان گمی کے بیان کے مطابق:

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب جھیل ولر بالکل خشک تھی اور یہاں عالی شان محلات بنے ہوئے تھے۔انہی میں سے ایک محل میں ایک نیک دل اور خدا ترس مہاراجہ رہتا تھا جس کی مہارانی کا نام رتن مالا تھا۔مہارانی بھی دل کی بہت اچھی تھی مگر بدقسمتی سے ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اور وہ دونوں ہر روز دعا کرتے تھے کہ ان کے ہاں اولاد ہو۔

آخر ان کی التجا قبول ہوئی اور ایک دن ایک جوگی ان کے محل میں آیا۔اس نے مہاراجہ اور مہارانی سے کہا کہ ان کے

ہاں جو بچہ پیدا ہوگا وہ بارھویں سال اس کو دے دیا جائے۔ ورنہ ان کے یہاں کبھی بچہ پیدا نہ ہوگا۔

اگر چہ شرط بڑی کڑی تھی مگر دونوں نے اولاد کی چاہت میں اسے قبول کر لیا اور ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اکہ نندن رکھا گیا۔ یہ بچہ بہت خوبصورت اور معصوم تھا۔ ماں باپ اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ ان کی آنکھ کا تارا اور زندگی کا سہارا تھا۔ ہر شخص اس سے پیار کرتا اور اس کی ذہانت اور چلبلی طبیعت کو دیکھ کر تعریف کرتا۔

ہوتے ہوتے گیارہ سال گزر گئے اور ایک دن جوگی نے محل کے دروازے پر دستک دی۔ مہاراجہ اور مہارانی نے اسے اندر بلوایا اور احترام سے بٹھایا۔ جوگی نے کہا اب وہ اپنا وعدہ پورا کریں اور بچہ اس کے حوالے کر دیں۔

اکہ نندن اس وقت پاٹھ شالہ میں پڑھنے گیا ہوا تھا۔ ماں باپ نے اسے بلایا اور روتے ہوئے اسے جوگی کے حوالے کر دیا لیکن جوگی نے بچہ کو ساتھ لے کر جانے کی بجائے ایک عجب حکم دیا۔ اس نے کہا اسے یہیں ذبح کیا جائے اور پکا کر اس کے سامنے رکھا جائے کیونکہ وہ بھوکا ہے اور اپنی بھوک دور کرنا چاہتا ہے۔ اس خوفناک حکم کو سن کر سب کے اوسان خطا ہو گئے خوف کے مارے ماں باپ کے منہ سے چیخیں نکل گئیں مگر جوگی بالکل اطمینان سے بیٹھا تھا اور اپنی شرط پوری کرانے پر مصر تھا۔

مجبوراً مہاراجہ اور مہارانی نے اپنے پیارے بیٹے کو ذبح کیا اور اس کا گوشت پکایا۔ جوگی نے اکہ نندن کے ماں باپ سے کہا وہ سب لوگوں کے لئے بچے کا گوشت رکھیں تا کہ سبھی چکھ سکیں اور خود مہاراجہ اور مہارانی بھی اسے کھائیں۔ جوگی نے یہ بھی کہا کہ اکہ نندن کے لئے بھی اس کے بدن کا بھنا ہوا گوشت رکھا جائے کیونکہ وہ پاٹھ شالہ سے واپس آ کر اسے کھائے گا۔

جوگی نے مہاراجہ اور مہارانی سے کہا کہ وہ رونے پیٹنے کی بجائے اکہ نندن کو پکاریں، وہ آ جائے گا۔ چنانچہ اکہ نندن کو پکارا گیا تو وہ اپنے معصوم چہرے پر شوخ مسکراہٹیں لئے سامنے آ گیا۔ اور کہنے لگا ''ماں میں پاٹھ شالہ سے آیا ہوں، بڑی بھوک لگی ہے۔ کھانے کو جلد کچھ دو!'' والدین نے حیران ہو کر بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور جوگی کی طرف دیکھا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔

کشمیری زبان کی یہ قدیم لوک کہانی کشمیر کے لوک ادب میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور ہر کشمیری کو زبانی یاد ہے۔ خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی۔ بیاہ شادی پر لوگ اسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یہ کہانی سب سے پہلے رمضان بٹ نے نظم کی اور اس کے بعد احمد زرگر اور صمد میر اور علی وانی نے بھی اسے نظم کیا لیکن جو شہرت اور مقبولیت رمضان بٹ کی کہانی کو نصیب ہوئی وہ دوسروں کی کہانیوں کو میسر نہیں ہوئی۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ کہانی ایک تمثیل ہے جس میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ اگر ہم نفس امارہ پر قابو پالیں تو ہمیں وہ سکون قلب حاصل ہو سکتا ہے جسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔'' (15)

لڈی شاہ۔۔ایک سماجی لوک بیانیہ:

لڈی کشمیری لوک شاعری کی ایک اہم صنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقبول لوک کردار بھی ہے۔علی محمد لون کی رائے کے مطابق ''کسی ملکی یا عوامی واقعہ، کسی قدرتی حادثے، یا کسی خاص اور اہم انسانی تجربے کو کچھ اس طرح اپنے سامعین کے سامنے لانا ہے کہ بیک وقت تین مقاصد پورے ہوتے ہوں۔'' (16)

1۔ تفریح کا سامان پیدا کرتا ہے

2۔ سرکاری بیانیہ سے بالاتر ہو کر یہ حادثہ یا واقعہ خالص لوک اور عوامی انداز میں لوگوں کے سامنے آجاتا ہے۔

3۔ اس واقعہ میں بیان کردہ انسانی مصائب یا المیہ پر مزاح کا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔

علی محمد لون کے مطابق:

لڈی شاہ میں روزمرّہ گھریلو حالات اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں پر طنز و مزاح کا رنگ چڑھانے کے علاوہ اکثر اوقات ایسے کسی واقعہ یا حادثے کا ذکر ہوتا ہے، جس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی جسمانی ذہنی یا نفسیاتی زندگی متاثر ہو چکی ہو۔کشمیر میں جب پہلی بار ہوائی جہاز آیا تھا، اس موقعہ پر لڈی شاہ نے ایک گیت لکھا تھا جو اب بھی زبان زدِ خاص و عام ہے:

ہوائی جہاز کشمیر میں آگیا
جس کسی نے بھی اسے دیکھا
اس کی زبان سے استغفر اللہ نکلا!

زلزلہ، قحط، سیلاب، کوئی بہت ہی زبردست آگ، کوئی حملہ یا کوئی نیا تصور، زندگی کی کوئی نئی کروٹ، کوئی سماجی یا اخلاقی خرابی اور بہت سے سیاسی موضوعات وغیرہ لڈی شاہ کے کلام میں وقتاً فوقتاً جگہ پاتے رہے ہیں اور یہ سب ہم تک ایک خاص عوامی اور لوک مزاح کے ساتھ آتے رہے ہیں۔

1947ء میں کشمیر پر حملہ ہوا۔رسل و رسائل کے ذرائع منقطع ہو گئے۔ضروریات زندگی کی درآمد رک گئی۔ نمک بازار سے غائب ہو گیا۔پہلے نمک چھ پیسے سے دو آنے تک سیر بکتا تھا اور اب لوگ دس روپے سے سولہ روپے تک سیر خریدنے کو تیار تھے۔غرض ایسا قحط پڑا کہ الامان والحفیظ! لڈی شاہ نے اس واقعہ کو قلم بند کیا۔

(1) ذرا رُک جاؤ۔میری بات سنو!
میں تمہیں نمک کے قحط کا قصہ سناؤں گا
خاوند اپنی بیوی سے بدگمان ہے
اور اس نے گھریلو ضروریات کی چیزیں مقفل رکھی ہیں
وہ خود ہی چابی لے کر یہ چیزیں بیوی کو دیتا ہے

اس ڈر سے کہ بیوی کہیں اسراف نہ کرے!
ذرا رُک جاؤ، میری بات سنو
میں تمہیں نمک کے قحط کا قصہ سناؤں گا!

(2) خاوند بیوی کے منع کرنے کے باوجود اپنی ضد پر اڑا ہے
اور وہ چولہے ہانڈی کی برابر نگہبانی کئے جا رہا ہے
کہ کہیں بیوی نمک کا کوئی ٹکڑا چھپا کر نہ رکھے
میں تمہیں نمک کے قحط کا قصہ سناؤں گا!

نمک کا قحط تو ایک عارضی حادثہ تھا۔ کسی سال جب فصلیں اچھی ہوتی ہیں اور کوئی ان ہونی بات نہیں ہوتی تو دیہاتوں میں بہت سی شادیاں رچائی جاتی ہیں۔ ہر طرف براتیں نکلتی ہیں۔ گانے ہوتے ہیں ضیافتیں پکتی ہیں اور شادیوں سے متعلق پیشہ ور لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر لڈی شاہ کہتا ہے ۔

دیہاتوں اور شہروں میں شادیوں کی دھوم ہے
بیٹی والوں نے بیٹے والے کو کہلا بھیجا
کہ وہ برات لے کر سہ پہر کو پہنچ جائیں!
نہ پہنچے تو شام کو برأت کا سواگت طلاق کے کاغذ سے کیا جائے گا
دیہاتوں اور شہروں میں شادیوں کی دھوم ہے

لڈی شاہ اب بھی دیہاتوں اور شہروں میں اتنا مقبول اور ہر دل عزیز ہے کہ لوگ جوں ہی اسے آتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے چہرے اپنے آپ کھل اٹھتے ہیں اور وہ لڈی شاہ کے اردگرد جمع ہو کر اس سے گانے کی فرمائش کرتے ہیں، اس کا طنز و مزاح سُن کر وہ کچھ دیر کے لئے تفریح حاصل کرتے ہیں، ہنستے ہیں خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ اکثر موقعوں پر ان ہی لوگوں پر طنز بھی کیا جاتا ہے۔ لڈی شاہ صنف کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آج کل بعض لوگ اس صنف میں ایک دوسرے پر ہجو لکھتے ہیں۔ یا کسی بھی اچھے یا خراب سیاسی نظریے کا پرچار بھی کرتے ہیں۔ ''آزاد کشمیر'' ریڈیو ار ریڈیو کشمیر سری نگر سے اکثر سیاسی موضوعات پر لڈی شاہ نشر ہوتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ لڈی شاہ دونوں طرف کے سننے والوں میں خاصے مقبول ہیں۔''(17)

کشمیری لوک دانش:

اپنی متنوع ثقافت کے باعث کشمیری زبان اور اس کی ادبیات لوک دانش کے شاندار خزانہ سے مالا مال ہیں۔ یہ کشمیری ضرب الامثال ہیں جو اپنے دامن میں صدیوں کی دانش کو سموئے ہوئے ہیں۔ میر غلام احمد کشفی، سلیم خان گمی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''کشمیری زبان میں ضرب الامثال اور محاورات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ شیخ نورالدین، للّہ عارفہ، بابا نصیر الدین، ارنی مال اور حبہ خاتون کی ساری شاعری ضرب الامثال اور محاورات پر مشتمل ہے۔ جو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اس کے علاوہ بعد کے لوگوں نے فارسی، عربی اور انگریزی کی ضرب الامثال کے ترجمے کر کے اپنی زبان کو وسعت دی ہے۔ کہیں کہیں عربی اور فارسی کی ضرب الامثال من وعن اپنائی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے کشمیری زبان کی ضرب الامثال کا احاطہ بہت بڑا کام ہے۔'' (18)

غلام احمد کشفی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سلیم خان گمی لکھتے ہیں۔

''یقیناً یہ کام بڑا کٹھن ہے، دنوں اور ہفتوں کا نہیں، ماہ و سال کا کام ہے کیونکہ خالص کشمیری ضرب الا مثال اور محاورات کشمیر کے دیہات میں بڑے بوڑھے کسان اور معمر بیبیاں استعمال کرتی ہیں۔ آزاد کشمیر اور پاکستان کے شہروں میں بولی جانے والی کشمیری زبان خالص کشمیری زبان نہیں۔ اس میں اردو، فارسی کے کثیر الفاظ شریک ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ''شاعر'' کے لئے خالصتاً کشمیری لفظ ''گونمات'' ہے جو صرف دیہات میں بسنے والے لوگ بولتے ہیں۔ شہروں کے باسی اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے۔ کشمیری لفظ ''بس لوٹھ'' بھی صرف کشمیر کے دیہاتی بولتے ہیں۔ لفظ ''بس لوٹ'' شور و غوغا کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کشمیری ضرب الامثال اور محاورات آہستہ آہستہ معدوم ہو رہے ہیں اور کشمیری زبان کی بقا اور تحفظ کا کام لسانیات کے ماہروں کو فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ (19) ''

کشمیری ضرب الامثال اور محاورات کا تحفظ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اہل کشمیر کے متنوع کلچر کا عکس ان میں ملتا ہے کشمیری کا اندازِ فکر کیا ہے، طرز بود و باش کیا ہے۔ وہ کونسی عمرانی قدریں ہیں جن سے انہیں پیار ہے اور وہ کونسی ذہنی و سماجی برائیاں ہیں جن سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ اخلاق و اصلاح کے وہ کون سے پیمانے ہیں جن کے توسط سے وہ اپنوں اور بیگانوں کو میزان نقد پر تولتے ہیں۔ یہ اور ایسے کئی دوسرے سوالوں کا جواب ان ضرب الامثال میں ملتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

1۔ ترجمہ: پانی، پانی میں مل گیا اور دودھ دودھ میں

فارسی، مال حرام بود بجائے حرام رفت

تشریح: جب کسی بدقماش آدمی کی کمائی ضائع ہو جائے اور منفعت کا مقصد فوت ہو جائے تو اس وقت بولتے ہیں۔

2۔ ترجمہ: اندھے دیکھ بھال کے لئے ہیں اور کانے کوٹنے کے لئے

فارسی: کار نجار بدست گلکار۔

تشریح: انتظامی حلقوں میں بعض اوقات بڑی بوالعجبیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اگر کسی ملک میں

خویش پروری کے طفیل کوئی جاہل سیاسی کارکن شعبہ تصنیف و تالیف کا انچارج بن جائے اور ایسے آدمی کو افسر مال لگا دیا جائے جو پٹواری کے کام سے بھی واقف نہ ہو تو اس وقت طنزیہ طور پر یہ ضرب المثل استعمال میں لائی جائے گی۔ یعنی غلط آدمی کے سپرد کام کرنا۔

3۔ ترجمہ: ٹھنڈے کو ٹھنڈا کرنا اور گرم کو گرم

تشریح: دیہات میں آئے دن معمولی نوعیت کے جھگڑے سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ اگر چند مخلص بزرگ ان جھگڑوں کو موقع پر ختم نہ کر دیں تو فساد کے بڑھ جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ بزرگ عام طور پر خلوص نیت سے بُرے آدمی کو بُرا اور سچے کو سچا کہتے ہیں۔ اگر کوئی قصوروار بڑھ چڑھ کر باتیں کرے تو اسے ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اس طرح مناقشت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی خلوص نیت سے تصفیہ کی کوشش کرنا۔

4۔ گیدڑیوں تو علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں لیکن جب چلاّنا ہو تو اکٹھے چلاّتے ہیں۔

مطلب: کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

تشریح: برادرانہ رفاقت کا جذبہ بہت بڑی قوت ہے۔ اگر دو بھائی علیحدہ علیحدہ بھی ہوں تو مسرت اور مصیبت میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ گیدڑ حریص جانور ہے لیکن جب مشکل پیش آئے تو وہ بھی حرص و آز چھوڑ کر اپنے ساتھی کی امداد کو آجاتا ہے

5۔ ترجمہ: گھر میں اندھیرا ہے اور چلے ہیں مسجد میں چراغ جلانے

اردو: گھر نہیں دانے اور اماں چلی بھنانے

پنجابی: باہر میاں پنج ہزاری، اندر بی بی کرماں ماری

تشریح: یہ ضرب المثل شیخی بگھارنے والے لوگوں کے طرزِ عمل پر طنزاً استعمال ہوتی ہے۔ کشمیری میں اسی مفہوم کی ایک اور ضرب المثل بھی مروج ہے۔ ''گھرہ نہ دے کاون سال'' یعنی گھر میں کھانے کے لئے اناج تک نہیں ہے اور پرندوں کو دانے دنکے کھانے کی دعوت دی جارہی ہے۔ پنجابی زبان میں یہ ضرب المثل بہت خوبصورت شکل میں موجود ہے۔ کوٹھی نہیں دانے تے کانواں نوں نیوندرے'' نیوندرا' وہ دعوت ہے جو شادی پر لڑکی اور لڑکے والے اڑوس پڑوس کو دیا کرتے ہیں۔

6۔ اردو پنچوں کا سر آنکھوں پر لیکن پرنالہ وہیں رہے گا۔

پنجابی: ساڈے گھر آؤ گے تے کیہ لے کے آؤ گے۔ ساڈے گھروں جاؤ گے تے کیہ دے کے جاؤ گے۔

تشریح: یہ ضرب المثل ہٹ دھرم اور حریص آدمی کے بارے میں بولی جاتی ہے اور تضحیک کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

7۔ ترجمہ: بیچ والے برتن میں ٹانگیں ڈالنا

مطلب: دخل در معقولات

تشریح: کشمیری کسان بڑا دور اندیش ہوتا ہے۔ وہ اگلے موسم میں فصل بونے کے لئے بڑے بڑے برتنوں میں گندم اور مکی وغیرہ کے بیج سنبھال کر رکھتا ہے۔ تاکہ وہ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہیں۔ جب بیج بونے کا وقت آتا ہے تو برتنوں کے منہ کھول دیئے جاتے ہیں اور تجربہ کار سیانے کسان بیج کا معائنہ کرتے ہیں کہ کہیں خراب تو نہیں ہوئے۔ بیج کی اچھی حالت اور خرابی کا پتہ لگانا ایک مشکل کام ہے۔ جس کے لئے سوجھ بوجھ اور تجربہ کی ضرورت ہے، بیج کے معائنہ کے وقت اگر کوئی چھوکرا یا چرواہا کوئی بات کرے تو سیانے کسان اسے جھڑک دیتے ہیں اور کہتے ہیں "کیوں تو بیج کے برتن میں ٹانگیں ڈال رہا ہے۔" بزرگوں کی معقول بات میں ناپختہ نوجوانوں کی بے جا مداخلت کے وقت یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

8۔ ترجمہ: جنگل کے پودے اللہ کی آبیاری

مطلب: بے سہاروں کا سہارا خدا ہوتا ہے

9۔ ترجمہ: باربار کہنے سے تو جنگل بھی گر جاتے ہیں

مطلب: باربار کہنے سے ذہن متاثر ہوتا ہے۔

تشریح: معاشرتی توازن کے لئے ضروری ہے کہ اہل دانش غلط کاروں کی اصلاح کے لئے شب و روز مصروف عمل رہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کے خیالات غلط کاروں کو فوراً راہ راست پر لے آئیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ بہی خواہان ملت تنگ و دو سے منہ موڑلیں۔ ان کا فریضہ ہے کہ وہ کوشش کرتے رہیں۔ آخر کار ان کے خیالات اپنا اثر دکھائیں گے اور کند ذہن سے کند ذہن آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔

10۔ ترجمہ: بدن پر چیتھڑے اور نام پھولوں کی مالا

اردو: لکھے نہ پڑھے نام فاضل

تشریح: یہ ضرب المثل گپ ہانکنے والے مردوں اور عورتوں کی مضحکہ خیز باتوں سے تنگ آ کر کہی جاتی ہے۔

11۔ ترجمہ: دودھ میں سے کانٹے تلاش کرنا

مطلب: سعی لاحاصل کرنا

تشریح: دودھ میں کانٹے نہیں ہوا کرتے لیکن اگر کوئی احمق شخص دودھ میں کانٹے تلاش کرے تو اس کا مطلب ہے وہ ایک لاحاصل کوشش کر رہا ہے۔

12۔ ترجمہ: جنگل سے آیا ہوا ریچھ

مطلب: درندہ خصلت آدمی

تشریح: جب کوئی عام آدمی یا حکمران ظلم و ستم اور جبر و استبداد سے کام لے تو اس وقت کہا جاتا ہے۔

13۔ترجمہ: سیلاب کو چھاج سے روکنا

تشریح: جب کوئی شخص خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے اور اپنی محدود قوت کو بے پناہ اور بیکراں سمجھ لے تو اس کی کم عقلی پر طنزاً کہا کرتے ہیں۔

14۔ترجمہ: موت پر شربت لانا

اردو: مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

تشریح: مریض زندہ تھا تو کسی نے اس کے علاج اور آرام کی طرف توجہ نہ دی۔ جب وہ مر گیا تو دوا دارو اور شربت کی بوتلیں آ گئیں۔ مصیبت کے وقت بے وفائی کرنے والوں کے افسوس ناک طرز عمل پر طنزاً یہ محاورہ چست کیا جاتا ہے۔

15۔ترجمہ: ماں کے سر پر دوپٹہ نہیں، بیٹا ستار پر غلاف چڑھانے جا رہا ہے۔

تشریح: بعض اوقات کوتاہ اندیش اولاد کی وجہ سے والدین افلاس و غربت کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔ بد اندیش اولاد کی اصلاح کے لئے اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ جن والدین نے اسے پالا پوسا اور پروان چڑھایا ان کا کچھ خیال کرے۔ نیز طنز سے بھرپور یہ ضرب المثل ناخلف اولاد کی اصلاح کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

کشمیر کے لوگ سادہ دل اور مجلس پسند ہیں۔ ان کی سادگی اور مجلسی انداز فکر کی ایک جھلک مذکورہ ضرب الامثال اور محاورات میں ملتی ہے۔ وہ ستم گاری کو کسی روپ میں بھی پسند نہیں کرتے خواہ ستم گاری اولاد کی طرف سے ہو یا حکمران کی طرف سے۔ وہ پھولوں سے پیار کرتے ہیں اور پھولوں کی باس اور رنگ سے زندگی کا تار و پود سنوار تے ہیں۔ حسین تر زندگی کی تڑپ ان کی کہاوتوں، بجھارتوں اور محاوروں میں بھی عکس ریز ہے۔ (20)

گوجری لوک بیانیہ:

کشمیری کے بعد، گوجری آزاد جموں و کشمیر کی ایک اہم زبان ہے۔ اس کے حوالے سے ہم اس باب کے آغاز میں بات کر چکے ہیں۔ پاک و ہند کے جن جن علاقوں میں گوجر آباد ہیں۔ انہوں نے ان علاقوں کی زبانوں کا اثر قبول نہیں کیا۔ ''وہ جہاں بھی گئے۔ انہوں نے اپنی زبان کو نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ مذہب اسلام اختیار کرنے پر بھی ان کی زبان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ان کا لباس اور بول چال کی بھاشا، ان کے قبیلوں میں، جہاں بھی ہیں، محفوظ ہے۔'' (21)

شری سی سی وی، ویدیہ کے مطابق ''ملک کے جس حصے میں گوجر آباد ہیں بھلے وہ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں ہی رہتے ہیں، ان سب کی زبان ایک جیسی ہی ہے۔ جسے گوجری کہا جاتا ہے۔'' (22) طویل خانہ بدوشی کی زندگی میں بھی گوجروں کی زبان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس اعتبار سے گوجری زبان کا خالص پن ابھی تک برقرار ہے لیکن اگر کہیں تھوڑا بہت فرق پڑا بھی ہے تو اس سے زبان میں کوئی بنیادی تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔

بقول ڈاکٹر کھجوریہ ''ان کی آبادی کا سلسلہ گجرات (کاٹھیاواڑ) سے لے کر مدھیہ پردیش، راجستھان اور گنگا و جمنا کے میدانوں سے ہوتا ہوا پنجاب، ہماچل اور جموں وکشمیر کے دور دراز پہاڑوں و جنگلوں تک چلا گیا ہے۔ یو۔ پی کے پہاڑی علاقے گڑھوال، ڈیرہ دون، چکروتہ اور نیپال کی ترائی تک ان کی بھرپور آبادی ہے اور دوسری طرف پاکستان کے ہزارہ، سوات اور چترال کے علاقوں تک ان کی آبادی کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ان سب علاقوں میں گوجری اپنی ایک جیسی بولی بولتے ہیں۔(23)''

اس یکسانیت کا اثر ان کی تہذیب وثقافت پر بھی پڑا ہے، چنانچہ گوجری میں گائی جانے والی لوک واریں، کشمیر کے دونوں طرف رائج ہیں۔

گوجری لوک واریں:

گوجری لوک واروں کے سلسلے میں رانا فضل حسین، بابائے گوجری کا کام نہایت قابل قدر ہے اور اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ رانا فضل حسین نے گوجری لوک واروں کا جو قیمتی خزانہ ''گوجری لوک ہار'' میں یکجا کیا ہے، وہ پنجابی کے رزمیہ ادب سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ حتیٰ کہ گوجری میں دلّا بھٹی، کی وار دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ رانا فضل حسین کی تحقیق کے مطابق:

''جموں وکشمیر، بھمبر، راجوری، پونچھ، ڈنگ بٹل (اودھم پور) کٹھوعہ کے علاقوں پر مغلوں نے بہت سے حملے کئے پیر پنجال کے ان پہاڑی علاقوں کے چھوٹے چھوٹے راجواڑوں نے مغل افواج کو آٹھ دفعہ عبرتناک شکستوں سے دوچار کیا۔ 1586ء میں وادی کشمیر سے ایک وفد دہلی پہنچا، اندرونی مناقشات کا یہ شاخسانہ تھا اور دہلی سے مغلوں کی فوج سرینگر لائی گئی۔ پھر کشمیر کا مغل براستہ لاہور، گجرات، بھمبر، راجوری سے پیر پنجال، پیر گلی، ہیر پور، شوپیاں، تاشیر گڑھی سرینگر ایک سو چھیاسٹھ سال تک آباد رہا۔ مغلوں نے اس مغل شاہراہ پر بہت سے تعمیری اور فلاحی کام بھی کئے۔ سرائیں، برج، مڑھا اور قلعہ ہری پربت مغل بادشاہ اکبر نے قحط کے زمانے میں تعمیر کرایا۔ اس سے لوگوں کو وادی میں روزگار ملا۔

''مغل عہد حکومت میں بیگار کا ایسا ظالمانہ نظام رائج رہا جو مغلوں کے بعد افغانوں، سکھوں، ڈوگروں اور بھارتی سامراج کے حالیہ عہد تک مسلسل جاری ہے۔ راجوری سے ایک کڑیل جوان کسی ماں کا اکلوتا بیٹا بیگار میں پکڑا گیا۔ پیر پنجال کے اس سیف الملوک پر پالکی اٹھانے کے دوران بیگمات میں سے کوئی پری دل ہار گئی۔ اسے ایک سال تک یرغمال بنائے رکھا۔ اس نوجوان کی ماں کا کرب اس لوک داستان سے عیاں ہے۔ یہ نوجوان ڈرامائی طور پر مغل قافلے سے فرار ہوا، اس کی تلاش تیز کر دی گئی۔ ایک خونی دریا کے کنارے اس نوجوان کے پہننے کے کپڑے ملے اور اس کی تلاش ترک کر دی گئی۔ وہ بھاگ کر والدہ کے پاس آ گیا۔ یہ دونوں ماں بیٹا اپنا گاؤں چھوڑ کر دچھن پارا ہجرت کر کے چلے گئے۔''(24)

ماں مقدم میر، دلاّ بھٹی، دلمیر۔ روح اللہ خان سانگو، مقدم صوبہ جنگباز، شہباز، زمان، مکھنی اور مقدم، راجہ سلطان خان ، سردار علی اور سبز ولی، مخدوم عنایت، مقدم نیک، مقدم وارث (برسیا) نیکو دھاڑے مار، تاج محمد، شمس اور راجولی، برام اور شاہ بانو، احمد حسن آوانہ خوشال، نادر، نجی محمد آوانہ، مراد کھٹانہ، نیک محمد چوڑالادی، مقدم ناجر، نور محمد نور کی گوجری لوک واریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مغلوں سے ڈوگروں تک اس خطے کے عوام نے ہمیشہ زور اور زبردستی کو چیلنج کیا۔ اسی طرح سردار منصور خان اور سردار فیروز خان کی پہاڑی لوک وارا پنے جوہر میں پنجابی اور سندھی کے رزمیہ ادب کے مقابل رکھی جا سکتی ہیں۔ ماں کی گوجری وار مغلوں کے بُرے دربار، الاؤ بھڑکانے، للکار کر اٹھنے اور خون کی مشعلیں جلانے کی بات کرتی ہے۔ رانا فضل حسین کے اردو ترجمے میں اس کے بول یوں ہیں:

ماں کی نصیحت کبھی نہ بھلانا
برسات میں ندیوں سے پار نہ جانا
سرما میں گلیوں سے باہر نہ جانا
بوڑھی ماں کا کہنا سُننا
بھوکے پیٹ بیگار لی جاتی ہے
بُرے مغلوں کے دربار
پیر پنجال سے پار نہ جانا
وہ ڈائن مار دے گی
تو بڑھیا کا اکلوتا بیٹا ہے
ہر بلا پھیلی ہوئی دیکھ
ظلم کے کارنامے بُرے ہیں
دھرتی پر یہ عفریت اور یہ بھوت ہیں
ہر گردن میں سخت سم ہے
غلامی ہمارا چڑا چیرتی ہے
آزادی کے پر جلاتی ہے
ہم تم آنکھیں بند کر کے سوئے ہیں
اٹھو اپنے کام نبیڑو
الاؤ شعلے جلا رہے ہیں
ارے للکار کر اُٹھو

ارے اپنے کام سنبھاؤ
ارے مقدر کیوں روٹھ گیا
ارے خون کی مشعلیں جلاؤ(25)

دُلاّ بھٹی کا گوجری لوک بیانیہ:

رات خواب دیکھا خواب بڑی مصیبت ہے
بیٹے اچانک تمہارا محل گر پڑا
سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہ رہی
مغلوں نے بھینسے بیل سب ذبح کر دیئے
گوشت سیخوں کے ساتھ بھون بھون کر کھایا
تیرے داداساندل کو بوری میں بند کر کے مارا
مغلوں نے الٹی کھال اتروا کر بیچ میں گھاس بھرا
اگر تو فرید کا بیٹا اور بھٹیوں کی اولاد ہے
شیر بن کر مغلوں کا بُرا حال کر دے
اگر تو بھٹی گجر سردار کا بیٹا ہے
فرید ساندل مرد جی دار کا
اکبر مغل کی فوج کو مار کر ڈھیر کر دے
تیرے سامنے کون آئے جو اتنا دلیر ہے
جینا مرنا ایک بار ہے اور دنیا چار دن کی ہے
مردوں کا نام زندہ رہتا ہے بزدل کو پھٹکار ہے
مجھے اپنے برابر کوئی سُورما دکھائی نہیں دیتا
مغلوں کو ماروں گا اکبر خود روئے گا
میری گرج سے مغلوں کا دربار کانپ جائے گا
خود اکبر بھی روئے گا اور اس کے راجے سردار بھی
اکبری فوجوں کو ماروں گا بے حال کر دوں گا
بگا شیر کو مار کر حلال کروں گا
گھوڑی چڑھ کے جاؤں گا اور دلی دربار دیکھوں گا

دیکھوں گا کون کمینہ مجھ پر وار کرتا ہے
میری ماں سُن تم کیوں شور مچاتی ہو
میرا نام دُلا کیوں رکھا کچھ اور رکھ دیتی
بارہ چک شکر کی طرح پیس کر کھا جاؤں گا
اکبر کی ڈالیوں کو لوٹ لوں گا بازوؤں میں زور ہے
بکی گھوڑی تیار کر کے مغلوں کو ٹھکور دوں گا
میں فرید کا بیٹا ہوں میری شیروں جیسی شان ہے
مرزا نظامو چڑھ آیا نزدیک و دور شور بپا ہو گیا
مہادت ہاتھیوں کو سُندور سے رنگ کر تیار ہو گئے
دریا پار کرتے مغلوں کو لوگوں نے ضرور دیکھا
اور اگر مغل پوچھتے ہیں دُلا بھٹی قریب ہے یا دور
دشمن کہتے یہ قریب ڈیرا ہے جہاں دُلا مغرور رہتا ہے
ہمدرد پھسلاتے کہ دُلا کی پنڈی بڑی دور ہے
مغل مونچھیں مروڑ کر کہتے پنڈی ضرور جانا ہے
جلا دیں گے دُلا کے محل توڑ دیں گے غرور
ہاتھ جوڑ کر منت کرتا ہے پرُھو سچی بات بتاتا ہے
نجوم کی اصل پتری حال بتا دیتی ہے
اگر پتری جھوٹ بولے آگ میں جلا دوں گا
اگر پتری جھوٹ بولے پانی میں بہا دوں گا
اکبری فوج پنڈی کو تباہ کر دے گی
آٹھ دن بھاری ہیں دُلا جھنگ جا کر ڈیرا لگا لے
نوواں دن مردا لڑنا اللہ فتح دے گا
نظامو مرزا کی پگڑی تیرے پاؤں میں ہو گی
مہرو بھٹی نے چڑھائی کی کندھے سے بندوق لگی ہے
مہرو سیف ملوک بن کر مغلوں پر ٹوٹ پڑا
ستر مغل برا حال کر کے اس نے مارے

میدان میں چیلنج کر کے مغل مار ڈالے
بیکانیر کا صوبیدار ہاتھی سے کھینچ کر مارا
مہر و حملہ کر کے تباہ کرتا گیا
مرد کا زور دیکھ کر کچھ مارے گئے کچھ بھاگے
مہر و زخمی ہو گیا مغلوں نے گھیر لیا
تلوار پکڑ کر پھر زخمی شیر لڑتا رہا
مرتے مرتے بھی مرد نے مغلوں کے ڈھیر لگا دیئے
زخمی بہادر کو دیکھا تو آخیر گھیر کر مار دیا
مرزا نظاموں نے مغل سپاہی لئے اور چڑھائی کی
پنڈی میں سخت تباہی مچادی
لچے ظالم پنڈی آئے پردہ نشینوں پر ہاتھ ڈالے
بھٹیوں پر ظالموں نے بہت ظلم کئے
لوہے کے گرم کوڑے سے رانیاں چیخ پڑیں
نند بھاوجیں آگے پیچھے باندھ کر لے چلے
بھٹیوں کی بیٹیاں باندھ کر لاہور لے چلے
بھٹیوں کی کرنی لدھی کے پیش آئی
لدھی نے کُرلانا شروع کیا
نظامو تمہارا بیڑہ غرق ہو ظلم کا حساب دینا پڑے گا
لدھی ماں لمبی چیخ مار کر رونے لگی
دُلا ننھیال گیا تھا سرخ گھوڑی پر کاٹھی ڈال کر
تیری پنڈی کو ظالموں نے آ کر تباہ کر دیا
میرے شیر دلیر آجا تیری زندگی کا سہارا ہے
تیری بہو بیٹیوں کا شرم حیا ختم ہو گیا
مرزا کمینہ عزت کو داغدار کر کے لے چلا ہے
آ قید سے چھڑا پانچ پھول رانی باندھی ہوئی ہے
مردوں کا نام سدا رہتا ہے جمنا مرنا ایک بار کا ہے

ڈلا پوچھتا ہے روڑا بھائی بتاؤ کیا کچھ گزری

روڑا جاٹ نے رو کر ساری بات بتائی

ارے تیری پنڈی ڈلے جل کر تباہ ہوئی ہے

ڈلا ماں لدھی اور بہن سلیمہ گرفتار کر لی ہیں

تیری عزت چھن گئی پانچ پھولوں رانی قید ہو گئی

نور خان تیرا بیٹا اور بہو قیدی بنا لئے

لدھی ماں گود پال کر تیری چاہت رکھ رہی تھی

مغل عورتوں کو پیچھے ہاتھ باندھ کر لے گئے

ڈلا تو دہلی کے مینار گرا دیتا اگر مرد ہوتا

دشمن لاہور اور دلی جا کر ٹکے ٹکے میں فروخت کریں گے

تو اگر ڈلا مرد ہے تو آج انصاف کر

بھٹیوں کے بندی وان ہمت سے چھڑا لے

غصے سے بابا لال خان نے کہا یہ بھٹی بیٹیاں ہیں

ڈلا بے شک ہمارا دشمن ہے یہ ہماری بیٹیاں ہیں

ڈلا بھی آئے گا مگر ہم بھی بھٹی ہیں

مردو گاؤں سے نکلو لڑ کر انصاف کرتے ہیں

لال خان چیلنج کر کے میدان میں حملہ آور ہوا

ایک طرف لال خان تلوار چلا رہا تھا

دوسری طرف ڈلا کاٹ کر مار رہا تھا

بھٹی میدان میں اللہ کا نام پکارتے ہیں

مغلوں کی لاشوں کو کتے کوے نوچیں گے

ڈلا بھٹی لال خان مغلوں پر بجلی بن کر گرے

مردوں نے گرج کر ظلم کا بیڑہ غرق کیا

نظامو لدھی ماں کے پاؤں میں پگڑی رکھتا ہے

ڈلا کی تلوار سر پر تھی گردن کی رگیں کاٹتی ہے

ماں نے کہا ڈلا بہادر بات سمجھا دیتی ہوں

مرے ہوئے مردار کو بھوکا شیر نہیں کھایا کرتا

ظالموں کو معاف کردے آکر پاؤں پڑا ہے

ہارے ہوئے بزدل کو ڈولے کبھی نہ ستاتا (26)

سکھوں اور ڈوگروں کے خلاف مزاحمت کا بیانیہ بھی ان گوجری واروں کا موضوع رہا ہے۔ سلطان خان کی وار ایک اہم مثال ہے:

ارے سلطان خان تو کبھی جموں نہ جانا

ارے بہتر ہے تجھے لڑتے ہوئے مرجانا

ارے راجہ سلطان گلابو بڑا دغاباز ہے

ہمت سے لڑ کر اے مرد جموں چھین لینا

سلطان خان ظالم ڈوگرہ کے بُرے جال کو توڑ دو

ارے سلطان خان تو جموں نہ جانا

گلابو ظالم ہے اعتبار نہ کرنا

مکر فریب سے اس نے جموں جاگیر لینی ہے

راج کی بُو آتی ہے شاہدرہ کے پیر نے کہا

راجہ سلطان تیری فوج میں گلابو ملازم تھا

تین روپے پر منگلا میں تیرا چاکر تھا

بھمبر سے چلتے وقت بائیں کوا بولا

تجھے سلطان ماں منع کر رہی ہے

ظالم کا سلطان کبھی اعتبار نہ کرنا

دھوکے سے بلا کر تجھے مار دے گا (27)

پہاڑی لوک گیت:

ہم اس باب کے شروع میں گوجری کے ساتھ ساتھ پہاڑی بولی کے بارے میں بھی اظہار خیال کر چکے ہیں۔ پہاڑی رزمیہ لوک واریں سکھوں، ڈوگروں اور انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی کہانی سناتی ہیں۔ اس سلسلے میں سردار منصور خان سردار فیروز خان کی پہاڑی لوک وار کی مثال پیش نظر ہے:

لیں گے جموں اور کشمیر:

لیں گے جموں اور کشمیر
ساتھ پونچھ کی جاگیر
قیدی ہے، منصور سردار
جیل ڈالا فیروز جی دار
نوازش علی بھی گرفتار
جموں قید چناب سے پار
بے تقصیر قیدی ہیں
لیں گے جموں اور کشمیر
فتح محمد خان نے محاسب خانے توڑے
فوج کریلہ مجان پہنچی
منصور خان کا کوئی جرم نہیں
ڈوگرہ کے تھانے توڑ ڈالے
ہمارا دیس ہوا دلگیر
درہال سے دو بھائی پکڑے
پونچھ راجوری میں ظلم مچایا
جموں تک گولیاں چلیں
میر پور کے تھوری بھی گرفتار ہوئے
ظلم ختم ہوگا آخر
لیں گے جموں اور کشمیر (28)

واروں کے علاوہ پہاڑی لوک گیتوں میں بھی اسی رزمیہ لہجے کی گونج سنائی دی ہے۔ ایک گیت سپاہی کے جانے کے دکھ اور آتے ہوئے خوشی کا اظہار اس گیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

آتے سپاہی کی لاکھ لاکھ خوشیاں تھیں
جاتے ہوئے اے میرے سپاہی تو نے ہماری بات نہیں پوچھی
سپاہی واپس آئے گلیوں میں الغوزے بجے
اے میرے سپاہی میرے ملک کی قسمت جاگ اٹھی

سپاہی کی ماں منتیں مانتی ہے، اس کی بہن گھر بار مانتی ہے
ڈھکی سے اترتے ہوئے مجھے سخت گرمی لگی ہے
اے میرے سپاہی، تم آ کر چھتری کی چھاؤں کر جاؤ
ڈھکی سے اترتے ہوئے میرا چھلا گم ہو گیا ہے
اس میرے چھلے کی، اے سپاہی تلاش کرنا (29)

شمس خان کا رزم نامہ:

شمس خان کا رزمیہ ایک معروف پہاڑی لوک رزمیہ ہے۔ شمس خان نے سکھ اور ڈوگرہ فوجوں سے ٹکر لی۔ شمس خان اور اس کے ساتھ مجاہدوں اور سرفروشوں نے جرأت اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔ کئی مقامات پر سکھوں اور ڈوگروں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ممکن تھا مجاہد کامیاب رہتے لیکن چند زر پرست مسلمانوں نے انہیں دھوکہ دیا اور فریب سے شمس خان کو مروا دیا۔ اس کے بعد شمس خان کے ساتھی بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ڈوگروں نے ان کی کھالیں اتروائیں اور ان میں بھوسہ بھر دیا گیا۔ شمس خان کا رزمیہ آزاد کشمیر کے اس ہیرو کی کہانی ہے جو وطن اور اہل وطن کی پاسبانی کے لئے جیا اور مرا تو مشعل حیات سے تاریک راہوں کو ہمیشہ کے لئے منور کر گیا۔ (30)

یہاں اس رزمیہ کے منتخب حصوں کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

ترجمہ:

''جوان ہوتے ہی شمس خان نے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے خوب صورت، پُر وقار گھوڑے پر زین ڈال کر شہر جموں کی طرف چل پڑا، جموں میں وہ مہاراجہ کے دربار میں گیا تو مہاراجہ نے پوچھا ''تم بہادر کہاں کے رہنے والے ہو؟'' شمس خان نے جواب دیا ''میرا وطن پونچھ ہے اور میں ملدیاں قبیلے کا بہادر ہوں''

مہاراجہ نے یہ بات سُن کر اسے گھوڑا اور خلعت عطا کئے اور کنگنوں کی جوڑی پہنائی لیکن شمس خان تو کسی اور مقصد سے آیا تھا اور وہ مقصد اس نے بیان کر دیا۔ اُس نے کہا ''اے مہاراجہ! آپ مجھے پونچھ کا علاقہ دے دیں۔'' مہاراجہ بولا ''اے شمس مجھے ڈر ہے کہ تو باغی نہ ہو جائے اور خراج کی رقم ہڑپ نہ کر جائے''

بعد ازاں مہاراجہ جموں اور اس کے درمیان ٹھن گئی زوردار رن پڑا:

لڑائی ہوئی تو دیوان دھنو میدان جنگ سے بھاگ نکلا اور چھپڑے نامی گاؤں سے بھی دور جا کر سانس لیا۔ پھر وہ جموں پہنچا اور مہاراجہ کے دربار میں حاضر ہو کر شور و غل مچانے لگا۔ اس نے مہاراجہ سے کہا چونکہ وہ جموں سے باہر کبھی نہیں نکلتا اسی وجہ سے ریاست

پونچھ اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور وہاں شمس خان قبضہ جما چکا ہے جب مہاراجہ نے دیوان دھنو کی یہ تلخ باتیں سنیں تو وہ مارے غصہ کے کانپنے لگا۔''

''مہاراجہ نے سب سے پہلے شمس خان کے دو ساتھیوں علی اور سبز علی کو قتل کیا اور ان کی کھال میں بھوسہ بھروا دیا۔ مہاراجہ نے اس کے معصوم اور بے گناہ بچوں کی کھال بھی کھنچوا دی۔ جب مہاراجہ نے اُوڑی کے مظفر خان سے کہا کہ وہ شمس خان کا پتہ بتائے تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''آدھی رات کو جب شمس خان سو رہا تھا تو اسے ایک بُرا خواب آیا۔ اس نے دیکھا کہ لہو کی بھری ہوئی تھالی اس کے منہ کے سامنے آئی ہے۔ اس نے اپنے چچا راجولی سے کہا۔ اے راجولی چچا! موت اب قریب آ گئی ہے کیونکہ خون سے بھری طشتری میرے منہ کے سامنے آئی ہے۔۔ سب سے بُرا کام یہ ہوا کہ ہم نے نور خان تیڑ دے کو ہتھیار دے دیئے۔''

''آدھی رات کے وقت شمس خان بستر سے اٹھا اور باہر جانے کے لئے چھلانگ لگائی لیکن نور خان جھپٹا اور اس نے شمس خان کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اگڑ خان نے آگے بڑھ کر تلوار سے حملہ کر دیا۔ شمس خان نے دائیں بائیں دیکھا مگر اس کی مدد کے لئے وہاں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ مصیبت کے وقت اس کا ساتھ کون دیتا۔''

بالآخر شمس خان کا سر کاٹ کر مہاراجہ کو بھیج دیا گیا۔ رزمیہ کے آخری شعر میں کہا گیا:

''بہادر شمس خان کی ماں مبارک باد کی مستحق ہے جس نے شمس خان جیسا دلیر اور شجاع بیٹا پیدا کیا۔ کوئی ماں بھی شمس خان ایسا بیٹا پیدا نہیں کرے گی۔(31)

آزاد جموں کشمیر کی ان تینوں زبانوں کا بیانیہ آزادی کا لوک بیانیہ ہے۔ آزادی اور کشمیر ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ ہیں۔

حوالہ جات:

1. Dogra, Ramesh C handra, "Jammu and Kashmir" a select an annotated bibliography of manuscripts, books and articles..." Verinag Publishers, Mirpur, Azad Kashmir, 1991. pp. 46,66,67,68

2۔ میاں کریم اللہ قریشی کرناہی، پہاڑی اور اردو۔ایک تقابلی جائزہ،مقتدرہ قومی زبان پاکستان،اسلام آباد 2007ص، 283

3۔ ایضاً،ص 283-284

4۔ بخاری،محمد یوسف(ڈاکٹر)،کشمیری زبان وادب کی مختصر تاریخ،طبع اول،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،1989،ص،15

5۔ میر عبدالعزیز،''کشمیری زبان''،مضمون،مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند،چودھویں جلد،علاقائی ادبیات مغربی پاکستان (جلد دوم) مدیر خصوصی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود،پنجاب یونیورسٹی،لاہور،1971،ص،145

6۔ کریم اللہ قریشی،پہاڑی اور اردو، ص،293

7۔ ایضاً، ص،290

8۔ میر،جی ایم،جموں کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں،دوسرا ایڈیشن،کشمیر لبریشن فرنٹ،مکتبہ رضوان،علامہ اقبال روڈ، میرپور،1991، ص،10-11

9۔ وانی،عبدالصمد خواجہ،''کشمیر کی کہانی،مضمون مشمولہ تحریک آزادی کا ہمنوا مجلّہ''سونت کال'راولپنڈی،1989،ص،10

10۔ ایضاً

11۔ رسول طاؤس بانہالی (تحقیق اور ترجمہ) کشمیری لوک کہانیاں۔لوک ورثہ کا قومی ادارہ،اسلام آباد،س۔ن، ص، 7-9

12۔ تحسین جعفری کاشمیری، کشمیر لوک روایات کے آئینے میں۔مشترکہ اشاعتی پروگرام، الفیصل، لاہور، لوک ورثہ اسلام آباد،2013،ص18-21

13۔ ڈاکٹر برج پریمی،جلوہ صدرنگ،سری نگر،1989، ص،122-138

14۔ سلیم خان گمی،کشمیر ادب وثقافت،لاہور1987، ص187-198

15۔ ایضاً، ص،248-250

16۔ علی محمد لون،کشمیری لوک شاعری،ایک جائزہ مشمولہ دو ماہی،''شیرازہ''(ایڈیٹر محمد یوسف ٹینگ) ثقافت نمبر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس،کلچر اینڈ لینگوئجز،سری نگر، 1966

17۔ ایضاً، ص، 196-198

18۔ سلیم خان گمی،کشمیر ادب وثقافت، ص۔70

19۔ ایضاً، ص، 70-71

20۔ ایضاً، ص، 71-82

21۔ ڈاکٹر آر آر کھوریہ،اے این بھاردواج،جموں وکشمیر کے گوجر،گلشن پبلیشرز،سری نگر،1981، ص، 74

22۔ ایضاً، ص،76

23۔ ایضاً، ص،74-75

24۔ رانا فضل حسین، گوجری لوک بار، گوجری ادبی سنگت، میر پور آزاد جموں وکشمیر،2007، ص،36-37

25۔ ایضاً، ص، 60

26۔ ایضاً، ص،78-80

27۔ ایضاً، ص، 118

28۔ ایضاً، ص، 256

29۔ غلام حسین اظہر، گوجری پہاڑی لوک گیت، لوک ورثے کا قومی ادارہ، اسلام آباد، 1982، ص،197

30۔ سلیم خان گمی، کشمیری ادب وثقافت، ص، 101

31۔ ایضاً، ص، 102-108

آٹھواں باب

گلگت بلتستان کا لوک بیانیہ

گلگت بلتستان کا لوک بیانیہ

گلگت بلتستان آئینی اعتبار سے پاکستان کا صوبہ ہے جو دیگر پاکستانی صوبوں کے لوک بیانیہ سے کسی طرح کم نہیں۔

گلگت بلتستان کا لسانی تنوع:

گلگت۔ بلتستان میں کئی زبانیں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہیں لیکن ان میں پانچ زبانیں اہم اور مرکزی حیثیت کی حامل ہیں۔ان میں شینا زبان سب سے اہم ہے اور گلگت کی نمائندگی کرتی ہے۔دوسری بلتی زبان ہے جو بلتستان کا احاطہ کرتی ہے۔تیسری زبان بروشسکی ہے، جو ہنزہ کے باشندوں کی نمائندگی کرتی ہے۔دیگر زبانوں میں کھوار اور وخی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔کھوار بنیادی طور پر ضلع چترال کی زبان ہے۔کھوار اور شینا کے متعدد الفاظ مشترک ہیں اسی طرح وخی اور شنا کے کئی الفاظ مشترک ہیں۔عملاً شنا اور بلتی صوبے کی اہم ترین زبانیں ہیں۔

اکبر حسین اکبر نے اس علاقے کی زبانوں (ان کے لفظوں میں بولیوں) کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔وہ خطے کے جغرافیائی عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ قراقرم اور ہندوکش کے سلسلہ ہائے کوہ میں گھرا ہوا گلگت بلتستان اور دیامر کا علاقہ جسے (بقول مؤرخین و محققین از منہ قدیم میں ''بلورستان'' اور ''دردستان'' کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے) قیام پاکستان کے بعد شمالی علاقوں کے نام سے موسوم کیا گیا۔'' (1) اور اسے گلگت بلتستان کے نام سے آئینی صوبے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔''تقریباً 28 ہزار مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا یہ علاقہ مخصوص جغرافیائی ساخت کی بنا پر ایک کثیر اللسانی خطہ ہے جہاں کم وبیش بارہ مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔جن میں شنا، بلتی، برشسکی، کھوار، وخی، ڈومکی، گوجری، کاشغری، فارسی، کشمیری اور چھموگڑھی شامل ہیں۔ان میں سے شنا وہ واحد زبان ہے جو لہجے کی معمولی تبدیلی کے ساتھ تقریباً پورے علاقے میں بولی جاتی ہے لیکن شنا کو اس علاقے میں قومی زبان کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔'' (2) اکبر حسین اکبر مزید لکھتے ہیں کہ ''مخصوص جغرافیائی ساخت کی بدولت یہ علاقے از منہ قدیم سے، دیگر علاقوں سے تقریباً کٹے ہوئے تھے۔چھوٹی چھوٹی پہاڑی وادیوں میں محبوس یہ لوگ بیرونی دنیا کی معاشرتی تبدیلیوں سے بالکل بے خبر تھے۔اس طرح دوسرے علاقوں کے باسی بھی اس ''جغرافیائی کیپسول'' کے اندر رہنے والوں کے رہن سہن، زبان، تہذیب وتمدن، ثقافت اور بود و باش سے قطعاً نابلد تھے۔یہی وجہ ہے کہ ایک قدیم ثقافتی، تہذیبی، لسانی اور تمدنی ورثے کے مالک ہوتے ہوئے بھی، آج اہل گلگت ادبی لحاظ سے تقریباً تہی دست نظر آتے ہیں۔یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی کے وسط تک چلتا رہا اور اس عجیب وغریب علاقے کی مقامی بولیاں، جن کی تعداد

بارہ ہیں، ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ (3) انیسویں صدی میں مغربی مستشرقین نے ان علاقوں کی طرف توجہ کی۔''ان یورپیوں نے اس علاقے کی تاریخ، جغرافیہ، طرزِ معاشرت، زبانوں، ثقافت اور تہذیب وتمدن پر تحقیق کی۔ (4) اپنی بحث کے نتیجے میں اکبر حسین اکبر نے شنا کو ہند آریائی زبانوں کے گروپ کی ایک اہم شاخ قرار دیا ہے۔ان کے خیال میں یہ اس خطے میں رہنے والی قدیم قوم کی زبان تھی اور ہے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے بھی شنا، بروشسکی، گوہجالی (وخی) کھوار اور بلتی کو گلگت بلتستان کی زبانیں قرار دیا ہے۔انہوں نے کاشغری کو بھی علاقے میں بولی جانے والی زبانوں میں شمار کیا ہے۔ڈاکٹر منگلوری کے لفظوں میں:

''رقبے اور افراد کے اعتبار سے شمالی علاقہ جات کی بڑی زبان ''شنا'' ہے۔ پورے ضلع دیامر (داریل، تانگیر، استور، گلگت اور پنیال کی وادیوں) میں شنا ہی بولی جاتی ہے۔ بلتستان کی وادی روندو کے چند دیہات میں بھی شنا بولی جاتی ہے لیکن اس کا لہجہ بلتی زبان کے زیر اثر ہے۔

پورے بلتستان میں یعنی ضلع گھانچے اور ضلع سکردو میں بلتی زبان بولی جاتی ہے۔

نگر اور ہنزہ کی وادیوں، خنجراب اور بروشال کے علاقوں میں بروشسکی زبان بولی جاتی ہے۔اشکومن اور یاسین کے تھوڑے سے حصوں میں بھی یہی زبان بولی جاتی ہے۔

ہنزہ کے شمال میں گوہجال کا علاقہ ہے۔اس علاقے کی زبان گوہجالی یا واخی کہلاتی ہے۔شمالی علاقہ جات کی اہم زبانوں میں سب سے کم علاقے اور کم افراد کی زبان گوہجالی (وخی) ہے۔وادی اشکومن، وادی یاسین اور کوہ غذر کے علاقے میں کھوار زبان بولی جاتی ہے۔۔کھوار زبان چترال کی بڑی اور اہم زبان ہے۔(5)

ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی چترال سمیت اس خطے میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد سترہ بتاتے ہیں۔وہ چترال کو شمالی علاقہ جات میں شمار کرتے ہیں۔ عظمیٰ سلیم کے مطابق شمالی علاقہ جات ایک کثیر اللسانی خطہ ہے۔اس میں مختلف زبانیں رائج ہیں۔جن میں شنا، بلتی اور بروشسکی زبان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس کے علاوہ واخی، ڈومکھی، گوجری، کھوار، کاشغری فارسی، کشمیری، پنجابی پشتو کے ساتھ اردو زبان بھی بولی جاتی ہے۔(6)

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر منگلوری لکھتے ہیں:

''شمالی علاقہ جات (گلگت بلتستان) کی جن زبانوں کا ذکر مندرجہ بالا بیان میں کیا گیا ہے۔ان میں سے مرکزی اہمیت کی حامل زبانیں، شنا، بلتی، بروشسکی اور کھوار اپنا تحریری ادب رکھتی ہیں۔شمالی علاقہ جات میں گوجری، کاشغری، فارسی، کشمیری، پنجابی اور پشتو بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔نیز ان کا کوئی متعین علاقہ نہیں۔ باوجود یکہ یہ زبانیں اپنا تحریری ادب رکھتی ہیں لیکن گلگت بلتستان میں انہوں نے اپنے ادب کو فروغ نہیں دیا، اس لئے ان کے بارے میں بحث نہیں کی جارہی۔واخی کا نام واخان کی وجہ سے پڑا ہے۔تاجکستان، افغانستان، چین اور پاکستان کے مابین ایک ایسا آزاد اور غیر جانبدار علاقہ ہے جسے واخان کی پٹی کہا جاتا ہے۔یہی علاقہ واخیوں کی

آماجگاہ ہے۔ واخی زبان کو گوہجالی، وخیکو اریا گوئیسکی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ زبان بالائی ہنزہ، تحصیل اشکومن کے بالائی حصوں اور ضلع غذر کے چند گاؤں میں بولی جاتی ہے۔ گلگت بلتستان کے علاوہ یہ زبان ضلع چترال کے بروغل کے علاقے، صوبہ سنکیانگ کے ضلع تاشقرغن یارقند میں بولی جاتی ہے۔ واخی زبان کے بارے میں لیفٹیننٹ کرنل لاریمر نے قابل قدر کام کیا جو دو جلدوں میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر جارج بدرس نے واخی کی پہلی لغت تیار کی۔ ناروے کے پروفیسر مورگنسیٹرن افغانستان کے پروفیسر دوست شنواری نے بھی اس زبان کے ضمن میں بہت کام کیا۔ اسلام سے قبل واخی کا رسم الخط خروشتی تھا جو اس علاقے میں اسلام کی آمد کے بعد نسخ او نستعلیق میں تبدیل ہو گیا۔ گلگت بلتستان کے علاقے میں واخی زبان بولنے یا سمجھنے والوں کی تعداد اٹھارہ انیس ہزار سے زیادہ نہیں۔ (7)

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کے مطابق:

"گلگت شنا کے علاقے کا مرکز ہے۔ گلگت کے نام کے بارے میں مختلف لوگوں کی آراء مختلف ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ سنسکرت کا لفظ ہے، اور سنسکرت میں گی کے معنی ہیں پہاڑ اور گرت کے معنی ہیں گھرا ہوا۔ یہ شہر چونکہ چاروں طرف سے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اس لئے اس کا قدیم زمانے میں نام "گری گرت" تھا اور مرور زمانہ سے بگڑ کر گلگت ہو گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام "گلگوت" تھا۔ جس کے معنی سنسکرت میں "قبرستان" کے ہیں۔ قدیم زمانے میں وہاں بہت سی جنگیں ہوئیں اور بہت لوگ قتل ہوئے اس طرف چاروں طرف قبرستان بن گیا۔ اور اس جگہ کا نام گلگوت پڑ گیا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس کا اصل نام گلگشت تھا۔ وہاں پھول ہی پھول تھے۔ بعد میں سیلابوں سے زرخیز مٹی بہہ گئی اور نام بگڑ کر گلگت ہو گیا۔

کاشغر کے ترکوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ترکی لفظ ہے۔ "کھل" کے معنی ہیں "جانا" کھیت کے معنی ہیں آنا۔ اس جگہ پر مرکزی پڑاؤ تھا، لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لئے اس جگہ کا نام "کھل کھیت" پڑ گیا جو بعد میں بگڑ کر گلگت ہو گیا۔" (8)

گلگت۔ تاریخ کا سفر:

"ماہرین کے خیال میں ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح سے دوسرے صدی عیسوی تک شن قوم مختلف ادوار میں گروہوں کی شکل میں کوہستان سندھ اور گلگت میں وارد ہوتی رہی ہے۔ مشہور ماہر لسانیات گریرسن کا خیال ہے کہ "فارس کے کچھ باشندے ترک وطن کر کے ایک دو ریلوں میں اس ملک میں چلے آئے جسے آج دردستان کہا جاتا ہے۔ اس ملک میں ان لوگوں کے آباؤ اجداد پہلے آباد تھے جو آج کل (ہنزہ اور نگر میں) بروشسکی بولتے ہیں اور غالباً شمال مغربی ہندوستان کے ان باشندوں کی نسل سے ہیں جنہیں انڈو آرین حملہ آوروں کے پہلے ریلے نے

یہاں دھکیل دیا تھا۔(9)

شنوں سے قبل ان اطراف میں یشکن قوم آباد تھی اور صدیوں تک اس ملک پر قابض رہی لیکن شنوں کے آنے پر دونوں قوموں میں بڑی خونریز جنگیں ہوتی رہیں اور بالآخر خرخرسن فاتح ہو گئے۔ یشکوں نے شنوں کی قیادت تسلیم کر لی۔ یہی نہیں انہوں نے فاتحین کے طور طریقے، تہذیب اور زبان بھی اختیار کر لی۔ گریرسن کے مطابق ''اس دشوار گزار ملک میں شمال سے آئے ہوئے حملہ آوروں کی زبان بلاشبہ قدیم باشندوں کی زبان سے اثر پذیر ہوتے ہوئے اپنے منفرد انداز میں ایرانی اور ہندوستانی کے مابین الگ نشو و نما پاتی رہی۔''(10)

بقول ڈاکٹر منگلوری ''قدیم زمانے میں اس علاقے کے لوگ مافوق الفطرت مخلوق پر اعتقاد رکھتے تھے، پھر بلخ کے قُرب کی وجہ سے ان علاقوں میں زرتشتی مذہب پھیلنے لگا۔ قبل مسیح میں ان علاقوں میں بدھ مت پھیل گیا۔ بارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس ملک میں اسلام کا وارد ہوا۔ دردقبائل نے بدھ مت چھوڑ کر مذہب اسلام اختیار کیا۔ شنوں کا قدیم ترین حکمران خاندان ''شاہ رئیس'' تھا۔ اس خاندان نے چترال سے کشمیر تک سیکڑوں برس تک حکومت کی۔ گلگت کا ظالم بادشاہ شری بدت اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جسے آذر جمشید نے 1120ء میں شکست دی۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں میں اسلام پھیلنے لگا۔

شنوں میں دوسرے مشہور خاندان تراخان نے بھی گلگت پر مدتوں حکومت کی۔ اس خاندان کے دو افراد بہت نامور گزرے ہیں ایک مرزا خان اور دوسرے اس کی بیٹی مرزا جواری۔ مرزا جواری نے اپنے کمسن بیٹے حبیب کے نام پر حکومت کی۔ اس کے دور میں گلگت بہت خوشحال تھا اس نے دریلوں سے گلگت کو سیراب کرنے کے لئے ''نہر جواری'' بنوائی۔ اس خاندان کا آخری حکمران حبیب خان تھا جسے (مہتر چترال) سلیمان شاہ خوشوقیہ نے 1925ء میں قتل کیا۔ 1840ء میں خوشوقیہ خاندان کے مشہور بادشاہ گوہر امان نے گلگت پر قبضہ کر لیا۔ گوہر امان نے ایک سال (1841ء تک) گلگت پر حکومت کی۔ کریم خان نے سکھوں کی فوج کی مدد سے گوہر امان کو گلگت سے نکال دیا اور سکھوں کی سرپرستی میں 1842ء سے 1851ء تک گلگت پر حکومت کی۔ اسی زمانے میں گلگت کا کشمیر سے تعلق پیدا ہوا۔ راجا گوہر امان نے راجا ہنزہ اور داریل کی اقوام کے ساتھ مل کر گلگت پر حملہ کیا۔ اس متحدہ فوج نے گلگت کو تسخیر کر لیا اور راجا گوہر امان کی فوج نے ڈوگرہ فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ اس کے بعد گلگت گوہر امان کے تسلط میں رہا اور ڈوگرہ فوج دریائے سندھ کے پار بونجی تک ہی رہی۔ گوہر امان کی زندگی میں ڈوگرہ فوج کو دریا پار کرنے کی ہمت نہ ہوئی لیکن 1860ء میں گوہر امان کی وفات پر ڈوگروں نے گلگت پر حملہ کر کے اسے قبضہ میں لے لیا۔ گوہر امان کی وفات کے بعد گلگتیوں کی متحدہ قومیت منتشر ہوگئی۔ ڈوگروں نے 1860ء سے 1866ء تک گلگت، یاسین اور داریل پر مسلسل جارحانہ حملے جاری رکھے۔ 1862ء میں مڈوری کوٹ کے مقام پر ڈوگروں نے یاسین کے معصوم بچوں اور عورتوں کا قتل عام کیا۔ بچوں اور عورتوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔ ڈوگروں کا یہ دور گلگت کے

لوگوں کے لئے مظالم کا دور تھا۔ 1877ء میں انگریزوں نے مہاراجہ کی اجازت سے اپنی ایجنسی قائم کی۔ کرنل ڈیورینڈ اس کے پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے۔ انگریز اور ڈوگرے مشترکہ حکمران رہے لیکن انگریز ہنزہ اور نگر کے روس، افغانستان اور چین کے ساتھ تعلقات کو ہندوستان کے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے اس لئے مہاراجہ کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے 1935ء میں ان علاقوں کو ساٹھ سال کے پٹے پر لے لیا۔ 1947ء میں برطانوی راج کا سورج ڈوب گیا تو دو الگ الگ مملکتیں وجود میں آگئیں۔ معاہدات منسوخ ہو گئے اور برطانوی حکومت نے پٹے کی باقی میعاد منسوخ کر کے گلگت ایجنسی مہاراجہ کی تحویل میں دے دی۔ 27 اکتوبر 1947ء کو مہاراجا ہری سنگھ نے کشمیر کا بھارت سے الحاق کر دیا۔ عوام نے متحدہ کوششیں کیں اور یکم نومبر 1947ء کو گلگت اور ملحقہ علاقے آزاد کرا لئے۔ 16 نومبر 1947 کو پاکستان نے ان علاقوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ (11)

بلتستان۔ تاریخ کا سفر:

بلتستان والا حصہ مختلف ادوار میں مختلف ناموں مثلاً بلو، بلور، بالتی، بلتی اور تبت خورد وغیرہ پکارا جاتا رہا ہے۔ اس حصے کے بارے میں روایت ہے کہ قبل مسیح کے زمانے میں لداخ، لہاسہ، کرگل اور بلتستان کے علاقوں پر ایک دیو مالائی کردار کیسر کی حکومت تھی۔ اس کی حکومت وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس نے ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کو بھی تخت و تاراج کیا۔ اس کے زمانے میں لوگ ''بونچ چھوس'' مذہب کے پیروکار تھے۔ دو سو سال قبل مسیح ان علاقوں میں بدھ مت کی تبلیغ شروع ہوئی۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں لداخ سے گلگت تک پلولا شاہی حکمران تھے۔ اس دور میں بلورستان پر تبتیوں کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔ اس زمانے میں تبت اور چین کے درمیان بڑی کشمکش جاری تھی۔ پامیر کے آس پاس چینی اور تبتی فوجوں میں بڑی جنگ ہوئی۔ نویں صدی عیسوی تک بلتستان تبت کا ایک صوبہ تھا۔ اس کے بعد بلتستان خانہ جنگی کی وجہ سے تبتی سلطنت سے الگ ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ مختلف وادیوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ وادی سکردو پر رگیالو ستر الیوں کی حکومت تھی۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں سکردو کے شاہی خاندان میں کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ بادشاہ نے کشمیر کی طرف سے آنے والے ایرانی نژاد مسلمان ابراہیم کو داماد بنا لیا۔ بادشاہ کے بعد مقپون ابراہیم کی نسل بلتستان کے بڑے حصے پر ساڑھے چھ سو سال تک برسر اقتدار رہی۔ اس عرصے میں بڑے نامی گرامی حکمران گزرے ہیں مثلاً بہرام چو، بوخا، شیر شاہ، علی خان، علی شیر انچن اور مقپون احمد شاہ۔ چودھویں صدی میں مبلغین نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی تھی اور لوگ تیزی سے اسلام کی طرف راغب ہوئے اور نئی تہذیب، اقدار کا معاشرہ جنم پذیر ہوا۔ علی شیر انچن کے مغلوں کے ساتھ بھی گہرے تعلقات رہے۔ مقپون خاندان کا آخری حکمران احمد شاہ تھا۔ جس سے ڈوگروں نے حکومت چھین لی اور بلتستان 1840ء کے بعد ڈوگروں کے تسلط میں آ گیا۔ (12)

1840-1948ء کے دوران ڈوگرہ راج رہا۔ جس کے خلاف 1842ء کی تحریک آزادی ناکام رہی۔ محمد

یوسف حسین آبادی کے مطابق 'بلتستان میں آخری ڈوگرہ ڈپٹی کمشنر ستمبر 1947ء میں سکردو پہنچا تھا۔ اور وہ 11 فروری 1948ء کو سپاہی سرفراز خان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔'' (13)

ہپر نگ کور کا زندگی نامہ:

''نانگا پربت (دیامیر) کے قریب ہپر نگ کور نامی پہاڑ ہے۔ پہاڑ کے قریب ''گور'' نامی گاؤں ہے۔ جس کے بارے میں محاورہ ہے کہ گور کے لوگ اپنے بڑے بوڑھوں کو ہپر نگ کور سے نیچے لڑھکا دیتے ہیں۔ صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کے قبائلی علاقے میں ایک جگہ کے بارے میں بھی ایسی ہی لوک کہانی ہے۔

ہپر نگ کور سے متعلق لوک کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ''گور'' کے گاؤں میں لوگوں کی عمریں سو سے ڈیڑھ سو سال تک تھیں۔ گاؤں کے وسائل کم تھے اس لئے راجا نے سوچا کہ یہ لوگ اتنی عمروں تک کیوں زندہ رہتے ہیں اور بلاوجہ وسائل پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ راجا سوچتا رہا اور بالآخر اس نے اپنی سوچ کو عملی شکل دے دی اور حکم دیا کہ ہر فرد جس کی عمر اسی سال پوری ہو جائے اسے ہپر نگ کور کے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گہری کھائی میں پھینک دیا جائے۔

لوگوں کو راجا کا یہ حکم سخت ناگوار گزرا لیکن وہ بے بس تھے۔ بعض نے اپنے معمر عزیزوں کو چھپانے کی کوشش کی لیکن ایسی بات کب تک چھپ سکتی تھی۔ چنانچہ راجا کے اس فیصلہ کے بعد ایک سال میں گور کے آٹھ مردوں کو اور سات معمر عورتوں کو ہپر نگ کور کی چوٹی سے کھائی میں دھکیلا گیا۔ گاؤں کے لوگ پہاڑ کی نصف بلندی تک ڈھول باجوں کے ساتھ معمر شخص کو لے جاتے اور پھر اسے اس کے رشتہ دار ہی اسے چوٹی تک لے جاتے۔

مدت کے بعد شنور جان کی بھی راجا کی مقرر کردہ عمر پوری ہوئی تو اسے بھی ہپر نگ کور کی چوٹی پر لے جایا گیا۔ نادر خان اپنے عزیزوں کے ساتھ اپنی ماں کو وہاں لے گیا۔ نادر کی ماں ہر ایک سے گلے ملی اور پھر چوٹی کی نگر سے کھائی میں کود گئی۔ چالیس سالہ نادر اپنی ماں کی اس طرح کی موت پر شدید مغموم کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ راجا کو کیا حق حاصل ہے کہ لوگوں کی عمروں پر قدغن لگائے۔ نادر کا سترہ سالہ بیٹا محبوب خان بڑے غور سے اپنے باپ کی حالت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اچانک پورے عزم کے ساتھ باپ سے بولا۔ تم نے جس طرح اپنی ماں کو مرنے دیا ہے میں تو تمہیں اس طرح ہرگز نہ مرنے دوں گا۔

وقت گزرتا گیا۔ نادر اپنی کمر کے گرد بندھی رسی میں ہر سال ایک گرہ لگاتا گیا۔ آخری گرہ لگانے میں ایک مہینہ رہ گیا تھا کہ ایک رات نادر اور محبوب، دونوں باپ بیٹا خاموشی سے گھر سے نکلے۔ محبوب نے پہلے سے انتظام کیا ہوا تھا۔ راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ وہ بڑی مشقت اٹھا کر ایک غار میں پہنچے۔ محبوب نے غار میں آگ جلائی۔ نادر نے غار کے اندر رکھی ہوئی چیزوں کو غور سے دیکھا۔ محبوب نے غار کو رہائش کے قابل بنانے کے لئے بہت محنت کی تھی اور شاید لاتعداد پھیرے کئے تھے۔

''غار میں موجود تمام چیزیں دیکھنے کے بعد نادر بیٹھ گیا تو محبوب نے باپ سے کہا، اگر تم نے غار سے

بھاگنے کی کوشش کی یا اپنے آپ کو راجا کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچا تو میں تمھارے ساتھ ہپر نگ کور سے کود جاؤں گا۔

دونوں باپ بیٹا کچھ دیر تک وہاں بیٹھے بات چیت کرتے رہے۔ محبوب باپ کو برف میں چھپائی ہوئی چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا پھر نادر نے محبوب کو گھر جانے کی اجازت دے دی تاکہ پو پھٹنے سے پہلے گھر پہنچ جائے، نیز تمام ضروری چیزیں اس کے پاس موجود ہیں اس لئے چند ماہ تک وہ اسے ملنے کے لئے نہ آئے۔

''گور میں نادر کی گمشدگی کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ عام طور پر یہی سوچا گیا کہ نادر اپنی عمر پوری ہونے کے خیال سے خود ہی ہپر نگ کور سے کود گیا ہے۔ پھر دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ محبوب اپنے باپ کے لئے تمام ضروری چیزیں مہیا کرتا رہا اور گور کے حالات اور گھر کے معاملات باپ کو وقتاً فوقتاً بتاتا رہا۔ مدت تک غار میں رہنے سے نادر اکتا گیا تھا اس لئے وہ رات کو گھومتا ہوا چوٹی پر چلا جاتا۔ محبوب کو اپنے والد کے معمولات کا علم تھا اس لئے دونوں کی چوٹی پر ملاقات ہو جاتی۔ اور دونوں واپس آ کر غار میں بیٹھ جاتے۔

گور کا راجا اب گاؤں کا سب سے معمر فرد تھا۔ اس کی عمر سو سال ہو چکی تھی۔ ایک رات راجا کی طبیعت میں عجیب قسم کی پژمردگی سی پیدا ہوئی۔ وہ محل سے نکل کر سیبوں کے باغ میں گیا۔ پھر وہاں سے نکل کر چلتا گیا۔ کسی لا شعوری کیفیت میں وہ ہپر نگ کور کی طرف چل پڑا۔ چاندنی رات تھی۔ راجا چوٹی سے کچھ دور تھا کہ اسے ایک آسان سا راستہ نظر آیا۔ وہ اس راستے پر چل پڑا۔ کچھ آگے بڑھا تو ایک دو ہموار کھیت نظر آئے جن میں جڑی بوٹیاں اگائی ہوئی ہیں۔ اسی دوران میں وہاں راجا اور نادر کی ملاقات ہو گئی۔ نادر نے راجا کو بتایا کہ گور کے لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اس لئے وہ یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ راجا خاموشی سے نادر کی باتیں سنتا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔

دوسرے دن گور کے بے شمار لوگ راجا کے محل کے سامنے جمع تھے۔ راجا نے پیغام بھیج کر محبوب کو بلوایا۔ راجا نے محبوب سے نادر کے بارے میں صاف صاف بات کرنے کے لئے کہا۔ محبوب نے سچ کہہ دیا اور بولا اس کا باپ بہت عقل مند شخص ہے، گور کے لوگوں کو، ہمیں اور راجا کو اس کی ضرورت ہے۔ راجا نے کہا اگر محبوب کا باپ اتنا عقل مند ہے تو وہ ہمیں ریت کی رسی بنا دے۔

یہ فرمائش کر کے راجا محل میں چلا گیا۔ لوگ گھروں کو چلے گئے۔ محبوب باپ سے ملنے کے لئے غار میں پہنچا۔ نادر نے پوچھا راجا نے کیا پیغام بھیجا ہے۔ محبوب کے پوچھنے پر نادر نے بتایا کہ رات اس کی راجا سے ملاقات ہو چکی ہے۔

محبوب نے باپ کو بتایا کہ راجا نے ریت کی رسی بنا کر دینے کے لئے کہا ہے، نادر نے مسکرا کر کہا راجا سے جا کر کہو کہ نادر کہتا ہے کہ راجا جس قسم کی رسی کہہ رہا ہے اس کا نمونہ بھیج دے، نادر تیار کر دے گا۔

دوسرے روز گور کے بے شمار لوگ نادر کا جواب سننے کے لئے محل کے باہر اکٹھے تھے۔ محبوب آ گیا۔ راجا

محل سے باہر نکلا تو محبوب نے ادب سے کہا کہ اس کا باپ کہتا ہے کہ راجا ریت کی جیسی رسی بنوانا چاہتا ہے اس کا نمونہ بھیج دیا جائے، اس نمونے کے مطابق رسی تیار کر دی جائے گی۔ راجا محبوب کا یہ جواب سن کر خاموشی سے محل میں چلا گیا۔

اس دن گور اور اس کے تمام ارد گرد کے علاقے میں منادی کر دی گئی کہ راجا نے تمام بچوں، بڑوں، عورتوں اور مردوں کو دعوت پر بلایا ہے۔ دعوت کا بہت شاندار انتظام تھا۔ لوگوں نے خوب جی بھر کر کھایا اور پیا۔ آدھی رات ہونے والی تھی کہ راجا نے اعلان کیا کہ نادر، محبوب کا قصور معاف اور آئندہ کے لئے عمر کی قید کا فیصلہ منسوخ۔ لوگوں نے فیصلہ سنا۔ ان میں عجیب تبدیلی ہوئی انہوں نے آئندہ اس کی کوئی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ راجا نے اپنے بیٹوں کو اپنے رشتہ داروں کے پاس رہنے کے لئے بھیج دیا اور خود اپنی موت کے وقت کا انتظار کرتا رہا۔'' (14)

ظالم راجہ شری بدت کا انجام:

گلگت میں ہر سال ایک جشن منایا جاتا ہے جس کی بنیاد بچوں کو کھانے والے ایک راجہ کے مظالم سے نجات کی کہانی پر رکھی گئی ہے کہ کس طرح گلگت کے عوام اجتماعی طور پر راجہ کے مظالم سے نجات پاتے ہیں۔

گلگت کے علاقے کی رعایا اپنے ظالم اور بدکردار راجا کے ہاتھوں سخت اذیت میں مبتلا تھی۔ راجا بے تحاشا گوشت کھاتا تھا۔ اس کے لئے گوشت مہیا کرنے کے لئے اس کے حواری اور خدمت گار لوگوں کے میمنے پکڑ لاتے اور راجا کو کھلاتے۔ مرجان نامی ایک خاتون زچگی کی حالت میں تھی۔ اتفاق سے اس کی بکری بھی ایسی ہی کیفیت میں تھی۔ مرجان کا بچہ مردہ حالت میں پیدا ہوا بکری نے ایک میمنا دیا لیکن بکری صبح تک زندہ نہ رہ سکی۔ مرجان کو اپنے مردہ بچے کا صدمہ تھا۔ اس نے تو بچے کا نام بھی رکھ دیا تھا، بلبل خان۔۔۔ مرجان اس صدمے میں ہی تھی کہ میمنے نے دودھ کے لئے شور و پکار شروع کر دی۔ مرجان پریشان تھی کہ میمنے کے لئے دودھ کیسے حاصل کرے۔ اسے کچھ سمجھ نہ آئی، میمنا شور کر رہا تھا۔ مرجان کی چھاتیوں میں دودھ اُترا ہوا تھا، مرجان نے میمنے کو اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔

مرجان کے دودھ پر پلتا ہوا میمنا اب بڑا ہو گیا تھا۔ ایک دن راجا کے خدمت گار آئے اور مرجان کے میمنے کو پکڑ کر لے گئے۔ اس رات راجا کے دستر خوان پر بھونا ہوا گوشت بہت لذیذ تھا۔ اس قدر لذیز گوشت کے بارے میں راجا نے استفسار کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ میمنا ایک عورت کے دودھ پر پلا تھا۔ راجا نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ انسانی دودھ پر پلنے والا گوشت سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ چنانچہ راجا کے خدمت گاروں نے معصوم بچوں کو پکڑ کر لانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ راجا ان معصوم بچوں سے اپنا شوق پورا کرتا رہا۔

بچوں کی گمشدگی سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ مائیں اب بچوں کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں۔ اسی دوران میں مرجان کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ مرجان نے اس کا نام بلبل خان ہی رکھا۔ بلبل خان کی پیدائش سے مرجان کی روح کے زخم مندمل ہونے لگے۔ بلبل خان تین سال کا ہو گیا۔

ایک رات مرجان اپنے بیٹے بلبل خان کو سینے سے لگا کر سوگئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ آدھی رات کو کچھ کھٹکا ہوا۔ مرجان جاگ گئی۔ اس نے دیکھا تو بلبل خان وہاں موجود نہیں تھا۔ کھڑکی کے قریب اس کی ٹوپی پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مرجان سب کچھ سمجھ گئی۔ دل کے درد سے اس نے زور سے "بُنگا" کیا۔ اس "بُنگا" سے ساری وادی کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ساری وادی گونج اٹھی۔ لوگ جاگے اور مشعلیں اٹھائے مرجان کے گھر کی طرف دوڑے۔ منظر دیکھ کر سب سمجھ گئے۔ مرجان دہلیز سے لگی کھڑی تھی۔ عورتیں اسے تسلی اور سہارا دینے کے لئے بڑھیں۔ مرجان پٹ سے دہلیز پر جا گری۔ اس سے پہلے ہی اس کی روح اس کے قفس خاکی سے پرواز کر چکی تھی۔

لوگ بچوں کے معاملے کے پیچھے کارفرما ہستی کو بہت حد تک جان چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے سات معتبر افراد کو فوری طور پر راجا کے محل کے پچھواڑے والی کھائی کی نگرانی کرنے کے لئے بھیج دیا۔ انہوں نے محل سے پھینکی ہوئی بلبل جان کی پوشاک شناخت کر لی۔

دوسرے دن وہ ساتوں معتبر افراد راجا کے دربار میں حاضر ہوئے اور ایک جشن میں راجا کو شریک ہونے کی دعوت دی اور دعوت میں بہت لذیذ گوشت پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ راجا خوش ہو گیا۔ رات کو راجا اور اس کے حواری جشن میں شریک ہوئے۔ شامیانے لگے ہوئے تھے۔ دنبے بھونے جارہے تھے پرانی شراب پیش کی گئی۔ راجا اور حواری میٹھی شراب پیتے رہے۔ گوشت کھانے کا موقع ہی نہ آیا اور وہ شراب پی پی کر مدہوش ہو گئے۔ خاص خاص لوگوں نے راجا اور اس کے حواریوں کو سلوں کے ساتھ باندھا اور دریا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح لوگوں کو اس عذاب سے نجات ملی۔ (15)

گلی متی کا لوک بیانیہ:

یہ ظالم راجہ کے خلاف انفرادی جدوجہد کی ایک کہانی ہے۔

روبینہ امتیاز قزلباش کے بیان کے مطابق: پہاڑوں اور ان کی وادیوں میں بسنے والوں کے درمیان محبت اور شفقت کا ایک عجیب رشتہ قائم ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ پہاڑ اپنی وادیوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ندی نالوں کا منہ کھول دیتے ہیں جو وادیوں میں اگے ہوئے درختوں، جانوروں اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ان کے تیز جھرنوں پر جندر آٹا پیستے ہیں۔ سردیوں میں انہیں جنگلوں کے دم سے گرمی میسر آتی ہے۔ چیل کی چھوٹی بالیاں گندے بروزے سے بھرپور "دیئی" کا کام دیتی ہیں۔ جو اندھیری راتوں میں مشعلیں بن کر مشکل پگڈنڈیوں پر چلنے والے راستہ کو منور کرتی ہیں۔

پہاڑوں کی اونچی دیواروں اور وادیوں کی تنگی، انسانی آواز میں ایک ایسی گونج پیدا کر دیتی ہے جو وائرلیس اور ٹیلی فون کے بغیر زور کی پکار کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتی ہے۔ اس طرح اچانک حادثوں کی اطلاع ہر طرف گشت کر جاتی ہے۔ زور کی اس پکار کو پہاڑی "بُنگا" کہتے ہیں۔ پہاڑی معاشرے میں اچھا اور

واضح "بگا" دینے والے کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ضرورت کے وقت اس کو کہا جاتا ہے کہ "بگا" دے کر قریب کے گاؤں کو اطلاع کر دے۔ایک گاؤں سے "بگا" دوسرے گاؤں کو دیا جاتا ہے۔اس طرح ایک ہی دن میں بہت سے گاؤں کو اہم خبر مل جاتی ہے۔

پاکستان کے ان پہاڑیوں کی زندگی صدیوں سے ایک سی ہی ہے۔ان کی سوچ، ان کا اخلاق، ان کا رہنا سہنا، ان کے اوزار، خوراک، لباس، رسم و رواج آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے صدیوں قبل تھے۔ان کا وجود بیسویں صدی میں ہو کر بھی بیسویں صدی میں نہیں ہے اور اگر معاشرتی نفسیات کے ماہرین انہیں اپنی توجہ کا مرکز بنائیں تو انتہائی دلچسپ معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔

پہاڑی اپنے پہاڑوں کی قدر کرتے ہیں۔وہ ان کی بلند چوٹیوں کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کے حسن کی تعریف کرتے ہیں، ان کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔وہ پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر کبھی قدم نہیں رکھتے ان کا عقیدہ ہے کہ پہاڑ پاک ہیں۔انہیں انسانی قدموں سے ناپاک کرنا گناہ ہے۔پہاڑ ایسے گناہگار سے خفا ہو جاتے ہیں اور اپنا بدلہ ضرور ہی لیتے ہیں۔

جب بیرونی ممالک اور پاکستان کے ترقی یافتہ علاقوں سے کوہ پیما یہاں آتے ہیں تو وہ ان باشندوں کو کتنا ہی لالچ کیوں نہ دیں وہ ایک مخصوص بلندی کے بعد سامان آگے لے جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں "ہمیں گناہگار نہ کرو، اگر ہم یہ گناہ کر بیٹھے تو پہاڑ ہم سے بدلہ لیں گے۔"

انہی پہاڑوں کے بیچوں بیچ بلتستان کا علاقہ ہے جس کے وسط میں وادیء گلگت ہے۔برسوں قبل وادی گلگت ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔اس پر "راجہ" حکومت کرتے تھے۔یہ راجے مصیبت، قحط، غربت، بیماری اور ان آفات کے سد باب کی سی ذمہ داریوں سے واقف نہ تھے۔انہوں نے اپنا رشتہ دیوتاؤں سے جوڑ رکھا تھا اور ان کے حوالے سے باشندوں میں خوف و ہراس پھیلا کر اطمینان سے راج کرتے تھے۔انسانوں سے بلند اور دیوتاؤں سے قریب۔۔ یہ راجہ اپنی مرضی کے مالک تھے۔ان کے لئے زندگی کا مقصد اپنی ہر خواہش کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔جائز و ناجائز، عدل و ظلم، ہمدردی و بے تعلقی، انسانیت و وحشت، ان میں تفریق و امتیاز سے وہ عاری تھے۔راجہ ہونے کے ناتے سے وہ اپنے آپ کو ان اخلاقی مطالبات سے بالاتر سمجھتے تھے۔وادی ان کے لئے بازی گاہ تھی اور گلگتی ان کی سہولت کا ایک ذریعہ۔وادی کے لوگ برسوں سے ان کے ظلم کا شکار تھے مگر زندگی کی اس طرز کو دیوتا کی مرضی سمجھ کر ہر ظلم سہنے کے عادی ہو چکے تھے۔

مردانگی، عزم، کمال۔۔ یہ سب صلاحیتیں ان میں موجود تھیں جو ان کی زندگیوں کے باقی پہلوؤں میں اظہار پاتیں۔مگر راجہ کے خلاف قدم اٹھانا ان کی سوچ میں داخل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ان کے لئے یہ ایک دیوتائی معمہ تھا جو ان کی سمجھ سے باہر تھا۔کبھی کبھار کوئی راجہ اتفاق سے، انسان دوست نکل آتا تو یہ لوگ اسے دیوتا کی عنایت سمجھتے اس

راجہ کی انسان دوستی میں پہلے راجہ کے مظالم بھول جاتے۔خوش اور مطمئن زندگی گذارتے۔زیادہ اطاعت گذار ہو جاتے۔کبھی کبھار کے یہ خوشگوار حادثے،ان کے دلوں میں ڈھلتی ہوئی نفرت کی کڑی کی کڑی توڑ دیتے،اس طرح یہ کڑیاں ایک ایسی مضبوط زنجیر میں نہ بدل پاتیں جو اس مسلسل استبداد کو اپنے گھیراؤ میں لے کر اس کو ہمیشہ کے لئے جکڑ کر ختم کر سکے۔جہالت کے شکار یہ اچھے لوگ اپنی سوچ کے اس زاویے کو نہ بدل سکتے تھے۔راجہ جیسا بھی ہوتا،دیوتا کا اوتار تھا اور انہیں اس کا راج سہنا ہی پڑتا۔

جب جیپ رکی تو ایک عجیب منظر تھا،صاف،شفاف،تیزی سے بہتا ہوا نالہ ''کارگاہ''۔۔۔اس کے دائیں کنارے پر سنگلاخ چٹانیں سورج کی روشنی روکے،اونچی مغرور کھڑی ہیں۔بائیں طرف بجری اور پتھروں کا محدود ساحل،پھر تنگ سا راستہ اور ایک اور پہاڑ جس پر اکا دکا جھاڑیاں چند چیل کے درخت اور بس۔وادیءگلگت کے جنوبی نکڑ پر،جہاں بس یہیں ختم ہوتا ہے۔یہ ایک عجیب سی تنگ سی وادی ہے۔یہاں دن کو بھی شام کا سماں رہتا ہے۔نالے کے شور اور اس کی گونج سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

ہم ٹراؤٹ کے شکار کو آئے تھے۔راستہ نالے کے ساتھ ساتھ رواں تھا۔تنگ وادی تنگ تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔شام،گہری شام میں بدل رہی تھی۔دائیں جانب چٹانیں اور بائیں جانب پہاڑ بلند تر ہوئے جا رہے تھے۔عجیب سی گھٹن اور ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔نالے کا شور جیسے وادی کی سب آوازوں کو دبائے ہوئے تھا۔''کوئی نہ آئے،کوئی نہ جائے،کچھ نہ سنائی دے۔'' تنگ وادی یہی انداز لئے بڑھتی جا رہی تھی۔

میں رُک گئی،''آگے کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''گل مُتی''،گلگتی بولا۔

''ایک لڑکی تھی''

''یہاں کیا کرنے آئی تھی''

''اپنے پہاڑ کی گود میں پناہ لینے۔''

''مجھے بتاؤ گلگتی،یہ کیا واقعہ ہے؟''

میرا تجسس مجھے آگے لے گیا۔ہم بڑھتے گئے۔وادی تنگ ہوتی گئی اور پہاڑ بلند تر۔اب راستہ ایک پگڈنڈی میں سمٹ چکا تھا۔کارگاہ کی پر جوش لہریں ہمارے ٹخنوں سے ٹکرا رہی تھیں۔جیسے ہمیں آگے جانے سے روک رہی ہوں۔شام گہری ہو چکی تھی۔بہت دور آسمان روشن تھا تو سہی،مگر اس کی روشنی نیچے پہنچ نہ پا رہی تھی۔پہاڑ چٹانوں کی طرح ننگا تھا۔اب تو اس پر جھاڑی کیا،گھاس تک نہ تھی۔بھُر بھُری مٹی اور پھسلتے پتھر۔یہاں پہنچ کر گلگتی رک گیا۔اس کا رخ پہاڑ کی طرف تھا۔اس کے چہرے پر دُکھ اور ندامت کا ہلکا سا تاثر تھا۔پہاڑ کے وسط میں ایک بڑا سا غار دکھائی دیا۔اس کا دہانہ کھلا تھا۔اندر سیاہ اندھیرا تھا۔غار کے منہ پر ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا جیسے لڑھکنے کو تیار کھڑا ہے۔

''یہاں گل مُتی نے پناہ لی تھی۔'' وہ ڈری ڈری آواز میں بولا۔ کیوں؟

''پرانی بات ہے بی بی'' گلگتی نے ایک لمبا سانس لیا۔ پھر اس نے بتایا کہ جس راجہ کا یہ دور تھا، وہ بے انتہا مغرور، ظالم اور بد تھا۔ دنیا کی ہر بُری عادت اس میں تھی۔ بہت شراب پیتا، بہت خوراک کھاتا۔ بہت سوتا، غسل کبھی کبھار کرتا۔ غصہ جنون کی حد تک تھا۔ اس حالت میں اکثر قتل کر دیتا۔ پچھتاوا نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھا۔ جو کر بیٹھا سو کر بیٹھا۔ عقل سے عاری جھوٹ اور سچ کی تمیز سے بے بہرہ، معاشرے کی مروجہ قدروں کا کھلم کھلا مذاق اڑاتا تھا۔ انسان اس کے لئے کھلونے تھے اور ان کی زندگیاں اس کی ذاتی سہولتیں تھیں۔ آخر وہ دیوتائی قوت کا حامل جو تھا۔ گلگتی بہت ہی تنگ آئے ہوتے تھے۔ وادی میں غم اور مایوسی کا دور دورہ تھا۔ لوگ ضرورت سے زیادہ مشقت میں کھو کر اس مشکل وقت کو گذارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دعا کرتے رہتے کہ راجہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے۔ تا کہ کم از کم ان کی اولاد تو اس کے عتاب سے محفوظ رہ سکے۔ وادی میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کھیتوں میں ہمیشہ کام کرتی چلی آتی تھیں مگر اب انہوں نے منہ چھپانا اور محتاط رہنا شروع کر دیا۔ کسی کی عزت محفوظ نہ تھی۔ راجہ کو جو بھا گئی سو اسے اٹھا کر چلتا بنا۔ پھر بعد میں وہ بے چاری شرم کی ماری، کبھی اپنے گھر والوں کے پاس واپس نہ آ سکتی۔ اسے دریائے ہنزہ میں پناہ ملتی۔ کتنے ہی گھر اس المیے کا شکار ہو چکے تھے۔

گل مُتی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ بچپن سے ہی وہ نیک اور پاک تھی۔ شکل وصورت کی بے انتہا خوبصورت۔ گاؤں کے سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے اور اس کی نرم طبیعت کی وجہ سے اس کی قدر کرتے تھے۔ بزرگ اس کو دعا دیتے تھے۔ نوجوان اس کو پانے کا ارمان دل میں لئے مشقت کرتے تا کہ کچھ کر دکھائیں اور گل مُتی کے قابل ہو سکیں۔ وہ صرف اپنے ماں باپ کی ہی نہیں سارے گاؤں کی بیٹی تھی۔ ہمدرد، حساس، مہربان اور حسین۔۔۔!

سیاہ لانبے بال، گلابی اور شفاف رنگ، بڑی بڑی حساس سرمئی آنکھیں، گھنی لانبی پلکیں، دراز قد، سڈول جسم، پتلی کمر، نازک ہاتھ اور پاؤں لانبی انگلیاں، قدرت نے اسے خاص توجہ سے بنایا تھا۔ جب پانی بھرنے جاتی تو عورتیں بھی اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکتیں۔ وہ سب کے اندر پیار اکساتی تھی۔ سب کی مدد کو تیار، سب کی عیادت کو رضامند، دکھ سکھ بانٹنا اس کی فطرت تھی۔ لوگوں کے چہرے اسے ان کی دلوں کی کیفیت بتا دیتے اور بغیر کچھ پوچھے وہ ان کی مدد کو پہنچ جاتی۔ کسی کو تسلی کا لفظ، کسی کے لئے پر امید جملہ، کسی کو خاموش رفاقت۔ جو بن پڑتا کر گزرتی۔ نوجوانوں کی مجلسوں میں اس کا ذکر ہوتا۔ ''گل مُتی چاہیے تو کچھ بن کر دکھاؤ!'' وہ ان کے لئے مردانگی، عزم اور کمال کا محرک تھی۔ گل مُتی ان کی زندگیوں میں ایک حسین واقعہ تھی!

اس دن ایک بہت ہی حسین شام تھی۔۔ دریائے گلگت آہستہ آہستہ رواں تھا۔ سنہری سورج سرمیلے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ اس کی زرد کرنیں لہروں سے کھیل رہی تھی۔ دھندلکوں میں وادی بہت

خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہر چیز کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ درخت، پتے، کھیت، گھاس، پتھر اور دریا کی لہریں، سبھی خاموش اور پرسکون تھیں۔ فصلیں ابھی کمسن تھیں۔ ان کی سبز کونپلیں دھیرے دھیرے سرسرا رہی تھیں۔ کام کرنے والے کبھی کے گھروں کو جا چکے تھے۔ کھیت خالی تھے اور پگڈنڈیاں خاموش۔ لوگ کھانے اور سونے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ رات ہونے سے پہلے سب ضرورتوں سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ ٹمٹماتی چراغوں کی روشنی میں کام کرنے کے قائل نہ تھے۔

گل مُتی بھی کام ختم کرنے میں ماں کی مدد کر رہی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ گھر میں پانی نہ تھا۔ رات کو پیاس لگی تو کیا ہوگا۔ بوڑھی ماں کو چشمہ پر جانا پڑے گا۔ آج اس نے بہت کام کیا ہے، تھک گئی ہے۔ کیوں نہ میں ہی جلدی سے پانی لے آؤں۔ چشمہ نزدیک ہی تو ہے۔

اس نے جلدی سے گھڑا اٹھایا۔ ''آئی ماں۔ میں بس ابھی آئی'' اس نے کہا اور جواب سنے بنا چلتی بنی۔ ابھی وہ کچھ دور ہی گئی تھی کہ اسے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ گل مُتی نے سوچا۔ اگر راجا ہوا تو اے دیوتا میری مدد کر!'' ابھی اس کے قدم رُکے ہی تھے کہ گھوڑ سوار سر پر پہنچ گیا۔ گل مُتی نے نگاہیں اٹھائیں۔ سوار راستہ روکے اسے گھورے چلے جا رہا تھا۔ اس کی مست آنکھوں میں غلیظ جذبات عیاں تھے۔ صورت مکروہ تھی۔ جسم موٹا اور بھونڈا۔ گل مُتی گھڑا ہاتھ میں لئے بے خوف اس کا جائزہ لے رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔۔''اس میں تو دیوتاؤں والی کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تو انسان کی بھی گری ہوئی شبیہ ہے۔۔۔وادی کے سب لوگ اس سے خوفزدہ ہیں! آج تک! آخر کیوں؟

گل مُتی نے راجہ کو پہلی بار دیکھا تھا۔'' یہ بدمست! یہ کریہہ صورت! یہ کمزور آدمی! اور پھر ہمارا راجہ! اس کا ذہن تیزی سے گھوم رہا تھا، اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی نفرت راجہ کو نظر نہ آ رہی تھی۔ وہ تو اس کے حسن کو دیکھے چلا جا رہا تھا۔

''میرا راستہ چھوڑ دو، مجھے پانی لینے جانا ہے۔'' گل مُتی نے دبدبے سے کہا۔ راجہ ایک دم چونک پڑا۔ وادی کی کوئی لڑکی آج تک اس سے یوں مخاطب نہ ہوئی تھی۔ اکثر تو اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتیں۔ وہ گھوڑے سے اترا۔ ایک ہاتھ سے باگ سنبھالی اور دوسرا ہاتھ گل مُتی کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھایا۔ گل مُتی نے غضبناک ہو کر گھڑا اٹھایا اور پوری قوت سے راجہ کے دے مارا۔ راجہ پھرتی سے ایک طرف ہو گیا۔ گھڑا جا گھوڑے کے منہ پر لگا۔ گھوڑا بدکا اور باگ چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ راجہ ذرا سی دیر کے لئے لڑکھڑایا پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔''اس چھوکری کی یہ مجال؟'' اس نے سوچا۔

گل مُتی بھاگ کھڑی ہوئی۔ آگے آگے وہ تھی اور پیچھے راجہ۔ گل مُتی دوڑتی چلی گئی۔ کھیتوں سے ان کے ''اٹ'' پھلانگتی، راستوں سے پگ ڈنڈیوں سے۔۔۔اُس نے مدد کے لئے کسی کو نہ بلایا۔۔۔وہ سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ میری کیا مدد کریں گے جو برسوں سے راجاؤں کے سامنے بے بس ہیں۔ میں پہاڑوں کی مدد مانگوں گی میں آخر

ان کی بیٹی ہوں۔

گل مُتی بھاگتی چلی گئی۔ وادی تنگ ہوتی گئی۔ نالے کا شور بڑھتا گیا۔ شام، گہری شام میں بدل گئی۔ گل مُتی کے قدم نہ رُکے۔ آگے آگے وہ تھی اور تعاقب میں راجہ۔ یہ موذی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔۔ اس کا غیرت مند عزم کہہ رہا تھا۔

پھر وہ پکاری ''کوئی ہے؟ کوئی قدرت؟ کوئی عظمت؟ جو مجھے بچالے۔ میں اسے اپنی عزت کا واسطہ دیتی ہوں۔''

وادی اتنی تنگ ہوگئی کہ آگے بڑھنا مشکل ہوگیا کہ گل مُتی کو اپنے اکھڑے سانسوں کی آواز بھی نہ سنائی دے رہی تھی۔ تعاقب میں راجہ تھا۔ آگے راہ محدود تھی۔ دائیں طرف نالہ تھا۔ گل مُتی نے بائیں طرف کے چٹیل پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔

وہ پہاڑ پر چڑھتی گئی۔

راجہ لپکتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا

گل مُتی کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ کر منہ میں آنے کو ہے، مگر وہ بڑھتی چلی گئی۔

راجہ بہت قریب آ چکا تھا۔

یہ یہ یہ یہ پہاڑ!!! گل مُتی ''کا بگا'' بلند ہوا اور ایک مسلسل گونج بن کر پہاڑوں سے ٹکراتا وادی کے کونے کونے میں دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔

لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے اور کارگاہ کی طرف لپکے۔ ان کا ہجوم تنگ وادی میں گھستا چلا گیا۔ ان کے ہاتھوں میں ''دینیوں'' کی روشنی تھی جو ان کی تنگ راہ کو منور کر رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے تیزی سے مگر خاموش رواں تھے۔

گل مُتی کے ''بگے'' کی گونجیں اب بھی ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ تجسس انہیں کھینچے لئے آ رہا تھا فکر و اندیشہ سے ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ کوئی کسی سے نہ پوچھ رہا تھا۔ سبھی خاموش تیز تیز بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

زور کا دھماکہ ہوا۔ پہاڑ پھٹ گیا۔ اس کے سینے میں ایک سیاہ غار نمودار ہوا اور گل مُتی اس غار میں داخل ہو گئی۔ دھماکے سے راجہ کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گل مُتی کے دوپٹے کا سہارا لینے کی ناکام کوشش کرتا ہوا گرا۔ لڑھکا اور پھر لوگوں نے راجہ کو گڑ گڑ گڑ ازگڑ از شڑاپ کے ساتھ کارگاہ کی تند موجوں کی نذر ہوتے دیکھا۔ پلک جھپکنے میں پانی برابر ہوگیا۔ کارگاہ کا پانی راجہ کو کھا گیا تھا۔

ہجوم جیسے سکتے میں آ گیا۔ کافی دیر تک وہ سب پانی کی تلملاتی سطح کو دیکھتے رہے۔ پھر جیسے آہستہ آہستہ ان میں شعور جاگا، انہوں نے پہاڑ کی سمت نگاہیں بلند کیں۔ سارا پہاڑ ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ ریت اور مٹی کی لہریں پھسل

پھسل کر نیچے آ رہی تھیں۔ سطح اتنی بھری بھری تھی جیسے مٹی کا ہلکورے لیتا سمندر ہے اور جس نے قدم رکھا دھنس جائے گا۔ پتھروں اور کنکروں کی بارش ہو رہی تھی۔ دور چوٹی پر بڑی بڑی چٹانوں کے ٹکڑے اور گول پتھر خطرناک صورت میں ہل رہے تھے جیسے ابھی گرے کہ ابھی گرے۔

پھر انہوں نے وسط میں ایک غار دیکھا۔ غار کے دہانے پر شام کی ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں گل مُتی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ اتنے فاصلے۔۔۔ اتنے اندھیرے کے باوجود گل مُتی کی آنکھوں کا تاثر ان تک پہنچ رہا تھا۔ جیسے اس کی دو بڑی بڑی حساس آنکھیں ان کے قریب آ کر ان کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ وہ ان آنکھوں سے رواں سب تاثرات کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہے تھے۔ انہیں لرزتے پہاڑ، منڈلاتی چٹانوں، تلملاتی موجوں۔۔۔ کسی کا بھی احساس نہ رہا۔ گل مُتی کی نگاہیں تھیں اور وہ تھے اور بس۔

گل مُتی انہیں دیکھتی رہی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو دیکھا۔ اپنی ہمجولیوں کو دیکھا۔ ان نوجوانوں کو دیکھا جو اس کے لئے اپنی جان بھی فدا کر سکتے تھے۔ اس نے ان کے قدموں کو بھی دیکھا جو لرزتے پہاڑ کے باوجود اس تک پہنچنے کے لئے اٹھے تھے مگر اب رُک کر اس کے حکم کے منتظر تھے۔

اب گل مُتی کی آنکھوں میں کسی کے لئے رفاقت نہ تھی۔ وہ انہیں لاتعلقی سے دیکھتی رہی۔ نظروں کے اس ملاپ میں جیسے مدتیں گذر گئیں۔ پھر اس نے منہ موڑا اور غار کے اندر اندھیرے میں چلی گئی۔ کچھ لمحوں تک غار کے دہانے پر اس کی لہراتی زلفوں کا گمان رہا پھر وہ بھی گم ہو گیا۔

گل مُتی ان سب سے منہ موڑ کر غار کے اندھیروں کو اپنا چکی تھی۔ یہ اس کا اٹل فیصلہ تھا۔

کرب ان کے دلوں کو مسل رہا تھا۔ روح کے اندر اتنا درد امنڈ آیا تھا کہ آہ بھی نہ نکل رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ذہنوں پر پڑے ہوئے پردے ویسے ہی پڑے رہے۔ کسی نے راجہ کے محل کا رُخ نہ کیا۔ کسی کو بغاوت کی نہ سوجھی۔ غم سب کا مشترک تھا مگر ذہنوں اور ضمیروں کے پردوں کو جنہیں صدیوں نے بُنا تھا کسی نے نہ ہٹایا۔

ان کی گل مُتی جا چکی تھی، بس یہ اذیت ناک احساس تھا اور اس کو خاموشی سے سہہ لینے کی ویرانی تھی جو ان کی روحوں کو گھائل کیے دے رہی تھی۔

راجہ کی لاش ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملی۔ اس کا کمسن بچہ گدی نشین ہوا اور راجہ کہلایا۔ لوگوں نے اس کا راج قبول کر لیا اور دعا کی کہ وہ ہمدرد اور انسان دوست ہو۔

''مگر گل مُتی کا کیا ہوا'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

گلگتی حیران رہ گیا جیسے اب اس کے کہنے کے لئے کیا باقی رہ گیا تھا۔ ''بی بی! وہ پھر غار سے کبھی نہ آئی۔ وادی کے لوگ اس کی ضرورت کی چیزیں غار کے دہانے پر رکھ آتے۔ جن میں سے کچھ وہ کبھی کبھار اٹھا بھی لیتی۔۔۔ لیکن کسی نے پھر اس کی جھلک نہ دیکھی۔''

اس طرح برسوں گذر گئے۔ ایک دن ان چیزوں کو اٹھانے وہ باہر نہ آئی۔ پھر کافی دن اسی طرح گذر گئے۔ لوگوں کو تشویش ہوئی۔ کچھ نے اندر جا کر دیکھنے کا ارادہ کیا جس دن وہ غار کے پاس پہنچے آگے یہ بڑا پتھر راستہ روکے کھڑا تھا لڑھکنے کو تیار۔ وہ سمجھ گئے گل مُتی مر چکی ہے اور کسی کو اس کی لاش دیکھنے کی اجازت نہیں۔

''مگر گاؤں والوں نے اسے باہر لانے کی کوشش کیوں نہ کی؟''

''بی بی وہ سب بہت شرمندہ تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ گل مُتی پہاڑوں کی آغوش میں اتر جائے گی، مگر ایسے لوگوں میں کبھی رہنا نہ چاہے گی۔ جو صدیوں سے ایسے نظام کو سہہ رہے ہوں، جو انہیں ذلت اور دکھ دے مگر اس کو بدلنے کا ان میں عزم اور حوصلہ نہ ہو۔'' (16)

روبینہ امتیاز قزلباش کی بیان کردہ کہانی ایک لوک بیانیہ ہے جو 1980ء کی دہائی کے اواخر میں سامنے آیا۔

ڈم سنگھ کا لوک بیانیہ:

گذشتہ صفحات میں ہم بچوں کا گوشت کھانے والے ظالم راجہ شری بدت کی کہانی پڑھ چکے ہیں۔ گلگت کے لوگ اس ظالم راجہ سے نجات پانا چاہتے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا سورما نہیں تھا جو اس سے ٹکر لے سکے۔ مقامی روایات کے مطابق بالآخر ایک بہادر شخص ڈم سنگھ نے راجہ شری بدت سے ٹکرانے کی ٹھان لی۔ اس واقعہ کے حوالے سے ایک معروف لوک گیت ہے جسے ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے گلگت بلتستان کے زبان و ادب کے بارے میں اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ہم اسے یہاں پیش کرتے ہیں۔

شری بدت خود کو مضبوط کہتا ہے، شری بدت خاک مضبوط ہے
میں یعنی ڈم سنگھ کا کھوتو مضبوط ہوں
میں اس آہنی کدال سے تمھارے محل کو زمین بوس کر دوں گا
سنو! تم خود کو مضبوط سمجھتے ہو!
لیکن میرا نام بھی ڈم سنگھ ہے! دیکھنا ! میں تمہارے ساتھ کرتا کیا ہوں
میں اس آہنی کدال سے محل کے بیخ و بُن کو اکھیڑ دوں گا۔ (17)

میمنے اور اس کی ماں کا لوک بیانیہ:

ایک اور گیت بے بسی اور درد کی تصویر دکھاتا ہے۔

میمنا: ماں! وہ دیکھو ایک شکاری پہاڑ کے اوپر نظر آرہا ہے
کیل بکری: نہیں! وہ تو ایک مینار ہے
میمنا: یہ آواز تو بندوق کی معلوم ہوتی ہے
کیل بکری: نہیں! یہ تو بادل گرجنے کی آواز ہے

میمنا: آپ کے جسم پر خون کے دھبے کیسے ہیں؟

کیل بکری: نہیں! یہ خون کے دھبے نہیں ہیں۔ میں صبح ایک لال رنگ والی گھاس پر لیٹی تھی

میمنا: آپ کی ٹانگیں کیوں لڑکھڑا رہی ہیں؟

کیل بکری: اچھا میرے لختِ جگر! میں تجھ سے ہمیشہ کے لئے
رخصت ہوتی ہوں اور تجھے نیلگوں آسمان والے
اور پہاڑ کی دوسری طرف رہنے والے تیرے بڑے
سینگوں والے ماموں کے سپرد کرتی ہوں(18)

خلیفہ رحمت ملنگ جان:

انیسویں صدی (پیدائش 1879ء) شنا زبان کے شاعر رحمت ملنگ جان نے یورمس کے عشق میں شہرت پائی۔ رحمت کا تعلق ضلع غذر سابق ریاست پونیال کے ایک گاؤں شہر قلعہ سے تھا۔ یورمس گاؤں بوربر کی حسین وجمیل اور صاحبِ کردار خاتون تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہنے لگے لیکن محبت کی یہ داستان بھی خون رنگ نکلی۔ یورمس کے والدین نے اس کی شادی کسی اور جگہ کر دی۔ اُس عشق کے حوالے سے کئی روایات مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق، رحمت کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ''وہ دریا میں کانٹا ڈال کر محبوب کی یاد میں ڈوب گیا۔ حتیٰ کہ سورج سر پر آ گیا اور ملنگ کو دھوپ کا بھی احساس نہ ہوا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی تھی لیکن کوئی بھی مچھلی نہیں پھنسی تھی۔ ایک شخص ادھر سے گزرا اور ملنگ کا تھیلا خالی دیکھ کر بولا: ''واہ ملنگ! بڑے اچھے شکاری ہو کہ صبح سے ایک بھی مچھلی نہیں پکڑی۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ تمہارے عشق میں تو اتنی طاقت ہے کہ تم یورمس کا نام لے کر جو کام کرتے ہو پورا ہو جاتا ہے۔ آج میں بھی دیکھوں کہ تمھارا عشق کتنا سچا ہے''۔

رحمت ملنگ نے ایک نظر اس شخص پر ڈالی اور پھر دریا کی مچلتی لہروں کو دیکھ کر چند شعر کہے جن کا مطلب یہ ہے:
''یہ لوگ اتنے بیوقوف کیوں بنتے ہیں؟ ہم عاشقوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ یہ اتنے بدگمان ہیں کہ ہماری کیفیت جنون پر شک کرتے ہیں۔ یہ عشق کے اس مقام سے واقف نہیں جہاں سے گزر کر ذرہ ذرہ حسنِ یار کی جھلک دکھاتا ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ حق شناسوں کا خدا عشق ہے۔ انہیں کون بتائے کہ عشق بن کوئی بھی مقصد کو نہیں پہنچ سکتا۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آسمان سے زمین تک ہر چیز قوتِ عشق ہی کی بدولت قائم ہے۔''

رحمت ملنگ نے یہ اشعار کہے اور کانٹا دریا سے نکالا۔ کہتے ہیں کہ کانٹے میں اتنی بڑی مچھلی پھنسی ہوئی تھی کہ وہ آدمی چکرا کر گر پڑا۔ بڑی دیر بعد ہوش میں آیا تو رحمت ملنگ سے معافی مانگی۔(19)

ایک دفعہ رحمت ملنگ شیر قلعہ کے پل سے گزر رہا تھا۔ پل اتنا تنگ تھا کہ صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ جب وہ پل کے درمیان پہنچا تو دوسری طرف سے یورمس آتی ہوئی دکھائی دی۔ یورمس اور اس کا شوہر آگے پیچھے چل

رہے تھے۔ یکایک رحمت ملنگ کے قدم رک گئے۔ یورمس کو سامنے دیکھ اس پر عجیب جذب و کیف کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اب یہی ممکن تھا کہ رحمت ملنگ یورمس کے لئے راستہ چھوڑنے کی خاطر واپس مڑ جائے لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ محبوب کی طرف پیٹھ کرے۔ چنانچہ اس نے عجب فیصلہ کیا کہ پُل سے دریا میں کود گیا اور باقی فاصلہ تیر کر طے کیا۔(20) ہم اس سے قریبی مماثلت رکھنے والا ایک واقعہ چترال کے شاعر محمد سیئر اور یار من ہمیں کے عشق کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔

''ایک دفعہ رحمت ملنگ یورمس کے گاؤں کی طرف نکلا۔ چلتے چلتے وہ ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ لوگوں نے اس کی یہ حرکت دیکھی تو طنزاً پوچھا ''کیا بات ہے رحمت ملنگ! زمین کیوں سونگھ رہے ہو؟ کیا یورمس کی خوشبو آ رہی ہے۔''

رحمت ملنگ نے ایک گہری سانس لی اور کہا:

''اے لوگو! جب عشق کی آگ میں جل کر دل کندن ہو جائے تب انسان کی تمام حسیات طاقتور بن جاتی ہیں۔ تم عشق کر کے دیکھ لو، ذرے سے آفتاب بن جاؤ گے۔ ابھی کچھ دیر قبل یورمس یہاں سے گزر کر گئی ہے۔ میں اس کے بدن کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔''

بعد میں پتا لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ واقعی یورمس کچھ دیر پہلے وہاں سے گزر کر گئی تھی۔

ایک دن رحمت ملنگ کو راجا پونیال نے طلب کیا اور اس کے عشق کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

''اے ملنگ جان! تمہارے عشق کے قصے بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ پونیال کا ہر فرد تمہارے اور یورمس کے عشق کی بات کرتا ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے عشق میں کتنے سچے ہو۔''

رحمت ملنگ نے راجا کی بات کے جواب میں چند اشعار کہے، جن کا ترجمہ اس طرح ہے:

''جو شخص شراب عشق پی لے تو دنیا کی ہر چیز اس کے لئے مسخر ہوتی ہے۔ میں کیا ہوں؟ خاک کا پتلا! یورمس کے عشق نے مجھے معرفت نفس کی دولت بخشی ہے۔ اب میں جو لفظ بھی منہ سے نکالتا ہوں صرف قول نہیں بلکہ انمول موتی ہوتے ہیں۔ مجھ سے جو بھی عمل سرزد ہوتا ہے میرا عشق اس کا رہنما ہوتا ہے اور جس کسی کا رہنما جب تک عشق نہیں ہوتا وہ منزل سے آشنا نہیں ہوتا۔''

راجا نے یہ اشعار سنے تو تعریف کی لیکن کہا کہ تیرے عشق کا اعتبار تبھی آئے گا جب عملی مظاہرے کرو گے۔

کہتے ہیں کہ راجا نے رحمت ملنگ کو بتائے بغیر حکم دیا کہ گاؤں کی ہر عورت ایک ایک روٹی پکا کر راجا کے محل میں لے آئے۔ شام کے وقت تمام عورتیں اپنی پکائی ہوئی روٹی لے کر راجا کے محل میں پہنچیں اور اس کے حضور پیش کیں۔ راجا نے ہر ایک سے روٹی وصول کرتا اور اسے رخصت کرتا رہا۔ یورمس نے اپنی روٹی راجا کو دی تو راجا نے اس پر خاص نشان لگایا۔ اس طرح سب عورتوں کو رخصت کر دیا گیا۔

اس کے بعد راجا نے ملنگ جان کو بلایا اور کہا: اے ملنگ جان! تمہارے عشق کی صداقت کا امتحان ہے۔ ان بہت سی روٹیوں میں ایک روٹی یورمس کے ہاتھ کی پکی ہوئی ہے۔ اگر تم عشق کے سچے ہو تو یورمس کی بنائی ہوئی روٹی کی نشان دہی کرو۔

رحمت ملنگ نے یہ سن کر آنکھیں بند کر دیں اور روٹیاں سونگھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اس نے ایک روٹی نکال کر راجا کو دی کہ یورمس کی بنائی ہوئی ہے، اور واقعی وہی یورمس کی بنائی ہوئی تھی۔ راجا یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا اور ملنگ جان کے عشق کی سچائی پر ایمان لے آیا۔'' (21)

''ملنگ کو گلاب بہت پسند تھا جسے ہمیشہ اپنی ٹوپی میں رکھتا تھا۔ کیونکہ یورمس کی شکل گلاب کے رنگ سے ملتی جلتی تھی۔ اس لئے اس کی شاعری میں زیادہ گلاب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

ترجمہ:

ترے ہاتھ مرمر کے ہیں
تری گردن خراد کی سی
تیرے چہرے کا رنگ گلاب جیسا
تیرا دل گلاب کی طرح سُرخ ہے

جب تو ایک رنگ کا لباس پہن کر
پھولوں کے سامنے آنکلتی ہے

تو مری جان بدن میں نہیں رہتی
جو خیال میں ہمیشہ یورمس کے ساتھ رہتی ہے (22)

رحمت ملنگ جان کی شاعری میں تصوف کا گہرا رنگ جھلکتا ہے۔ سندھی، سرائیکی اور پنجابی شاعروں کی طرح وہ بھی روایتی مذہب کا باغی ہے۔

ترجمہ:

اے خدا! تیری عبادت سے میں قاصر ہوں۔ یہ رکوع و سجود بس ایک مشق ہیں۔ میرا دل تو یورمس کی یاد میں جتا ہوا ہے اور بس یہی میری نماز ہے۔

ترجمہ:

تمہارے لئے یہ شرم کا مقام ہے کہ تمہاری بے رخی نے مجھے بتوں کے سامنے جھکا دیا ہے۔

ترجمہ:

میرے مرنے کے سو سال بعد میرا جسم خاک میں مل جائے گا تب بھی تیری آمد کا سن کر میرا قلب مجنوں بن کر تڑپ اٹھے گا اور میری روح آسمان پر آ کر خون میں لت پت ہوگی۔

ترجمہ:

میری اس شکستگی میں نہ تو میرے مرشد نے میری مدد کی۔ نہ ہی حاکم وقت نے انصاف کا ہاتھ بڑھایا۔ میری شکستگی بڑھانے میں ہمارے وزیر کی سستی ہی تھی کہ یورمس ایک بے پیر کے ہاتھ چڑھ گئی۔

ترجمہ:

میں اس رکوع و سجود کو عبادت کا درجہ نہیں دیتا بلکہ یہ تو بت پرستی ہے۔ میرے نصیب کا ستارہ جو گردش میں ہے وہ یورمس کی وجہ سے ہے۔

ترجمہ:

میرا کلام اگر کسی مجلس میں شروع ہو جائے تو شراب کے کوزے کھول دیئے جائیں گے اور تمام عاقل لوگ دیوانے ہو جائیں گے۔ سارے عالم کے لوگ محو ہو جائیں گے اور فرشتے تیرے حلقہ بگوش ہوں گے۔

ترجمہ:

میرا کلام اگر کسی بت خانے میں شروع ہو جائے تو بے ہوش لوگ بتوں کی طرح بے جان ہوں گے اور طالبین ہندو بن کر ان کی پرستش میں مبتلا ہوں گے۔

ترجمہ:

یورمس پھول کا روپ دھارتی ہے اور میری ٹوپی پر آ کر سجتی ہے۔ جب میں اس کے خیال میں بالکل محو ہو جاتا ہوں تو وہ پھولوں میں چھپ کر میری دسترس سے باہر ہو جاتی ہے۔ (23)

بلتستان ۔ تاریخی تناظر:

گلگت کی طرح بلتستان کی تاریخ بھی قبل مسیح کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ ممتاز منگلوری کے بقول
''قدیم زمانے میں بلتستان مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا۔ مثلاً پلو، بلور، بالتی، بلتی، تبت خورد وغیرہ، آخر میں فارسی اثرات کے تحت بلتی سے بلتستان کہلایا۔

روایات کے مطابق قبل مسیح کے زمانے میں ایک دیو مالائی کردار کیسر لداخ، لہاس کرگل اور بلتستان کے علاقوں پر حکمران تھا۔ کیسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مظالم کے خاتمے اور بدیوں کو دور کرنے کے لئے آسمان سے اتارا گیا تھا۔ کیسر نے گلگت، ہنزہ اور نگر کی ریاستوں پر بھی حملے کئے۔ کیسر کے زمانے میں لوگ ''بون چھوس'' کے پیروکار تھے۔ کیسر کی رزمیہ داستان سینہ بہ سینہ بارہ ابواب پر مشتمل چلی آرہی ہے۔ یہ داستان کلاسیکی ادب کا شاہکار ہے۔

سو دو سو سال قبل مسیح کے دوران میں بدھ مت کی تبلیغ شروع ہوئی۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں لداخ سے گلگت تک پلولا شاہی حکمران تھے۔ نویں صدی عیسوی تک بلتستان تبت کا ایک صوبہ تھا لیکن خانہ جنگی کی وجہ سے وہ تبتی سلطنت سے جدا ہو گیا۔ علیحدگی کے بعد بلتستان کی مختلف وادیوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔

لوک روایات میں جن افسانوی حکمرانوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں ''رگیالوستر البو'' کا نام قابل ذکر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وادی سکردو پر رگیالوستر البو کی حکومت تھی۔ جس کا صدر مقام رگیائیل تھا اس کے بعد اس کا بیٹا رگیالو چولو بزانگ کا نام رگیائیل نامی ریاست کے دیومالائی حکمرانوں میں گنا جاتا ہے۔

تیرہویں صدی کے آغاز میں سکردو کا شاہی خاندان نرینہ اولاد سے محروم ہو گیا۔

روایت ہے کہ ایک خوبرو نوجوان فقیر دیوسائی کی طرف سے آکر سکردو کے قریب ایک غار میں قیام پذیر ہو گیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ تو اس نے دیوسائی کی بلندی کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن لوگ سمجھے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ آسمان سے اترا ہے۔ روایات کے مطابق یہ نوجوان ابراہیم مصری یا ایرانی نژاد تھا اور کشمیر سکردو پہنچا تھا۔ مقامی حکمران ''شکری'' نے اسے داماد بنالیا۔ بلتی زبان میں گھر داماد کو 'مقپا'' کہتے ہیں۔ ابراہیم کو احتراماً ''مقپون'' کہا جانے لگا۔ اس کے بعد ابراہیم مقپون حکمران ہو گیا اور مقپون خاندان کی بنیاد پڑی اس خاندان نے رفتہ رفتہ عروج حاصل کیا اور تقریباً چھ سو سال تک برسر اقتدار رہا۔

ابراہیم مقپون ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا لیکن اس کی نسل کے بعد میں آنے والے مقپون اپنے پرانے طور طریقے چلاتے رہے حتیٰ کہ پندرھویں صدی عیسوی میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی بلتستان تشریف لائے۔ اس وقت وہاں بدھ مت رائج تھا۔ آپ کی یہاں آمد سے بلتستان میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ اسی دور میں بہرام چو نے روندو کے حکمران سے وہ علاقہ چھین کر سکردو میں شامل کرلیا۔ بہرام چو کے بیٹے بوخا نے اپنی حکومت

کے دور میں شہر سکردو آباد کیا۔ شگری سے دارالحکومت سکردو منتقل کیا اور مشہور قلعہ (کھرفوچو) تعمیر کیا۔ اسی دور میں میر شمس الدین عراقی بلتستان میں آئے اور آٹھ سال تک اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وہیں رہے۔ اندازہ ہے کہ اسی دور میں قدیم بلتی رسم الخط کی جگہ فارسی رسم الخط رائج ہوا۔ مقپون خاندان کا عروج شروع ہوا۔

مقپون سربرآوردہ حکمرانوں میں شیر علی انچن کا نام تاریخ میں سنہرے حروف میں رقم ہے۔ شیر علی نے اپنی بہادری سے تبت سے گلگت و چترال تک اپنی حکومت کو وسعت دی۔ اس کے تعلقات مغلوں کے ساتھ بھی قائم ہو گئے۔ اس کی بیٹی شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے بیاہی گئی۔ شیر علی انچن نے اپنی سلطنت کو محفوظ بنانے کے لئے ایک سو میل طویل دیوار تعمیر کی۔ اس میں دروازے اور برج بنائے۔

علی شیر انچن کی وفات کے بعد تخت حاصل کرنے کے لئے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اور برسوں تک حکومت کی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی۔ علی شیر انچن کے بعد شاہ مراد بڑا مدبر حکمران ہوا۔ اس نے بروشال سے لداخ تک تمام علاقے اپنے زیرنگیں کر لئے۔ شاہ مراد کی وفات کے بعد پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ بالآخر اہل سکردو نے 1710ء میں رفیع خان کو تخت پر بٹھایا۔ رفیع خان کی 1710ء سے 1745ء تک حکومت رہی۔ علی شیر ثانی حکمران بنا اور 1800ء تک اس کی حکومت رہی۔ علی شیر ثانی کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ احمد شاہ مقپون بلتستان کا آخری تاجدار ثابت ہوا۔

مقپون احمد شاہ نے 1800ء سے لے 1840ء تک حکومت کی لیکن اس کے دور میں علاقہ اندرونی انتشار کا شکار تھا۔ تاہم کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجہ کا احمد شاہ نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا لیکن مقامی سرداروں کی سازشوں کے باعث اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ کہ احمد شاہ اپنے اہل وعیال سمیت اسیر ہو کر کشمیر پہنچا اس کے ساتھ ہی بلتستان کی آزاد ریاست اور مقپون سلطنت کا چراغ گل ہو گیا۔

ڈوگروں نے بلتستان پر ایک سو سال سے بھی زائد عرصے تک حکومت کی۔ ڈوگروں کے دور حکومت میں بلتستان کے رہنے والوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ اہل بلتستان انسانیت سوز مظالم برداشت کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے ڈوگروں کی حکومت کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ دنیا کے نقشے پر پاکستان معرض وجود میں آیا تو اہل بلتستان نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تقریباً چھ ماہ کی خون ریز جنگ کے بعد یہ علاقہ ڈوگروں کی نحوست سے پاک ہو کر آزاد ہو گیا۔ اہل بلتستان نے اسلامی رشتہ کی بنیاد پر پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔" (24)

تاریخی تناظر سے ہٹ کر بلتستان کے ماضی کے حوالے سے کئی روایات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اساطیری روایات ایک رزم نامے "داستان کیسر" سے عبارت ہیں۔ محمد حسن حسرت اس اساطیری رزمیہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بلتستان کی رزمیہ داستانوں میں داستانِ کیسر (kasar saga) کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ

تبت لہاسہ سے لے کر بلتستان تک کے وسیع وعریض علاقے کا مشترکہ تاریخی، ادب اور ثقافتی ورثہ ہے۔ (25)

محمد حسن حسرت، کیسر داستان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دھرتی پر ابتری کا دور دورہ تھا۔ انسانوں نے ایک آسمانی دیوتا ''ہلایو کپون'' کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کو ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لئے دھرتی پر بھیج دے۔ یو کپون دیوتا نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کیسر کو حکم دیا کہ وہ اس مہم پر دنیا میں چلا جائے۔ کیسر نے باپ سے کچھ شرائط باندھیں جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس کی بہن ''ہلا مو بروک مو'' کو دنیا میں اس کی بیوی بنا کر بھیج دیا جائے۔ یو کپون دیوتا نے یہ شرط مان لی۔ پس بعض روایات، کے مطابق دودھ کی شکل میں بعض کے مطابق کیسر اور ہلا مو برو کو جلا کر اس کی راکھ کو زمین پر اتارا گیا۔ پھر سنگ کھہ راسکیس کی بیوی می گوقزا نے پہاڑ پر ایک گڑھے میں وہ دودھ یا راکھ کا پانی پیا جس میں کیسر کی روح موجود تھی اور وہ حاملہ ہوگئی۔ اسی طرح ایک اور سردار ہیاق ستن پا ابا کی بیوی کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور یوں ان دونوں عورتوں نے علی الترتیب کیسر اور بلا مو برو کمو کو آ دا گون کے ذریعے جنم دیا۔ کیسر نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے ایک بدصورت گونگے کا روپ اختیار کیا۔ جوان ہونے پر کیسر نے رسم سوئمبر کے ذریعے ہلا مو بروک مو کو اپنی بیوی منتخب کر لیا۔ اس کے ساتھ اس کی تخت نشینی کی رسم بھی عمل میں آتی ہے اور پھر اس کے معرکوں اور جنگی کارناموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ روایات کے مطابق دھرتی پر اس کی مدد کے لئے ایک پراسرار غیبی طاقت موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کیسر کے بہت سے ایسے سورما بھی موجود ہوتے ہیں جن کی پشت پناہی اور مدد سے وہ اپنے ہر مشن میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ کیسر بذات خود ہتھیاروں کا استعمال بہت کم کرتا اور زیادہ تر حکمت عملی سے کام لیتا ہے لیکن جہاں حکمت عملی نہیں چلتی وہاں اپنی مخفی قوتوں سے استفادہ کرتا ہے۔ اس پوری داستان میں کیسر کا کردار ناقابل تسخیر دکھایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سٹو نیوژھویل (نیلے پانی کی جھیل والا ملک) میں ایک دیو ''سمار گیال'' نامی رہتا تھا۔ ایک دن کیسر کو اس کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ یاد آیا جس میں یہ طے پایا تھا کہ جو حملے میں پہل کرے گا وہ دوسرے کو مار دے گا۔ پس کیسر ہلا مو بروک مو سے رخصت ہوا۔ راستے کی صعوبتوں کا سامنا کرتا ہوا وہ شمار گیال کے محل تک پہنچا اور اس کی بیوی کی مدد سے محل کے اندر جانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے شمار گیال کی بیوی کو دام محبت میں پھنسا کر ان تمام رازوں کا کھوج لگایا جن کے ذریعے اسے قتل کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار کیسر نے شمار گیال کو قتل کر دیا اور اس کے پیٹ کو چاک کیا تو اس میں سے وہ تمام چیزیں باہر نکل آئیں جن کو شمار گیال نے نگل لیا تھا۔ ان میں شمار گیال کی بیوی ملد ببروم سکد کے دو بھائی رگیالور رینگچن اور سلام رینگچن بھی تھے۔ جو پیٹ میں ہضم ہو کر چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ کیسر نے ان دونوں کی پرورش کی اور دونوں بھائی پھر سے بحال ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں بھائیوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک غیر معمولی آدمی ''کیسر'' ان کی بہن کے ساتھ رہ رہا ہے۔ انہوں نے کیسر سے کہا کہ وہ ان کے

ساتھ چند بازیاں لگائے۔ اگر وہ بازی جیت جائے تو ٹھیک ورنہ اسے اپنی بہن کے ساتھ رہنے نہیں دیا جائے گا۔ کیسر نے شرط مان لی اور ان کے ساتھ کئی بازیاں لگائیں لیکن وہ ہر دفعہ ہار گیا۔ پس معاہدے کے مطابق ان دونوں بھائیوں نے اسے گھوڑے کی کھال میں ڈال کر سی لیا اور کسی پرانے گھراٹ کے نیچے پھینک دیا، کیسر ایک عرصہ تک وہاں پڑا رہا، اسی دوران ہوریل (ترکستان) کے بادشاہ پاغلدے نے لنگ کھایل پر حملہ کر کے تاراج کیا اور کیسر کی بیوی ہلاموبردکموکو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ ابودونکبو اور اس کے بیٹے بومالیفتن نے ترک حملہ آوروں کا تعاقب کیا اور ہلاموبروک موکی بازیابی کے لئے جدوجہد کی لیکن وہ دونوں اس میں ناکام ہوئے اور بومالیفتن اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس شکست کے بعد لنگ کھایل کے عوام میں انتشار و بددلی پھیل گئی۔ ایک دن ابودونکبو نے بڑی کوشش کے بعد ان دونوں پرندوں کو تلاش کر کے نکالا جو کیسر کی روح کے ساتھ وابستہ تھے اور ان پرندوں کو کیسر کی تلاش میں بھیج دیا۔ ان پرندوں نے چہار اطراف میں چکر لگایا اور آخر کار کیسر کو اس جگہ پر پایا جہاں وہ گھوڑے کی کھال میں گھراٹ کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ ان پرندوں نے اسے کھال سے باہر نکالا اور پھر ترکوں کے ہاتھوں لنگ کھایل کی بربادی کا قصہ سنایا۔ کیسر نے سب سے پہلے ملد ابوہم سکد کے دونوں بھائیوں سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا جنہوں نے اسے کھال میں بند کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ پس ان دونوں بھائیوں کو گہری زمین میں دبا کر وہ اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا۔ کٹھن پہاڑی راستوں کے علاوہ ان محافظوں کو عبور کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ جن کو ترکستان کے بادشاہ نے اہم چوکیوں پر بٹھایا تھا۔ کیسر تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے ''ہوریل'' ترکستان پہنچا اور ایک لوہار ہمیسل کے ہاں قیام کیا اور ہمیسل کی بیٹی کتتمن مو سے شادی بھی کر لی اور وہیں موقع کی تاک میں بیٹھا رہا۔ اس دوران کیسر نے گونگے کی شکل اختیار کر لی تھی تاکہ ہوریل کے لوگ اس پر شک نہ کر سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہوریل کے بادشاہ پاغلدے گیالپو نے لنگ کھایل سے ابودونکبو کے بیٹے بومالیفستن کو مار کر اس کے تیر و کمان کو ہوریل لے گیا تھا۔ وہ تیر اور کمان اتنے بھاری تھے کہ ایک تیر کو اٹھانے کے لئے دو دو آدمیوں اور کمان کو اٹھانے کے لئے چار آدمیوں کی ضرورت تھی۔ ایک دن ہوریل کے بادشاہ نے اعلان کیا کہ موبے لیفستن کے کمان کو اٹھا کر تیر اندازی کرنے والا کوئی ہو تو اس شخص کی مرضی کے مطابق انعام دوں گا۔ کوئی شخص اس کے لئے آمادہ نہ تھا۔ البتہ کیسر تیار ہوا اور اس نے کہا کہ عوامی میلہ لگایا جائے تاکہ وہ یہ کرتب دکھا سکے۔ پس پاغلدے گیالپو کے حکم پر عوامی میلہ لگ گیا اور کیسر نے کمان میں تیر لگا کر کھینچنا شروع کیا۔ اس وقت کیسر نے دل میں سوچا اور دعا کی کہ وہ خود لوہار ہمیسل کے افراد خانہ بادشاہ کے افراد خانہ کے علاوہ تمام رعایا کے دائیں پہلو سے گزر کر بائیں طرف نکل جائے۔ اس نے تیر چھوڑا اور اسی تیر سے تمام رعایا ہلاک ہو گئی۔ کیسر نے وعدے کے مطابق انعام کے طور پر اپنی ٹوپی بھر تانبا مانگا۔ اس نے دل میں سوچا اور دعا کی کہ ہلاموبروک مو کے سونے کی زیورات کے بغیر ٹوپی نہ بھرے۔ بادشاہ نے قلعہ میں موجود تانبے کے تمام اسباب ڈالے اور آخر کار ہلاموبروک مو کے سونے کی زیورات کا ایک ٹکڑہ ڈالا تو ٹوپی بھر گئی۔

کیسر واپس ہمیسل کے گھر گیا اور پوچھا کہ اے بابا ہمیسل! آپ کی جائیداد میں تانبے کی کتنی اشیاء موجود ہیں؟ اس کے پاس لکڑی کی ایک تھالی (تھالو)، دو کٹورے (پھوتو) اور مٹی کی بنی ہوئی ایک ہانڈی (کواد) کے علاوہ تانبے کا کوئی سامان نہ تھا۔ کیسر کو اس کے پاس قلیل اسباب کی حالت دیکھ کر اپنے آپ پر غرور آیا اور ہمیسل سے الگ ہو گیا۔ (کیسر کا یہ معمول تھا کہ رات بھر لوہار کا کام کرتے ہوئے کتشمن مو سے زبو کیا (لوہار کی وہ چمڑے کی مشک والی دھنکنی جس سے ہوا دیتے ہیں) سے پھونکنے کا کام لیتا تھا۔ جب اس کو نیند آتی تو چمٹا گرم کر کے اس کے چہرے پر رکھتا۔ آخر کار کتشمن نے اپنی ماں سے شکایت کی۔ ماں نے ایک ترکیب سکھائی اور کہا کہ تم بیماری کا بہانہ بنا کر بستر میں لیٹ جاؤ تا کہ اس مشقت سے جان چھوٹ جائے۔ کتشمن مو نے ایسا ہی کیا تو کیسر نے اس کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لوری دیتے ہوئے سلا دیا۔ کتشمن مو کو نیند تو نہیں آئی بہر حال یہ ایک بہانہ تھا۔ کیسر اسے بستر پر سلانے کے بعد خود اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوا۔ اس نے اپنے ''الیکرمان'' یعنی مافوق الفطرت سورماؤں کو حکم دیا کہ ایک ایسا صندوق بنا کر لائیں جس میں ایک کنبہ کے افراد آسکیں۔ اس وقت کتشمن مو چوری چھپے یہ حرکات دیکھ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے اصل روپ اور حسین وجمیل صورت دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی اور ہنس پڑی تو اتنے میں ایک ہی دھماکے کے ساتھ وہ سب کچھ غائب ہو گئے اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد کیسر بھی اسی گونگے کی صورت میں نظر آنے لگا۔ اس وقت کتشمن مو نے کہا میں نے تمہاری چالا کی پکڑ لی ہے۔ کیسر نے بھی جواب میں کہا کہ میں نے بھی تمہاری چالا کی پکڑ لی ہے۔ جن اور دیوتا دونوں آئے ہوئے تھے اور اب وہ چلے گئے۔ تم اس کونے میں تھی اور میں اس کونے میں۔ اب اٹھو اپنا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ (26)

کیسر کی مہمات کا اختتام بوڑھے اور بڑھیا کی شادی پر ہوتا ہے اور رقص وسرود پر یہ داستان اختتام کو پہنچتی ہے۔

ڈوگرہ مخالف رزمیہ گیت:

سید محمد عباس کاظمی نے اپنی کتاب ''بلتی لوک گیت'' میں ڈوگرہ راج کے خلاف بلتی مزاحمت کا ایک گیت شامل کیا ہے۔ یہ گیت سید محمد عباس کاظمی نے غلام علی ہوشے سے سن کر کتاب میں شامل کیا: بقول مصنف:

''چو حیدر خان بلتستان کا وہ غیور فرزند ہے جس پر بلتیوں کو آج بھی فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا، چو حیدر خان اماچہ 1819ء سے 1842ء تک شگر کا حکمران رہا تھا۔ 1840ء میں جب ڈوگروں نے تمام لداخ اور بلتستان پر قبضہ کیا اور بلتی قوم پر ڈوگرہ غلامی کے بادل چھا گئے تو اس بہادر سپوت نے گلاب سنگھ والیء جموں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بلتستان کی آزادی کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن چند ننگ وطن افراد کی غداری کی وجہ سے اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر جموں کے زنداں میں ڈالا گیا اور چند سال بعد اسی زنداں میں جان جانِ آفریں کے حوالے کی۔ راجہ حیدر خان غازی کی اسیری کے بعد اس کے کسی چاہنے والے نے اس کی یاد میں جو گیت گایا وہ چو حیدر خان کے نام سے مشہور ہے:

گیت کا متن یوں ہے:

ترجمہ:

میں جب خوبانی کے باغ میں گئی (تو دیکھا) بہت ساری خوبانیاں پکی ہوئی ہیں
میرے گُھرو کے نہ ہونے سے یہ خوبانیاں بے ذائقہ لگتی ہیں
اے راجہ حیدر خان!
میں جب سیب کے باغ میں گئی (تو دیکھا) بہت سارے سیب پکے ہیں
میرے گُھرو کے نہ ہونے سے یہ سیب بے ذائقہ لگتے ہیں
اے راجہ حیدر خان!

میں جب گلاب کے باغ میں گئی (تو دیکھا) بہت سے گلاب کھلے ہیں
میرے گُھرو کے نہ ہونے سے یہ گلاب بدرنگ لگتے ہیں
اے راجہ حیدر خان!(27)

جہان علی میر کا حزنیہ گیت:

اسی کتاب میں ایک اور گیت درج ہے، جس میں جہان علی میر کی گرفتاری کا ذکر ملتا ہے مرتب کے الفاظ کے مطابق یہ گیت اسے وزیر تقی منقبہ نمبر دار شوت (روندو) سے ملا۔ اس کے بقول:

''تاریخی کتب اور مقامی روایات کے مطابق تقریباً ہزار برس پہلے مصر کے شاہی خاندان کا فرد نوجوان ابراہیم شاہ وہاں سے بھاگ کر کشمیر پہنچا اور پھر سکردو آ گیا۔ اس نے شگری قبیلے کے سردار کی اکلوتی بیٹی سے شادی کی۔ شگری خاندان سکردو کا حکمران خاندان تھا اور نسلاً یونانی تھا۔ بلتی زبان میں خانہ داماد کو ''مقپا'' کہتے ہیں۔ ابراہیم شاہ کو بھی اسی مناسبت سے ابراہیم مقپا کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ نام بگڑ کر مقپون بن گیا۔ سسر کے انتقال پر حکومت ابراہیم مقپون کو مل گئی، رفتہ رفتہ مقپون خاندان نے اتنی طاقت پکڑ لی کہ اس خاندان کے علی شیر خان نے جو تاریخ میں انچن یعنی ''اعظم یا طاقتور'' کے نام سے مشہور ہے، تبت اصلی سے لے کر چترال تک علاقے کو بزور بازو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس خاندان کی ترقی اور فتوحات سے متاثر ہو کر مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے اپنی ایک چچازاد گل خاتون کی شادی علی شیر خان انچن سے کر دی۔ اس کی ایک بیٹی کی شادی اپنے ولی عہد شہزادہ سلیم کے ساتھ کر دی۔ بلتستان کی لوک کہانیوں میں مقپون رگیالفوں کو دیوتاؤں کی اولاد بتایا گیا۔ خاندان مقپون کی فتوحات اور ناقابل شکست رگیالفوؤں کی وجہ سے انہیں برق مقپون یعنی چٹانوں جیسا مضبوط مقپون کہا جاتا ہے۔

1800ء میں جب مقپون احمد شاہ بلتستان کا رگیالفو بنا تو کئی مقامی راجاؤں اور سرداروں نے خود مختاری

کے خواب دیکھے۔ رگیالفو احمد شاہ مقپون نے ایک ایک کر کے ان راجوں کو دبایا۔ انہی سرداروں میں سے ایک علی میر بھی تھا۔ رگیالفو احمد شاہ نے اسے جیل میں بند کر دیا۔ علی میر کی بیوی جہان نے رگیالفو کے دربار میں رحم کی اپیل کی۔ رگیالفو احمد شاہ نے اس پر رحم کرتے ہوئے جواب دیا کہ علی میر جیسے سرکش کو رہا تو نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ تمہاری بہتر بود و باش کے لئے میں بشو اور کوثر درا کے علاقوں کے میوہ جات اور کھرمنگ اور غندوس علاقوں سے ملنے والے سونا چاندی کی آمدنی تمہیں بخش دیتا ہوں لیکن جہان کو اپنے خاوند کے بدلے کسی سیم و زر کی خواہش نہ تھی۔ اس لئے جہان نے دربار مقپون میں دوبارہ اپنا مدعا اس گیت کے ذریعے پیش کیا۔

چٹان جیسے (مضبوط) مقپون کی درگاہ سے مجھے عطا کیا جاتا ہے
بشو اور کوورا سے حاصل ہونے والی آمدنی مجھے عطا کی جاتی ہے
بشو اور خوژ درالہ اس آمدنی کا میں کیا کروں
(عرض تو یہ ہے) جہان کو (اس کا) علی میر واپس عطا کیا جائے
چٹان جیسے (مضبوط) مقپون کی درگاہ سے مجھے عطا کیا جاتا ہے
کھرمنگ اور غندوس سے حاصل ہونے والی سونے چاندی کی آمدنی مجھے عطا کی جاتی ہے
کھرمنگ اور غندوس کی اس آمدنی کا میں کیا کروں
(عرض تو یہ ہے) جہان کو (اس کا) علی میر واپس عطا کیا جائے (28)

عقل مند بہو۔۔ بلتی لوک دانش:

معروف ادیب اور محقق سید عالم نے اپنی کتاب ''شمالی علاقہ جات کا لسانی و ادبی جائزہ'' میں یہ لوک کہانی بیان کی ہے۔ یہ کہانی بلتی لوک دانش کا شاہکار ہے۔:

'' کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں بلتستان کی شگر نامی وادی میں ایک نہایت ہی عقل مند ترکھان رہتا تھا جو کندہ کاری، پچی کاری اور دیگر چوبکاری کے فن میں انتہائی عبارت رکھتا تھا۔ اس کا نام چندن تھا۔ اس کی ایک بیٹے کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ عموماً تعمیرات کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا اور اس کے گھر کی دیکھ بھال اور بیٹے کی پرورش اس کی بیوی کیا کرتی تھی۔ چندن کا بیٹا جوان ہو گیا تو اس کی ماں مر گئی۔ اب چندن کے لئے گھر سے باہر کام کے لئے جانا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ بیوی کے مرنے کے بعد گھر کی دیکھ بھال کے لئے کوئی نہ تھا۔ صرف بیٹا تھا جو کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ ادھر لداخ کے راجہ کی طرف سے پیغام پر پیغام آ رہا تھا کہ اس کے محل کی تعمیر کے لئے چندن جلد از جلد پہنچ جائے۔ چنانچہ چندن نے لداخ جانے سے پہلے بیٹے کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیاریاں مکمل کر لینے کے بعد ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ کچھ روز گزرنے کے بعد چندن نے بہو سے کہا صبح میں اور تمہارا میاں لداخ کی طرف سفر پر جا رہے ہیں تم ہمارے لئے سامان کی تیاری کر لو۔ بہو نے ایک تھیلے میں ترکھان کے اوزار اور

دوسری تھیلی میں چند روٹیاں ڈال کر سامان باندھ لیا۔ صبح سویرے باپ بیٹا سفر پر روانہ ہو گئے۔ سامان پیٹھ پر اٹھائے چلتے چلتے وہ دونوں پہاڑ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جگہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے نو چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اس میں نو موڑ تھے۔ پہلا موڑ عبور کیا تو چندن نے بیٹے سے کہا۔ ''وہ عبور کرنے کا بندوبست کرو''۔ بیٹے نے تھیلے میں سے دو روٹیاں نکال لیں اور دونوں نے ایک ایک روٹی کھالی۔ دوسرے موڑ پر پہنچے تو باپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ بیٹے نے کہا دو ہی روٹیاں تھیلی میں تھیں۔ جو ہم نے کھالی ہیں۔ اب اور کچھ ہمارے پاس نہیں ہے۔ باپ نے کہا کہ اتنے لمبے سفر کے لئے صرف دو روٹیاں تھیلی میں ڈالی تھیں۔ یہ بیوقوف لڑکی میری بہو نہیں بن سکتی۔ چلو واپس چلتے ہیں۔ واپس گھر پہنچنے پر چندن نے بہو کو طلاق دلوائی اور کسی اور لڑکی کو بہو بنالیا۔ اس بہو کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا، اس طرح چندن نے دس لڑکیوں کو بہو بنایا اور یکے بعد دیگرے سب کو طلاق دلواتا گیا۔ اب چندن نے فیصلہ کیا کہ جب تک ایک عقل مند بہو کا بندوبست نہیں ہوتا لداخ کا سفر ملتوی رکھا جائے گا، چندن اب بہو کی تلاش میں خود نکل کھڑا ہوا، دن بھر چلنے کے بعد وہ کسی گاؤں کے کنارے پہنچا تو اس نے دیکھا تین لڑکیاں اون بُن رہی تھی، چندن نے لڑکیوں سے پوچھا کہ میں دور جگہ سے یہاں پیدل چل کر آیا ہوں تو بتاؤ کہ میں نے ادھر سے ادھر تک کتنے قدم اٹھائے ہوں گے۔ یہ سن کر دو لڑکیوں کو سخت غصہ آیا اور کہا ہم تمہارے قدم تھوڑے گنتے رہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور بے ہودہ سوال پوچھتا ہے۔ لیکن تیسری لڑکی نے چندن سے کہا۔ تم ادھر سے یہاں تک نظریں ہم پر جما کر آئے ہو۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارے یہاں پہنچنے تک ہم نے اون پر کتنی بار ضرب مارا ہے۔ چندن لڑکی کی بات سن کر اس کی دانائی سے متاثر ہوا اور اس کے گھر جا کر رشتہ مانگ لیا اور اپنے لڑکے کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کر لی۔ شادی کے چند روز بعد چندن نے پھر لداخ جانے کا ارادہ کیا اور بہو کو سامان سفر تیار کرنے کے لئے کہا۔ رات کو بہو نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ تم اپنی ساری بیویوں کو کس وجہ سے طلاق دیتے رہے ہو؟ لڑکے نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد بیوی نے شوہر سے کہا کہ جب تمہارا باپ تم سے کہے کہ بیٹا ''چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو'' تو تم اسے ایک دو موڑ پر روٹی اور خوبانی کا خستہ وغیرہ کھلا دینا۔ پھر جب وہ دوبارہ تم سے ایسا ہی کہے تو تم شور مچاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کی طرف دوڑو کہ چیتا آ گیا ہے۔ باپ بھی یہ سن کر دوڑ کر وہ چڑھائی عبور کرے گا اور آئندہ پھر طلاق کی نوبت نہیں آئے گی۔ دوسری صبح کو باپ بیٹا سفر پر روانہ ہو گئے۔ بیٹے نے پہلے موڑ پر باپ کو روٹی کھلائی اور دوسرے موڑ پر خوبانی کا خستہ کھانے کو دیا۔ تیسرے موڑ پر پہنچتے ہی باپ کے کہنے سے پہلے ہی بیٹے نے شور مچا کر اوپر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کل نو موڑ تھے دو گزر چکے تھے باپ نے وہ شور سن کر بیٹے کے پیچھے پیچھے دو موڑ دوڑ کر طے کر لئے۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی چیتا نظر نہ آیا۔ بیٹا برابر دوڑے جا رہا تھا۔ چندن وہیں پر ٹھہرا اور لڑکے کو آواز دے کر بلایا پھر کہا واپس چلو۔ اسے بہو کی شیطانی کا پتہ چلا تھا لہٰذا گھر پہنچتے ہی اسے طلاق دلوا کر فارغ کر دیا۔ کچھ دن اس نے اس فکر میں گزارے کہ اسے ایک عقل مند بہو کیوں کر مل سکتی ہے۔ پھر ایک روز عقل مند بہو کی تلاش

میں دوبارہ سفر پر روانہ ہوگیا۔ راستے میں ایک شخص ملا جو اسی راستے پر سفر کر رہا تھا۔ چندن اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ شخص جوتا پہنے چل رہا تھا اور چندن جوتے اتار کر ہاتھ میں لئے ننگے پاؤں جا رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ایک ندی پر پہنچ گئے۔ اب ندی کو عبور کرنا تھا۔ چندن نے جوتے پہن لئے لیکن اس کے ساتھی نے اپنے جوتے اتار دیئے اور ندی عبور کرنے کے بعد چندن نے جوتے اُتار دیئے اور اس شخص نے جوتے پھر پہن لئے۔ اس شخص نے سوچا کہ چندن پاگل ہے۔ کچھ دیر اور ساتھ چلنے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ دونوں ایک جگہ پر بیٹھ گئے۔ چندن کے پاس دو روٹیاں تھیں۔ دونوں نے ایک ایک روٹی کھالی اور پھر چلنے لگے۔ راستہ بھر چندن یہ کہتا ہوا چلتا رہا۔ ''ایک روٹی میں نے خود کھالی اور دوسری روٹی پانی میں پھینک دی'' اس شخص کو یہ سن کر سخت غصہ آیا کہ کتنا کنجوس آدمی ہے۔ میں نے ایک ہی روٹی کھائی تھی وہ اسی کو بار بار دوہرا رہا ہے۔ لیکن وہ چندن سے کچھ پوچھے بغیر چلتا رہا ایک گاؤں میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ چند لوگ ایک جنازہ اٹھائے جا رہے ہیں۔ چندن نے پوچھا بھئی یہ لاش نئی ہے کہ پرانی؟ ساتھی کو سخت غصہ آیا اور برہم ہو کر کہا آج کوئی مرا ہوگا جسے یہ لوگ دفنانے جا رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی پرانی لاش بھی ہوتی ہے۔؟ ساتھی کو اب یقین ہوگیا کہ چندن ضرور پاگل ہے، کیونکہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے ۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ دونوں ایک مکان کے پاس سے گزرے۔ اس مکان کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ دھواں دیکھ کر چندن نے پوچھا ارے بھئی یہ گرم دھواں ہے یا ٹھنڈا؟ ساتھی نے اس بیہودہ سی بات پر جل کر کہا۔ دھواں گرم ہی ہوتا ہے۔ چندن خاموش ہوگیا۔ دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی کاشت میں مصروف ہے۔ چندن نے ساتھی سے پوچھا ارے بھئی یہ آدمی کھا کر کاشت کر رہا ہے کہ کھانے کے لئے؟ ساتھی اب چندن سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ اس نے مجبوراً جواب دیا فصل کھانے ہی کے لئے کاشت کی جاتی ہے، اتنے میں چندن کے ساتھی کا گھر قریب آ گیا۔ رات ہو رہی تھی وہ آدمی گھر جانے لگا تو چندن نے اس سے کہا میں سامنے والے عبادت خانے میں رات گزاروں گا تم گھر جاؤ لیکن گھر میں داخل ہونے سے پہلے تین بار تم کھانس لو۔ اس شخص نے ناراض ہو کر چندن سے جان چھڑانے کے لئے تین بار کھانسنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس شخص کی بیٹی صحن میں نہا رہی تھی۔ کھانسنے کی آواز سن کر جھٹ کپڑے پہن لئے۔ اتنے میں باپ اندر داخل ہوگیا۔ جب بیٹی نے باپ کو کچھ افسردہ پایا تو اس سے پوچھا کہ سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ باپ نے کہا اور تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی صرف اتنا ہوا کہ صبح سویرے ہی ایک پاگل آدمی میرا ہمسفر بن گیا اور راستہ بھر پاگلوں کی سی باتوں اور حرکتوں سے مجھے پریشان کرتا آیا۔ اتنا کہنے کے بعد باپ نے بیٹی کو ساری باتیں سنا دیں۔ سارا قصہ سننے کے بعد بیٹی بولنے لگی کہ وہ شخص پاگل نہیں بلکہ بہت ہی عقل مند ہے۔ اس کی ساری باتیں حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اس نے پانی میں جوتے پہن لئے۔ خشکی پر ننگے پاؤں چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ راستہ اور راستے میں موجود ہر چیز ہمیں نظر آتی ہے۔ اس لئے ننگے پاؤں پر چلنا کوئی نقصان دہ نہیں۔ لیکن پانی میں

چونکہ راستہ صاف نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے کوئی چیز چبھ جائے، آبی کیڑے مکوڑے کے کاٹنے اور پھسل کر گرنے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ اس لئے اس شخص نے پانی میں جوتے پہن لئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ شخص بار بار یہ کہتا رہا ''ایک روٹی اپنی میں نے کھالی اور دوسری دریا میں پھینک دی'' یہ بھی اس کی عقل مندی کی علامت ہے۔ آپ نے جو مفہوم سمجھ لیا ہے وہ درست نہیں۔ وہ آپ کی کھائی ہوئی روٹی کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ جو روٹی اس نے کھالی وہ صرف پیٹ بھرنے کے لئے کام آئی اس لئے یہ روٹی بیکار تھی۔ جب کہ جو روٹی اس نے آپ کو کھلائی وہ اس کے لئے اجر کا سبب بن گئی۔ بیٹی کی یہ باتیں سن کر باپ حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا تو پھر بتاؤ پرانی لاش اور نئی لاش سے کیا مراد ہے؟ بیٹی کہنے لگی پرانی لاش سے مراد غریب اور نادار شخص ہے جس کا دنیا میں پرسان حال نہیں ہوتا وہ بیمار ہو یا صحت مند، سفر میں ہو یا حضر میں گمنام ہی ہوتا ہے۔ وہ مہینوں فاقے کرے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لئے غریب آدمی زندہ رہ کر بھی چلتی پھرتی لاش ہی ہوتی ہے۔ جب یہ مر جاتا ہے تو بس دفنانے کی رسم عمل میں آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک پرانی لاش ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں امیر آدمی کے پاس چہل پہل رہتی ہے اس کے گرد نوکر چاکر ہوتے ہیں شان و شوکت ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو اسے نکالنے کے لئے بیسیوں لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جب وہ مر جاتا ہے تو وہ نئی لاش بن جاتا ہے۔ باپ نے کہا تم خوامخواہ اس کی باتوں کی تاویل کرتی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ گرم دھواں اور ٹھنڈے دھواں والی بات کا کیا مطلب ہے؟ بیٹی نے کہا امیر گھرانے کے چولہوں سے جو دھواں نکلتا ہے وہ گرم دھواں ہوتا ہے۔ کیونکہ ان چولہوں پر قسم قسم کے کھانے پک رہے ہوتے ہیں۔ لیکن غریب لوگوں کے چولہوں میں صرف تاپنے کے لئے لکڑی جل رہی ہوتی ہے لیکن ان پر پکتا کچھ نہیں۔ یہ دھواں ٹھنڈا دھواں ہوتا ہے۔ یہ سن کر باپ کو بھی اس آدمی سے عقیدت ہونے لگی۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگ کھا کر کاشت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کفایت شعاری سے کام نہیں لیتے بلکہ سب کچھ کھا پی کر ختم کرنے کے بعد قرض (مانگ کر) گزارہ کرتے ہیں اور کاشت کے موسم میں کاشت کرنے لگتے ہیں تا کہ اس کی فصل سے کھایا ہوا قرض چکا دیں۔ ایسے لوگ ایک بار جب اس چکر میں پھنس جاتے ہیں تو اس سے نکل نہیں پاتے اور ہمیشہ کھا کر کاشت کرتے رہتے ہیں۔ اب باپ کو یقین ہو گیا کہ وہ نہایت عقلمند آدمی ہے۔ لیکن اس نے تین بار کھانس کر گھر میں داخل ہونے کی جو ہدایت کی وہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بیٹی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس خیال سے صحن میں نہارہی تھی کہ باپ ابھی نہیں پہنچے گا۔ اگر باپ داخل ہوتے ہوئے تین بار نہ کھانستا تو وہ اسی بے پردگی کے عالم میں اندر پہنچ جاتا۔ اب اسے چندن سے اتنی عقیدت ہوگئی کہ سیدھا اس کے پاس جا کر اسے گھر آنے کی دعوت دی۔

چندن نے انکار کیا اور کہا کہ وہ اسی عبادت خانے میں ہی رات گزارے گا اور صبح سویرے بہو کی تلاش میں نکلے گا۔ اس شخص نے گھر جا کر بیٹی کو وہ ماجرا سنایا اور کہا کہ اس کے لئے کھانا بنالو وہ یہاں نہیں آرہا ہے کیونکہ صبح سویرے وہ عقل مند بہو کی تلاش میں نکلنے والا ہے۔ بیٹی کے دل میں خیال آیا کہ مجھے ایسے عقل مند آدمی کی بہو بننا

چاہیئے ۔خیر اس نے کھانا تیار کیا روٹیاں دستر خوان میں لپیٹ لیں۔ پھر (کٹورے) پلیٹ میں ترکاری ڈالی اور ترکاری میں گوشت کی بوٹیاں ڈال دیں۔ پھر باپ سے کہا کہ یہ اس آدمی کے پاس لے جائیں اور اسے کہنا کہ آج تاروں کی تین اور چاند کی دو تاریخ ہے اور موسم ابرآلود ہے۔ باپ وہ کھانا لے کر گیا۔ راستے میں اس نے اس کھانے میں سے ایک روٹی اور گوشت کی دو بوٹیاں کھالیں اور ترکاری کا آدھا حصہ پی لیا۔ اس کے بعد باقی کھانا چندن کے پاس رکھ دیا اور کہا میری بیٹی نے کہا ہے کہ آج تاروں کی تین اور چاند کی دو تاریخ ہے۔ اور موسم ابرآلود ہے۔ چندن نے کھانا کھالیا اور اس آدمی سے کہا اپنی بیٹی سے کہنا کہ آج تاروں کی بھی یکم تاریخ ہے اور چاند کی بھی یکم تاریخ ہے اور موسم صاف ہے۔ اس آدمی نے گھر آ کر چندن کی باتیں بیٹی کو سنائیں تو بیٹی سمجھ گئی کہ باپ نے ایک روٹی، آدھی ترکاری اور گوشت کی دو بوٹیاں ہڑپ کر لی ہیں۔ پوچھا تو باپ نے تصدیق کی۔ چندن اس آدمی کی بیٹی کی بات سے اتنا متاثر ہوا کہ صبح سویرے خود اس کے ہاں چلا گیا اور بیٹے کے لئے رشتہ مانگ لیا۔ رشتہ منظور ہوا اور کچھ دنوں کے بعد دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ اب چندن نے لداخ جانے کا ارادہ کیا اور ایک دن بہو سے کہا کل میں اور تیرا میاں لداخ روانہ ہو رہے ہیں ہمارے سفر کے لئے سامان تیار کرلو۔ بہو نے خانوں والا ایک تھیلہ بنایا اور ہر خانے کو خوبانی کے خستہ اور بادام سے بھر دیا ایک اور تھیلی میں گوشت کے پکے ہوئے ٹکڑے ڈال دیئے۔ دوسرے تھیلے میں ترکھان کے اوزار ڈالے۔ اس طرح سامان تیار کر دیا۔ اس کے بعد اپنے شوہر کو بلا کر سمجھایا کہ جب وہ چڑھائی پہنچیں اور باپ کہے ''چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو'' تو ہر موڑ پر اس تھیلی کے ایک خانہ کو کھول کر اس میں جو کچھ ہے وہ اسے کھانے کو دے اور جب باپ تھکن دور کرنے کے لئے آرام کرے تو یہ گوشت کے ٹکڑے اس کو پیش کرے۔ اسی طرح چڑھائی ختم ہو جائے گی۔ جب چڑھائی کے آخری مرحلے پر باپ آرام کرنے بیٹھ جائے تو بیٹا بانسری بجائے۔ یہ کہہ کر اس نے شوہر کے سامان میں ایک بانسری بھی رکھ دی۔ جب دوسری صبح وہ دونوں روانہ ہو گئے تو چندن کے بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ دونوں نے خستہ، بادام اور گوشت کھاتے ہوئے درے کو عبور کیا اور درے کی چوٹی پر جب وہ آرام کرنے کے لئے بیٹھے تو بیٹا اس انداز سے بانسری بجانے لگا کہ چندن کی تھکن اور پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ بانسری کی آواز سن کر لداخ کے بادشاہ کے آدمی ان کے استقبال کو پہنچ گئے۔ وہاں سے آگے گھوڑوں پر سوار ہو کر انہوں نے سفر کیا۔ لداخ پہنچے تو بادشاہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اب محل کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تیاریاں مکمل ہونے کے بعد چندن نے تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ چندن کی خدمت کے لئے راجہ نے ایک نوکر بھی رکھ دیا تھا۔ چند سالوں میں محل کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا۔ ایسا عالی شان محل اردگرد کے علاقوں میں کسی بادشاہ کو نصیب نہ تھا۔ محل دن میں سات رنگ بھی اختیار کرتا تھا اور محل اپنی جگہ سورج کے ساتھ گھومتا بھی تھا۔ اس کی کندہ کاریاں بھی عجوبہ روزگار تھیں۔ جب بادشاہ محل دیکھنے کے لئے پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ بادشاہ چندن اور اس کے بیٹے پر اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنے پاس موجود ہر چیز انعام دینے کے لئے حقیر دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ اس نے دربانوں سے مشورہ مانگا کہ چندن کو کیا انعام دیا؟

جائے۔ ہر کسی نے مختلف رائے دی۔ کسی نے کہا کہ خزانے کا دروازہ کھول کر ان دونوں سے کہا جائے کہ جتنا سونا چاندی اٹھانا چاہیں اٹھا کر لے جائیں۔ کسی نے کہا کہ ان دونوں کے وزن کے برابر تول کر سونا چاندی دینا چاہئے۔ کسی نے کہا کہ انہیں اتنا مال و دولت دینا چاہئے کہ دس پشتوں تک مالا مال رہیں۔ اسی دوران ایک وزیر نے اٹھ کر کہا چندن کو آپ جو چاہیں انعام دیں لیکن چندن کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تا کہ وہ کسی اور راجہ کے لئے ایسا عالی شان محل نہ بنا سکے۔ دربار میں موجود سارے لوگوں کو یہ تجویز بہت پسند آگئی۔ راجہ نے حکم دیا کہ صبح کو اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ دربار میں اتفاق سے اس وقت وہ لڑکا بھی حاضر تھا جس کو بادشاہ نے چندن کی خدمت پر مامور رکھا تھا۔ اس نے جب چندن کے ہاتھ کاٹنے کی بات سنی تو دوڑ کر چندن کے پاس آیا اور روتے ہوئے وہ قصہ سنایا کہ صبح اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ چندن یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے لڑکے کو تسلی دی اور چپ ہو گیا۔ رات کو چپکے سے چندن محل میں گیا اور اس کی مرکزی چابی نکال لی۔ جس سے محل ٹیڑھا ہو گیا۔ صبح راجہ کو خبر ہوئی کہ محل ٹیڑھا ہو گیا تو اس نے چندن کو بلا کر اس کا سبب پوچھا۔ چندن نے کہا ہو سکتا ہے کہ راجہ کی نیت ٹیڑھی ہو گئی ہو۔ جس کی وجہ سے محل ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ راجہ نے اس سے ٹیڑھا پن کو ٹھیک کرنے کی خواہش کی تو چندن نے کہا کہ ٹیڑھا پن کو ٹھیک کرنے کا سامان وہ گھر چھوڑ آیا ہے۔ اگر بادشاہ چاہتا ہے تو آدمی بھیج کر منگوا سکتا ہے۔ لیکن دو بھاری بھرکم سمجھدار وزیروں کے ساتھ جانا پڑے گا۔ بادشاہ نے وزیروں کو جانے کا حکم دیا۔ جب وہ جانے لگے تو چندن نے کہا کہ تم لوگ جا کر میری بہو سے کہنا کہ سسر نے ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے کا سامان لانے کے لئے بھیجا ہے۔ جس کا نام ''سرتمی سترن شاارن کورن از بری ٹھواق'' ہے۔ میری بہو سامان لا کر دے گی۔ وزیر روانہ ہو گئے اور چندن کی بہو کو وہ پیغام پہنچایا تو وہ سمجھ گئی کہ باپ بیٹے پر برا وقت آن پڑا ہے اور یہ کہ ان وزیروں کو سزا دینے کے لئے بھیجا ہے۔ بہو نے خندہ پیشانی کے ساتھ خوب خاطر تواضع کی اور کہا کہ اس نازک چیز کو نکالنے کے لئے گھر کے سامنے والا سفیدہ کاٹنا پڑے گا اور نہایت احتیاط سے چیرنا پڑے گا کیونکہ وہ چیز اس سفیدے کے تنے کے اندر ہے۔ وزیروں نے اس سفیدے کو گرا کر اس کے تنے کو چیرنے کے لئے کونٹیاں لگا دیں۔ تنے کے اندر شگاف پڑ گیا تو بہو نے کہا کہ تم لوگ اس شگاف میں اندر ہاتھ ڈال لو میں بھی کنارے سے ہاتھ ڈالتی ہوں اس کے بعد احتیاط کے ساتھ وہ چیز نکال لیتے ہیں۔ جب سارے وزیروں نے اس شگاف میں اپنے دونوں ہاتھ ڈالے تو چندن کی بہو نے تیزی سے کھونٹی نکال لی جس سے ان کے ہاتھ شگاف میں پھنس گئے۔ بہو نے ان سے پوچھا اب بتاؤ چندن اور اس کا بیٹا کہاں اور کس حال میں ہیں۔ سب نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہیں۔ باقی دس وزیروں نے ان دونوں وزیروں کی جن میں سے ایک نے چندن کے ہاتھ کاٹنے کی تجویز پیش کی تھی اور دوسرے نے تائید کی تھی۔ بہو نے ان دونوں میں سے ایک کی زبان اور دوسرے کی ناک کاٹ ڈالی اور کہا جاؤ راجہ سے کہو کہ ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے کا سامان مل گیا ہے۔ چندن اور اس کے بیٹے کو ان کی خدمت کا معاوضہ دے کر صحیح وسلامت ادھر پہنچا کے اپنے وزیروں کی جان چھڑا لے۔

وہ دونوں بڑی بدحالی میں بادشاہ کے پاس دربار میں پہنچ کر داستان سنانے لگے لیکن کسی کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آتی تھیں کیونکہ زبان اور ناک کے کاٹنے کے بعد الفاظ صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر دربار میں کچھ لوگ ہنسنے لگے اور بعض رونے لگے۔ آخر بادشاہ نے زبان حال سے معاملہ سمجھ لیا۔ اس نے چندن سے بہت شرمندگی کا اظہار کیا اور معافی مانگی اور ڈھیر سارا مال انعام میں دے کر اسے عزت کے ساتھ گھر روانہ کر دیا۔ باپ بیٹا گھر پہنچے تو انہوں نے باقی وزیروں کو آزاد کر دیا۔ چندن نے اپنی بہو کو اس عقل مندی پر شاباش دی اور اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ اطمینان سے زندگی گزارنے لگا۔" (29)

نوٹ: یہ دراصل شکر چکسن (موجودہ ضلع کرگل کی کہانی ہے اور وہ گل ابھی تک اسی خمیدہ حالت میں کھڑا ہے۔ اگرچہ وہ بھی گھر یا چوکے انجام سے دوچار ہے)

بلتی ضرب الامثال ۔۔لوک دانش

1۔ کم ہمتی کی زندگی گزارنے سے ہمت کر کے مر جانا بہتر ہے
2۔ ہمت کا سرا اونچا سوچ کا سر نیچا
3۔ کتے کے دانت کے لئے کتے کا چمڑا چاہئے
4۔ کمزور شخص بیماریوں کا گھر ہے
5۔ آدمی کی قدر اس کے مرنے کے بعد ہوتی ہے، کھانے کا مزہ اسی وقت ہوتا ہے۔
6۔ مشورہ کرنے کے لئے کوئی شخص نہ ہو تو اپنے گھٹنے سے ہی مشورہ کرو۔
7۔ وطن کی طرف اٹھنے والا ہر قدم سونے کا ہوتا ہے
8۔ اولاد نہ ہونے کا دکھ بڑھاپے میں ہوتا ہے اور ٹھکانہ نہ ہونے کا دکھ شام کو ہوتا ہے۔
9۔ ناتجربہ کار کتا لے کر شکار پر مت جاؤ، ناتجربہ کار ساتھی کے ساتھ سفر نہ کرو
10۔ بیکار چیزیں بھی ایک دن کام آتی ہیں (30)

بچوں کے لئے لوک دانش:

روتے بچوں کو چپ کرانے کے لئے بڑی بوڑھیاں زمین پر بیٹھ کر روتے بچے کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتی اور ایک ایک انگلی کو مٹھی کی شکل میں بند کرتی ہوئی یہ گیت گاتی ہیں

اردو ترجمہ:

بڑھیا کے باغ میں پیاز ہے
پیاز کوٹنے کے لئے ایک سل ہے
سل کو چاٹنے کے لئے پلا ہے
پلے کو باندھنے کے لئے ایک ڈوری ہے
ڈوری کاٹنے کے لئے ایک چھری ہے
چھری کو تیز کرنے کے لئے ایک لوہار ہے
لوہار کو کھانے کے لئے ایک دیو ہے
دیو کو مارنے کے لئے آگ ہے

آگ کو بجھانے کے لئے پانی ہے
پانی پینے کے لئے ایک بیل ہے۔(31)

بروشسکی لوک بیانیہ:

بروشسکی شاعری کے بارے میں شیر باز علی خان برچہ کا یہ اقتباس بہت اہمیت کا حامل ہے۔وہ لکھتے ہیں:
''بروشسکی زبان انیسویں صدی کے وسط تک تنہائی کا شکار رہی۔تاہم اس میں لوک کہانیوں، پہیلیوں، ضرب الامثال، محاوروں، اقوال اور چند ایک لوک گیتوں کا انمول ذخیرہ موجود ہے۔یہ ایک حیران کن امر ہے کہ بروشسکی میں شاعری کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں۔شعر کے لئے فارسی لفظ ''بیت'' مستعمل ہے۔فی زمانہ شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں شادی بیاہ اور آباء کے سورمائی گیت اور لوریاں، ثنا سے مستعار رزمیے، منقبت، حمد، نعت اور نظمیں ملتی ہیں۔ ماضی میں رومانی شاعری کی حوصلہ شکنی ہوئی۔چھوٹا سا معاشرہ تھا لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کے سانجھی تھے۔ چنانچہ رومانی ابیات کہنا معاشرتی اقدار کو للکارنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ایک خیال یہ بھی ہے کہ قدیم بر وشو معاشرے میں شاعری تابو کے زمرے میں آتی تھی۔''(32)

ہنزہ۔تاریخی روایات:

ہنزہ والوں کو یہ روایت بہت پسند ہے کہ قدیم علاقہ باختر سے چار فوجی سردار ہنزہ میں وارد ہوئے۔یہ دراصل سکندر اعظم کی فوج کے ایک گم گشتہ دستے کا حصہ تھے جو بروشال میں بیمار ہو گئے۔بعد میں انہوں نے اسی جگہ کو اپنا مسکن بنالیا اور ان کی نسل پھلی پھولی۔یہ بھی ممکن ہے کہ کسی زمانے میں یہ لوگ ایران سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ان کے سردار کا نام مغول تیتم تھا اور اس کی اولاد عرصہ دراز تک چترال سے لے کر واخان، بدخشان، ہنزہ، استور، داریل اور تانگیر میں حکومت کرتی رہی۔وہ لوگ رئیسان گلگت کے نام سے معروف ہوئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدخشان، چترال، وخان، بلتستان، یاغستان اور کشمیر تک سے لوگ آکر ہنزہ، نگر اور یاسین میں بس گئے۔

بڑی بڑی چٹانوں پر بالخصوص گنیش کے قریب براہمی سوگدیانی، خروشتی، شاردھا اور گپتا زبانوں میں تحریریں کندہ ہیں۔یہ تحریریں پہلی سے آٹھویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں۔ماہرین کی رائے کے مطابق یہ کندہ کاری بدھ زائرین اور کشان بادشاہوں کے سفرا کے مشاق ہاتھوں کی یادگار ہیں۔

رئیسان گلگت کے بعد شری بدت ایک جابر حکمران ہوا جو مالیہ، بچوں کی صورت میں وصول کرتا تھا۔ اور لوگ اس سے سخت خوف زدہ، پریشان اور متنفر تھے۔بلتستان سے آذر جمشید نے وہاں آکر لوگوں کی معاونت سے شری بدت کا خاتمہ کیا۔

آذر جمشید کے بعد اس کا بیٹا سوملک اور پھر اس کا بیٹا شاہ ملک حکمران بنا۔ شاہ ملک حقیقی معنی میں راجگان گلگت کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ شاہ ملک کے دونوں بھائی گلگت میں رہتے تھے۔ مغول تیتم ہنزہ کے حکمران تھے لیکن مالیہ جمع کر کے شاہ ملک کو گلگت بھیجا کرتے تھے۔

شاہ ملک کے بعد اس کا بیٹا صاحب خان، پھر اس کا بیٹا دولت شاہ، پھر اس کا بیٹا شاہ ملک ثانی حکمران ہوئے۔ شاہ ملک ثانی کے تین بیٹے کبھی گلگت اور کبھی التست میں رہتے تھے۔ اس دوران میں ایک شخص لداخ سے آکر ہنزہ پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ ملک کی اولاد کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اس خاندان کا ایک فرد لالی تھم راجا چلس خان کے پاس چلا گیا۔ راجا نے اپنی بہن سے لالی کی شادی کرادی۔ جس سے دو توام بچے گرگس اور مغلت پیدا ہوئے۔ یہ بڑے ہو کر ہنزہ اور نگر کے حکمران بنے۔ ایک روز شکار کے دوران میں مغل بیگ نے گرگس کو تیر مار کر قتل کر ڈالا اور ہنزہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ وزیر ٹبو نے مغل بیگ کو قتل کر کے بدلہ لے لیا۔

گرگس کی نرینہ اولاد نہیں تھی، اس لئے ان کے خاندان میں سے شاہ خان نامی ایک پیر مرد کو ڈھونڈ کر گرگس کی بیٹی نور بی بی سے نکاح کرادیا اور شاہ خان کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یہ لوگ شاہ خان کو آسمانی حاکم تصور کرتے تھے اور اپنی اصطلاح میں اسے ''عیاشولم عیاشو'' کہتے تھے۔

روایت ہے کہ شہزادہ شاہ خان کسر نامی ایک راجہ کے خوف سے بدخشان میں اقامت پذیر تھا یہ شہزادہ جونہی ہنزہ میں وارد ہوا تو وزیر بٹو نے جو گرگس کی بیٹی نور بی بی کا رضاعی باپ تھا، مشہور کیا کہ آسمان سے ایک شہزادہ اترا ہے۔ شہزادے کی آمد پر ہنزہ میں خوشیاں منائی گئیں۔ اہلیان نگر نے طنزاً پوچھا۔

اے بے حکمران لوگو کیا خوشیاں منا رہے ہو؟ اس پر ہنزہ والوں نے جواب دیا: آسمان سے ایک مخلوق لائے ہیں۔

وزیر ٹبو کا تعلق گلگت کی رونو قومیت سے تھا جس نے گرگس کے قاتل مغل بیگ کو ہلاک کر کے اس کا کلیجہ گرگس کی بیٹی نور بی بی کو پیش کیا۔ وزیر ٹبو کی اس وفاداری سے والیانِ ریاست، بہت خوش تھے۔ بہر حال بعد میں یہ خاندان عیاش کتس کے نام سے مشہور ہوا۔

پندرھویں صدی کے وسط تک ہنزہ اور نگر راجگان گلگت (آل ترا خان) کے باج گزار تھے لیکن اس خاندان کے دور میں وہ آزاد اور خود مختار ہو گئے۔ شاہ خان عرف عیاشو کے بعد اس کا بیٹا ماپوری تھم اور اس کے بعد اس کا بیٹا عیاشو ثانی حکمران بنے۔ عیاشو ثانی نے بلتستان کے راجا ابدال خان کی بیٹی شاہ خاتون سے شادی کی۔ شاہ خاتون کے ساتھ بلتستان کے دستکار بھی ہنزہ آئے جنہوں نے یہاں التت اور بلتت میں سولھویں صدی کے وسط میں محلات تعمیر کیے۔

شاہ خاتون کے بطن سے سات بیٹے پیدا ہوئے۔ ان میں سے پانچ اپنے والد کے بعد یکے بعد دیگرے

حکمران ہوئے۔ پانچویں بیٹے شہزادہ سلیم کے زمانے میں ہنزہ اور چین کے درمیان اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ چھٹے اور ساتویں بیٹے شہزادہ مہری تھم اور سلطان نے ہنزہ کی حکومت دو حصوں میں بانٹ لی۔ بعد میں انہوں نے نگر پر قبضہ کرلیا اور مہر تھم نگر اور سلطان ہنزہ کا حاکم بنا۔

سلطان کے بعد اس کے دو بیٹوں علی خان اور شاہ عباس عرف شیوس نے بالترتیب التت اور بلتت کی حکومت سنبھال لی۔ کچھ مدت بعد شاہ عباس نے علی خان کو قتل کر دیا اور پورے ہنزہ پر قبضہ کرلیا۔ شاہ عباس کے بعد اس کا بیٹا شہ بیگ کا بیٹا خسرو بھاگ کر درایل میں پناہ گزیں ہو گیا جب شاہ خان کا انتقال ہو گیا تو اس کا نابالغ بیٹا تخت نشین ہوا تو خسرو چند قبائل کے ساتھ ہنزہ آیا اور تخت پر قبضہ کرلیا۔ یہ واقعہ 1754ء کا ہے۔ اس کے تیس سال بعد خسرو کو اس کے بیٹے سمی مرا نے پتھر مار کر ہلاک کر دیا اور خود (1784) میں حکمران بن بیٹھا۔

مرزا سمی کاہل الوجود اور نااہل شخص تھا، لوگ اس سے بیزار ہو گئے اور اس کے جلاوطن بھائی سلیم خان کو بلایا۔ سلیم خان نے چڑھائی کر کے مرزا کو قتل کر دیا اور 1790ء میں خود حکمران بن گیا۔

سلیم خان بیدار مغز حکمران تھا۔ روزانہ دربار لگاتا تھا۔ اس نے حیدر آباد، علی آباد اور احمد آباد کی بنجر اراضی کو قابل کاشت بنایا۔ اس نے 34 (چونتیس) سال حکومت کی۔ اس کی وفات (1824) پر اس کے دونوں بیٹوں محمد امین خان اور غضنفر علی خان کے درمیان جانشینی کا جھگڑا ہوا۔ غضنفر نے محمد امین کو زہر دلوا دیا اور حکمران بن گیا۔ 1863ء میں غضنفر علی خان نے وفات پائی۔ اس کے پانچ بیٹوں میں بھی جانشینی کی جنگ ہوئی اور غزان خان کامیاب ہو گیا۔ اس نے دوسرے بھائیوں کو جلاوطن یا قتل کرا دیا۔ بعد میں اس کے بیٹے صفدر علی خان نے غزان خان کو قتل کرا کے خود تخت نشین ہو گیا۔

1889ء میں ایک روسی نمائندہ آیا۔ اس نے صفدر علی سے روسی حکومت کی تابعداری اور خیرسگالی کی گفت وشنید بھی کی مگر ناکام رہا، اسی سال برٹش ایجنٹ گلگت، ہنزہ اور نگر آیا اور برطانیہ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا وعدہ لے لیا بعد میں ان کے وظائف مقرر کیے۔

برٹش ایجنٹ نے کاشغر کے جنرل کونسل کو براہِ ہنزہ خط بھیجنا چاہا تو میر ہنزہ نے اجازت نہ دی۔ چنانچہ مہاراجہ کشمیر کی فوجیں ہنزہ پر حملہ آور ہوئیں۔ ہنزہ اور نگر کی متحدہ فوجوں نے 19 دن تک مقابلہ کیا لیکن مہاراجہ کی فوجیں غالب آگئیں اور دسمبر 1891ء میں نگر پر قابض ہو گئیں۔ نگر کا میر آذر خان اور صفدر علی میر ہنزہ درہ منکہ پار کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

بعد ازاں مہاراجہ نے نگر اور ہنزہ کے شکست خوردہ حکمرانوں کو واپس لانے کی خواہش ظاہر کی۔ صفدر علی تو واپس نہ آیا البتہ آذر خان واپس آگیا اور ان کے گزارے کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ 14 اپریل 1892ء کو صفدر علی کے سوتیلے بھائی محمد نظیم کو موروثی میر ہنزہ اور ہمایوں بیگ کو موروثی وزیر مقرر کیا گیا۔ اسی طرح راجا ظافر خان کو نگر کا

میر مقرر کیا گیا۔ مہاراجا کی طرف سے سندیں دی گئیں اور وائسرائے کی منظوری سے انہیں خود مختار ریاستوں کا درجہ دے دیا گیا۔ محمد نظیم خان نے 1938ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا محمد غزان خان جانشین ہوا۔

1945ء میں غزان خان کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بڑا بیٹا محمد جمال خان جانشین ہوا۔ 2 نومبر 1947ء کو گلگت کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو گیا والیان ہنزہ نے بھی الحاق کا اعلان کر دیا۔ 1948ء میں کراچی میں انہیں سابقہ حقوق اور مراعات کا یقین دلایا گیا۔ بعد ازاں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 23 اگست 1972ء کو ریاست نگر اور ستمبر 1974ء میں ریاست ہنزہ کی آزاد حیثیت کا خاتمہ کر دیا۔(33)

بلتی شہزادے کے ہاتھوں شری بدت کی ہلاکت:

پرانے زمانے میں گلگت میں شاہ رئیس نامی ایک حکمران تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے سر میں ایک سونے کا سینگ تھا جس کا صرف اس کے بال سنوارنے والے ملازم کو علم تھا۔ چونکہ حاکم ہر قیمت پر اس بات کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے ملازم کو اس راز کو چھپانے میں بڑی ذہنی الجھن کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ اس طرح پریشان ہو کر وہ بیمار پڑ گیا اور اسے دست آنے لگے۔ آخر اس ذہنی پریشانی سے خلاصی پانے کے لئے اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جنگل میں زمین میں ایک گڑھا کھودا اور اسمیں منہ رکھ کر زور سے چلایا کہ بادشاہ کے سر پر سونے کا سینگ ہے۔ اس کے بعد اس نے گڑھا بند کیا اور واپس لوٹ آیا۔

کہتے ہیں کہ اس وقت ایک لڑکی گلہ چرا رہی تھی۔ اس کے پاس ایک آدمی آیا اسے ایک چغہ اور دھاگا دیا کہ پھٹی ہوئی جگہ کو سی دے۔ لڑکی نے چغہ مرمت کرنا شروع کیا تو چغہ اور پھٹ گیا۔ جب کہ دھاگا سلامت رہا۔ اس لڑکی نے اس آدمی کی حرکات سے اندازہ لگا لیا کہ وہ شخص شری بدت ہے۔ شری بدت لڑکی سے یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ وہ لڑکی کے اس اچھے سلوک کا بدلہ چکا دے گا کیونکہ (بقول اس کے) وہ گلگت کا حاکم بننے والا ہے۔

اس کے بعد شری بدت شاہ رئیس کے اصطبل میں چھپ گیا اور گھوڑوں کے آگے اخروٹوں کا جو چارا ڈالا جاتا تھا وہ کھا جاتا۔ اس طرح گھوڑے کمزور ہوتے گئے۔ بادشاہ نے گھوڑوں کے کمزور ہوتے جانے پر تشویش کا اظہار کیا۔ آخر ایک روز سائیس شری بدت کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ شری بدت نے کہا کہ شاہ رئیس اگر حاکم ہے تو کیا میں اخروٹ بھی نہیں کھا سکتا۔ یہ کہہ کر شری بدت غائب ہو گیا۔ سائیس نے یہ بات بتائی تو شاہ رئیس نے بیٹن نچوانے کا انتظام کروایا۔ بیٹن والے خاص قسم کے درخت کی بنی ہوئی بانسریاں بجاتے اور ناچتے ہیں۔ اتفاق سے اس ناچ کے لئے جو بانسری لائی گئی تھی۔ اس جگہ سے لائی گئی تھی جہاں پر حاکم کے ملازم نے راز اگلا تھا۔ چنانچہ جب وہ بانسریاں بجائی گئیں تو ان سے یہ آواز نکلتی تھی کہ "بادشاہ کے سر پر سونے کا ایک سینگ ہے۔"

اتفاق یہ کہ اسی وقت شری بدت بھی وہاں آ گیا چنانچہ بادشاہ کے حکم سے شری بدت کو گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ رئیس نے ناراض ہو کر شری بدت پر خنجر پھینکا۔ شری بدت نے اسی خنجر سے بادشاہ کا خاتمہ کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔

بادشاہ بن جانے پر شری بدت نے بھیڑیں چرانے والی لڑکی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے اس سے شادی کر لی۔اس بھیڑیں چرانے والی لڑکی سے نور بخت نامی لڑکی پیدا ہوئی۔

رئیسان گلگت کے آخری حکمران کو قتل کر کے شری بدت تخت پر بیٹھ گیا۔روایت ہے کہ وہ شخص بہت ظالم تھا۔بچوں کی صورت میں مالیہ وصول کرتا تھا جن کا گوشت اسے بہت پسند تھا اس کے ظلم کی وجہ سے گردونواح میں سرکشی کی لہر دوڑ گئی۔

شری بدت کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے کسی اوزار کے ذریعے قتل نہیں کیا جا سکتا۔

آذر جمشید بلتستان کا ایک شہزادہ گلگت آیا تو لوگوں نے شری بدت کی لڑکی نور بخت کو ساتھ ملا لیا اور اس کی موت کا راز معلوم کر لیا۔اس کی موت کا راز یہی تھا کہ اسے آگ کے سوا کسی اوزار سے نہیں مارا جا سکتا۔ چنانچہ شری بدت سے نجات حاصل کرنے کے لئے لوگوں نے شری بدت کی لڑکی نور بخت کی مدد سے شری بدت کو آگ سے جلا ڈالا۔

تاریخی حصہ ختم ہو جانے کے بعد بھی کہانی جاری رہتی ہے۔شری بدت کو زندہ جلا کر لوگوں نے اس سے نجات حاصل کی۔اس خوشی کو تازہ کرنے کے لئے ہنزہ میں تھوشلنگ کا تہوار ہر سال منایا جاتا ہے۔اس روز تمام چھوٹے اور بڑے صبح کاذب کے وقت سوکھی لکڑیوں کو آگ لگا کر ہاتھوں میں تھامے قلعے کے باہر ایک جگہ جمع ہونے لگتے ہیں اور یہاں آگ برسا کر اس کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، پھر اس کے پاس کھڑے ہو کر ایک گیت گاتے ہیں اس کے بعد میر صاحب کے محل میں ایک پرتکلف دعوت دی جاتی ہے۔اس دعوت میں قومی گیت گائے جاتے ہیں۔(34)

عبداللہ ہنزائی نے ہنزہ کی لوک کہانیوں کی ایک کتاب ''ہنزہ کی لوک کہانیاں'' مرتب کی ہے، جسے کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ہنزہ کے تین قبیلوں کی روایات پر مبنی ایک کہانی ''انجام تھکونیٹز اور قبیلہ درامنکٹ'' ان میں سے ایک ہے جو بروشسکی لوک بیانیہ کا نچوڑ ہے۔

بروشسکی لوک بیانیہ:

ہنزہ خاص میں جن تین قدیم قبیلوں سے نسل پھیلی ہے۔ان تین قبیلوں میں ''تھکونیٹز'' بلتت میں ''اوسنکوژ'' التت میں اور ''ہماچانگ'' گنش میں مشہور ہیں، اور چونکہ یہ تینوں موضعات آبادی کے لحاظ سے بہت پرانے ہیں اس لئے ان تین قبیلوں سے ہنزہ کے آس پاس میں آبادیاں بس گئیں اور نسل بڑھ گئی ہے۔ان میں قبیلہ وارتنگ کے بارے میں خصوصاً ذکر کیا جاتا ہے۔ بلتت میں ان کی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی اور یہ قبیلہ ''درم تھکونیٹز'' کے نام سے نالہ حسن آباد میں بمقام ششپر بہت آباد تھا۔ان کی یہاں پر بہت اچھی آبادی تھی اور لوگ زیادہ خوشحال ہو گئے تھے۔اس لحاظ سے ششپر اس زمانے میں بہت زیادہ مشہور ہو چکا تھا۔لیکن ان کی یہ خوشحالی ان کے لئے وبال جان بن گئی۔ساری خوشحالی نے انہیں بہت زیادہ خودسر اور مغرور بنا دیا تھا اور ان لوگوں کی بدمستی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔

اس زمانے میں یہ لوگ اپنے باپ کو 'ببا' اور ماں کو 'ززی' پکارا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ عیاشو میوری شہزادے کو قبیلہ "تھکونیٹز" نے پالا پوسا اور یہ شہزادہ چونکہ اس قبیلے میں پرورش پا چکا تھا اس لئے جب ہوش سنبھالا تو اسے ان کی بدمستی کا علم ہو گیا اور ان کی طاقت کو بھانپ گیا، اور جونہی "میوری" ہنزہ کا حاکم بن گیا تو سب سے پہلے "میوری تھم" کو قبیلہ تھکونیٹز کی طاقت کو کچلنے کا خیال دل میں آیا۔ کیونکہ وہ ان سے خطرہ محسوس کر رہا تھا چنانچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر قبیلہ ہما چانگٹ، اور قبیلہ اوسنگو کے ساتھ ساز باز کرنا پڑی اور انہیں اپنے ارادے میں شریک کر لیا اور یوں اکابران ہنزہ کے خفیہ صلاح و مشورے سے قبیلہ تھکونیٹز کو ختم کرنے کی ایک سازش تیار ہوئی۔

چنانچہ اس خفیہ منصوبہ کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ کسی بہانے سے تھکونیٹز کو علی آباد آنے کی دعوت دی جائے ،اور اس دوران انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس لئے علی آباد میں خفیہ طور پر چیدہ چیدہ افراد کو تلواروں کے ساتھ رکھا گیا اور ادھر میوری تھم نے علی آباد میں تماشے کا اہتمام کیا۔ جس میں شراب کا بھی بندوبست ہوا۔ اس خفیہ انتظام کے بعد دعوت طعام ان کی دعوت موت بن گئی۔ ادھر میوری تھم نے چند افراد کو ششپر نالے کی طرف بھیجنے کا بھی بندوبست کیا تھا۔ تاکہ وہ ادھر جا کر وہاں کے باقی ماندہ افراد کا صفایا کر دیں۔

چنانچہ اس سازش کے تحت تمام خفیہ انتظامات کر لئے گئے اور قبیلے تھکونیپر کو دعوت پر علی آباد بلا لیا گیا۔ مذکورہ دعوت میں نالہ ششپر سے جتنے لوگ بھی شرکت کے لئے آئے تھے وہ سب کے سب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے جونہی یہ بدقسمت لوگ اپنی مستی کے عالم میں علی آباد کے "بررم موس" پہنچ گئے ان پر میوری تھم کے خفیہ مسلح افراد اچانک ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سب کا صفایا کر دیا گیا۔ حیرت کی بات تو تھی کہ ان بے گناہ افراد کو ان کے اپنے "میر" نے دعوت دی تھی، اور وہ خوشی خوشی اس دعوت میں شرکت کے لئے آئے تھے، لیکن آن واحد میں یہ تمام بے گناہ افراد قتل ہوئے۔ کوئی بھی ان میں سے نہیں بچ سکا۔ اس طرح بروم موس، پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ستم ظریفی یہ کہ ان لاشوں کو یونہی چھوڑا گیا ان کی دفن کفن کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ میوری تھیم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ششپر نالے میں موجود بقیہ افراد کا بھی صفایا کرنے کے لئے اپنے آدمی وہاں بھیجے تھے۔ اس طرح وہاں پر موجود تمام چھوٹے بڑے قتل ہوئے۔

درم تھکونیٹز کی لاشیں یہاں یونہی پڑی رہیں لیکن قدرت کو جوش آیا، اوپر سے ایک زبردست سیلاب آیا اور ان تمام بے گور و کفن لاشوں کو ڈھانپ لیا۔ چنانچہ بعد میں اسی سیلاب کی وجہ سے اس جگہ کا نام 'بروم موسے' مشہور ہوا۔ یعنی سفید سیلابی زمین۔

چونکہ تھکونیٹز کے قبیلے تمام افراد بشمول مرد و زن اور بچے قتل ہو چکے تھے اس لئے اب ان کی کوئی اولاد نرینہ باقی نہیں بچی تھی اور تقریباً ان کی ساری نسل ختم ہو چکی تھی۔ قدرت خداوندی دیکھئے، اسی سال فصل کی بوائی

ہوئی اور کسانوں نے ہل چلایا لیکن جب فصل پکنے کے قریب پہنچی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فصل کے دانے کالے نکلے۔ چنانچہ یہ سال ان کے لئے بار آور ثابت نہ ہوا اور نہ صرف اس ایک سال میں ایسا ہوا بلکہ مسلسل اگلے کئی سالوں تک یہ حالت رہی۔ جس سے لوگوں کی معاشی و اقتصادی حالت بری طرح متاثر ہوئی اور شدید قحط سالی کے شکار ہوئے۔ بہت سے طریقے سوچے گئے اور کاہنوں کو نچوایا گیا اور فریادیں کی گئیں لیکن سب کے سب لاحاصل اور یوں لوگ فاقہ کشی کرتے رہے۔ بالآخر کاہنوں اور نجومیوں کا آخری سہارا ہی لیا گیا۔ اور چونکہ اس زمانے میں لوگ نہایت توہم پرست ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ان کا آخری سہارا یہی کاہن ہی ہوا کرتے تھے۔ بالآخر ان کاہنوں نے پیشن گوئی کی کہ ''جب تک تھکو نیٹر کی کسی نرینہ اولاد کے ہاتھوں سے کھیت میں بیج نہ بویا جائے تب تک خوشوں میں کالے دانے نکلتے رہیں گے۔'' چنانچہ اس کی تلاش شروع ہوگئی۔ اب میر بھی پریشان تھا اور ساتھ ہی اس کے ہم خیال لوگ جنہوں نے قبیلہ تھکو نیپر کو ناحق قتل کیا تھا اور جس سے یہ مصیبت ان پر نازل ہوئی تھی۔ اب ان کی کسی اولاد نرینہ کی تلاش شروع ہوگئی۔

وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ 'درم چھورم' اپنی بلوغت کے دہلیز پر قدم رکھتا گیا اور دیکھتے دیکھتے وہ وقت بھی آیا جسے عہد جوانی کہتے ہیں۔ وہ ایک طاقتور اور نہایت جسیم اور تنومند جوان بن گیا تھا۔ اس کی جوانی کے سامنے سارے جوان دم توڑ چکے تھے۔ اور انہوں نے ہتھیار ڈالا تھا۔ اس جوان پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی وہ جہاں جانا چاہتا، جا سکتا تھا اور جس گھر میں گھستا، اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ لے کہ درم چھورم اپنی مستی کے عالم میں یونہی گنش کی طرف نکلا اور چلتے چلتے ایک جگہ پہنچا جسے 'سُفر' کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ ایک توت کے درخت کے نیچے سرسبز مقام پر بیٹھی ہے اور کوؤں کو بھگانے میں مصروف ہے۔ اس طرح وہ پکے ہوئے توت کی حفاظت کر رہی تھی اور بار بار وہ کوؤں کو آوازیں دے رہی تھی۔ جونہی درم چھورم کی نظر اس پر پڑی وہ اس پر سو بار فدا ہوا اور ایسا فریفتہ ہو گیا کہ اس نے ادھر دیکھا اور نہ اُدھر دیکھا فوراً ہی اس دوشیزہ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں دبوچ کر اُٹھا لانے کا تہیہ کر لیا۔ یہ دوشیزہ گنش قبیلہ ہماچانگ کی تھی اور ہماچانگ کے لوگ بڑے جاہل ہوا کرتے تھے، لیکن درم چھورم جیسے نڈر جوان کے لئے کسی کا بھی کوئی خوف نہیں تھا۔ چنانچہ اس فریفتگی کے عالم میں بلا جھجک اس دوشیزہ کے قریب پہنچا اور آن واحد اسے دبوچ لیا اور پھر اسے اپنے مضبوط کندھوں پر لادا اور فوراً بلتت کی طرف چل پڑا لیکن اب اس کے سامنے مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ اس لڑکی کو کیوں کر وہ اپنے گھر لے جا سکتا تھا۔ گھر والے اسے کیا کہیں گے اور یونہی وہ اسے گھر پر کیوں رہنے دیں گے وغیرہ۔۔۔ اس لئے یہ خدشات دل میں آتے ہی فوراً اس نے یہ سوچا کہ اب اسے دور اُوپر پہاڑی کے دامن تک لے گیا اور ایک نامعلوم مقام یعنی ایک غار میں اسے رکھ چھوڑا، پہلے تو وہ لڑکی ڈری اور روتی بھی رہی لیکن اس حسین جوان کے بازو میں آنے کے بعد اور اس کی بے باکی کو بھانپنے کے بعد اب وہ سہم گئی بلکہ قدرے مطمئن ہو کر اس کے ساتھ یوں

زندگی گزارنے پر رضامند ہوگئی۔ کیونکہ یہ عشق یک طرفہ نہیں تھا اس کے دل میں بھی عشق ومحبت کی چنگاریاں سلگ چکی تھیں۔اس لئے اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ چنانچہ اب درم چھورم کی معشوقہ کا مقام وہ غار ہی رہا اور اس بارے میں کسی کو علم بھی نہیں ہوا۔اس لڑکی کا نام ''بلوگی'' تھا۔اور وہ راس کی بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگی۔

ادھر گنش میں اس لڑکی کے والدین کو وقت پر گھر نہ آنے کی وجہ سے پریشانی ہوئی اور یوں بات پھیلتے پھیلتے قبیلہ، ہماچانگ کے لوگوں کو علم ہوا۔تو اب اس کی تلاش شروع ہوگئی۔وہ تلاش بسیار کے بعد ہمت ہار بیٹھے۔ اس لڑکی کے بارے میں کوئی پتہ نہ چلا، اور وہ مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ آئے۔انہوں نے یہی سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ دریا میں ڈوب کر مرگئی ہو۔اس لئے غائبانہ طور پر اس کی وفات کی رسومات وغیرہ ادا ہو۔

چھورم اور اس کی معشوقہ بلوکی اس پہاڑی غار میں نہایت سکون سے زندگی گزارتے رہے۔اس دوران چھورم اپنی معشوقہ کے لئے اشیاء خوردونوش کا بندوبست کرتا رہتا تھا اور اس سلسلے میں کسی اور کو بالکل علم نہیں ہوسکا تھا۔ حتیٰ کہ کچھ سال گذر گئے اور ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔جس کا نام انہوں نے ''درم دلتس'' رکھا۔پھر دوسرے سال دوسرا بیٹا پیدا ہوا اس کا نام ''درم ملتس'' رکھا۔اور اگلے دو سال بعد ایک تیسرا بیٹا پیدا ہوا۔جس کا نام ''حیدر علی '' رکھا گیا۔پھر ان کا چوتھا بیٹا پیدا ہوا۔اس کا نام انہوں نے ''درم پنو'' رکھا اور آخر میں ان کا پانچواں بیٹا پیدا ہوا۔جس کا نام 'دشمن خروک' رکھا گیا۔اس طرح درم چھورم سے کل پانچ بیٹے پیدا ہوئے اور اس تمام عرصے میں جلوکی، اور 'درم چھورم' اپنے ان بیٹوں کے ساتھ اسی پہاڑی غار میں زندگی بسر کرتے رہے اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب یہ پانچوں بیٹے جوانی کی حدود میں داخل ہوگئے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حسب معمول موسم گرما کے آخر میں ترمبہ کی کاشت کا وقت قریب پہنچا، لیکن ان کے پاس ہل جوتنے کے لئے بیل نہیں تھے۔ کیونکہ ان کے حصے میں ''بُل مل'' میں ایک کھیت تھا جس میں ترمبہ کی کاشت کرنا تھا۔

اس لئے ایک روز بلوکی اور چھورم نے اپنے بیٹوں سے کہا ''بیٹو ہمارے رشتہ داروں کے بیل او پر اولتر نالے میں چر رہے ہیں اس لئے تم میں سے دو جا کر وہاں سے ایک جوڑا بیل لے کر آجاؤ تا کہ ہم بھی کاشت کریں۔'' اس حکم کی تعمیل میں دو بیٹے تیار ہوگیا اور پھر اولتر نالے کی طرف روانہ ہوگئے۔وہ دونوں اوپر چراگاہ پہنچ گئے اور وہاں جاتے ہی انہوں نے سات جوڑے بیلوں کے دیکھے۔وہ ایک جوڑے کی بجائے سات جوڑے بیلوں کے ہنکا کر لے آئے اور پھر 'بل مل' میں ان کو جوتا۔اس دوران چھورم موجود نہیں تھا۔

بلوکی نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی اور کہا تھا ''میرے میکے والے بڑے جاہل لوگ ہیں۔شاید وہ لوگ اپنے بیلوں کی تلاش میں آپ تک پہنچ جائیں اور اپنے بیلوں کو یوں جتا دیکھ کر شاید وہ تمہیں ماریں۔اس لئے خیال رکھنا کہ جب تک تم بیل جوتے رہتے ہو اس دوران تم اپنی اونچی آواز میں ''میں اپنے ناناؤں کے بیلوں کے

قربان! میں اپنے ماموں کے باز کے قربان، میں لُٹ جاؤں بیلؤ میں تم پر قربان ہو جاؤں وغیرہ وغیرہ الفاظ دہراتے رہنا۔ اور اگر اس دوران وہ لوگ تمہارے قریب آ جائیں اور وہ تم سے پوچھ لیں کہ تم کون ہو، تم ان سے کہہ دینا کہ ہم تو تمہارے بھانجے ہیں ہم بلوکی کے بیٹے ہیں، ہمارا باپ درم چھورم ہے۔'' چنانچہ بلوکی نے اس قسم کی نصیحتیں کیں اور انہیں کھیت کی طرف رخصت کر دیا۔

چھورم کے بیٹوں نے ان بیل کے جوڑوں کو ہانکا اور انہیں جوتنے کے لئے اپنے کھیت کی طرف لے گئے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اسی روز جس روز بلوکی کے بیٹے اولتر سے بیل کے جوڑے لائے تھے گنش سے ہماچانگ والوں نے اپنے جوان بیٹوں کو اولتر سے بیل لانے کے لئے بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچ گئے تو انہیں وہاں پر اپنے بیلوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ چراگاہ میں انہیں ڈھونڈا لیکن غور کرنے سے انہیں پتہ چلا کہ ان بیلوں کے پاؤں کے تازہ نشانات نیچے آبادی کی طرف تھے۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ غالباً کوئی انہیں لے گیا ہے۔ بس وہ بھی ان نشانات کے پیچھے پیچھے واپس لوٹ آئے۔ اور ''بُواگن'' سے ہوتے ہوئے شرانگ تک آئے اور یہاں سے نیچے آبادی کی طرف نظر دوڑائی۔ تو دیکھا نیچے 'بل مل' میں ان کے بیل کھیت میں جتے ہوئے ہیں۔ انہیں یوں لے جا کر استعمال کرنے پر بہت غصہ آیا، اور انہوں نے آپس میں کہا کہ ''ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ ان کی یہ جرأت کیسے ہوئی۔ اب ہم ان کی خبر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے تیز تیز قدموں کے ساتھ نیچے کی طرف آئے۔ اور ہوتے ہوئے ''ہراسونگ'' پہنچ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی انہیں نیچے کھیتوں سے کچھ عجیب آوازیں آنے لگیں۔ یہ نوجوان غصے کی عالم میں تھے۔ لیکن ان آوازوں کو سن کر ذرا رک گئے اور غور سے سننے کی کوشش کی۔ ان کے کانوں کو یہ آوازیں سنائی دیں۔ ''میں اپنے ناناؤں کے بیلوں پر قربان! میں اپنے ماموں کے باز کے قربان! اس طرح وہ اپنے ان بیلوں کی تعریف سنتے رہے تو وہ حیران ہوئے اور پھر انہوں نے آپس میں کہا ''چلیں، انہیں مارتے ہیں۔'' لیکن ایک نے کہا ''نہیں'' بلکہ جا کر دیکھیں کہ آخر یہ لوگ ہیں کون! وہ لوگ ہماچانگ جیسے لوگوں کو نظرانداز کر کے اس طرح بیلوں کو کیوں لائے ہیں اور پھر یہاں پر ہماری تعریف کیوں ہو رہی ہے۔'' بالآخر یہ اتفاق رائے ہوا۔ کچھ کھیت کے منڈیر پر ٹھہرے رہیں اور کچھ ان کی طرف آگے بڑھیں۔ اتنے میں بلوکی کے بیٹوں نے انہیں دیکھ لیا تھا اور انہیں یقین ہوا تھا کہ ہو نہ ہو یہ تو ماموں لوگ ہوں گے۔ فوراً بیلوں کو چھوڑا اور آ کر اپنے ماموؤں کو آداب بجالائے اور نہایت احترام سے ان کا استقبال کیا۔ ہماچانگ والے تو حیران بھی تھے اور ساتھ ہی غصے میں بھی تھے۔ انہوں نے ان سے دریافت کیا۔ کہ ''تم لوگ کون ہو اور اس طرح تم لوگ بلا اجازت ہمارے بیلوں کو یہاں کیوں لائے ہو؟'' اس پر چھورم کے بیٹوں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ ''ہم بلوکی کے بیٹے ہیں اور ہمارے باپ کا نام درم چھورم ہے'' ہماچانگ کے جوانوں نے ان سے پھر سوال کیا۔ ''تمہارا باپ کدھر ہے؟'' لڑکوں نے جواب دیا: ''وہ تو اوپر پہاڑی میں رہتے ہیں۔'' اس پر انہوں نے پوچھا۔ ''وہ وہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ نیچے آبادی میں کیوں نہیں آتا؟'' اس پر بلوکی کے بیٹوں

نے جواباً عرض کیا۔ ''ہمارا والد آپ لوگوں سے ڈر کر وہاں پر روپوش ہوا ہے۔'' یہ سنتے ہی ہما چانگ کے جوانوں کو اشتیاق پیدا ہوا کہ پتہ چلایا جائے اور معلوم کیا جائے کہ واقعی وہ وہاں پر موجود ہے یا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اوپر جا کر اس کا سُراغ لگایا جائے۔ یہ جوان مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے بلوکی اور چھورم دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے موجود پایا۔ انہیں اس طرح دیکھ کر ہما چانگ والے خوش ہوئے اور انہوں نے بلوکی کو اس طرح نہ چھوڑا بلکہ اسے اور چھورم دونوں کو نیچے گنش لے آئے۔ یہاں لاتے ہی قبیلہ ہما چانگ میں خوشیاں منائی گئیں کیونکہ کافی عرصہ کے بعد ان کی بیٹی ان کو زندہ ملی تھی۔ اب انہوں نے ان دونوں کی باقاعدہ شادی کی رسم ادا کی اور اپنی بیٹی کے لئے جہیز کا بندوبست کیا۔ علاوہ دیگر اشیاء کے وہ سات جوڑے بیلوں کو بلوکی کو دیئے گئے اور یوں اہتمام کے ساتھ بلوکی کی رخصتی ہوئی۔ اس کے بعد چھورم اور بلوکی معہ اپنے بیٹوں کے آرام وسکون سے زندگی گزارنے لگے۔ بلتت میں قبیلہ دراتنگ کی نسل اسی چھورم سے پھیلی ہے۔ (35)

حوالہ جات:

1۔ اکبر حسین اکبر، اردو اور شینا کے مشترک الفاظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1992، ص، 5
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، ص، 8-9
5۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مختصر تاریخ زبان و ادب۔۔ گلگت بلتستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2009، ص 31
6۔ عظمیٰ سلیم بشمولہ، ایضاً، ص، 32
7۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مختصر تاریخ زبان و ادب۔۔ گلگت بلتستان، ص، 33
8۔ ایضاً، ص، 37
9۔ گریرسن، لنگوسٹک سروے آف انڈیا، ج 8، حصہ دوم، صفحہ 2-3
10۔ ایضاً، ص، 10
11۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، مختصر تاریخ زبان و ادب۔۔ گلگت بلتستان، ص، 28-30
12۔ ایضاً، ص، 27-28
13۔ محمد یوسف حسین آبادی بلتستان پر ایک نظر، سکردو، 1984، ص، 61
14۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص، 92-96
15۔ ایضاً، ص، 96-97
16۔ روبینہ امتیاز قزلباش، گل متی (شمالی علاقہ جات کی لوک کہانیاں)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، 1990، ص، 9-19
17۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص، 56
18۔ ایضاً، ص، 60
19۔ ایضاً، ص، 104
20۔ ایضاً، ص، 60
21۔ ایضاً، ص، 104-105
22۔ سید عالم، شمالی علاقہ جات کا لسانی و ادبی جائزہ، ناصر آباد، استور، س۔ن، ص، 111-112
23۔ اسرار الدین اسرار (مترجم) ملنگی سمڑہ، شنالینگویج اینڈ کلچر پروموشن سوسائٹی، گلگت، 2012، ص، 6-42
24۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، گلگت بلتستان، ص، 117-119
25۔ محمد حسن حسرت بلتستان، مشمولہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلو پیڈیا، شمالی علاقہ جات، لوک ورثہ، اسلام آباد، الفیصل، لاہور، س۔ن، ص، 263
26۔ ایضاً

27۔ سید محمد عباس کاظمی، بلتی لوک گیت، لوک ورثہ اشاعت گھر، اسلام آباد، 1985/88، ص،103-104
28۔ ایضاً، ص 190-192
29۔ سید عالم، شمالی علاقہ جات کا لسانی وادبی جائزہ، ناصر آباد، استور، 2011، ص، 166-174
30۔ ایضاً، ص، 159-160
31۔ الحاج محمد ابراہیم زائر، ارضِ بلتستان، س۔ن ص،112
32۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری، ص،221
33۔ ایضاً، ص، 204-208
34۔ ایضاً، ص، 230-231
35۔ عبداللہ جان ہنزائی، ہنزہ کی لوک کہانیاں، سنگِ میل، لاہور، 1998، ص،42-50

لوک بیانیہ کیا ہے؟ سادہ لفظوں میں لوگوں کی اپنی مادری زبانوں میں بیان کردہ حکایات، روایات، ان کے گائے ہوئے گیت، بزرگوں سے نسل درنسل منتقل ہوتی لوک دانش، ضرب الامثال، لوک کتھائیں، جیسے قبیلے کی بہادری کے منظوم قصے، محبت کی رنگین و سنگین داستانیں، آزادی اور آزادی کے لئے مر مٹنے کا بیانیہ، قبائل کی روایتی تاریخ بھی لوک بیانیہ کے ضمن میں آتی ہے۔ اسی طرح صدیوں سے چلی آنے والی سینہ بہ سینہ روایات جنہیں ان کی مادری زبان میں بیان کیا گیا ہو، لوک بیانیہ کا حصہ ہوتی ہیں اور اس میں مادری زبانوں کا تنوع خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا آغاز، ان کا ارتقاء، ان کی موجودہ صورت، ان زبانوں کا ورثہ، یہ سب لوک بیانیہ کا حصہ ہے۔ پاکستان درجنوں زبانوں اور بولیوں کا ایک خوبصورت باغ ہے۔ جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے اس لوک بیانیے میں ان تمام پھولوں کو یکجا کر کے ایک خوبصورت گلدستہ ترتیب دینے کی کاوش کی گئی ہے۔

آثار قدیمہ لوک بیانیہ کی اولین بنیاد ہیں۔ پاکستان کا لوک بیانیہ ہمیں صدیوں پیچھے لے جاتا ہے۔ اس کتاب میں لوک بیانیہ کے تاریخی شواہد اور آثار قدیمہ پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے ثقافتی اور سماجی پہلوؤں پر بات کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب منفرد اہمیت کی حامل ہے۔